دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈھ

کی

۸۴ویں جلد

از جولائی ۱۹۵۹ء تا دسمبر ۱۹۵۹ء

مُرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

مطبع معارف پریس اعظم گڈھ

فہرست مضامین معارف

جلد ۸۴

جولائی ۱۹۵۹ء تا دسمبر ۱۹۵۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست مضمون نگارانِ معارف

جلد ۸۴

جولائی ۱۹۵۹ء تا دسمبر ۱۹۵۹ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسمائے گرامی	صفحہ	شمار	اسمائے گرامی	صفحہ
۱	جناب مولوی ثناء اللہ صاحب جامعہ دار السلام، عمر آباد	۳۱۴	۷	جناب مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دار المصنفین	۴۹
۲	جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس	۴۶۰	۸	جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر مدرس دار العلوم معینیہ، اجمیر	۲۴۵،۱۸۷ ۴۰۵،۳۵۱
۳	جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش	۲۶۶، ۵۹ ۴۵۱،۳۶۶	۹	مولانا محمد عبد الحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند	۱۶۵، ۷۵
۴	مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین	۱۴۹،۷۹ ۲۳۷،۱۵۷ ۳۱۷،۲۸۶ ۳۹۷،۳۷۹ ۴۷۵،۴۳۶	۱۰	ڈاکٹر محمد عبد الحمید صاحب فاروقی ایم اے پی ایچ ڈی صدر شعبۂ اردو و فارسی و اسلامک کلچر، گجرات کالج، احمد آباد	۳۷
۵	جناب مولانا سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی	۴۲۳	۱۱	جناب مولوی محمد عثمان عمادی صاحب، بی، ایس سی علیگ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن	۲۰۹
۶	جناب مالک رام صاحب	۱۴۴	۱۲	جناب محمود الحسن صاحب ندوی، جامعہ نگر دہلی	۳۰۰،۲۲۴

رجسٹرڈ نمبر اے ۵۲۰   جولائی ۱۹۵۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۸۴ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۵۹ء نمبر ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ہماری جماعت کے ممتاز رکن اور ندوہ کے نامور فرزند مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے وفات پائی، انھوں نے متوسطات تک ندوہ میں تعلیم پائی، اور تکمیل جامعہ ازہر مصر میں کی تھی، علامہ رشید رضا کے خاص شاگردوں میں تھے۔ ان کا ذوق ابتدا سے سیاسی بلکہ انقلابی تھا، چنانچہ مصر کے قیام کے زمانہ میں قسطنطنیہ جاکر انور پاشا سے ملے، انکی ملاقات نے سیاست اور آزادی کا نشہ اور تیز کر دیا، پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستان واپس آئے، اور کچھ دنوں تک مولانا عبدالباری فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ رہے، جن کی ذات اس زمانہ میں مسلمانوں کی سیاست کا مرکز تھی، مگر مولانا عبدالرزاق کے خیالات اس زمانہ کی سیاست سے بہت آگے تھے۔ اس لیے زیادہ دنوں تک یہ ساتھ نہ رہ سکا،

حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں مولانا ابوالکلام کو ایک علمی و سیاسی رفیق کار کی تلاش تھی، اس کے لیے ان کی نگاہ انتخاب مولانا عبدالرزاق پر پڑی اور ان کو انھوں نے کلکتہ بلا لیا، اس وقت سے وہ مولانا کے دامن سے ایسے وابستہ ہوئے کہ مرتے دم تک ان کا ساتھ نہ چھوڑا، وہ برسوں مولانا ابوالکلام کے سیاسی اور علمی کاموں میں ان کے دست راست رہے۔ چنانچہ دوسرے دور کے البلاغ اور مشہور عربی اخبار الجامعہ کے اڈیٹر مولانا ابوالکلام برائے نام تھے، ان کا پورا کام

مولانا عبدالرزاق انجام دیتے رہے، الجامعہ ہندوستان میں عربی کا پہلا معیاری اخبار تھا جس کی شہرت عرب ملکوں تک تھی، ہندوستان کے مسلمانوں میں عربی ادب و انشا کا صحیح ذوق پیدا کرنے اور عرب ملکوں سے ان کا رابطہ استوار کرنے میں اس اخبار کا بڑا حصہ ہے، ان علمی و صحافتی مشاغل کے ساتھ سیاسی تحریکوں میں بھی عملی حصہ لیتے رہے، اور اس راہ میں قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، ہندوستان کی جنگ آزادی کے سلسلہ میں جب مولانا ابوالکلام کی مشغولیتیں زیادہ بڑھ گئیں اور وہ اپنے علمی و صحافتی مشاغل چھوڑنے پر مجبور ہوئے تو مولانا عبدالرزاق صاحب نے مختلف اوقات میں پیغام ہند اور آزاد ہند وغیرہ متعدد اخبار نکالے، آزاد ہند ابتک جاری ہے، بنگال کے مسلمانوں کی بیداری اور ہندوستان کی تحریک آزادی میں الہلال اور البلاغ کے بعد اس اخبار کا نمایاں حصہ ہے،

ہندوستان کی آزادی کے بعد مولانا ابوالکلام نے مولانا عبدالرزاق کو دلی بلالیا اور وہ حکومت ہند کے ثقافتی تعلقات کے شعبہ کے عربی رسالہ ثقافۃ الہند کے اڈیٹر اور آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی کے شعبۂ عربی کے انچارج مقرر ہوئے اور کئی سال تک یہ دونوں کام انجام دیتے رہے، پھر مولانا ابوالکلام کی وفات کے بعد ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ ملازمت چھوڑ کر کلکتہ چلے گئے، ان کو ایک مرتبہ حلق میں کینسر کی شکایت ہو چکی تھی مگر علاج سے افاقہ ہو گیا تھا، چند دنوں کے بعد پھر یہ مرض ابھر آیا، اس مرتبہ علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا، اور اسی مرض میں گذشتہ مہینہ وفات پائی، وفات کے وقت ۶۴ - ۶۵ سال کی عمر رہی ہوگی،

مولانا عبدالرزاق خالص افغانی پٹھان تھے، اس لیے پٹھانوں کی خوبیاں اور خامیاں دونوں ان کے حصہ میں آئی تھیں، وہ کہنہ مشق صحافتی تھے، ان کی پوری عمر صحافت میں گذری، عربی اور

اردو دونوں کے ادیب تھے، نہایت فصیح و سلیس عربی اور اردو لکھتے تھے، اخبارات کے علاوہ انھوں نے مختلف اوقات میں اردو کے کئی رسالے نکالے اور ان کے ذریعہ اسلامی تاریخ اور عربی تہذیب وثقافت سے متعلق خاصہ لٹریچر اردو میں پیدا کردیا، وہ طبعاً انتہا پسند، انقلابی اور آزادخیال تھے، اس کا اثر ان کے سیاسی اور مذہبی خیالات میں نمایاں تھا، سیاسی خیالات میں وہ کمیونسٹ تھے، اور مذہب میں غیر مقلد اور ترقی پسند تھے، تقلید جمود اور بدعات کے سخت مخالف تھے، ابتدا میں اسی اثر کے ماتحت انھوں نے ابن تیمیہ اور ابن قیم کے بہت سے رسائل کا اردو میں ترجمہ کیا، مگر بعض اوقات ان کی آزادخیالی صحیح مذہب کے حدود سے بھی آگے نکل جاتی تھی،

طبعاً نہایت شریف مخلص، دوست نواز، متواضع، بے تکلف، فیاض، سیرچشم، خوش مزاج اور بذلہ سنج انسان تھے، روپیہ پیسہ کی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ تھی، انھوں نے جو کچھ پیدا کیا سب صرف کردیا، حکومت ہند میں ڈیڑھ ہزار ماہوار پاتے تھے، مگر ایک حبہ نہیں بچتا تھا، ان کی فیاضی سے ان کا ہر ملنے والا مستفیض ہوتا تھا، اور لطف یہ کہ ان کی زندگی نہایت سادہ بلکہ طالب علمانہ تھی، ان کی بے سروسامانی دیکھ کر کوئی شخص یہ یقین ہی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اتنی بڑی تنخواہ پاتے ہیں، مولانا ابوالکلام کے ساتھ برسوں رہے، ان کے ہمدم و ہمراز اور انیس جلوت و خلوت تھے، ان سے زیادہ مولانا سے قریب اور ان کا واقف کار دوسرا شخص نہیں نکل سکتا، مولانا بھی ان کی بڑی قدر اور ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے،

ان کی پوری زندگی قوم وملت، ملک و وطن اور علم وادب کی خدمت میں گذری، ان کے مضامین کے علاوہ تصانیف کی تعداد دو درجن سے کم نہ ہوگی، دہلی کے قیام کے زمانہ میں عربی اردو کا ایک

مبسوط لغت مرتب کر رہے تھے جس کا ایک حصہ لکھ بھی چکے تھے، اور مولانا ابوالکلام کی ایک سوانحعمری بھی لکھی تھی، جس کے متعلق ان کا بیان تھا کہ اس میں ایسے اہم واقعات ہیں جن کا کسی کو بھی علم نہیں، اس لیے یہ کتاب ان کی یا مولانا کی وفات کے بعد شائع ہو گی، یہ سوانح عمری غالباً اس سوانحعمری سے مختلف ہے جو انھوں نے مولانا کی وفات کے بعد مولانا کی روایت سے شائع کی ہے، ان کتابوں کے علاوہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق بعض اور تصانیف بھی ان کے پیش نظر تھیں جن میں سے غالباً بعض کتابیں انھوں نے شروع بھی کر دی تھیں، یقین ہے کہ ان کی غیر مطبوعہ تصانیف کے مسودے ان کے لائق فرزند عزیزی احمد سعید خاں صاحب کے پاس محفوظ ہوں گے، اور وہ ضائع ہونے پائیں گے، مولانا عبد الرزاق نے اپنے قلم سے عرصہ تک مذہب و ملت کی خدمت کی ہے، اللہ تعالیٰ اس کے صلہ اور اپنی رحمت کے طفیل میں ان کی بشری لغزشوں سے درگذر کر کے اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ رحمۃً واسعۃً

دوسرا حادثہ دنیائے عرب کی نامور شخصیت ڈاکٹر عبد الوہاب عزام مصری کی وفات کا ہے، وہ عربی دنیا کے اکابر رجال میں تھے، ان میں علم و سیاست دونوں کا اجتماع تھا، وہ اسلامی علوم و ادب کے فاضل، عربی، فارسی، ترکی، انگریزی، فرنچ وغیرہ متعدد زبانوں کے ماہر تھے، اردو سے بھی واقفیت رکھتے تھے، انھوں نے مصر اور لندن کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی، ابتدا میں مدرسۂ قضاء شرعی کے استاد مقرر ہوئے تھے، پھر فواد یونیورسٹی میں عربی، فارسی اور ترکی کے پروفیسر، پھر اسی یونیورسٹی میں شعبۂ السنہ مشرقیہ کے صدر مقرر ہوئے، اور آخر میں آرٹس کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے، علم کے ساتھ سیاست میں بھی ممتاز تھے، چنانچہ مختلف اوقات میں حکومت مصر کی جانب سے یمن، سعودی عرب اور پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے، تھوڑے دن ہوئے سعودی حکومت نے ریاض یونیورسٹی کے قیام و تاسیس کے سلسلہ میں انکی خدمات حاصل کی تھیں، ابھی وہ اس کام کو انجام دے رہے تھے کہ پیام اجل آگیا، انھوں نے

اپنے علم و دماغ سے علم و فن اور دنیائے عرب کی بڑی قیمتی خدمات انجام دیں اور علمی مضامین کے علاوہ بہت سی محققانہ تصانیف اور تراجم یادگار چھوڑے۔ عربی دنیا میں انکی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ مشکل سے بھر سکیگی، اللہ تعالیٰ علم و ملت کے اس خادم کو اپنے دامن رحمت میں جگہ دے۔

اس گئی گذری حالت میں بھی الحمد للہ مسلمانوں میں ایسی ہستیاں موجود ہیں جن پر بجا طور سے فخر کیا جا سکتا ہے، آج ہم ایک ایسی شخصیت کا تعارف کراتے ہیں جس سے غالباً بہت کم لوگ واقف ہونگے، یہ شخصیت ڈاکٹر خان عبد اللطیف خان کی ہے، وہ دار المصنفین کے قدر دانوں میں ہیں، انکا اصل وطن کھنڈوہ سی پی ہے اور اب وہ کویت میں پریکٹس کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انکو جس طرح دولت دنیا سے نوازا ہے اسی طرح وہ قوم و ملت کی راہ میں صرف بھی کرتے ہیں، وہ دو سال سے دار المصنفین کو ایک ہزار روپیے سالانہ بھیجتے تھے، کویت کی دولت کے افسانے سنکر انکو توجہ دلائی گئی کہ دار المصنفین کے کتبخانہ میں بجلی کی روشنی اور پنکھا نہیں ہے جس کے لیے دو ہزار روپئے کی ضرورت ہے اگر وہ کویت کے دو چار علم دوست اصحاب ثروت کو دار المصنفین کا لائف ممبر بنوا دیں تو یہ دونوں ضرورتیں پوری ہو جائیں، خط ملنے کے ساتھ ہی انھوں نے دو ہزار روپیے بحری تار کے ذریعہ بھیجدیے، ایک ہزار اپنی اور ایک ہزار اپنی بیگم صاحبہ کی جانب سے، ہم نے جب اسکے اعلان کی اجازت چاہی تو انکار کیا کہ یہ رقم انھوں نے حسبۃً للہ دی ہے، اس لیے اسکے اعلان کی ضرورت نہیں، اور جب اس کے لیے زیادہ اصرار کیا گیا تو بمشکل آمادہ ہوئے، اس قسم کی فیاضیوں کا اعلان اسلیے ضروری ہے کہ اس سے قوم کے اصحاب ثروت کو سبق حاصل ہو، بعد میں معلوم ہوا کہ انکی یہ فیاضی دار المصنفین کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ مذہبی مدارس اور دینی اداروں کو اس سے بھی بڑی رقمیں دیتے رہتے ہیں، اس زمانہ میں ایسی فیاضی کی مثالیں کم ملیں گی اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب موصوف اور انکی بیگم صاحبہ کو اسکا اجر عطا فرمائے،

ہم کو اس کا دلی افسوس ہے کہ ناظرین معارف کو اس مہینہ غیر معمولی انتظار کرنا پڑا، یہ اس مجبوری کی بنا پر پیش آیا کہ ادھر کئی مہینہ سے کاغذ کا اتنا قحط تھا کہ کسی قیمت پر بھی نہیں ملتا تھا، بڑی مشکلوں سے بقدر ضرورت فراہم ہو سکا ہے، اس تاخیر کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں، انشاء اللہ آیندہ مہینہ سے پرچہ وقت سے شائع ہوگا،

مقالات

امام حسن بن محمد الصغانی لاہوری

از

جناب مولانا عبد الحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۶)

ہندوستان میں صغانی کے طویل قیام کے اثرات

صغانی کے اس طویل قیام نے خلافت بغداد سے ہندوستان کے رشتہ کو مزید استحکام بخشا اور رجب ۶۲۲ھ میں خلیفہ الناصر لدین اللہ کا انتقال ہوگیا اور خلیفہ الظاہر لدین اللہ سریر آرائے خلافت ہوا تو اس کے سکون پر بھی بجز خلیفہ کے نام کی تبدیلی کے وہی عبارت ثبت رہی جو خلیفہ الناصر لدین اللہ کے دور میں ہوتی تھی، خلیفہ الظاہر لدین اللہ کا زمانۂ خلافت سال بھر سے کم رہا، ۶۲۳ھ میں اس کا انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا المستنصر باللہ مسند خلافت پر بیٹھا. تب بھی ان تعلقات میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا. اور حسب دستور وہی عبارت جو گذشتہ خلفاء عباسیہ کے سکون پر رقمزد ہوتی تھی، اسکے دور میں بھی باقی رہی،[1]

المستنصر باللہ نے تخت نشین ہونے کے بعد صغانیؒ کو بغداد طلب کیا. ہندوستان سے ان کی روانگی کی صحیح تاریخ تو معلوم نہیں لیکن یہ ظاہر ہے کہ ۶۲۳ھ کے اواخر یا ۶۲۴ھ

---

[1] ملاحظہ ہو The Sultans of Dehli their coinage and metrolagy by wright P.U.1936

کے اوائل میں یہاں سے روانہ ہوئے اور ۶۲۳ھ میں بغداد پہنچے، جیسا کہ مورخ ذہبی کا بیان ہے،

ذهب منها بالرسالة الشريفة	ان کو دارالخلافت بغداد سے سفارت
الی صاحب الهند فبقی مدة	کے عہدہ پر ہندوستان کے بادشاہ کے
وقدم سنة اربع وعشرين	دربار میں بھیجا گیا جہاں ایک مدت دراز تک
وستمائة[1]	انکا قیام رہا اور ۶۲۴ھ میں وہاں سے واپس آئے،

صغانی کی بغداد میں آمد مورخ بغداد کمال الدین ابن الفوطی نے الحوادث الجامعہ میں سال کا تعین نہیں کیا ہے، لیکن اس امر کی تصریح کی ہے کہ صغانی المستنصر باللہ کے زمانہ میں آئے تھے، لکھتے ہیں:

نفذه الخليفة الناصر رسولا	آپ کو خلیفہ الناصر ...... نے ہندوستان
الی ملك الهند، فعاد بعد	کے بادشاہ کے پاس سفیر بنا کر بھیجا،
مدة طويلة في خلافة	تو ایک مدت دراز کے بعد مستنصر باللہ
المستنصر بالله[2]	کے دور خلافت میں واپس آئے،

صغانی کو بعض امور پر گفت و شنید کے لیے بغداد طلب کیا تھا، اس لیے ان کا وہاں زیادہ قیام نہیں رہا اور اسی سال ہندوستان بھیج دیا گیا۔ الذہبی تاریخ الاسلام میں لکھتے ہیں:

ثم اعيد اليها رسولاً عامئذ[3]	پھر اسی سال (۶۲۴ھ) میں انکو ہندوستان واپس بھیج دیا گیا،

صغانی شعبان ۶۲۴ھ میں بغداد سے روانہ ہوئے تھے، ابن ابی الوفاء القرشی المتوفی

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام ترجمہ حسن بن محمد الصغانی، مخطوطہ کتب خانہ ریاست رامپور۔ [2] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ طبع بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۲۶۶ [3] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام، ترجمہ حسن بن محمد الصغانی

[illegible] الجواہر المضیہ میں لکھتے ہیں:

رجع منها سنة اربع وعشرين	وہ ہندوستان سے ۶۲۴ھ میں بغداد آئے
واعيد اليها رسولا في	اور پھر اسی سال شعبان میں سفیر
شعبان من السنة[1]	ہوکر واپس ہندوستان چلے گئے۔

مورخین کے بیانات اور صغانی کی تصریح کے پیش نظر (جو آگے مذکور ہے) مولانا عبدالحی صاحب کا بیان کہ موصوف رضیہ سلطانہ کے دور میں سفیر ہوکر یہاں آئے تھے، کسی طرح صحیح نہیں، کیونکہ رضیہ سلطانہ ربیع الاول ۶۳۴ھ میں تخت نشین ہوئی، اور صغانی اس وقت بغداد میں تھے، نزہۃ الخواطر میں ہے:

ثم خرج من الهند سنة اربع	پھر وہ ۶۲۴ھ میں ہندوستان سے روانہ
وعشرين وستمائة فحج ودخل	ہوئے، حج کیا اور یمن پہنچے، پھر بغداد
اليمن ثم عاد الى بغداد	آئے، اس کے بعد مستنصر باللہ کے دربار
ثم اعيد الى الهند رسولا	سے آپ کو ہندوستان سفارت پر
من حضرة المستنصر بالله	سلطانہ ہند رضیہ بنت التمش
العباسي الى رضية بنت	کے دربار میں بھیجا گیا
الايلتتمش ملكة الهند[2]	

بغداد سے واپسی پر جب صغانی بصرہ میں ٹھہرے تو حضرت عمار العبدی رضی اللہ عنہ کے مزار پر بھی حاضر ہوئے، مجمع البحرین میں لکھتے ہیں:

بصرہ میں وارد ہوا اور حضرت عمار عبدیؓ کے مزار پر حاضری

---

[1] ملاحظہ ہو الجواہر المضیہ طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ج ۱، ص ۲۰۲ [2] نزہۃ الخواطر ج ۱، ص ۱۳۸

صحار العبدی[1] رضی اللہ عنہ — حضرت صحار العبدی رضی اللہ عنہ کو
له صحبة ودفن بظاهر البصرة — آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت
نائیا عن البلد قال الصغانی — کا شرف حاصل ہے۔ بصرہ سے باہر
مؤلف هذا الكتاب وقد زرت — شہر سے ذرا دور آپ کا مزار ہے،
قبره في شعبان من سنة — صغانی اس کتاب کا مولف کہتا ہے
اربع وعشرين وستمائة — میں نے شعبان ۶۲۴ھ میں آپ کی
وصحار بلدة وهي قصبة — قبر کی زیارت کی، صحار چھوٹا سا شہر ہے جو
عمان مما يلي الجبل وتؤام — عمان کے توابع میں پہاڑ سے متصل ہے
قصبتها مما يلي الساحل[2] — اور ان حدود سے ملا ہوا ہے جو ساحل بحر سے

---

[1] حضرت صحار رضی اللہ عنہ قبیلۂ عبد القیس سے تھے، اسی نسبت سے العبدی مشہور ہوئے، آپ کو حضور اکرمؐ کی زیارت اور صحبت کی سعادت حاصل تھی، انساب پر آپ کی گہری نظر تھی، نہایت سحر طراز خطیب اور بڑے فصیح اللسان بزرگ تھے۔ جاحظ نے اپنی زندۂ جاوید کتاب البیان والتبیین اور کتاب الحیوان میں فصاحت و بلاغت سے متعلق بہت سی باتیں آپ ہی کے حوالہ سے نقل کی ہیں، آپ بعض کتابوں کے مصنف بھی تھے، ابن الندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں:

له من الكتب كتاب الامثال — آپ کی تصانیف میں سے کتاب الامثال بھی ہے

اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہو چکا تھا اور ان کے زمانہ میں علم لغت کی تدوین بھی شروع ہو گئی تھی علم الامثال کی تدوین کا سہرا آپ ہی کے سر ہے۔

حضرت صحار عبدیؓ کا تذکرہ طبقات ابن سعد سے لیکر اصابہ تک طبقات کی سب کتابوں میں موجود ہے لیکن آپ کے مزار کی اتنی صراحت کہیں نہیں ہے، مجمع البحرین، سید مرتضی الزبیدی کو نہیں ملی، اسلئے تاج العروس بھی ان معلومات سے خالی ہے،

[2] مجمع البحرین روٹوگرافت کاپی اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی مادہ صحر،

صغانی کے بعض بیانات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ بحر فارس کے راستہ سے ہندوستان آئے تھے۔ چنانچہ آتے وقت جزیرۂ خارک میں بھی ٹھہرے تھے۔ سید مرتضیٰ الزبیدی المتوفی ۱۲۰۵ھ العباب الزاخر کے حوالہ سے تاج العروس میں لکھتے ہیں،

قال الصغانی وقد دخلت	صغانی کہتا ہے کہ میں ۶۱۴ھ میں خارک
خارك سنة ستمائة و	میں بھی گیا ہوں۔ جب دوبارہ مجھے
اربع وعشرين حين	دار الخلافہ بغداد (اللہ تعالیٰ اس کی
ارسلت ثانية من دار الخلافة	عظمت کو دوبالا کرے) سے سفیر بناکر
عظمها الله تعالیٰ رسولا	ہندوستان کے بادشاہ شمس الدین
الی ملك الهند شمس الدين	التمش انار اللہ برہانہ کے دربار
التمش انار الله برهانه[1]	میں بھیجا گیا تھا۔

واضح رہے اس مرتبہ صغانی کو تنہا نہیں بھیجا گیا تھا بلکہ ایک پورا وفد آپ کی زیر نگرانی میں آیا تھا، یہ وفد ۶۲۵ھ میں ہندوستان کے حدود میں داخل ہوا، اور ۶۲۶ھ میں دہلی پہنچا، یہاں اس کا نہایت شاندار استقبال ہوا۔ منہاج الدین جوزجانی طبقات ناصری میں رقم طراز ہیں:

چوں پاسے آں قلعہ (اچہ) انصراف فرمود در موافقت حشم منصور آں بادشاہ غازی (التمش) بحضرت دہلی اجلہا اللہ آمد، و در ماہ رمضان سنہ خمس وعشرین وستمائۃ بحضرت دہلی اہل وصول بود، دریں وقت رسل دار الخلافت بالتشریفات وافرہ بحدود ناگور رسیدہ بود، و در روز شنبہ بیست و دوم ماہ ربیع الاول

[1] ملاحظہ ہو العباب بحوالہ العروس مادہ خرک

ستہ و عشرین وستمائۃ بحضرت دہلی رسیدند و شہر را آذین بستند و آں پادشاہ و ملوک و فرزندان آں طاب ثراہم و دیگر ملوک و خدم و بندگان ہمہ بخلعت دار الخلافت مشرف گشتند[1]

یہ وفد خلافت بغداد سے خلعت فاخرہ اور علم وغیرہ لیکر خشکی کی راہ سے آیا تھا، مگر صغانی بحری راستہ سے اس سے پہلے پہنچ گئے تھے، اسی وفد کے متعلق عبد اللہ بن عمر المکی ظفر الوالہ میں لکھتے ہیں:-

کان وصولہ الیہا فی رمضان	رمضان ۶۲۵ھ میں سلطان التتمش دہلی
من سنۃ خمس وعشرین	پہنچا تو اسے خلیفہ بغداد کے ایلچیوں کی آمد کی
وستمائۃ وصول رسول الخلیفۃ	اطلاع ملی کہ وہ بغداد سے براہ خشکی بڑے
الی ناگور بجہز معہ لباس الی البرود	ساز و سامان کے ساتھ ناگور آگئے ہیں اور
فی سنۃ ست وعشرین وصل حاجب الخلیفۃ	۶۲۶ھ میں خلیفہ عباسی امیر المومنین
العباسی امیر المومنین المستنصر باللہ	مستنصر باللہ ابو جعفر بن الظاہر کی خلعت
ابو جعفر بن الظاہر بخلعۃ	اور علم لیکر سلطان شمس الدین التتمش کے دربار
الخلافۃ ولواء الی شمس الدین	میں پہنچے تو خلیفہ نے اس وفد کا استقبال کیا
فاستقبلہ وامرہ بالزینۃ	اور شہر و دربار کو آراستہ کرنے کا حکم دیا اور
وکان یوماً مشہوداً[2]	یہ یادگار دن تھا۔

فخر الدین مبارک شاہ نے تصریح کی ہے کہ سلطان التتمش نے اس وفد کو نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ رخصت کیا اور خلیفہ بغداد کی خدمت میں کچھ تحائف بھی بھیجے تھے مگر صغانی واپس نہیں گئے، ان کا قیام یہیں رہا، تاریخ مبارک شاہی میں ہے:

۱؎ ملاحظہ ہو طبقات ناصری، مرتبہ علامہ عبد الحی حبیبی، طبع کوئٹہ ۱۳۴۹ء، ج ۱، ص ۵۲۴

۲؎ ملاحظہ ہو ظفر الوالہ بمظفر و آلہ، طبع لیڈن، ج ۲، [illegible]

در سنہ ست وعشرین وستمائۃ رسولان دار الخلافت جامہائے مرحمت خلیفہ خلد اللہ خلافتہ برائے سلطان مرحوم آوردند، سلطان مرحوم چنانچہ شرط اطاعت وخدمتگاری باید بجا آورد، با فرزندان وملوک بزرگ بخلعۃ چندان فرحت وبہجت روئے داد کہ در تحریر نیاید، در شہر قبہا بستند وطبل وشادیانہ کوفتند، بعد چند گاہ رسولان دار الخلافت را باعزاز واکرام روان کرد وخدمت بسیار در حضرت دار الخلافت فرستاد[1]

اس مرتبہ بھی صغانی کا قیام مستقل ایک جگہ نہیں رہا، مگر جہاں بھی رہا درس وتدریس کا سلسلہ برابر جاری رہا اور جس خطہ میں بھی آپ کے قدم گئے وہ قال اللہ وقال الرسول کی صداؤں سے معمور ہوگیا، ملوک وسلاطین سے لیکر فقراء ومساکین تک سب نے زانوئے تلمذ تہ کرکے حدیث رسول کے نور سے اپنے قلب ونظر کو منور کیا، شیخ فرید الدین محمود بن علی الناگوری المتوفی ۷۵۲ھ سرور الصدور میں لکھتے ہیں:

ہمدرین ذکر مولانا رضی الدین صغانی رفتہ رحمۃ اللہ علیہ صاحب کتاب مصابیح[2] کہ ایشان در ناگور[3] آمدند، می گویند، دستار سخت[4] بسر بستندے، دو در دار باتیغہا وزرہ[5]

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ مبارک شاہی مولفہ یحیٰی بن احمد السیہرندی مطبع بپٹسٹ مشن کلکتہ ۱۹۳۱ء ص ۱۹،

[2] مصباح الدجی بھی صغانی کی حدیث میں ایک مشہور اور مقبول کتاب تھی جو اب مشارق الانوار میں محفوظ ہے، اس کا تذکرہ صغانی نے مشارق الانوار کے مقدمہ (طبع آستانہ ص ۴) میں کیا ہے اور لکھا ہے، لوگ اس کے سماع پر ٹوٹے پڑتے تھے، اور اس کے ساتھ بڑا انہماک اور شغف رکھتے تھے [3] ناگور ایک مشہور شہر ہے اب جودھپور کے حدود میں واقع ہے، مسلمان حکمرانوں میں سب سے پہلے معز الدولہ بہرام شاہ نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا تھا، طبقات ناصری (طبع کلکتہ ۱۲۶۳ھ ص ۲۳) میں مذکور ہے:

(باقی ص ۱۲ پر)

پوشیدہ نمی ماند، سخت فاضل و عالم، محدث تام، چنانچہ می گفتند[1] کہ این مصباح الدجی

در یک روز در یک محفل تمام فرد خواندہ کرد، و بزرگان ناگور، قاضی حمید الدین ناگوری

و قاضی کمال الدین و بزرگان دیگر از صدور، و ملوک از خدمت ایشان سماع کردند

و اجازت و روایت یافتند[2]،

مصابح الدجی کا درس اس طرح ہوتا تھا کہ درس کے وقت جب کوئی نیا اور مشکل

لفظ آجاتا اور شاگردوں میں سے کوئی اس کے متعلق کچھ پوچھتا تو آپ فرماتے، یہ لفظ صحاح

جوہری کی فلاں جلد، فلاں صفحہ اور فلاں سطر میں ہے، دیکھ لو، شیخ فرید الدین ناگوری لکھتے ہیں:

این صحاح لغت را مولانا رضی الدین صغانی بنشستہ جلد کردہ بود، ہر جا کہ

نشستے پیش او بودے، ہر کرا لغتے مشکل شدے، بگفتے در فلاں جلد و فلاں صفحہ و فلاں

سطر این لغت است، یک سبق ہمچنان بودی کہ مولانا گفتے، این چنین ملکہ کردہ بود مردان

رنجہا بردہ اند و زحمتہا کشیدہ اند، تا بجا یگاہی رسیدہ، شما رایگان می طلبید و انچہ

(بقیہ حواشی ص ۱۱) معز الدولہ بہرام شاہ ...... بطرف ہندوستان غزا کرد و محمد باہلیم را در بست و ہفتم رمضان سنۃ اثنی عشر و خمسمائۃ بگرفت و بند کرد و بعافیتش بگذاشت و ولایت ہندوستان تمام او را داد بار دیگر عاصی شد و قلعہ ناگور در ولایت سوالک بحد بیرہ بنا کرد۔"

چونکہ شیخ حمید الدین ناگوری کے وطن ہونے کا فخر اس شہر کو حاصل رہا ہے، اس لیے یہ ایک خاص کا ملک ہے، صاحب تاج العروس نے اسی نسبت سے اسکو تاج العروس میں بھی جگہ دی ہے اور لکھا ہے۔

ناکور بفتح الکاف مدینۃ بالهند ومنها الشیخ حمید الدین الصوفی الناگوری الملقب بسلطان التارکین من قدماء الشیوخ	ناگور بفتح الکاف (گ) ہندوستان میں ایک شہر ہے حمید الدین ناگوری یہیں کے رہنے والے تھے جن کا لقب التارکین ہے اور آپ قدماء مشائخ میں سے ہیں،

۳؎ فی الاصل نیرابندی ۵؎ فی الاصل وراع، اگر الف نہ ہوتا تو ورع بمعنی ورا، درست تھا

(حواشی صفحہ ہذا) ۱؎ فی الاصل ۔۔۔ فی آرند ۲؎ ملاحظہ ہو سرور الصدور من ملفوظات حمید الدین المبرور مرتبہ نور الدین (مخطوطہ) پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ص ۱۴۲ ۳؎ فی الاصل مراہان،

یافتہ آید آنہا ہم شکر نمی گوئید،[1]

صحاح جوہری کا درس | اسی طرح صغانیؒ نے ہندوستان اور سندھ میں صحاح جوہری کا بھی درس دیا ہے
جیسا کہ العباب الزاخر کے مقدمہ میں فرماتے ہیں:

فی ھذا الکتاب مِمّا یشا کل مَا	اس کتاب (العباب) میں اس قسم کے تمام
ذکرت منیف علی الفی موضع	الفاظ (اغلاط جوہری) جن کا میں نے ذکر
نبہت علیہا کلّھا فی کتابی	کیا ہے وہ دو ہزار سے بھی زیادہ مواقع
التکملۃ ومجمع البحرین وقد	پر ہیں، میں نے ان پر اپنی دونوں کتابوں
صحح نسختہ وحشاھا من قرأ	التکملہ اور مجمع البحرین میں تنبیہ کردی ہے
علی ھذا الکتاب بالھند	جن لوگوں نے صحاح جوہری مجھ سے ہندوستان
وَالسند وَالیمن وَالعراق،[2]	سندھ، یمن اور عراق میں پڑھی ہے انھوں
	نے اپنے نسخوں کی تصحیح اور اس کا تحشیہ بھی
	میرے پاس کیا ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ صغانیؒ نے یہاں صحاح جوہری کا درس ہی نہیں دیا ہے، بلکہ اس کی تصحیح اور تحشیہ کا بھی کام کرایا ہے،

صغانی کی سیر و سیاحت اور ریاضت و عبادت | صغانی کے بعض بیانات سے ثابت ہوتا ہے کہ اُن کی سیر و سیاحت کا دائرہ مملکتِ اسلامیہ کے حدود تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ دارالحرب میں بھی صغانیؒ کی آمد و رفت رہی ہے اور ان کی سیاحت محض سیر و تفریح کے لئے نہ تھی، بلکہ اس کا مقصد نفس کا تزکیہ اور

---

[1] ملاحظہ ہو سرور الصدور ومع تکملہ بدر البدور (مخطوطہ) ص ۲۶۶ [2] ملاحظہ ہو مقدمہ العباب، مخطوطہ راقم السطور منقولہ از نسخہ مولانا عبدالعزیز المیمنی زید مجدہم،

عبادتِ الٰہی میں انہماک اور اشتغال تھا، کیونکہ بلادِ اسلامیہ میں آپ کا جتنے عرصہ قیام رہتا، طالبانِ علوم کا اتنا ہجوم رہتا کہ عبادت و ریاضت کا موقع نہ ملتا، اس لئے آپ کبھی کبھی اس کام کے لئے دار الحرب میں چلے جاتے، اور عبادت و ریاضت میں اس قدر مشغول رہتے تھے کہ گویا اس عالمِ قدس کے سوا دنیائے فانی سے کوئی سروکار ہی نہیں ہے، اس حقیقت کا انکشاف اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ ناگور میں علما، فقرا اور اعیانِ مملکت آپ سے مصباح الدجیٰ کا سماع کر رہے تھے کہ آپ کے ایک دوست نے آپ سے درخواست کی کہ کچھ علم تصوف کی بھی تعلیم دیجئے، آپ نے فرمایا اس وقت میں درس حدیث میں مشغول ہوں، فرصت نہیں، اگر تمہیں اس کی طلب ہے تو میرے ساتھ ایسے مقامات پر چلو جہاں مسلمانوں کی حکومت نہ ہو وہاں تمہیں بتاؤں گا تصوف کیا ہے، اس دوست کی طلب صادق تھی، اس لئے گجرات کے سفر میں آپ کا رفیقِ سفر ہوا، وہاں آپ نے . . . عملاً یہ بتلایا کہ تصوف عمل اور اخلاص کا اعلیٰ نمونہ اور استقامت و صفتِ احسان کا دوسرا نام ہے، اس کا تعلق سراسر عمل سے ہے گفتار اور قال سے نہیں، تصوف کی حقیقت عمل ہی کی راہ سے منکشف ہوتی ہے، اگر اس میں کمال پیدا کرنا ہو تو تم اسی طرح عبادت کرو جس طرح مجھے دیکھتے ہو، جیسا کہ حدیث میں ہے صلوا کما رأیتمونی اصلی (اسی طرح سے نماز پڑھو جس طرح سے تم مجھے نماز پڑھتا ہوا دیکھتے ہو) یہ شخص ریاضت و عبادت میں آپ کا استغراق و انہماک دیکھ کر حیران رہ گیا، اور جی چھوڑ بیٹھا، سرور الصدور میں اس کی پوری تفصیل ہے،

" ہم دریں فرمودند، کہ اودرا یادے بود کہ از خدمت مولانا رضی الدین علیہ الرحمۃ علم تصوف درخواست کردے تا وے را بیاموزند چیزے از آن علم، خدمت ایشاں فرمودند کہ مرا این جا مشغولی است کہ خلق ناگور دریں وقت از من علم احادیث می شنوند و مرا فرصت نیست کہ دریں میان ترا علم تصوف بیاموزم اگر می خواہی کہ ایں علم بیاموزی دریں سفر ہا کہ می رویم، و دریں بلاد کفار کہ آنجا[1]

---

[1] فی الاصل کنارا

ایں چنیں انبوہے نباشد، بیائی تا ترا ایں علم بیاموزم می گویند چوں ایشاں دارالحرب بارسیدند چنانچہ جالور[۵۱] و گجرات[۵۲]، و دریں روز ہا دستار[۵۳] و دراہے پیچیدہ در بقچہ با خریطہ نہادہ و پیراہن[۵۴] کوتاہ پوشیدہ و نعلین در پاے کرد و کوزہ آب برگرفت و در نماز و طاعت مشغول شد و مے رفت تا روزے ایں مرد گفت کہ آخر من از خدمت شما علم تصوف می خواہم کہ بیاموزم و شما گفتہ بودید کہ چوں بدیں بلاد برسیم کہ فراغت باشد از دیگر گفت و شنود ترا از آں علم چیزے بیاموزم خدمت گفتند بدانکہ علم تصوف بقال نیست، بکال است، چنانچہ من می کنم و مرا می بینی و نماز می گذارم و کارہا دیگر چنانچہ از من بینی[۵۵] تو نیز ہمچنیں می کن کہ علم تصوف بجز دانستن و گفتن کہ تصوف ایں است،

صوفیا، اور علما، کا یہی وہ عمل تھا جس نے سخت سے سخت تر قوم کو بھی حلقہ بگوش اسلام بنادیا تھا، اسی طویل اقتباس کا ایک ٹکڑا جناب خلیق احمد نظامی نے تاریخ مشائخ چشت میں سرور الصدور ہی کے حوالہ سے نقل کیا ہے جس کی نسبت موصوف کا خیال ہے کہ اس واقعہ کا تعلق شیخ حمید الدین ناگوری سے ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

"شیخ حمید الدین ناگوری نے علم حدیث کو علم تصوف سے زیادہ اہمیت دی اور اپنا بیشتر وقت اسی میں صرف کیا، ایک دن اپنے ایک مرید سے فرمانے لگے،"

---

[۵۱] جالور، جودھپور میں ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ وہی مقام ہے جہاں علاء الدین کے لشکر نے خمس کا مطالبہ کیا تھا تفصیل کے لئے دیکھو ظفر الوالہ بمظفر و آلہ طبع لیڈن ج-۲ ص ۵۰۵، [۵۲] گجرات پورے طور پر علاء الدین خلجی کی فتوحات کے بعد ۶۹۷ھ میں اسلامی قلمرو میں شامل ہوا ہے، اسی لئے اس کو دارالحرب سے تعبیر کیا ہے تفصیل کے لئے دیکھو مرآۃ احمدی از محمد خان بہادر طبع کلکتہ ۱۹۲۸ء ج ۱ ص ۴۲ [۵۳] فی الاصل و دستار و [۵۴] پیچیدہ و [۵۵] فی الاصل از بینی،

مرا این جا مشغولی ست کہ خلق ناگور درین	مجھے یہاں یہ مشغولیت ہے کہ آج کل ناگور
وقت از من علم احادیث می شنوند و مرا	کے لوگ مجھ سے علم حدیث سنتے ہیں مجھے
فرصت نیست کہ درین میان ترا علم تصوف	فرصت نہیں کہ اس دوران میں تجھے علم
بیاموزم، (تاریخ مشائخ چشت ص ۱۴۹)	تصوف سکھاؤں،

ہم نے جو اقتباس پیش کیا ہے اس میں کہیں اس امر کا کوئی اشارہ نہیں ملتا جس سے یہ ثابت ہو کہ اس واقعہ کا تعلق شیخ حمید الدین ناگوری سے ہے۔

جب ۲۰ شعبان ۶۳۳ھ میں سلطان التمش کا انتقال ہوگیا تو اس کی اولاد میں خانہ جنگی ہوئی، آخر کار اس کا منجھلا لڑکا رکن الدین حریفوں پر غالب آیا، اور فیروز شاہ لقب اختیار کرکے تخت سلطنت پر متمکن ہوا، مگر اس کا دور حکومت پرآشوب گذرا، یہ خود سر، سخت گیر اور عیش پرست تھا، مگر اس نے خلیفۃ المومنین کی نیابت اور اطاعت سے سرمو انحراف نہ کیا، اس کے دور کے ڈھلے ہوئے سکوں پر ناصر المومنین کے الفاظ اس امر کا بین ثبوت ہیں ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ صغانیؒ کے اس طویل قیام نے خلیفۃ المسلمین کا احترام ہی مسلمانوں کے دلوں میں زندہ نہیں کردیا تھا، بلکہ اُن میں یہ جرأت بھی پیدا کردی تھی کہ اگر کسی کو سلطان وقت سے داد رسی میں کسی قسم کی کوئی کوتاہی کا اندیشہ ہوتا تھا تو وہ پادشاہِ وقت سے یہ کہنے میں ذرا نہیں جھجکتا تھا، کہ اگر ہماری داد و فریاد نہیں سُنی گئی، یا جو ظلم و ستم ہم پر ہوا ہے اس کا بدلہ نہیں لیا گیا تو ہم بغداد جاکر خلیفہ سے دادخواہی کریں گے، تاج الدین ریزہ جو ایک ملنسار شگفتہ مزاج اور پرگو شاعر تھا، جب اس کے کسی دشمن نے اسے زدوکوب کیا تو اس نے ان مظالم کی ایک داستان نظم کی اور منظوم فریاد اپنے ممدوح سلطان رکن الدین فیروز شاہ کے دربار میں پیش کی جسے اس طرح سے شروع کرتا ہے،

بفریاد آمدم اینجا بفریاد	گر شاہ جہاں دادم دہد داد

اور آگے لکھتا ہے،

اگر دادے نیابم ازیں ستم را ردم زمین خاک خون آشام برباد
ز آب چشم امیر المومنین را نمایم دجلۂ دیگر بہ بغداد

رکن الدین فیروز شاہ کی سخت گیری عیش کوشی اور سرمستی نے جلد ہی اعیانِ مملکت اور اربابِ اقتدار کو اس سے برگشتہ کر دیا اور سب نے سازش کرکے اس کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، یہ اُن کی سرکوبی کے لئے نکلا مگر اس کے ساتھیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس کی بہن رضیہ کو تختِ سلطنت پر لا بٹھایا، اُس نے اسے بھی قید کرادیا، اور بحالت قیدی ۶۳۴ھ میں وہ دنیا سے رخصت ہوگیا، جب زمامِ کار رضیہ سلطانہ کے ہاتھ میں آگئی، اور یہاں کی سیاسی فضا مکدر ہوگئی تو معلوم ہوتا ہے صغانی حج کی اجازت لے کر حجاز چلے گئے اور غالباً ۶۳۴ھ میں حج کیا اور کچھ عرصہ کیلئے وہیں ٹھہر گئے،

(باقی)

کلامِ علیؓ سے عربی شعرا، و ادباء کا استفادہ

از

جناب سید محمود حسن صاحب قیصر امروہوی، رضا لائبریری رام پور

امیر المومنین علی بنؓ ابی طالب کی ذات گرامی جہاں مسلمانوں میں مذہبی لحاظ سے ایک مخصوص اہمیت رکھتی ہے، وہیں مختلف علوم و فنون مثلاً علم کلام، علم اسرار الشریعت، الہٰیات، خطابت و موعظت، معانی و بیان، نحو و عربیت وغیرہ میں بھی آپ کو اساسی درجہ حاصل ہے،

آپ کے آثار علمیہ میں آپ کے خطبے اور مکاتیب "نہج البلاغۃ" کی صورت میں آج بھی موجود ہیں، جس کو چوتھی صدی ہجری کے مشہور ادیب اور مولف "الشریف الرضی محمد بن الحسین ابن موسیٰ الموسوی" متوفی ۴۰۶ھ نے تالیف کیا تھا،

آپ کے کلام کی غیر معمولی اہمیت اور شہرت عام کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ عرب کا ہر ادیب اور شاعر اس سے متاثر نظر آتا ہے، البتہ چونکہ نثر عربی نے ترقی نہیں کی تھی اسلیے لوگوں کی توجہ صرف آپ کے کلام کو مدون کرنے کی طرف رہی، چنانچہ اس سلسلے میں حارث اعور، اصبغ بن نباتہ، زید بن وہب جہنی، حضرت عبد اللہ بنؓ عباس وغیرہ کے نام خاص طور سے ملتے ہیں، ان میں صرف حارث اعور کے پاس کلام علیؓ کا اتنا بڑا ذخیرہ تھا کہ ایک مرتبہ جب امام حسنؓ نے ان کو لکھا کہ آپ نے امیر المومنین سے وہ احادیث سنی ہیں جو میں نہیں سن سکا تو حارث نے اس کے جواب میں ایک اونٹ بار کرکے آپ کی خدمت میں بھیجا۔[1]

---

[1] ذیل المذیل طبری، مطبوعہ مصر، ص ۱۰۹

اس کی تائید ابن سعد کی روایت سے بھی ہوتی ہے جو اس نے اپنے سلسلۂ سند کے ساتھ عامر کی زبانی نقل کی ہے، عامر کا بیان ہے کہ میں نے حسنؓ و حسینؓ کو دیکھا، یہ دونوں حارث اعور سے حدیث علی کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے،[۱]

اسی طرح اصبغ بن نباتہ، زید بن وہب جہنی، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ وغیرہ سے بھی امیر المومنینؓ کے بکثرت خطبے اور خطوط مروی ہیں، جن کا تفصیلی ذکر میں نے اپنی کتاب "رجال نہج البلاغۃ" میں کیا ہے،

غرضکہ پہلی صدی کے نصف اول تک ہی کلام علیؓ کی شہرت اس حد تک ہو گئی تھی کہ عرب درس کے طور پر ان خطبوں کو پڑھا کرتے تھے، چنانچہ امام شعبی متوفی ۱۰۶ھ کا صعصعہ ابن صوحان کے بارے میں مشہور قول ہے "تعلمت منه الخطب" (میں صعصعہ سے خطبے سیکھا کرتا تھا)

اس کے بعد عربی نثر نے جب ترقی شروع کی اور عربوں میں نثر نگاری کا ملکہ پیدا ہو چلا تو یہ تاثرات اخذ و استفادہ کی صورت میں نظر آتے ہیں، چنانچہ حضرت حسن بصریؒ کے مکتوب میں بھی جو حضرت عمرؒ بن عبد العزیز کے نام ہے[۲] اور عربی نثر کا ایک بہترین نمونہ ہے، جگہ جگہ امیر المومنینؓ کے خطبوں کے الفاظ بلکہ جملوں کے جملے نظر آتے ہیں، مثلاً

۱۔ فاحذرها الحذر، فانها مثل الحية لين مسها وسمها يقتل

۲۔ فانها قد آذنت بزوال لايدوم نعيمها ولا يومن فجائعها

۳۔ فانظر اليها نظر الزاهد المفارق۔

مذکورۂ بالا تینوں جملے امیر المومنین کے ہیں، جو نہج البلاغۃ میں مختلف خطبات اور حکم کے تحت

---

[۱] طبقات ابن سعد ۶/ ۱۱۶، [۲] حسن بصری کا یہ خط مکمل صورت میں حافظ ابو نعیم اصفہانی متوفی ۴۳۰ھ نے اپنی مشہور کتاب "حلیۃ الاولیاء" (۲/ ۱۳۵) میں نقل کیا ہے جو تقریباً ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے،

خفیف لفظی فرق کے ساتھ موجود ہیں۔

اس کے بعد جہاں تک نظر جاتی ہے ہر ادیب اور شاعر کے یہاں یہ تاثرات ملتے ہیں،
ان میں ابن نباتہ متوفی ۳۷۴ھ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے[1] اسکا مشہور قول ہے:

حفظت من الخطابة کنزاً	میں نے خطابت کا ایسا خزانہ محفوظ کیا ہے
لا یزیدہ الا نفاق الا سعة	جو خرچ کرنے سے کم نہیں ہو سکتا۔
وکثرة حفظت مائة فصل من	میں نے مواعظ علی بن ابی طالب کی
مواعظ علی بن ابی طالب[2]	سو فصلیں یاد کی ہیں۔

اس پر امیر المومنین کے کلام کا اتنا گہرا اثر تھا کہ اپنے خطبوں میں بھی اس نے وہی پرواز پیدا کرنا چاہا، چنانچہ اکثر مقامات پر وہ بے تکلف امیر المومنین کے خطبوں کے جملوں کے جملے اپنا لیتا ہے اور الفاظ کا ذخیرہ تو تمام تر اس نے آپ ہی کے خطبوں سے حاصل کیا ہے،
ابن ابی الحدید معتزلی نے اپنی شرح میں متعدد مقامات پر ابن نباتہ کے ان سرقات کا

---

[1] ابن نباتہ کا شمار اپنے وقت کے ائمۂ ادب میں ہوتا ہے، اس کا پورا نام "الخطیب ابو یحییٰ عبد الرحیم بن محمد بن اسمٰعیل بن نباتہ الفارقی" ہے، علامہ ابن خلکان اس کے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

کان اماماً فی علوم الادب ورزق	وہ علوم ادب کا امام تھا، اور اپنے ان
السعادة فی خطبه التی وقع الاجماع	خطبوں میں جنکے بارے میں علماء ادب کا یہ اجماع ہے
علی انه ما عمل مثلها وفیها دلالة	کہ ایسے خطبے کسی نے نہیں کہے، اسکو سعادت حاصل تھی،
علی غزارة علمه وجودة قریحته الخ	یہ خطبے اسکے علم کی گہرائی اور طبیعت کی جودت کی نشانی ہیں

اس کے خطبوں کا دیوان ۱۳۱۱ھ میں بیروت کے مطبعہ جریدہ سے شائع ہو چکا ہے، رضا لائبریری رام پور میں اس کی ایک جلد موجود ہے [2] شرح ابن ابی الحدید ۱/ ۸

انکشاف کیا ہے، ذیل میں چند مثالیں درج کرتا ہوں،

۱۔ نہج البلاغہ کا ایک مشہور خطبہ ہے جس کی ابتدا اس طرح ہے :۔

احمده شكراً لانعامه واستعينه على وظائف حقوقه

(نہج البلاغہ مط بیروت ۱/۲۰۴)

میں اللہ کی حمد کرتا ہوں اسکی نعمتوں کے واسطے اور اس سے مدد و اعانت کا طالب ہوں، اسکے ان حقوق کی ادائگی میں جو مقرر کیے گئے ہیں

اس خطبے کے متعلق ابن ابی الحدید اپنی شرح (۲/۱۱۸) میں لکھتا ہے :

واعلم ان هذه الخطبة من اعيان خطبه ومن ناصع كلامه ونادره وفيها من صناعة البديع الرائقة المستحسنة البريئة من التكلف مالا يخفى وقد اخذ ابن نباتة الخطيب كثيرا من الفاظها فاودعها خطبه مثل قوله

جاننا چاہیے کہ امیر المومنین علیہ السلام کا یہ خطبہ آپ کے مشہور اور نادر خطبات میں ہے۔ اس میں صنعت بدیع کا نہایت اچھا استعمال کیا گیا ہے جو تکلف اور آورد سے بالکل بری ہے۔ ابن نباتہ خطیب نے اس خطبے کے بکثرت الفاظ لیے ہیں اور ان کو اپنے خطبوں میں وارد کیا ہے۔ مثلاً شديد كلبها، عال لجبها، ساطع لهبها، متغيظ زفيرها، متأجج سعيرها، بعيد خمودها، ذاكٍ وقودها، مخوف وعيدها. عم قرارها، مظلمة اقطارها. حامية قدورها، فظيعة امورها، فان هذه الالفاظ كلها اختطفها

واغار علیھا واغتصبھا وسمط بھا

خطبہ وشذربھا کلامہ وبمثل قولہ

پس ان تمام الفاظ پر اس نے دن دھاڑے ڈاکہ مارا ہے اور ان کو غصب کیا ہے اور اپنے کلام اور خطبوں کو ان سے سجایا ہے، ان کے علاوہ حسب ذیل الفاظ بھی اس نے اس خطبے سے لیے ہیں، ھول المطلع وروعات الفزع واختلاف الاضلاع واستکاک الاسماع وظلمۃ اللحد وخیفۃ الوعد وغم الضریح وردم الصفیح

۲- نہج کا ایک دوسرا خطبہ ہے جس کی ابتدا اس طرح ہے:

اما بعد، فانی احذرکم الدنیا	بعد ازاں، پس میں تم کو دنیا سے ڈراتا ہوں
فانھا حلوۃ خضرۃ حفّت	کیونکہ وہ دیکھنے میں بھلی معلوم
بالشھوات (نہج ۱/۱۲۸)	ہوتی ہے،

اس خطبے کے حسب ذیل اقتباسات ابن نباتہ نے قدرے تغیر کے ساتھ اپنے ایک خطبے میں وارد کیے ہیں:

امیرالمومنین	ابن نباتہ
حملوا الی قبورھم فلا یدعون	وحیداً علی کثرۃ الجیران، بعیداً
رکباناً وانزلوا فلا یدعون	علی قرب المکان......اسیر
ضیفاناً وجعل لھم من الصفیح	وحشۃ الانفراد فقیرا الی
اجنان ومن التراب اکفان	الیسیر من الزاد، جار من
ومن الرفات جیران فھم	لا یجیر وضیف من لا یمیر،
جیرۃ لا یجیبون داعیا	حملوا ولا یدرون رکباناً وانزلوا

ولا یمنعون ضیما ولا یبالون	ولا یدعون ضیفانا واحتموا
مندبۃ ان جیدوا والم یغزوا	ولا یستمون جیرانا ولحتشدوا
وان لحظوا الم یقنطوا جمیع	ولا یعدون اعوانا [1]
وهم احاد وجیرۃ وهم ابعاد	
متدانون لا یتزاورون	
وقریبون لا یتقاربون	

۳- اما بعد، فان الدنیا	اما بعد، بیشک دنیا نے منھ پھیرلی اور
قد ادبرت واذنت بوداع	رخصت کی اطلاع دے دی اور
وان الآخرۃ قد اقبلت	بیشک آخرت سامنے آچکی اور سر
واشرفت باطلاع (نہج ۱/)	اٹھاکر دیکھنے لگی،

یہ پورا اقتباس ابن نباتہ کے ایک خطبے میں اس طرح موجود ہے:

ایها الناس، ان الدنیا قد ادبرت وآذنت بانقلاب

وان الآخرۃ قد اقبلت واذعنت باقتراب [2]

عرب کے دوسرے خطباء ابن نباتہ کے علاوہ دوسرے ادبا اور خطبا کے یہاں بھی بکثرت ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ انھوں نے شعوری اور غیر شعوری طور پر امیر المومنین کے کلام سے استفادہ کیا ہے اور اپنے کلام میں بلندی پیدا کرنے کی غرض سے آپ کے الفاظ اور جملوں کو اپنایا ہے، بلکہ بیشتر آپکے پورے پورے خطبے لوگوں نے مجمع عام میں پڑھے ہیں، ذیل میں چند مثالیں درج کرتا ہوں:

۱- انما الدنیا دار مجاز والآخرۃ   بیشک دنیا گذرگاہ ہے اور آخرت دار مقر،

---

[1] شرح نہج البلاغۃ ابن ابی الحدید ۱/ ۳۹ [2] دیوان خطب ابن نباتہ ص ۱۰۰

دار قرار فخذوا من ممرکم	پس اپنی گذرگاہ سے اپنی قرارگاہ کے لیے
لمقرکم الخ (نہج ۱/ ۲۳۰)	توشہ حاصل کرو۔

یہ پورا خطبہ ایک اعرابی نے اپنے نام سے پڑھا ہے، چنانچہ ابو اسمٰعیل قالی متوفی ۳۵۶ھ نے اپنی امالی (۱/ ۲۵۸) میں اس کو اس طرح روایت کیا ہے:

وحدثنا ابو بکر رحمہ اللہ	ہم سے ابو بکر رحمہ اللہ نے عبد الرحمٰن
قال اخبرنا عبد الرحمٰن عن	کی زبانی انھوں نے اپنے چچا سے سن کر
عمہ قال ولی جعفر بن سلیمان	بیان کیا کہ ایک مرتبہ جعفر بن سلیمان نے
اعرابیا بعض میاههم فخطبهم	کسی میلے میں ایک اعرابی کو والی بنایا،
یوم الجمعة فحمد اللہ واثنی	اس نے جمعہ کے دن لوگوں کو خطبہ دیا!
علیه ثم قال اما بعد،	پس اللہ کی حمد و ثنا کے بعد اس طرح بیان کیا:
فان الدنیا دار بلاغ	بیشک دنیا دار التکلیف ہے اور
والآخرة دار قرار فخذوا	آخرت قرارگاہ، پس تم اپنی قرارگاہ
لمقرکم من ممرکم ولا تهتکوا	کے لیے اپنی گذرگاہ سے توشہ حاصل کرو
استارکم عند من لا یخفی علیه	اور اپنے پردوں کو اس پر چاک نہ کرو
اسرارکم واخرجوا من	جو تمھارے بھیدوں سے واقف ہے
الدنیا قلوبکم	اور اپنے دلوں کو دنیا سے نکال لو،
۲- ایها الناس انما انتم	اے لوگو! بے شک تم اس دنیا
فی هذه الدنیا غرض تنتضل	میں نشانہ ہو جس پر موت تیر لگاتی
فیه المنایا (نہج ۱/ ۲۳۰)	ہے،

یہ خطبہ ابو اسمٰعیل قالی نے اپنی امالی (۲/۱۰۲) میں اموی خلیفہ عمر بن عبد العزیزؒ کے نام سے روایت کیا ہے:

وحدثنا ابو بکر بن الانباری	ہم سے ابو بکر بن الانباری نے، انھوں نے
قال حدثنی ابی قال حدثنا	اپنے باپ سے، انھوں نے احمد بن عبید
احمد بن عبید قال حدثنا	زناوی کی زبانی روایت کیا ہو، زنادی
الزنادی قال یقال ان عمر	کا بیان ہے، کہا جاتا ہے کہ عمر بن
بن عبد العزیز رحمہ اللہ	عبد العزیز رحمہ اللہ نے اپنے ایک
تکلم بھذا الکلام فی خطبتہ	خطبے میں اس کلام کے ساتھ بیان کیا تھا،
"انما الناس فی الدنیا اغراض" الخ	بیشک لوگ دنیا میں نشانہ ہیں
۳۔ الاوان الیوم المضمار	آگاہ ہو جاؤ، آج دبلا ہونا ہے اور
وغدا السباق، والسبقۃ الجنۃ	کل گھوڑ دوڑ ہے اور منزل جنت
والغایۃ النار (نہج ۱/۴۶)	اور انتہا دوزخ ہے،

مذکورۂ بالا کلام نہج کے ایک مشہور خطبے کا ٹکڑا ہے۔ ابن عجلان کا بیان ہے کہ عون ابن عبد اللہ بن عتبہ[1] اکثر یہ کلام پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ حافظ ابو نعیم اصفہانی نے اس کو اس طرح روایت کیا ہے:

حدثنا ابراھیم بن عبد اللہ، ثنا محمد بن اسحٰق، ثنا قتیبۃ بن سعد ثنا اللیث بن سعد، عن ابن عجلان عن عون انہ کان یقول "الیوم مضمار وغدا السباق، والسبقۃ الجنۃ، والغایۃ النار، فبالعفو

---

[1] طبقۂ اولیٰ کے تابعین میں ہیں، حافظ ابو نعیم نے حلیۃ الاولیاء میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔

تعفون وبالرحمة تدخلون وبالاعمال تقتسمون المنازل[۱]

بعض مثالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب آپ کے کلام کو غیر شعوری طور پر استعمال کرتے تھے، جس سے اس کی مقبولیت اور شہرت عام کا پورا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ حجاج بن یوسف نے خطبہ دیا، جس میں اس نے لوگوں کو طلب آخرت پر ابھارا، حضرت حسن بصری نے جب اس کی زبان سے خلاف توقع ایسا کلام سنا تو کہنے لگے

هذه ضالة المومن خرجت من قلب المنافق[۲]	یہ مومن کی گم شدہ چیز ہے جو منافق کے دل سے نکلی ہے،

اسی طرح ایک واقعہ ابن عبد ربہ الاندلسی نے عقد الفرید (۲/۳۳) میں لکھا ہے:

العتبی، قال قال عبد اللہ بن الاهتم، مات لی ابن وانا بمكة فجزعت عليه جزعا شديدا فدخل علی ابن جريج ليعزيني فقال لی يا ابا محمد: سل صبرا واحتسابا قبل ان تسلو غفلة ونسيانا كما تسلو البهائم	عتبی کا بیان ہے، عبد اللہ بن اہتم نے کہا میرے لڑکے کا انتقال ہو گیا، اس وقت میں مکہ میں تھا، اس کے غم نے مجھے بہت بےچین کیا، ابن جریج میرے پاس تعزیت کے لیے آئے اور کہا، اے ابو محمد! صبر کرو قبل اس کے کہ غیر محسوس طور پر صبر کرنا پڑے جس طرح جانور صبر کرکے بیٹھ جاتے ہیں،

مذکورۂ بالا قول امیر المومنینؑ کا ہے جو آپ نے اشعث بن قیس کی تعزیت کے موقع پر ارشاد فرمایا ہے، جو نہج البلاغہ میں اس طرح درج ہے:

---

[۱] حلیۃ الاولیاء ۱/۷۷ [۲] شرح ابن ابی الحدید ۲/۳۰۸

ان صبرت صبر الاکارم والا ۔ یا شریفوں کی طرح صبر کرو ورنہ چوپایوں کی طرح

سلوت کما تسلوا البھائم ۔ خاموش ہونا پڑے گا،

شعرا | ذیل میں چند ایسی مثالیں نقل کیجاتی ہیں جن میں شعرا نے امیرالمومنین کے اقوال ونکم سے فائدہ اٹھایا ہے اور ان کو مختلف طریقوں سے نظم کیا ہے :

۱۔ قیمۃ کل امرئ ما یحسنہ[1] ۔ ہر آدمی کی قیمت اس کا عمل خیر ہے ۔

امیرالمومنین کا یہ قول اتنا مشہور ہے کہ کثرت کے ساتھ مختلف شعرا نے مختلف طریقوں سے اس کو نظم کیا ہے، ان میں سب سے زیادہ اہتمام کے ساتھ علامہ ابوالحسن بن طباطبا العلوی متوفی بتین ۳۰۴ھ[2] نے نظم کیا ہے :

حسود مریض القلب یخفی انینہ ۔ ویضحی کئیب البال عندی حزینہ

یلوم علی ان رحت فی العلم راغبا ۔ واجمع من عند الرواۃ فنونہ

فاعرف ابکار الکلام وعونھا ۔ واحفظ مما استفید عیونہ

ویزعم ان العلم لا یجلب الغنی ۔ ویحسن بالجھل الذمیم ظنونہ

فیا لائمی دعنی اغالی بقیمتی ۔ فقیمۃ کل الناس ما یحسنونہ[3]

(ترجمہ) حاسد آدمی کا دل مریض ہے جو اپنی کراہ کو چھپاتا ہے اور میرے پاس آکر اس کا حزن والم ظاہر ہو جاتا ہے، وہ مجھے اس بات پر ملامت کرتا ہے کہ علم کے درپے رہتا ہوں، اور اہل علم کے دروازوں پر جاکر ان سے فنون علم جمع کرتا ہوں، پس میں نئے اور تازہ کلام اور برے کلام کو پہچانتا ہوں اور عیوب کلام جن سے میں فائدہ اٹھاتا ہوں ان کو یاد کرلیتا ہوں (حاسد) یہ خیال کرتا ہے کہ علم استغنا اور بے نیازی پیدا نہیں کرتا اور مذموم جہالت کے ساتھ

[1] نہج ۲/۴۴۸ [2] معجم الشعراء ص ۴۰۴ [3] المحاسن والمساوی للبیہقی (۲/۴۴)

وہ اپنے ظنون فاسدہ کو اچھا سمجھنے لگتا ہے، پس اسے ملامت کرنے والے مجھے چھوڑ دے تاکہ میں اپنی قیمت بڑھاؤں، کیونکہ لوگوں کی قیمت ان کا وہ عمل نیک ہے جس کو وہ بجالاتے ہیں۔

ایک محدث شاعر نے اسی مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے:

قال علی بن ابی طالب — وھو اللبیب الفطن
کل امرءٍ قیمتہ عندنا — وعند اھل العلم ما یحسن [1]

(ترجمہ) علی بن ابی طالب کا قول ہے، جو صاحب عقل اور جید الذہن ہیں، ہر آدمی کی قیمت ہمارے نزدیک اور تمام اہل علم کے نزدیک اس کا نیک عمل ہے۔

خلیل نے اس طرح کہا ہے

لا یکون العلی مثل الدنی — لا ولا ذوالذکاء مثل الغبی
قیمۃ المرء قدر ما یحسن المرء — قضاء من الامام علی [2]

محمد بن ابراہیم بن غناب شاعر دربار عبداللہ بن المعتز العباسی متوفی ۲۹۶ھ نے یہی مضمون اس طرح کہا ہے،

لا تلدعن مصطفی نغبن — واشترنی فانی عبد مثمن
کل امرء قیمتہ ما یحسن [3]

ترجمہ مجھ سے بے نیازی اختیار نہ کر، ورنہ نقصان میں رہے گا، مجھ کو خرید لے کیونکہ میں ایک قیمتی غلام ہوں، ہر انسان کی قیمت اس کا نیک عمل ہے،

۲۔ کفی بالادب شرفاً انّہ یدّعیہ — ادب کا یہی شرف کافی ہے کہ وہ شخص بھی

---

[1] المحاسن والمساوی بیہقی ۲/۲، [2] ادب الدنیا والدین ماوردی ص ۱۹،

[3] معجم الشعراء للمرزبانی ص ۴۶۶،

من لا یحسنه و یفرح اذا نسب	اس کا مدعی ہے جو اس کا لحاظ نہیں کرتا
الیه و کفی بالجهل خمولا انه یتبرأ	اور اپنی طرف اس کی نسبت سے خوش
منه و ینفیه عن نفسه من هو	ہوتا ہے، اور جہالت کے لئے یہی گمنامی
فیه و یغضب اذا نسب الیه،	ذلت کافی ہے کہ وہ شخص بھی اس سے بیزاری
(المحاسن والمساوی ۲/۲،)	رکھتا ہے، اور اپنی ذات سے اس کی نفی
	کرتا ہے، جو خود جہالت میں مبتلا ہے اور
	اپنی طرف اس کی نسبت سے غضبناک ہوتا ہے

ایک مولد شاعر نے اس مضمون کو اس طرح اپنایا ہے،

وکفی خمولاً بالجہالۃ اننی   اراع متی انسب الیہا واغضب[1]

(جہالت کے لئے یہی گمنامی کافی ہے کہ جب مجھ کو اس سے نسبت دی جاتی ہے تو غضبناک ہوجاتا ہوں)

۴۔ احبب حبیبک هونا ما عسی	اپنے دوست سے بقدر مناسب دوستی
ان یکون بغیضک یوما ما و	کرو، ممکن ہے کسی دن وہ دشمن ہوجائے،
ابغض بغیضک هونا ما عسی	اسی طرح دشمن سے بھی بقدر مناسب
ان یکون حبیبک یوما ما،[2]	دشمنی رکھو ممکن ہے کسی روز وہ دوست
(نہج ۲/۱۰۸)	ہوجائے،

اس مضمون کو مہلبی عہد کے مشہور شاعر ہدبہ بن الخشرم العذری متوفی بعہد معاویہ نے تین شعروں میں اس طرح نظم کیا ہے،

---

[1] المحاسن والمساوی ۲/۲۸، [2] دراصل یہ حدیث نبوی کا ایک ٹکڑا ہے۔ (م،)

وکن معقلاً للحلم واصفح عن الخنا فانک راءٍ ما حییت وسامع

واحبب اذا احببت حبّاً مقارباً فانک لا تدری متی انت نازع

وابغض اذا ابغضت بغضاً مقارباً فانک لا تدری متی انت راجع[۱]

(ترجمہ) علم کی پناہ بن، اور بیہودگی سے درگذر کر کیونکہ جب تو زندہ ہے، دیکھے گا بھی اور سنے گا بھی اور جب تو کسی کو دوست رکھے تو اعتدال کی حدود میں، کیونکہ تو نہیں سمجھ سکتا کہ کس وقت اس سے نزاع پیش آجائے، اسی طرح جب کسی سے دشمنی کرے، جب بھی اعتدال کو ملحوظ رکھ، نہ معلوم کب دوست بن جائے۔

نیز ایک صحابی شاعر نمر بن تولب نے یہ مضمون اپنے ایک مشہور قصیدہ میں اس طرح نظم کیا ہے۔

احبب حبیبک حبّاً رویداً فقد لا یعولک ان تصرما

وابغض بغیضک هوناً رویداً اذا انت حاولت ان تحکما[۲]

اس مقام پر یہ شبہہ کیا جا سکتا ہے کہ نمر بن تولب اور امیر المومنین علی بن ابی طالبؓ دونوں کا زمانہ ایک رہا ہے، اس لیے اس مضمون کی ایجاد میں تقدم کس کو حاصل ہے؟

۵ - ما انقض النوم لعزائم الیوم[۳] نیند کس قدر دن کے ارادوں کو توڑ دیتی ہے

ایک شاعر نے اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے۔

فتیً لا ینام علیٰ عزمه ومن صمّم العزم لم یرقد[۴]

مرد جب عزم کر لیتا ہے، تو وہ سویا نہیں کرتا، اور جس نے بھی پختہ ارادہ کر لیا وہ کیونکر سو سکتا ہے۔

۶ - وانّ اهل الدنیا کرکب بینا دنیا والے ان سواریوں کی مانند ہیں جو

---

[۱] امالی قالی ۲/۲۰۶ [۲] الادب والانشاء، لابی حیان التوحیدی ص ۱۲۸ [۳] نہج ۲/۱۲۰، ۱۵۷ [۴] شرح ابن ابی الحدید ۲/۲۶۔

هتف خلوا اذ صاح بھمہ	منزل پر پہونچیں اور فوراً ہی انھیں کوچ
سائقہم فارتحلوا	کا حکم دینے والا پکارے، اور وہ
(نہج ۴/۱۲۵)	کوچ کر جائیں،

اس مضمون کو تیسری صدی کے مشہور شاعر ابوالعتاہیہ متوفی ۲۱۲ھ نے اس طرح نظم کیا:

انّ دارا نحن فیہا لدار | لیس فیہا لمقیم قرار
کم وکم قد حلّہا من اناس | ذھب اللیل بھم والنہار
فہم الرکب اصابوا مناخا | فاستراحوا ساعۃ ثمّ سارو

وکذا الدنیا علی ما رأینا
یذھب الناس وتخلو الدیار[^1]

(ترجمہ) بیشک ہم جس گھر میں ہیں، وہ ایسا گھر ہے کہ جس میں ٹھہرنے والے کو قرار نہیں، نہ معلوم کتنے انسان اس گھر میں آئے، اور اپنے دن رات گذار کر چلے گئے، اُن کی مثال ایسی سواریوں کی ہے، جنھوں نے کوئی اترنے کی جگہ پائی بس کچھ دیر آرام کیا، اور پھر چل پڑے، اسی طرح یہ دنیا ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ اس میں آکر چلے جاتے ہیں، اور شہر کے شہر خالی ہو جاتے ہیں،

۷- الا انّ الدنیا.........	آگاہ ہو جاؤ، دنیا..........
فانّہا عند ذوی العقول کفیٔ	بیشک عقلمندوں کے نزدیک شاخص
الظلّ بینا تراہ سابغا حتّی	کے سایے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی
قلص وزائدا حتّی نقص.	جسے ابھی تو پھیلا ہوا دیکھتا ہے کہ سکڑ

[^1]: شرح ابن ابی الحدید ۲/ ۴۶۶

(نہج ۱/۲۵۵) جاتا ہے اور ابھی بڑھتا ہوا دکھتا ہے کہ ذرا دیر میں گھٹ جاتا ہے،

ایک شاعر نے اس مضمون کو اس طرح کہا ہے :۔

کلا انما الدنیا کظل غمامۃ اظلت یسیرا ثم خفت فولت[1]

آگاہ ہو جاؤ دنیا بادل کے سایہ کی طرح ہے، جو تھوڑا سا بڑھا پھر کم ہوا پھر لوٹ گیا،

۸۔ الناس اعداء ما جھلوا[2] لوگ اس چیز کے دشمن ہیں جس سے وہ ناواقف ہیں،

ایک شاعر نے یہ مضمون یوں نظم کیا ہے،

جھلت امرا فابدیت النکیر لہ والجاھلون لاھل العلم اعداء[3]

(ترجمہ) جس بات سے میں ناواقف رہا اس کو منکر اور برا سمجھا، یہ سچ ہے کہ جاہل لوگ اہل علم کے دشمن ہی ہوتے ہیں،

۹۔ قلیل تدوم علیہ ارجی من کثیر مملول، (نہج ۲/۲۱۰) کم مگر مسلسل عمل اس عمل کثیر سے زیادہ سود مند ہے جو گرانی کے ساتھ بجالائے،

یہ مضمون ایک شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے،

انی کثرت علیہ فی زیارتہ فمل والشیء مملول اذا کثرا

ورابنی منہ انی لا ازال اری فی طرفہ قصر اعنی اذا نظرا

میں نے زیادتی کے ساتھ اس سے ملنا شروع کر دیا، نتیجہ میں تکدر پیدا ہو گیا، بیشک جب کسی چیز کی زیادتی ہوتی ہے تو اس سے دل بھر جاتا ہے مجھ کو اس امر نے تعجب میں ڈال

---

[1] شرح نہج البلاغہ ابن ابی الحدید ۱/۲۵۵، [2] نہج ۲/۹۶، و ۲/۱۱۰، [3] شرح ابن ابی الحدید ۲/۱۶۱، [4] ایضاً ۲/۱۶۰،

دیا کہ اب جب بھی وہ میری طرف دیکھتا ہے تو اس کی نگاہوں میں وہ توجہ اور اعتنا نہیں پاتا،

۱۰- مالا بن آدم والفخر اوّله نطفة وآخره جيفة، (نہج ۲/۱۲۹)

(آدم کا بیٹا کس بات پر فخر کرسکتا ہے جس کا اوّل نطفہ ہے اور آخر مردہ)

یہی مضمون ایک شاعر نے اس طرح نظم کیا ہے،

ما بالُ من اوّله نطفة وجيفة آخره يفخر[۱]

۱۲- المقلّ غريب في بلدته (نہج ۲/۶۶)

یہ مضمون دوسری صدی کے مشہور شاعر خلف الاحمر متوفی سنہ ۱۸۰ھ نے اس طرح نظم کیا ہے۔

لا تظننّ انّ الغريب هو النائی ولكنّما الغريب المقلّ[۲]

یہ خیال نہ کرو کہ مسافر وہی ہے، جو اپنے اہل و عیال سے دور ہو بلکہ مسافر وہ ہے جس کے دوست کم ہوں،

۱۳- اعجز الناس من عجز عن اكتساب الاخوان، (نہج ۲/۷۰)

(لوگوں میں سب سے زیادہ عاجز وہ ہے جو دوستوں کے حاصل کرنے سے عاجز ہو)

یہ مضمون دوسری صدی کے مشہور ادیب اور شاعر ابن الاعرابی متوفی سنہ ۲۳۱ھ نے اس طرح نظم کیا ہے،

لعمرك ما مالُ الفتى بذخيرة ولكنّ اخوانَ الصّفا الذخائر[۳]

تیری زندگی کی قسم مرد کے لئے اس کا مال ذخیرہ نہیں ہے، لیکن خالص دوست ذخیرہ ہیں

۱۴- الحزم سوء الظّن (نہج ۲/۸۰) احتیاط بدگمانی ہے،

---

[۱] شرح ابن ابی الحدید ۲/۲۸۰ [۲] ایضاً ۲/۱۰۳ [۳] ایضاً ۲/۳۷۴،

کسی شاعر نے بعینہ اس مضمون کو ایک شعر میں نظم کیا ہے،

اساًت اذا احسنت ظنی بکم والحزم سوء الظن بالناس[۱]

(ترجمہ) میرا حسنِ ظن تمھارے ساتھ غلطی ہے، کیونکہ احتیاط یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ بدگمان رہا جائے،

۱۴- مثل الدنیا کمثل الحیۃ لین مسّھا والسمّ الناقع فی جوفھا (نہج ۲/۸۹) | دنیا کی مثال اس سانپ کی ہے جس کی جلد نہایت نرم لیکن اس کے پیٹ میں زہر قاتل بھرا ہوا ہے،

یہ مضمون ابوالعتاہیہ (متوفی ۲۱۲ھ) نے اس طرح نظم کیا ہے،

انما الدھر ارقم لین المس وفی نابہ السقام العقام[۲]

۱۵- زھدک فی راغب فیک نقصان حظ ورغبتک فی زاھد فیک ذل نفس، (نہج البلاغہ ۲/۱۲۹) | جو شخص تیری طرف راغب ہے، اس سے بچنا بے عقلی ہے، اور جو تجھ سے کھنچ رہا ہو اس کی طرف جھکنا نفس کی ذلت ہے،

عباس بن احنف (متوفی ۱۹۲ھ) نے اس مضمون کو اپنی ایک نسیب میں نظم کیا ہے،

مازلت ازھد فی مودۃ راغب حتی ابتلیت برغبۃ فی زاھد

ھذا ھو الداء الذی ضاقت بہ حیل الطبیب وطال یاس العائد[۳]

(ترجمہ) میں ہمیشہ اس شخص سے کھنچتا تھا جو میری طرف جھکتا تھا، یہاں تک کہ جو مجھ سے کھنچتا تھا، اس کی طرف میں راغب ہونے کی مصیبت میں مبتلا کر دیا گیا، یہ وہ مرض ہے

---

[۱] شرح ابن ابی الحدید ۳/۲۹۳ [۲] ایضاً ۲/۱۸۱ [۳] ایضاً ۲/۲۷۴،

کہ جس کے علاج سے طبیبوں کی ترکیبیں تنگ ہیں، اور عیادت کرنے والے کی ناامیدی طویل ہے،

۱۶- الحلمُ والاناۃُ توامانِ ینتجھما علوّ الھمّۃ، — حلم اور بردباری دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں جو ہمت کی بلندی سے پیدا ہوتے ہیں،

(نہج ۲/۱۲۹)

مشہور شاعر ابن ہانی (متوفی ۳۶۲ھ) نے قدرے شرح کے ساتھ اس مضمون کو اس طرح نظم کیا ہے[1]

وکلّ اناۃٍ فی المواطن سوددٌ — ولا کاناۃٍ من قدیرٍ محکّمٍ

ومن یتبیّن انّ للسیف موضعًا — من الصفح یصفح عن کثیرٍ ویحلم

۱۷- لا تحمل ھمّ سنتک علیٰ ھمّ یومک فان تکن السنۃ من عمرک فان اللہ تعالیٰ سیؤتیک فی کل غدٍ جدید، — اپنے (آنے والے) سال کا غم اپنے دن پر مت لاؤ کیونکہ اگر یہ سال تیری عمر میں قرار دیدیا گیا ہے، تو یقیناً اللہ تعالیٰ ہر نئے کل کا رزق تجھ کو پہنچائے گا،

(نہج ۲/۱۲۳)

یہ مضمون نابغہ (متوفی ۱۹۲ھ) نے یوں نظم کیا ہے،

ولستُ بخائبٍ ابدًا طعاما — حذار غدٍ لکلّ غدٍ طعامٌ

میں کل کے خوف سے کسی طرح بھی کسی کھانے سے محروم ہونے والا نہیں اس لئے کہ ہر دن کے لئے کھانا مقدر ہے،

۱۸- انّ للہِ عبادًا یختصھم اللہُ بالنعم لمنافع العباد فیقرھا فی ایدیھم مابذلوھا فاذا منعوھا — بے شک اللہ کے کچھ ایسے بندے بھی ہیں جنھیں بندگانِ خدا کی نفع رسانی کے لئے نعمتوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے پس جب تک

---

[1] کامل مبرد (۱/۹۲)

نزعها منهم ثم حولها الى غيرهم، (نہج ۲/۱۲۶)

وہ بذل وعطا سے کام لیتے ہیں ان نعمتوں کو ان کے پاس قائم رکھتا ہے اور جب بخل اختیار کرتے ہیں، تو ان نعمتوں کو چھین کر

ایک شاعر نے یہ مضمون اس طرح نظم کیا ہے،

لو يعطك الله ما اعطاك من نعم   الا لتوسع من يرجوك احسانا

فان منعت فاخلق ان تصادفها   تطير عنك زرافات ووحدانا[1]

(ترجمہ) اللہ نے تجھ کو جو نعمتیں دی ہیں وہ صرف اسی غرض سے کہ جو شخص تجھ سے بھلائی کی امید کر رہا ہو اس پر تو کشادگی کرے، پس اگر تو ان کو روک رکھے گا، تو وہ ایک ایک اور دو دو ہو کر تیرے پاس سے اڑ جائیں گی۔

۲۰۔ اشعث بن قیس سے جو کلمات تعزیت امیر المومنینؑ نے فرمائے ہیں وہ نہج البلاغہ (۲/۱۱) میں موجود ہیں، ابو تمام حبیب بن اوس (متوفی ۲۳۲ھ) نے ان کو حسب ذیل دو شعروں میں نظم کیا ہے۔

وقال عليٌّ في التعازي لاشعث   وخاف عليه بعض تلك المآثم

وتصبر للبلوى عزاء وخشية   فتوجر او تسلو سلو البهائم[2]

(ترجمہ) نیز علی بن ابی طالبؓ نے اشعث سے بطور تعزیت اس موقع پر فرمایا جب کہ آپ کو یہ خطرہ ہوا کہ اس غم میں اس سے کچھ گناہوں کا صدور نہ ہو جائے، مصیبت پر اگر اللہ کے خوف کے تحت صبر کروگے تو اس کا اجر پاؤگے ورنہ نتیجہ میں اسی طرح خاموش ہونا پڑے گا جس طرح جانور خاموش ہو جاتے ہیں۔

۱؎ شرح ابن ابی الحدید ۲/۶۹۴

۲؎ ادب الدنیا والدین للماوردی ص ۲۲۵

مدارجِ سلوک

از

جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو معارف اپریل ۱۹۵۹ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بشارت دی ہے کہ

اذا توضأ المومن وغسل وجہہ خرج من وجہہ کل خطیئۃ نظر الیھا بعینہ مع الماء، و اذا غسل یدیہ خرج من یدیہ کل خطیئۃ بطشتھا یداہ مع الماء و اذا غسل رجلیہ خرج کل خطیئۃ مشتھا رجلاہ مع الماء حتی یخرج نقیاً من الذنوب (رواہ مسلم عن ابی ھریرۃ)

جب بندہ مومن وضو کرتا ہے اور اپنا منہ دھوتا ہے تو وہ سارے گناہ جن کی طرف اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، پانی کے ساتھ نکل جاتے ہیں، اور جب وہ اپنے ہاتھ دھوتا ہے تو پانی کے ساتھ وہ سارے گناہ دور ہو جاتے ہیں جنھیں اس نے اپنے ہاتھوں سے کیا تھا، اور جب وہ اپنے دونوں پاؤں دھوتا ہے، تو وہ سارے گناہ پانی کے ساتھ دور ہو جاتے ہیں جن کے ارتکاب میں وہ چلا تھا، یہاں تک کہ وہ تمام گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے،

ہر عضو کے دھوتے وقت کلمۂ شہادت پڑھا کرے، یا جیسا کہ خواجہ عبید اللہ احرارؒ (وفات ۸۹۵ھ) اپنے رسالہ انفاس نفیسہ[۵۱] میں ہدایت فرماتے ہیں، الفاظ تین مرتبہ پڑھیں اور وضو کے ختم پر کہیں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ[۵۲]۔ اللّٰھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطھرین واجعلنی من عبادک الصالحین واجعلنی من الذین لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون[۵۳]، اس کے بعد کھڑا ہو کر وضو کے پانی سے تھوڑا سا پی لے، اور کہے

اللّٰھم داونی بدوائک واشفنی بشفائک واعصمنی من الوھن و الامراض والاوجاع[۵۴]،

اے اللہ اپنی دوا سے میرا مداوا کر، اپنی شفا سے مجھے اچھا کر، اور کمزوری اور بیماریوں اور دردوں سے مجھے محفوظ رکھ"

اس کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو پڑھے، اس نماز میں نفی خواطر کرے، اور ظاہر و باطن کے ساتھ متوجہ رہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

ما من مسلم یحسن الوضوء ثم یقوم فیصلی رکعتین مقبلا علیھما بقلبہ ووجھہ الا وجبت لہ الجنۃ،	جب بندہ مسلم اچھی طرح وضو کر لیتا ہے پھر اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھتا ہے بحضور تمام، تو اس کی جزا جنت ہوتی ہے،

(رواہ مسلم)

[۵۱] انفاس نفیسہ از خواجہ عبید اللہ الاحرار مشمولہ رسائل ستہ ضروریہ ص ۳۔ حضرت خواجہ نقشبندیہ سلسلہ کے رکن رکین ہیں، قطب وقت اور نویں صدی کے مجدد تھے، نسبت نقشبندیہ مولانا یعقوب چرخی سے حاصل کی تھی، اور دوسرے مشائخ نقشبندیہ سے بھی فیض پایا تھا، ۸۹۵ھ شب دوشنبہ، ۲۹ ربیع الاول کو انتقال فرمایا [۵۲] حدیث میں آیا ہے کہ اس اقرار شہادتین سے فتحت لہ ابواب الجنۃ الثمانیۃ یدخل من ایھا شاء بہشت کے آٹھ دروازے کھل جاتے ہیں جن سے چاہے داخل ہو، (رواہ مسلم) [۵۳] انفاس نفیسہ ص ۳ [۵۴] الرسالۃ الانسیہ ص ۲۰،

خواجہ بہاء الدین نقشبندؒ فرماتے تھے کہ اس نماز میں بھی ارکان نماز اور احکام نماز میں مشغول رہنا چاہئے، اور یہ مبتدی کی نسبت سے کہا گیا ہو، نماز تحیت وضو میں بہت ثواب ہے، شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے فرمایا ہو کہ یہ نماز ہر وقت پڑھی جا سکتی ہے، لیکن شیخ محی الدین عربیؒ نے کہا ہے کہ اوقات مکروہ میں نہ پڑھی جائے، اور یہی بات علمائے سلسلۂ نقشبندیہ کی تحقیق کے موافق ہے، اور نماز کے بعد تین مرتبہ گناہوں سے توبہ کی نیت سے یہ استغفار پڑھے، اور دعا کرے۔

استغفر اللّٰہ الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ،

جب سونے کا ارادہ کرے تو جائے خواب میں قبلہ کی طرف متوجہ ہو کر بیٹھے اور آیۃ الکرسی اور آمن الرسولؐ پڑھے اور ہاتھوں پر پھونک کر اپنے اعضائے جسم پر مل لے آنحضرت صلعم نے ایسا ہی کیا ہے، اور تین بار کہے، استغفر اللّٰہ الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ حدیث بی سعیدؓ میں آیا ہے کہ جو شخص سوتے وقت اس طرح استغفار کرتا ہے، اس کے سارے گناہ معاف کئے جاتے ہیں، (رواہ الترمذی) اس کے بعد ذکر میں مشغول ہو جائے، اور جب نیند کا غلبہ ہو تو سو جائے، منہ قبلہ کی طرف ہو اور سیدھے ہاتھ کی ہتھیلی گال کے نیچے رکھ لے، اور تین بار یہ دعا پڑھے[1]،

اللّٰھُمَّ اسلمتُ نفسی الیک و	اے اللہ میں نے اپنی جان تیرے سپرد کی، اپنا منہ تیری طرف کیا
وجّھتُ وجھی الیکَ و فوّضتُ	اپنا کام تیرے تفویض کیا، اور میں نے تجھ
امری الیكَ و الجأتُ ظھری	پر بھروسہ کیا، تیرے ثواب کی خواہش اور
الیكَ رغبۃً و رھبۃً الیکَ	تیرے عذاب کے ڈر سے، تیرے عذاب سے کوئی

---

[1] اس دعا سے پہلے یہ دعا پڑھ لینا اچھا ہے، باسمک اللّٰھم وضعت جنبی و بک ارفعہ، اللّٰھم ان امسکت نفسی فاغفر لھا وارحمھا وان ارسلتھا فاحفظھا بما تحفظ بہ عبادك الصّالحین، (صحاح ستہ)

لا ملجاء ولا منجاء منک الا الیک	پناہ اور نجات نہیں ہے سوائے تیرے، میں
اٰمنت بکتابک الذی انزلت و	ایمان لایا تیری کتاب پر جو تونے اتاری، اور
بنبیک الذی انزلت وبنبیک الذی	تیرے نبی پر جس کو تونے بھیجا،
ارسلت[1] (متفق علیہ)	
اللّٰھم ایقظنی فی احب الساعات	اے اللہ جو گھڑی تیرے لئے محبوب ترین
الیک واستعملنی باحب الاعمال	ہے، مجھے اس گھڑی بیدار کر، اور جو اعمال
الیک التی تقربنی الیک زلفا	بہتر ہیں، اُن کے لئے مجھے استعمال فرما تاکہ
وتبعدنی من سخطک بعدا	میں تیرا قرب حاصل کروں اور تیری ناراضی
	سے دور رہوں،
اللّٰھم لا تؤمنی مکرک ولا	اے اللہ! مجھے اپنے مکر سے مامون
تولنی غیرک ولا تنسنی ذکرک	نہ کر، اور نہ غیر کے حوالہ کر، اور نہ اپنا ذکر بھلا دے
ولا تجعلنی من الغافلین[2]	اور نہ مجھے غافلین سے کر،

مولانا یعقوب چرخیؒ اس تفصیل کے بعد سالک کو نماز تہجد کی تاکید فرماتے ہیں[3]، اس سلسلہ میں کہتے ہیں کہ خواجہ بزرگ بہاء الدین نقشبندؒ نے اُن سے فرمایا تھا کہ "پیش از صبح بسبق باطن مشغول باشی" اس سے آپ کا اشارہ تہجد کی طرف تھا، ابتداء حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صبح سے پہلے بیدار ہو جاتے

---

[1] حدیث میں کہا گیا ہے کہ اس دعا کے پڑھنے کے بعد اگر کوئی رات میں مرجائے تو دین اسلام پہ مرے گا، اور اگر صبح تک زندہ رہے تو بھلائی حاصل ہوگی، (ان مت فی لیلک مت علی الفطرۃ ای علی الدین الحق وان اصبحت اصبحت خیراً) اخرجہ البخاری وغیرہ من الائمہ [2] الرسالۃ الانسیہ ص ۲۱، ۲۲ [3] ایضاً ص ۲۹ تا ص ۳۲،

اور نماز ادا فرماتے۔ ابتدا میں نماز تہجد آپ پر فرض تھی بعض کا خیال ہے کہ آخر عمر میں یہ نماز آپ پر فرض نہ رہی تھی، بطور نفل آپ اسی پر مداومت فرماتے رہے، اور بعض کے نزدیک یہ نماز آپ پر آخر عمر میں بھی فرض تھی، قرآن کریم میں شب خیزوں کی بڑی تعریف آئی ہے۔

اِنَّ المتقین فی جنات وّ عیُوْن	البتہ متقی باغوں میں ہیں اور چشموں میں
آخذین مَا اٰتٰھم ربّھم انھم	لیتے جو دیا اُن کو اُن کے رب نے، وہ تھے
کانوا قبل ذلک محسنین، کانوا	اس سے پہلے نیکی والے، وہ تھے رات کو تھوڑا
قلیلاً مِنَ اللّیل ما یھجعُوْنَ و	سوتے، اور صبح کے وقتوں میں معافی
بالاسحار ھُمْ یستغفرون، (الذاریات)	مانگتے،

اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ سحر کے وقت یہ کلمات زیادہ کہنے چاہئیں۔

اللّٰھُمّ اغفرْ لنا وارحمنا وتب علینا، انّک انت التواب الرحیم،

قرآن کریم میں ایک جگہ شب خیزوں کی تعریف میں کہا گیا ہے،

تتجافٰی جنوبھُم عَنِ المضَاجع	جدا رہتی ہیں اُن کی کروٹیں اپنے سونے
یدْعُوْنَ ربّھم خوفاً وّطمعًا	کی جگہ سے، پکارتے ہیں اپنے رب کو
وممّا رزقنٰھم ینفقون فلا	ڈر سے، اور لالچ سے اور ہمارا دیا ہوا
تعلم نفسٌ مَّا اُخفی لھم من قرّۃ	کچھ خرچ کرتے ہیں، سو کسی جی کو معلوم
اعین جزآءً بما کانوا یعملون،	نہیں جو چھپا دھری ہے اُن کے واسطے
	آنکھوں کی ٹھنڈک، بدلا اس کا جو
(السجدہ ۲ رکوع ۔۱)	کرتے تھے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ سے فرمایا کرتے تھے:

علیکم بقیام اللیل فانه دأب الصالحین قبلکم و هو قربة لکم الی ربکم و مکفرة للسیئات و منهاة عن الاثم، (رواہ الترمذی)	تمھیں شب بیدار ہونا چاہئے کہ یہ صالحین کا طریقہ رہا ہے (یعنی انبیاء و رسل اور اولیاء شب بیدار رہے ہیں) اور یہ حق تعالیٰ کی قربت و رحمت کی موجب ہے، کفارۂ گناہ کا سبب ہے، اور گناہوں سے بچانے کا بھی سبب ہے،

دوسری حدیث میں آیا ہے،

اقرب ما یکون الرب من العبد فی جوف اللیل الآخر، فان استطعت ان تکون ممن یذکر اللہ فی تلک الساعة فکن (رواہ الترمذی وقال هذا حدیث حسن صحیح غریب اسناداً)	بندہ اپنے رب کی رحمت سے سب سے زیادہ قریب اس آدھی رات کے وقت ہوتا ہے جو صبح کے قریب ہوتی ہے، اگر تجھ سے ہو سکے تو ان لوگوں میں سے ہو جا جو اس وقت خدا کا ذکر کرتے ہیں۔

شب خیزوں کی فضیلت میں بہت سی حدیثیں ہیں، حضرت ابوسعید ابوالخیرؒ نے ایک رباعی میں اصل بات کو کیا خوب ادا کیا ہے۔[1]

شب خیز کہ عاشقاں بشب راز کنند — گرد در و بام دوست پرواز کنند
ہر جا کہ درے بود بشب در بندند — الا در دوست را کہ بشب باز کنند

اس کے بعد مولانا جامیؒ نے شب خیزوں کے کچھ آداب بیان فرمائے ہیں[2]، حدیث میں آیا ہے کہ

---

[1] الرسالۃ الانسیہ ص ۳۰ تا ۳۱ [2] ایضاً ص ۳۱، ص ۳۲،

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب شب میں بیدار ہوتے، تو پہلے مسواک کرتے اور وضو کرتے اور یہ آیتیں تلاوت فرماتے

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيٰتٍ لِّأُولِي
الْأَلْبَابِ ۝ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ
تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ۝ رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا
يُّنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا
وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۝
إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۝ (سورہ آل عمران رکوع ۲۰)

اس کے بعد یہ دعا پڑھتے:

اللّٰھم لک الحمد انت قیم السمٰوٰت	اے اللہ تیرے ہی لئے سب تعریف ہے تو ہی
والارض ومن فیھن، ولک الحمد	قائم رکھنے والا ہے آسمان اور زمین کو اور
انت نور السمٰوٰت والارض و	اُن کے درمیان جو چیزیں ہیں، اور تجھ ہی
من فیھن، ولک الحمد انت ملک	کو سب تعریف ہے، تو ہی آسمان اور زمین
السمٰوٰت والارض ومن فیھن	کا بادشاہ ہے اور ان کا جو اُن کے درمیان
ولک الحمد، انت الحق، ووعدک	ہیں، اور تیرے ہی لئے سب تعریف ہے تو ہی
الحق ولقاؤک الحق وقولک الحق	آسمانوں اور زمین کا، اور اُن کے درمیان
والجنۃ حق والنار حق والنبیون	کی چیزوں کا روشن کرنے والا ہے، اور تجھ
حق ومحمد حق والساعۃ حق اللھم	ہی کو سب تعریف ہے، تو ہی حق اور ثابت و
لک اسلمت وبک آمنت وعلیک	موجود ہے، اور تیرا وعدہ سچا ہے، تیرا دیدار

توکلت و الیک انبت و بک خاصمت و الیک حاکمت فاغفرلی ما قدمت و ما اخرت و ما اسررت و ما اعلنت و ما انت اعلم بہ منی انت المقدم و انت المؤخر، لا الٰہ الا انت و لا الٰہ غیرک ۔

(متفق علیہ)

حق ہے، اور تیرا کلام سچا ہے، اور جنت حق ہے، اور دوزخ حق ہے، اور سب پیغمبر حق ہیں، اور محمد صلعم حق ہیں، اور قیامت حق ہے! اے اللہ میں تیرا فرماں بردار ہوا، اور تجھ پر ایمان لایا، اور تجھ ہی پر بھروسہ کیا، اور تیرے ہی طرف میں نے رجوع کیا، اور تیری ہی مدد سے میں نے جھگڑا کیا، (یعنی اعدائے دین سے) اور تیری ہی طرف اپنی فریاد لایا تو میرے وہ گناہ معاف کردے، جو میں نے پہلے کئے، اور پیچھے کئے اور جو پوشیدہ کئے اور جو برملا کئے، وہ گناہ جس کو تو میری نسبت زیادہ جانتا ہے، تو ہی آگے بڑھانے والا ہے، اور تو ہی پیچھے رکھنے والا ہے، کوئی معبود برحق نہیں سوا تیرے!

وضو سے فارغ ہوکر ان آیات اور دعاؤں کے پڑھنے کے بعد دو رکعت تحیۃ الوضو ادا کرے، اس کے بعد خواجہ عبید اللہ احرارؒ[1] تاکید فرماتے ہیں کہ اپنے اوقات گزشتہ کا محاسبہ کرے، اگر یہ غفلت و معصیت میں نہ گزرے ہوں تو حق تعالیٰ کا شکر بجا لائے اور ان میں جو کچھ غفلت اور عصیاں میں گزرے ہوں ان پر حسرت اور عذر تقصیر پیش کرے، اور اس کلمۂ "بازگشت" کو تین بار زاری و تضرع و خشوع تمام کے ساتھ کہے :

---

[1] رسالہ انفاس نفیسہ ص ۳، ۴، ۵۔

"خداوندا بحضرت تو باز گشتم از ہر بدی و تقصیرے کہ بر من گذشتہ است دانستہ و نادانستہ

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشہد ان محمدا عبدہ

ورسولہ"

اور ایک مرتبہ ان ابیات کو درد و رقت کے ساتھ پڑھے۔

چوں بدرگاہ تو خود را در پناہ آوردہ ام | یا الٰہ العالمین بار گناہ آوردہ ام
بر درت زیں بار خود پشت دوتا آوردہ ام | عجز و زاری بر در عالم پناہ آوردہ ام
من نمی گویم کہ بودم سالہا در راہ تو | ہستم آں گمراہ کہ اکنوں رو براہ آوردہ ام
چار چیز آوردہ ام حقا کہ در گنج تو نیست | نیستی و حاجت و عذر و گناہ آوردہ ام
دل و درویشی و دلریشی و بے خویشی ہم | ایں ہمہ بر دعوئ عشقت گواہ آوردہ ام
چشم رحمت بر کشا موے سفید من ببیں | زانکہ از شرمندگی روے سیاہ آوردہ ام

اس کے بعد بہ نیاز تمام سو مرتبہ یہ استغفار پڑھے،

استغفر اللہ ربی من کل ذنب اذنبتہ عمدًا او خطاءً، سرًا او علانیۃً، واتوب الیہ من الذنب الذی اعلم ومن الذنب الذی لا اعلم وانت علام الغیوب۔

اس کے بعد نماز تہجد شروع کرے، دو رکعت کی نیت سے بارہ رکعت ادا کرے۔ پہلی دو رکعتوں میں سے رکعت اول میں بعد فاتحہ آیۃ الکرسی اور دوسری رکعت میں اٰمن الرسول پڑھے دوسری آٹھ رکعتوں میں سورۂ یٰسین پڑھے، ہر رکعت میں دس دس آیتیں، اس طرح:

پہلی رکعت بعد فاتحہ: یٰسین .... فبشرہ بمغفرۃ واجر کریم،

دوسری رکعت " : انا نحن نحی الموتی .... وھم مھتدون،

تیسری رکعت " : ومالی لا اعبد الذی...... ان کل لما جمیع لدینا محضرون

چوتھی رکعت بعد فاتحہ: وآیۃ لھم الارض المیتۃ ...... کل فی فلک یسبحون،

پانچویں رکعت " : وآیۃ لھم انا حملنا ذریتھم ..... ولا الی اھلھم یرجعون۔

چھٹی رکعت " : ونفخ فی الصور .... ھذا صراط مستقیم

ساتویں رکعت " : ولقد اضل منکم جبلا کثیرا ..... افلا یشکرون،

آٹھویں رکعت " : واتخذوا من دون اللہ الھۃ تا ختم : والیہ ترجعون،

آخری دو رکعتوں میں سورۂ اخلاص تین تین بار پڑھیں، یہ خواجہ یوسف ابو یوسف ہمدانی (۵۳۵ھ) کی روش رہی ہے، جو پیر سلسلۂ خواجگان نقشبندیہ ہیں، بعضوں نے ہر رکعت میں ایک مرتبہ سورۂ یٰسین بھی پڑھی ہے، اس کے بعد بیٹھ کر اور دو رکعت پڑھیں کہ کل درحقیقت تیرہ رکعت ہو جائیں، اس لئے کہ بیٹھ کر دو رکعت پڑھنا بمنزلہ ایک رکعت پڑھنے کے ہوتا ہے، ایسا اس لئے کیا جاتا ہے کہ اداے نماز طاق واقع ہو، کیونکہ حق تعالیٰ فرد ہیں، اور فرد کو محبوب رکھتے ہیں۔[۱]

حضرت خواجہ عزیزاں علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ (۷۱۵ھ وفات) جو سلسلہ نقشبندیہ میں قطب وقت گذرے ہیں، فرمایا کرتے تھے، کہ جب تین دل جمع ہو جاتے ہیں، تو بندہ مومن کا کام بن جاتا ہے، دل شب دل قرآن، و دل بندہ مومن[۲]

یعنی یٰسین ۱۲

اگر وقت تنگ ہو تو آٹھ یا چار یا دو رکعتیں پڑھی جا سکتی ہیں[۳] اور اگر کسی عذر کی وجہ سے نہ پڑھ سکیں تو دوپہر سے پہلے اس کی قضا کر لیں[۴] حضرت خواجہ عبید اللہ احرار ختم نماز پر اس دعا کی تاکید فرماتے ہیں،

اللّٰھم ارزقنا حبک وحب من	اے اللہ ہمیں اپنی محبت نصیب کر اور ان کی
یحبک وحب ما یقربنا الیک	محبت بھی جو تجھ سے محبت کرتے ہیں، اور ان

---

[۱] رسالہ انسیہ ص ۳۲، [۲] رسالہ انفاس نفیسہ ص ۶ [۳] ایضاً ص ۵،

اللّٰھمّ انصرنا وانصر من نصر الدّین
وانصر من نصر اھل الدّین، اللّٰھمّ
اخذل من خذل الدّین و
اخذل من خذل اھل الدّین
اللّٰھمّ احفظنا من العلّة فی
الغربة ومن الذلّة عند الشیب
ومن الشقاوة عند الخاتمة و
من الفضیحة یوم القیامة
اللّٰھمّ زیّن ظواھرنا بخدمتک
وبواطننا بمحبتک وقلوبنا
بمعرفتک وارواحنا بمشاھدتک
واسرارنا بمعاینة جناب قدسک
اللّٰھمّ ارنا الحق حقًّا وارزقنا اتباعه
وارنا الباطل باطلًا وارزقنا
اجتنابه ولا تکلنا الی انفسنا
ولا الی احد من خلقک طرفة
عین ولا اقلّ من ذٰلک وکن
لنا ولیًّا وناصرًا وحافظًا وعونًا
ومعینًا وعلی کل خیر دلیلًا و

اعمال کی محبت بھی جو ہمیں تیرا قرب عطا
کرتے ہیں، اے اللہ ہماری مدد کر، اور
اُن کی جو دین کی مدد کرتے ہیں، اور اُن کی
جو اہلِ دین کی مدد کرتے ہیں، اے اللہ اُن
کی مدد نہ کر جو دین کی مدد نہیں کرتے اور نہ تو
اہلِ دین کی مدد کرتے ہیں، اے اللہ ہمیں
مسافرت میں بیماری سے محفوظ رکھ، اور
بڑھاپے میں ذلت سے اور خاتمہ کے وقت
شقاوت سے اور قیامت کے دن فضیحت
یا رسوائی سے، اے اللہ زینت بخش ہمارے
ظاہر کو اپنی خدمت سے، ہمارے باطن کو
اپنی محبت سے، ہمارے دلوں کو اپنی معرفت
سے، ہماری روحوں کو اپنے مشاہدے سے
ہمارے اسرار کو اپنے معائنہ سے، اے اللہ
ہمیں حق کا مشاہدہ نصیب کر، اور اس کی
اتباع، اور باطل کو دکھلا اور اس سے
اجتناب عطا کر، اور ہمیں اپنے نفس یا کسی
مخلوق کے حوالہ چشم زدن کے لئے
نہ کر نہ اس سے کم کے لئے ہی، او

ملقنا ومؤیدًا، اللّٰھم ربنا اٰتنا
ممّن حضرنا وممن غاب عنّا و
وکل مومن و مومنة فی الدارین
حسنة یا واسع المغفرة، اللّٰھم
ارنا الاشیاء کما ھی، اللّٰھم
سَھّل علینا بجودک ویسّر
علینا بکرمک یا اکرم
الاکرمین یا ارحم الراحمین، اللّٰھم
تب علینا حتّٰی نتوب الیک و
اعصمنا حتی لا نعود وحبّب الینا
الطاعات وکرّہ الینا الخطیئات
بفضلک وکرمک یا ارحم الراحمین
وصلّی اللّٰہ علی خیر خلقہٖ محمد و
اٰلہٖ واصحابہٖ اجمعین!

ہمارا والی و مددگار و محافظ و
معین ہو جا، اور ہر خیر کی طرف
ہماری رہنمائی فرما، سکھلا، اور مدد فرما،
اے اللہ ہم میں سے جو حاضر ہیں اور جو غائب
ہیں، اور ہر مومن و مومنہ کو دارین میں بھلائی
نصیب فرما! اے اللہ ہمیں اشیاء کی حقیقت
کا مشاہدہ نصیب کر، اے اللہ، تو اپنے
جود وکرم سے ہمارے معاملات کو آسان و
سہل کر دے، اے سب سے زیادہ کرم اور
رحم کرنے والے، اے اللہ ہماری توبہ قبول
فرما، اور ہمیں گناہوں کی طرف رجوع کرنے
سے محفوظ رکھ، اپنی اطاعت کو ہمارے لیے
محبوب اور گناہوں کو ہمارے لئے مبغوض
کر دے، اپنے فضل و کرم سے، اے سب
سے زیادہ رحم کرنے والے خدا وصلّی
اللّٰہ علی خیر خلقہٖ محمد و اٰلہٖ و
اصحابہٖ اجمعین،

حضرت خواجہ ہدایت فرماتے ہیں کہ ان تیرہ رکعتوں کا ثواب تمام اولیاء، اپنے مال اور جمیع امت رسول کو بخش دے، تاکہ حق سبحانہ تعالیٰ ایک رکعت کے عوض دس رکعتوں کا ثواب

عطا فرمائیں،

گر یک بدہی تو دہ دہندت — گر شام دہی سحر دہندت

ہر دہ بدہ بیاد مولا — تا بر در دوست دہ دہندت

بلکہ ایک کے عوض سات سو عطا کریں، اور اگر چاہیں بے حساب دیں، جیسا کہ ارشادِ باری ہے،

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ	مثال ان لوگوں کی جو خرچ کرتے ہیں اپنے مال،
فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ	اللہ کی راہ میں ایسی ہے کہ جیسے ایک دانہ
سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ	اس سے اگیں سات بالیں، ہر بال میں سو
حَبَّةٍ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ	سو دانے اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے
وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ،	چاہے، اور اللہ نہایت بخشش کرنے والا ہے
(البقرہ - رکوع ۳۶)	سب کچھ جانتا ہے،

اور اس ثواب کو بھی رضائے حق کے لئے ان ہی لوگوں کی ارواح کو بخش دے، اور حق تعالیٰ سے عنایت و رحمت طلب کرے، بلکہ ان سے اُن کے سوا کچھ نہ مانگے،

از زندگیم بندگی تست ہوس — بر زندہ دلاں بے تو حرام ست نفس

خواہند ز تو مقصود دل خود ہمہ کس — جامی ز تو ہمیں ترا خواہد و بس

یہی مفہوم اس دعا کا کہ: اسئلك ان لا اسئلك سواك. یعنی میں تجھ سے یہ چاہتا ہوں

نماز تہجد ادا کرنے کے بعد سالک کو چاہئے کہ جو ذکر پیر نے اس کو تلقین کیا ہے اس میں مشغول ہو جائے[1]،

خواجہ احرارؒ فرماتے ہیں کہ اگر تہجد کسی وجہ سے ترک ہو جائے تو چاہئے کہ دوسرے دن آدھے دن

---

[1] انفاسِ نفیسہ ص ۸،

سے پہلے اس کو پڑھ لے، اس کا ثواب اتنا ہی پائے گا گویا کہ اس کے وقت پر ادا کیا گیا ہے، اور اگر سفر پر ہو اور سحر کو اٹھنے کا یقین نہ ہو تو یہ نماز اول شب پڑھ کر ہی سو رہے[۱]۔

جب صبح صادق ہو تو سنت فجر گھر ہی میں پڑھے، رکعت اول میں فاتحہ اور سورۂ کافرون اور رکعت دوم میں فاتحہ اور سورۂ اخلاص پڑھے، اس کے بعد ستر مرتبہ پڑھے: استغفر اللہ العظیم الذی لا الٰہ الا ھو الحی القیوم و اتوب الیہ[۲]، اور روشنی دل کے لئے یہ دعا اکتالیس بار پڑھے: یا رحمٰن یا رحیم یا حی یا قیوم یا بدیع السمٰوٰت والارض یا ذا الجلال والاکرام یا لا الٰہ الا انت اسئلک ان تحیی قلبی بنور معرفتک ابداً یا اللہ یا اللہ یا اللہ[۳]۔

فرض کے ادا کرنے کے لئے مسجد کو جائے، اور راستہ میں کہے، استغفر اللہ من جمیع ماکرہ اللہ قولاً و فعلاً و خاطراً و ناظراً اور جب مسجد میں داخل ہو تو پہلے اپنا سیدھا پیر رکھے، اور کہے السلام علیٰ اھل البیت، اللّٰھم افتح لی ابواب رحمتک[۴]،

فریضۂ فجر ادا کرنے کے بعد اپنی جگہ بیٹھا رہے، اور سبق باطن میں مشغول رہے، یہاں تک کہ آفتاب نکل آئے، اب دو رکعت نماز اشراق کی نیت سے ادا کرے اور ہر رکعت میں پانچ مرتبہ سورۂ اخلاص پڑھے[۵]

رسول اللہ صلعم نے فرمایا:

من صلّی الصبح فی جماعۃ ثم ثبت	جو کوئی نماز صبح جماعت کے ساتھ پڑھے،
فیہ حتی یُسبّح فیہ سُبحۃ الضحٰی ثم	پھر اسی جگہ بیٹھا رہے، یہاں تک کہ اس
یصلّی کان لہ کاجر حاجٍ و مُعتمرٍ	جگہ نماز ضحیٰ کی پڑھے، تو ہوگا اس کے لئے

---

[۱] انفاس نفیسہ ص ۶ [۲] رسالہ انسیہ ص ۲۳ [۳] انفاس نفیسہ ص ۷ [۴] رسالہ انسیہ ص ۳۲، رواہ مسلم ابو داؤد نسائی، اور ایک روایت میں یہ دعا آئی ہے، اللّٰھم افتح لنا ابواب رحمتک و سھّل لنا ابواب رزقک (ابن ماجہ) [۵] انفاس نفیسہ ص ۶،

تامّۃً لہ حجتہٗ وعمرتہ۔ (عن ابی امامۃ یرفعہ)

مانند اجر اس شخص کے کہ حج ادا کرے یا عمرہ بجالائے کہ اس کا حج اور عمرہ تمام اور کامل ہو۔

دوسری حدیث میں آیا ہے کہ

من قعد فی مصلاہ حین ینصرف من صلوۃ الصبح حتی یسبح رکعتی الضحیٰ لایقول الاخیرًا غفر لہٗ خطایاہ وان کانت مثل زبد البحر (فی مسند الامام احمد عن معاذ بن انس یرفعہ)

جو کوئی بیٹھے اپنی نماز کی جگہ پر جس وقت کہ پھرے نماز صبح سے یہاں تک کہ دو رکعت ضحیٰ کی پڑھے، اور بات نہ کرے، مگر جو نیک ہو (اور اس پر ثواب مترتب ہو یعنی ذکر حق میں مشغول رہے) بخشے جائیں گے اس کے گناہ اگرچہ کف دریا کے برابر ہوں

اس کے بعد اور دو رکعت استخارہ کی نیت سے پڑھے، اور حق تعالیٰ سے اس دن خیر کی توفیق طلب کرے، حق تعالیٰ اس کے دل اور آنکھوں کو خیر کی جانب کھول دیں گے[۱] رسول اللہ صلعم نے حکایۃً عن اللہ عز وجل فرمایا ہے۔

ابن آدم لاتعجزنی من اربع رکعات اوّل النھار اکفک آخرہٗ (عن نعیم بن ہمام، عند الترمذی)

اے اولاد آدم نہ عاجز ہو چار رکعت سے دن چڑھتے، بچاؤں گا۔ تجھے ہر بلا سے آخر دن تک۔

مولانا یعقوب چرخیؒ وصیت فرماتے ہیں کہ اشراق کی دو رکعت ادا کرنے کے بعد دس مرتبہ:

---

[۱] انفاس نفیسہ ص ۲

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِیْكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ

ضرور پڑھیں، اس ذکر کی تلقین آپ کو حضرت سیف الدین باخرزیؒ نے فرمائی تھی، جب آپ نے حضرت باخرزیؒ کے مزار پر توجہ کی تھی،[۵۱]

جب مسجد سے باہر آئے تو کہے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ اور اس دعا کو گھر پہونچنے تک پڑھتا رہے، اس کے بعد اگر قرآن پڑھ سکتا ہے، تو مصحف کو سامنے رکھ کر جس قدر چاہے پڑھے، اس کے بعد اگر طالب علم ہے، تو اپنے درس میں مشغول ہو جائے، اور اگر سالک ہے تو ذکر و مراقبہ میں مشغول رہے یہاں تک کہ جب آفتاب بلند ہو جائے اور زمین گرم ہو جائے نماز چاشت ادا کرے، یہ نماز بارہ رکعت ہے، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے،

مَنْ صَلَّی الضُّحٰی ثِنْتَیْ عَشَرَةَ رَكْعَةً	جس نے ضحیٰ کے بارہ رکعت پڑھے بنائیگا
بَنَی اللّٰهُ لَهٗ قَصْرًا فِی الْجَنَّةِ مِنْ	اللہ اس کے لئے جنت میں سونے کا مکان
ذَهَبٍ	

(الترمذی و ابن ماجہ عن انس رضی اللہ عنہ)

اس نماز کی رکعتیں آٹھ، چار اور دو بھی آئی ہیں،[۵۲] چنانچہ خواجہ احرار فرماتے ہیں کہ نماز چاشت کے چار رکعت ادا کئے جائیں اور رکعت اول میں بعد فاتحہ والشمس و ضحٰها، رکعت ثانی میں واللیل اذا یغشیٰ اور تیسری میں والضحیٰ اور چوتھی میں الم نشرح پڑھیں اور ختم نماز پر سجدہ کریں اور سات مرتبہ الوھاب پڑھیں غیر اللہ کی محبت دل سے نکل جاتی ہے، اور دل صاف ہو جاتا ہے،[۵۳]

جب بھی وضو ٹوٹ جائے تو پھر وضو کر لے، تحیت الوضوء ادا کرے، اور دعا کرے، یہ سب آداب طریقت سے ہیں، اور دوام وضو فراخی رزق کا بھی سبب ہے،

---

۵۱ رسالہ انسیہ ص ۳۴، ۵۲ ایضاً ص ۳۳، ۵۳ رسالہ انفاس نفیسہ ص ۸،

جب نماز ظہر کا وقت آئے تو اس کو جماعت سے ادا کرے، اور تین مرتبہ کلمۂ بازگشت[1] اور ستر مرتبہ استغفر اللہ من کل ذنب (تا آخر[2]) پڑھ لیں تاکہ اس حدیث نبوی صلعم کے مضمون پر عمل ہو جائے کہ

انہ لیغان علی قلبی حتی استغفر	میرے دل پر غفلت چھا جاتی ہے اور
اللہ فی کل یوم سبعین مرۃ ،	میں ایک دن میں ستر بار استغفار کرتا
(رواہ البخاری)	ہوں ،

سعی وجہد بلیغ کرے کہ عشا کی نماز کے وقت تک بیہودہ گفتگو نہ کرے، اور اس کے اجر کی بموجب ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین، حق تعالیٰ سے امید رکھے، یہ تمام اعمال بمنزلہ پرہیز ہیں، تاکہ مادہ مستعد مسہل ہو جائے، اور اس وقت مسہل لے کر اس تمام مواد کو جو نفس و طبیعت کی راہ سے داخل ہوا ہے خارج کر دے اور نجات پائے[3]!

۱؎ دیکھئے ص ۴۴ ۲؎ دیکھئے ص ۵۴ ۳؎ انفاس نفیسہ ص ،

جدید ایرانی شاعری میں وطنیت

از

جناب ڈاکٹر عبدالحمید صاحب فاروقی صدر شعبۂ اردو فارسی و اسلامک کلچر گجرات کالج احمد آباد

(۲)

میرزا محمد فرخی یزدی ایران کے ان گنے چنے سپوتوں میں سے ہے جو حقیقی معنوں میں آزادی اور حریت کے علمبردار کہے جاسکتے ہیں، جدید ایرانی شاعری میں فرخی کی شخصیت بڑی محترم مانی جاتی ہے، شمع آزادی کے اس پروانے نے دولت و ثروت اور جاہ و منصب کو ٹھکرا کر مادر وطن کے لئے قید و بند کی صعوبتوں کو ہنسی خوشی برداشت کیا اور بارہا اپنے بے باک قلم کی وجہ سے حکومتِ وقت کے مشق ستم کا نشانہ بنا،

فرخی کی تمام و کمال نگارشات آزادی اور وطنیت کے شدید جذبات کی ترجمان ہیں، فرخی نے عید نوروز کے موقع پر ایک نظم آزادی خواہوں کے ایک مجمع میں پڑھ کر سنائی جس کی پاداش میں یزد کے حاکم ضیغم الدولہ قشقائی نے فرخی کے ہونٹوں کو سلوا دیا، نظم کے بعض بند ملاحظہ فرمایئے:

مسمطِ وطنی

عید جم شد اے فریدون خوبتِ ایران پرست
مشتبہ ی خوی ضحاکی ست این خونہ زدست
حالیا کز سلم و تور[1]، انگلیس درد س ہمست
ایرجِ[2] ایران سراپا دستگیر دپای بست

---

[1] و [2] فریدوں کے لڑکے،

به که از راهِ تمدن ترک بی مهری کنی
در رهِ مشروطه اقدام منوچهری کنی

این همه ایران که منزل گاه کیکاوس بود
خوابگاه داریوش و مامنِ سیروس بود
جائے زال و رستم و گودرز و گیو و طوس بود
نے چنیں پامالِ جورِ انگلیس و روس بود

این همه از بے حسی ما بود کافسرده ایم
مردگانِ زنده بلکه زندگانِ مرده ایم

اس بند میں براہ راست حاکم سے مخاطب ہے:

خود تو میدانی نیم از شاعرانِ چاپلوس
کز برائے سیم بنمایم کسی را پاے بوس
یارسانم چرخ ریشؔ را بچرخ آبنوس
می نمی گویم تو ئی در گاہ ہیجا ہمچو طوس

لیک گویم گر بقانون مجری قانون شوی
بہمن و کیخسرو و جمشید و افریدون شوی[2]

ہونٹ سے جانے کے بعد فرخی نے ایک مسمط تہران کے آزادی خواہوں کے نام بھیجا، اس کے بعض بند ملاحظہ ہوں،

اے دموکرات بت باشرف نوع پرست

---

[1] ایک چڑیا جس کی آواز تیز اور باریک ہوتی ہے۔ [2] سخنوران ایران ص ۳۱۴۔

که طرفداری ما رنجبران خوئے تو ہست
اندریں دورہ که قانون شکنی دلخواست
گر ز ہم مسلک خویشت خبری نیست بدست

شرح این قصه شنو از دو لب دوخته ام
تا بسوز ز دولت از بہر دل سوخته ام

ضیغم الدوله چو قانون شکنی پیشه نمود
از ہمان پیشهٔ خود ریشهٔ خود تیشه نمود
خون یک ملت غارت زده در شیشه نمود
نے ز وجدان خجل وے نے ز حق اندیشه نمود

بگمانش که در امروز مجازاتی نیست
یا بفرداش برایں کرده مکافاتی نیست

تاخت در تبریز چنان خنگ ستبدادی را
کز میان برد بیک بارگی آزادی را
کرد پامال ستم، قریه و آبادی را
خواست تا جلوه دہد مسلک اجدادی را

زانکه می گفت: من از سلسلهٔ چنگیزم
بے سبب نیست که چنگیز صفت خونریزم[۵]

پہلی جنگ عظیم کے دوران میں فرخی نے بغداد و کربلا کی طرف ہجرت کی، اور چونکہ انگریزوں

---

۵ سخنوران ایران: ص ۳۱۵،

کی قبر آلود نگاہیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔ اس نے کربلا سے موصل تک کا سفر پیدل طے کیا، اس غربت کے زمانہ میں ایک مستزاد کہی ہے جس میں غیر ملکیوں کے استبداد اور ان کی ریشہ دوانیوں سے اہل وطن کو آگاہ کیا ہے:

اے وطن پرور ایرانی با مسلک و ہوش ہاں کن جوش و خروش
پندہای من با تجربہ بنما سے گوش گر تو ئی پند نیوش
اجنبی گر مثل میدہد ت ساغر نوش نوش نیش است، منوش
وز پی خستن او در ہمہ اوقات بکوش ناتوان داری و توش
کہ عدو دست نگرد و بخدا گر بنی است اجنبی اجنبی است

من سرگشتہ چو بر کار جہاں گردیدم رنجہا بکشیدم
پا برہنہ رہ دشت و درہ را ببریدم دست غم بگزیدم
حالت ملت عثمانی و تر زمن دیدم خوب و بد بشنیدم
باز برگشتہ و از اجنبیاں نومیدم حالیا فہمیدم
کہ اگر شیخ خورد گول اجانب صبی است اجنبی اجنبی است[۳]

آزادی کے عنوان سے فرخی کی ایک نظم ہے جو پاکیزگی جذبات اور جوش و تاثر کے لحاظ سے بڑی کامیاب نظم کہی جاسکتی ہے،

آزادی

قسم بعزت و قدر و مقام آزادی کہ روح بخش جہان است نام آزادی
بہ پیش اہل جہاں محترم بود آنکس کہ داشت از دل و جاں احترام آزادی

---

[۱] غیر ملکی [۲] گول خوردن: دھوکا کھانا، [۳] سخنوران ایران، ص ۳۱۷

کہ طرفداری مارنجبران خوئے تو ہست
اندریں دورہ کہ قانون شکنی دلہا خست
گر زہم مسلک خویشت خبری نیست بدست

شرح ایں قصہ شنوا ز دو لب دوختہ ام
تا بسوز د دولت از بہر دلِ سوختہ ام

نصیر الدولہ چو قانون شکنی پیشہ نمود
از ہماں پیشۂ خود ریشۂ خود تیشہ نمود
خونِ یک ملت غارت زدہ در شیشہ نمود
نے زوجدان خجل وسنے زحق اندیشہ نمود

بگمانش کہ در امروز مجازاتی نیست
یا بفرداش برایں کردہ مکافاتی نیست

تاخت در تیرد جہاں خنگ ستبدادی را
کز میاں بردیکبارگی آزادی را
کرد پامالِ ستم، قریہ و آبادی را
خواست تا جلوہ دہد مسلکِ اجدادی را

زانکہ می گفت: من از سلسلۂ چنگیزم
بے سبب نیست کہ چنگیز صفت خونریزم[۱]

پہلی جنگِ عظیم کے دوران میں فرخی نے بغداد و کربلا کی طرف ہجرت کی، اور چونکہ انگریزوں

[۱] سخنوران ایران: ص ۳۱۵،

کی قہرآلود نگاہیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں، اس لئے کربلا سے موصل تک کا سفر پیدل طے کیا، اس غربت کے زمانہ میں ایک مستزاد کہی ہے جس میں غیر ملکیوں کے استبداد اور ان کی ریشہ دوانیوں سے اہل وطن کو آگاہ کیا ہے:

اے وطن پرور ایرانی ہا مسلک بہوش | ہاں مکن جوش و خروش
پندہائے من با تجربہ بنمائے بگوش | گر توئی پند نیوش
اجنبی گر مثل مید ہدت ساغر نوش | نوش نیش است منوش
وز پئی خستن او در ہمہ اوقات بکوش | ناتواں داری وتوش

کہ عدو دوست نگردد بخدا گر بنی است | اجنبی اجنبی است

من سرگشتہ چو پرکار جہاں گردیدم | رنجہا بکشیدم
پا برہنہ رہ دشت و درہ را بریدم | دست غم بگزیدم
حالت ملت عثمانی وترز من دیدم | خوب و بد بشنیدم
باز برگشتہ و از اجنبیاں نومیدم | حالیا فہمیدم

کہ اگر شیخ خورد گول اجانب صبی است[۱] | اجنبی اجنبی است[۲]

آزادی کے عنوان سے فرخی کی ایک نظم ہے جو پاکیزگی جذبات اور جوش و تاثر کے لحاظ سے بڑی کامیاب نظم کہی جا سکتی ہے،

آزادی

قسم بعزت و قدر و مقام آزادی | کہ روح بخش جہان است نام آزادی
بہ پیش اہل جہاں محترم بود آنکس | کہ داشت از دل و جاں احترام آزادی

---

[۱] غیر ملکی [۲] گول خوردن: دھوکا کھانا، [۳] سخنوران ایران، ص ۲۱۷

هزار بار بود به ز صبح استبداد برائے دستۂ پابستۂ شام آزادی
بروز کار قیامت بپا شود آن روز کنند زنجیران چون قیام آزادی
اگر خدائے بمن فرصتی دہد یک روز کشم ز مرتجعین[1] انتقام آزادی[2]

فرخی نے بہت سی سیاسی رُباعیاں بھی کہی ہیں، جو اپنے جوش، خلوص، حریت پرستی، اور وطن دوستی کی بنا پر عوام میں بیحد مقبول ہیں، ایک دو رباعیاں ملاحظہ فرمایئے،

آنانکہ ز خون دو دست رنگیں کردند آزادی حق خویش تا[3] ئیں کردند
دارند دو انظار حل حق حیات آن قوم کہ انقلاب خونیں کردند

در مرز عجم ذلتِ ایرانی بیں در ملک عرب محو مسلمانی بیں
دایم مہر سروران ایرانی را پامال تجاوز بریتانی بیں[4]

احمد خان اخگر اگرچہ ایرانی فوج میں ایک اعلیٰ افسر تھا لیکن شعر و شاعری میں اس کا درجہ مسلّم ہے، اخگر خالص وطن پرست شاعر ہے، اور اس کی بیشتر نظمیں آزادی، حریت اور وطن دوستی کے جذبات کی ترجمان ہیں، اور ان ہی خصوصیات کی وجہ سے وہ عوام میں بہت مقبول ہے، ایک نظم "مہر وطن" کے بعض اشعار یہ ہیں،

تا مہر وطن در دلم انگیختہ دارم خون دلم از دیدہ برخ ریختہ دارم
مو، حافظ سرحد و قشون حافظ کشور دل را بقشون وطن آویختہ دارم
در راہ دفاع وطن پاک شب و روز برروے عدو تیغ بر آہیختہ دارم

---

[1] رجعت پسند [2] سخنوران ایران ص ۲۱۳ [3] حفاظت [4] سخنوران ایران ص ۳۲۳

این آب[1] و گِلم، ارث ز اجداد رسیده است — خونِ دلِ خود با گِلش آمیخته دارم

تاریخچہ تا ریخِ وطن کلکِ تو رخ — آبِ رُخِ دشمن بزمین ریختہ دارم[2]

ایک نظم میں اہلِ وطن کو جہد و عمل کی تلقین کی ہے، اور وطن کی آزادی کے لئے شمشیر بکف ہونے کا مشورہ دیا ہے،

صاحب خانہ باش

یا بزمِ خصم در راہِ وطن مردانہ باش — یا چو مُرغِ بستہ پر محبوسِ قیدِ لانہ[3] باش

دل بپرداز بلبل و گل، کن رہا زلفِ نگار — بس کن این دیوانگی کار عاقل فرزانہ باش

خانۂ ما چون وطن باشد بود حفظش ضرور — روز و شب در فکرِ حفظِ خانہ و کاشانہ باش

چند انگر سیم داری چون غریبان از سگان — تکیہ بر شمشیر کن در خانہ صاحب خانہ باش[4]

ایک نظم "وطن دوشاہ" میں وطنیت کے تصور کو بڑے موثر اور دلنشیں پیرایے میں پیش کیا ہے:

نیست گر دو جہان آنکہ نباشد وطنش — چون یہودی کہ خورد مشتِ جہان دہنش

جانِ بے تن نہ دہد سود، و تنِ بے جان نیز — جان بود ملتِ ایران و وطن چون بدنش

ہست ہجرانِ وطن سخت بر غیر تمند — سہل بر دوش بود بارِ بلا و محنش

یوسفِ مصر وطن، روشنیِ چشمِ من است — من چہ یعقوبم و بوے وطنم پیراہنش

در رہ حبِ وطن مانع و رادع چہ بود — ساغرِ حب وی از زہر بود، دہ بنش

آبِ ایران بود از زمزم و کوثر بہتر — خاکِ آن مشک فشان عطر فشان یاسمنش

دو جہان گر بتو دادند وطن را مفروش — کہ بود باعثِ ننگِ دو جہانت ثمنش[5]

۱؎ سرزمین وطن ۲؎ سخنورانِ نامی معاصر: برقعی، ص ۷، ۳؎ گھونسلہ ۴؎ R R R ص ۶۱،
۵؎ ثمن بمعنی قیمت

دور از انصاف بود ہشت ار بہری بعوضِ ذرہ ای از خاکِ وطن با کفنش[1]

ایک نظم میں وطن فروشی کی پرزور مذمت کی ہے، یہ نظم خلوص، شدتِ جذبات اور تاثر کی بہترین مثال ہے، ملاحظہ فرمائیے،

وطن فروشی

بجای شہد چہ (چوں؟) سقراط زہر نوشیدن درون دریا شیر از نہنگ دوشیدن
سرِ مغار در آغوشِ اژدہا خفتن بجائے آب بدوزخ حمیم نوشیدن
دہانِ مارِ جرس[2] وار بوسہ ہا کردن میان دیگِ پُر از آبِ جوش جوشیدن
بروے خارِ مغیلان برہنہ غلطیدن بہ شیرِ شرزہ[3] برای مصاف کوشیدن
پیادہ تشنہ گرسنہ جہان نوردیدن ز زخمِ نیزہ و خنجر لباس پوشیدن
بروے مخزنِ باروت مشتعل بودن بسوکِ ہر چہ عزیز است بر خروشیدن

درونِ چاہِ پُر از مار و کژدم افتادن
ہزار مرتبہ از وطن فروشیدن[4]

ابوالقاسم لاہوتی بھی دورِ مشروطیت کی پیداوار ہے آج کل سویٹ یونین میں مقیم ہے، انقلابی شاعر ہونے کی وجہ سے اس کی بیشتر نظمیں حبِ وطن، آزادی اور انقلاب کی ترجمان ہیں، ایران کے انقلابی گروہ سے منسلک رہنے کی وجہ سے لاہوتی کو بھی بارہا وطن سے فرار ہو کر غربت کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا ہے،

لاہوتی نے جدید طرز میں ایک نظم کہی ہے، جس میں اپنے وطن کی زبوں حالی، بربادی اور ویرانی کا دلدوز نقشہ کھینچا ہے، اور ان تمام تباہ کاریوں کا ذمہ دار انگریزوں کی

---

[1] PPR ص ۶۳ [2] مار زنگی، مار جلاجل Rattle-snake [3] شیر شرزہ یعنی شیر ژیان
[4] PPR ص ۶۴،

یشہ دوانیوں کو ٹھکرایا ہے،

چمن سوختہ

ریشہ ہاے صنوبر و شمشاد
پر و بال زیادی از بلبل
برگ خشکی سہ چار تا از گل
رہ پائی ز چند تن ستیاد

زیں علایم عیاں بود: کاینجا
...ئے بودہ شبہ نیست دریں
...ز اسوختہ ، زیں خونیں
... ا ز شکارچی برجا

رود سرخی میان آں جا...
سرخ از رنگ خونِ اہلِ چمن
ہر طرف جوقہ جوقہ زاغ و زغن
گاہ گاہی صداے از زار...

اے شگفتہ! ایں کدام باغ بدہ
...ہواے چنیں خوش و دلکش؟
...چنیں باغ را کہ زد آتش؟
...ش از چہ قتلِ عام شدہ؟

گرچہ ویرانہ ایست این گلزار
وانچہ ہم ماندہ، دو دازاں برپاست
لیک جاے ہم بود، پیدا است
پُر ز تاریخ و قدمت آثارا

گلشن ار سوختہ است و پژمردہ
بوے خویش ہنوز باقی ہست!
در بنا یش خراب گشتہ و پست
رونق از جلوہ، ز آسماں بردہ!

زیں علائم، بدون شبہہ، تمیز
میتواں داد: کاینچنیں صیاد
نیست جز انگلیس بدبنیاد
وایں چمن نیست غیر مصر عزیز![1]

حبیب یغمائی نے ایک نظم بچوں کے لئے "وطن" کے عنوان سے کہی ہے، جو سادگی و سلاست کی وجہ سے ایران کے قومی ترانہ کی حیثیت رکھتی ہے، بعض اشعار سنیئے:-

وطن

کشور ایراں کہ زید جاوداں   ہست وطن بہر ہمہ ایرانیاں
اہل وطن زادۂ ایں مادرند   یاور و غمخوار بیکدیگر اند
اے پسر با ادب ہوشیار   از دل و جاں خاکِ وطن دوست دار

---

[1] سخنوران ایران: جلد دوم ص ۳۱۱،

حبِ وطن مرد وفا آورد — حبِ وطن صدق و صفا آورد
حبِ وطن شیوهٔ نیکاں بود — حبِ وطن دیں بود ایماں بود
محترم ایں ملک چو مادر بدار — ہموطنِ خویش برادر شمار
در رہِ حفظِ وطنِ خویشتن — دل بکن از جان و تن خویشتن
تا بود نام بدت یادگار — یار باغیار مشو زینہار[۵۱]

عبدالعظیم خاں قریب نے اس نہج پر بچوں کے لئے ایک قومی ترانہ لکھا ہے، اس کی مقبولیت کی بنا پر اس کے گراموفون ریکارڈ بھی تیار کئے گئے ہیں، جسے ہر جگہ بڑے شوق سے سنا جاتا ہے، بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

وطن

کشورِ ما کشورِ ایران بود — مسکنِ شیران و دلیران بود
پادشہش کورش و دارا بود — چون جم و خسرو شہِ والا بود
پادشہ عادلِ انوشیروان — گشتہ پدید آوازهٔ عدلش جہان
رستم دستانِ جہان پہلوان — پست از و گشتہ سر سروران
بود حکیمش چو ابوذرجمہر — از دلِ روشن چو یکے ماہ و مہر
اے وطن اے حبِ تو آئینِ من — دوستیت کیشِ من و دینِ من
بیتو وجودِ من یک دم مباد — سایہ تو از سرِ من کم مباد
دولت و اقبالِ تو پائندہ باد — نامِ بلندت بجہان زندہ باد[۵۲]

محمد رضا خاں عشقی نے ایک اوپیرا "رستاخیز" کے عنوان سے لکھا ہے، جس میں ایران

---

۵۱ سخنوران ایران: جلد اول ص ۵۹، ۵۲ ایضاً ص ۳۲۳

کی گذشتہ عظمت اور شان و شوکت کا نقشہ بڑی چابک دستی سے کھینچا ہے، یہ اوپیرا روایتی اسلوب سے ہٹ کر جدید طرز پر لکھا گیا ہے اس لئے اسے بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا نظم کا پرخلوص لہجہ اور ماحول شاعر کی حب الوطنی پر شاہد ہے، خود عشقی نے اس اوپیرا کے بارے میں لکھا ہے "این اپیرا سے رستاخیز نشانہٴ پائے قطرات اشکے است کہ بروے کاغذ بعزاے فخر و بہاے نیاگان بدبخت ریختہ ام"[1]

۱۳۳۴ھ میں بغداد سے موصل جاتے ہوئے عشقی مداین کے کھنڈرات سے بیحد متاثر ہوا اور اس تاریخی شہر کی عظمت اور موجودہ بربادی کو اس خوبصورت اوپیرا کی صورت میں پیش کیا ہے۔ اوپیرا کے کردار میں عشقی، خسرو دخت، سیروس، داریوش، نوشیروان، خسرو، شیرین، اور زرتشت وغیرہ شامل ہیں، یہ تمام افراد یکے بعد دیگرے اسٹیج پر آتے ہیں، اور ایران کی سابقہ عظمت اور موجودہ تباہی و بربادی پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں، آخر میں زرتشت کی روح داخل ہوتی ہے، اور سلاطین و ناظرین سے مخاطب ہوکر انھیں بیداری کا پیغام سناتی ہے، افسوس ہے کہ اوپیرا کی طوالت اسے یہاں نقل کرنے سے مانع ہے،

کمالی اصفہانی بھی دور مشروطیت کی پیداوار ہے، اور اس کی بیشتر نظمیں حب الوطنی اور آزادی کے جذبات سے پر ہیں، "چکامہٴ وطنی" کے بعض اشعار ملاحظہ ہوں،

اے کشور عجم نہ چناں گشتہٴ خراب — کآبادی تو کس بتواں بیندی بخواب

گویند اہل فکر کہ اصلاح حال تو — شاید و لیک نیست طریقی جز انقلاب

برخیز مرد وار میاں بند اگر حیات — خواہی و پا گذار دلیرانہ در رکاب

آنرا کہ مرد در وطن نیست گو بمیر — زاں کش بعزرائے خرد نیست و تاب[2]

---

[1] دیوان عشقی: ص ۶۲، [2] سخنوران ایران جلد اول: ص ۴۴۳

نئی پود سے مخاطب ہو کر ایک نظم "به برادرزادهٔ من" کہی ہے اس میں اُن کے آبا و اجداد نے وطن کی آزادی، ترقی اور خوشحالی کے لئے جو جو قربانیاں کی ہیں، ان کی یاد دہانی کی ہے، ایک بند ملاحظہ ہو،

اے آنکہ زبعد ما نہی پا — در ملک وجود شاد و خندان
آباد چوں بنگری وزیبا — سرتا سراین سرائے ویران
چوں روئے نہی بکوہ و صحرا — آزاد و تراز ہوائے بستان
یاد آر زرنج و محنت ما — دیں حالت ہولناک ایران

تاگر شود ار پدر پسر ہم[1]

مرتضیٰ خان فرہنگ بھی انقلاب ایران کے سرفروشوں کی جماعت سے متعلق رہا ہے اور قید و بند کے مراحل سے گذر چکا ہے، پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب The Press and Poetry of Modern persia میں فرہنگ کی نگارشات کا ذکر کیا ہے، مرحوم خواجہ غلام الثقلین نے بھی اپنے سیاحت نامے میں انقلاب ایران کے سلسلے میں کئی جگہ فرہنگ کا ذکر کیا ہے اور اس کے اشعار نقل کئے ہیں[2] فرہنگ کی شاعری بھی وطن پرستی اور حریت پروری کے جذبات کی عکاس ہے "خاکِ ایران" کے عنوان سے ایک نظم ہے جس میں وطن کی عظمت کا ذکر کیا ہے، اور ہم وطنوں کو عمل اور حرکت کا پیغام دیا ہے بعض بند یہاں نقل کئے جاتے ہیں:

(۱)

تابندہ چو خورشید و فروزاں چو ستارہ
در صفحۂ پہناور این چرخ مقدب
اے آئینۂ شرق پدید از تو ہمارہ[3]

[1] Post Revolution Persian verse ص ۱۳۲ [2] سخنوران ایران ص ۴۱-۳۴۳ [3] ہموارہ۔

فرزند بلند اختر و مردانِ مہذب

از خلدِ بریں خوبتری اے چمنِ عشق
گہوارۂ علم و ہنری اے وطنِ عشق

(۲)

اے کعبۂ دل، قبلۂ جاں، منظرِ اشراق
اے موطنِ مردانِ ہنر پیشۂ مشہور
خاکم بدہاں سوزدت ایں سینۂ احراق
زاں آتشِ اسکندری اندر شبِ دیجور

یا روسپیان زیورِ تو بردہ بتاراج
بشکستہ شدہ اورنگ و بہم بزدہ شد تاج

(۳)

گر مرد ندارید بیائید زنی چند
گر داَمدہ سامانِ وطن را به نیو زاد[1]
آراستہ سازید و نشانید و تنی چند
کمشیدہ[2] کشد برکتِ[3] ظلم سپیئے داد

رستائی و شہری بشود پہلوی ایدون
در کوئے وطن علم و معارف شود افزون

---

[1] نظم و انتظام [2] خط بطلان [3] کشہ بروزن پشہ، اعلان و دستور،

(۴)

ا مردہ شما زندہ چنیں ملک نیاید
آں شوکت و آں عزت و رفعت ہمہ شد ہیچ
ایں خواب کہ مرگ است ازیں بیش نشاید
ترسم شود ت نالۂ ما در ہلہ پا ہیچ

یکبار بہوش آئی و بینی کہ اسیری
از ہند تو عبرت کن اگر مرد دلیری[1]

عبدالحسین خاں سپنتا نے بعض نظمیں کہی ہیں، جو وطنیت کے جذبات کی غماز ہیں، اُس کی رباعیاں شیرینی اور بلاغت کے لئے مشہور ہیں، ایک رباعی میں وطن کی محبت کا نقشہ بڑے لطیف اور دلنشیں پیرائے میں پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو،

وطن

گل گفت بگلدان: غم دیریں دارم
پژمردہ دلم، حالتِ غمگیں دارم
ہرچند کہ خانۂ بلوریں دارم
دور از وطنم خاطر خونیں دارم[2]

جدید ایرانی شاعری میں وطنیت کا یہ اجمالی خاکہ اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ ایرانی قوم اب جمود سے نکل کر عمل کی راہ پر گامزن ہے، ایران کی کلاسکی شاعری کم و بیش گل و بلبل اور زلف و سنبل کی رومانی یا مریضانہ داستان ہے، عربوں کے برخلاف جو سراپا عمل تھے، ایرانی خیال پرست الفاظ، اطاعت اور تعریف کے پرستار رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ایران میں لمبے لمبے بے معنی قصیدے اور طویل اکتا دینے والی مثنویوں کی بھرمار رہی لیکن دور مشروطہ میں، اور اس کے بعد ایرانی شاعری میں جو انقلاب آیا ہے، وہ

[1] سخنوران ایران ا ص ۴۳۳ [2] ص ۳۲۱ PPR،

بڑے دور رس نتائج کا حامل ہے، اور اس کی گونج ایرانی زندگی کے ہر شعبے میں سنائی دیتی ہے، وطنیت اور حریت کا تصور اگرچہ اُن کے لئے نیا نہیں ہے لیکن اب اس میں زیادہ توانائی، تازگی اور گیرائی آ گئی ہے، اب ایرانی سمجھ چکے ہیں کہ فطرتِ لہو ترنگ ہے، جل ترنگ نہیں، اسی لئے یہ دل وجگر کے خون سے سرمایۂ حیات حاصل کرتے ہیں، استبدادیت، اور غیر ملکی ریشہ دوانیوں کے صبر آزما دور میں، تیر و تفنگ اور توپوں کی سنسناہٹ اور گرج میں بموں کی بارش اور دار و رسن کی آزمایش میں بھی ان حرفروشوں نے اپنا پیغام قوم تک پہنچایا، صدیوں سے بے حس اور بے عملی کے دلدل میں پھنسے ہوئے عوام کو حرکت اور عمل کی راہ پر گامزن کیا، مجبور اور بیکس قوم کے سینے میں امید، عزم اور جوش کے دیئے روشن کئے، طاؤس و رباب سے منافرت سکھائی، اور شمشیر و سنان کو گلے لگانے کا جذبہ پیدا کیا، وطن کی عظمت اور انسان کی بزرگی کا رجز لکھا، اور یزدان و اہرمن کے فرق کو ذہن نشین کرایا،

فکر و فن کے لحاظ سے اگرچہ اُن کی نگارشات میں زیادہ گہرائی نہ مل سکے لیکن اُن کے خلوص اور جذبات کی صداقت میں کسی کو شبہہ نہیں، ان شاعروں نے اپنے گرد و پیش جو کچھ دیکھا اور جو کچھ محسوس کیا انھیں سادگی سلاست اور صداقت سے عوام تک پہنچا دیا، جو بجائے خود ایک بڑا فن ہے، اور یہی ایک نکتہ جدید ایرانی شاعری کو آفاقی اور غیر فانی بنانے کے لئے کافی ہے،

اک صدقِ مقال ہے کہ جس سے ۔۔۔ یہ چشم جہاں میں ہے گرامی[1]

---

[1] علامہ اقبال کا شعر بہ ادنیٰ تصرف،

باب التقریظ والانتقاد

الثقافۃ الاسلامیہ فی الہند

از مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی رفیق دارالمصنفین

یہ ایک کتاب کا نام ہے جو اس صدی کی ابتدا کے مشہور و معروف عالم اور سابق ناظم ندوۃ العلماء مولانا عبدالحئی الحسنی رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف ہے، جس کو ممالک اسلامیہ کے مشہور و ممتاز علمی ادارہ المجمع العلمی دمشق نے اپنی سابقہ روایت کے مطابق بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے، المجمع العلمی کے ساتھ مصنف کے خلف الصدق مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی بھی تمام اہل علم کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں، جن کی کوشش اور علمی و دینی اثر کی وجہ سے تیس چالیس برس کے بعد یہ قیمتی علمی ذخیرہ منصۂ شہود پر آیا ہے،

یوں تو مسلمان جس ملک میں بھی گئے وہاں کی تہذیب و تمدن اور علم و فن میں بیش بہا اضافہ کیا، ان خطوں کو جانے دیجئے جہاں سمٹک زبانیں بولی جاتی ہیں، وہاں کی تو انھوں نے دنیا ہی بدل دی مگر ان خطوں میں بھی ان کے تہذیبی اور ثقافتی آثار اور نقوش کافی نمایاں ہیں جہاں آریائی زبانیں بولی جاتی ہیں، ان میں خاص طور سے دو ملکوں پر ان کے اثرات بہت زیادہ پڑے ہیں، ایک ایران اور اس کے ملحقات، دوسرے ہندوستان اور اس کے متعلقات، ہندوستان میں مسلمان تقریباً بارہ تیرہ سو برس سے مستقل طور پر آباد ہیں، اور انھوں نے یہاں کی سیاست و حکومت کے ساتھ

تہذیب و ثقافت اور علم و فن کے ہر ہر شعبہ میں نمایاں حصہ لیا ہے، مگر افسوس ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور تمدنی تاریخ پر تو عربی، فارسی، انگریزی اور اردو میں سیکڑوں کتابیں لکھی گئیں، لیکن ان کی ثقافتی اور علمی تاریخ کا کوئی ایسا جامع تذکرہ اب تک نہیں لکھا گیا تھا کہ اس سے مسلمانوں کی علمی و فنی خدمات کا امتیاز بھی معلوم ہو سکتا، اور یہ بات تاریخی شہادت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ مسلمان اس ملک سے کچھ لینے نہیں بلکہ اس کو کچھ دینے آئے تھے، اور ہندوستانی مسلمانوں کے کردار کا اندازہ صرف ان کی سیاسی ہنگامہ آرائی ہی سے نہ لگایا جائے بلکہ ان کے کردار کی اصلی جھلک دینی، ثقافتی اور علمی زندگی میں تلاش کرنی چاہیے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے مصنف کو جنھوں نے آج سے تیس چالیس برس پہلے اس کا احساس کیا اور اس کمی و ضرورت کو پورا کر دیا، یہ کتاب آج سے بہت پہلے شائع ہونی چاہیئے تھی، مگر یہ ہماری علمی ناقدردانی تھی کہ اتنی مدت کے بعد شائع ہو سکی، یہ کتاب ہندوستانی مسلمانوں علمی و فنی کارناموں کی انسائیکلو پیڈیا ہے، اس میں عربی، فارسی اور اردو کی جتنی اہم کتابیں ہیں سب کا ذکر آگیا ہے، اس کتاب کو ہر کتبخانہ بلکہ ہر پڑھے لکھے گھر میں ہونا چاہیے، اگر اس کتاب کا مکمل نہیں تو کم از کم بعض حصے کا انگریزی، اور ہندی میں ترجمہ ہو جاتا تو اس سے ایک بڑی علمی ضرورت بھی پوری ہو جاتی، اور اس سے غلط فہمی کے بہت سے پردے بھی چاک ہو جاتے،

مصنف ایک دو نہیں بلکہ ایک درجن سے زیادہ محققانہ علمی و دینی کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں "گل رعنا"، "جنۃ المشرق" اور "نزہۃ الخواطر" سے اہل علم واقف ہو چکے ہیں، "الثقافۃ الاسلامیۃ" غالباً ان کی آخری تصنیف ہے، اور ان میں سب سے زیادہ تحقیقی اور علمی کتاب ہے،

مصنف کو خدا تعالیٰ نے اعلیٰ درجے کی تصنیفی صلاحیت عطا کی تھی، ان کی چند تصنیفی خصوصیات جو ان کی ہر کتاب میں نمایاں ہیں، ان میں اس عہد کے بہت کم مصنفین ان کے

سہیم و شریک ہیں، وہ خصوصیتیں یہ ہیں، محنت و تحقیق، جامعیت و سلامت فکر، اعتدال و ایجاز، حسن بیان اور لطف زبان، یعنی وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں، اس میں ڈوب کر لکھتے ہیں، اور موضوع کے تمام ضروری پہلوؤں کو پورے طور پر سمیٹ لیتے ہیں، کسی بات کے بیان کرنے میں خواہ اردو میں بیان کریں یا عربی میں ایجاز و اختصار سے کام لیتے ہیں،

پھر اس ایجاز کے ساتھ بیان میں اس قدر سلاست، روانی اور شیرینی ہوتی ہے کہ پڑھنے والی کی طبیعت اکتاتی نہیں، بلکہ لذت محسوس ہوتی ہے، خاص طور پر اس کتاب میں یہ خصوصیتیں اور نمایاں ہیں جن کی تفصیل یہ ہے،

کتاب میں کل ۴ ابواب اور ایک خاتمہ ہے، پہلے باب میں نو فصلیں ہیں جس میں علم الاشتقاق، فن لغت، نحو و صرف، فن بلاغت، فن عروض، علم ادب و انشا، فن تاریخ اور فن جغرافیہ پر جو کتابیں ہندوستان میں لکھی گئیں ان کی تفصیل ہے، دوسرے باب میں چھ فصلیں ہیں جن میں فقہ، اصول فقہ، حدیث، اصول حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، تصوف و سلوک اور علم کلام کی کتابوں کی تفصیل ہے، تیسرے باب میں بھی چھ فصلیں ہیں، جن میں بحث و مناظرہ، منطق و فلسفہ، ریاضی اور طبی تصنیفات کا ذکر ہے، ریاضی اور طب کے تمام شعبوں کی الگ تفصیل کی ہے، مثلاً جر اثقال میں مسلمانوں نے کیا کیا علمی و عملی کارنامے انجام دیے، جبر و مقابلہ، زمین کی پیمائش اور ہیئت میں کیا کیا کتابیں لکھیں اور رصدگاہوں اور اصطرلابوں وغیرہ کے سلسلہ میں انھوں نے کیا علمی و عملی نقوش قائم کیے ہیں، اسی طرح طب کے مختلف شعبوں، مفردات، قرابادین، اور حیوانات وغیرہ کے علاج میں انھوں نے کیا خدمات انجام دی ہیں، چوتھے باب میں ہندوستان کی اردو فارسی اور ہندی شاعری اور ان کے مشہور شعرا کا تذکرہ کیا ہے، عربی شاعری اور شعرا کا تذکرہ عربی ادب کے ذکر کے ضمن میں آگیا ہے، خاتمہ میں چار فصلیں ہیں، سب سے پہلی فصل میں، ان دینی کتابوں کے ترجموں کی تفصیل ہے جو ہندو یا عیسائی مذہب سے متعلق ہیں، اور جن کا

ترجمہ سنسکرت، عربی، فارسی یا ہندوستان کی کسی زبان میں ہوا، دوسری اور تیسری فصل میں تاریخی، اور ہندوستانی فلسفہ کی کتابوں کے ترجمہ کی تفصیل ہے اور چوتھی فصل میں طبی کتابوں کے تراجم کا ذکر ہے۔

مصنف جب کسی فن کی تصانیف یا تراجم کا ذکر کرتے ہیں تو پہلے اس فن کی ابتدا اور نشو ونما کی اجمالی تاریخ بیان کرتے ہیں، اور اس فن کی اہم تصانیف کا ذکر کرتے ہیں، اسکے بعد ہندوستان میں اس فن کی آمد یا ابتدا کا مختصر ذکر کرکے پھر اس فن پر ہندوستان میں جو کچھ کام ہوا ہے اس کو صدی کی ترتیب سے بیان کرتے ہیں،

مصنف کی محنت وتحقیق اور کتاب کی جامعیت کا پورا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے، جب آپ کسی فن کو بطور موضوع اختیار کریں، اور اس پر ہندوستان میں جو کچھ کام ہوا ہے، اس کی تلاش وتحقیق کے بعد ایک فہرست تیار کرلیں، اور پھر اس فہرست کو سامنے رکھکر اس کتاب کا مطالعہ کریں، مجھے یقین ہے کہ آپ کی اس مرتب کردہ فہرست میں کہیں نہ کہیں کوئی نقص ضرور نظر آجائیگا، خود راقم نے آج سے سات آٹھ برس پہلے "ہندوستان میں علم تفسیر" کے موضوع پر ایک مضمون لکھنے کا ارادہ کیا تھا اور عربی فارسی، اردو کے تمام متداول تذکروں کی ورق گردانی اور محنت وتحقیق کرکے اس پر مواد فراہم کیا تھا، اور ایک فہرست مرتب کرلی تھی، مگر سوء اتفاق سے مضمون لکھنے کی نوبت نہ آسکی، جب یہ کتاب سامنے آئی تو میں نے اپنے فراہم کردہ مواد پر نظر ڈالی، تو یقین ہوگیا کہ اگر یہ مضمون اس وقت لکھا جاتا تو ناقص رہ جاتا، گو اس فن کی بعض اہم تحریری یادگاروں کا ذکر مصنف کے قلم سے بھی رہ گیا ہے، مگر پھر بھی اس کی جامعیت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

مصنف کو اس کتاب کے مرتب کرنے کے لیے ہزاروں نہیں بلکہ بلا مبالغہ لاکھوں صفحات کا بالاستیعاب مطالعہ کرنا پڑا ہوگا، اور بقول علامہ شبلی شکر کے ان بکھرے ہوئے دانوں کو

نہ جانے کہاں کہاں سے چن کر انھوں نے مٹھائی کا یہ خوان تیار کیا ہوگا۔

ہندوستان میں عربی و فارسی نصاب تعلیم پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں وہ بالکل منفرد ہیں۔ اس سلسلہ میں ان کو کتنی عرق ریزی کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ خود ان کے اس بیان سے ہوتا ہے،

ولکن تصفحت کتبا کثیرۃ من تاریخ	میں نے بیشمار تاریخی کتابیں، شعرا کے تذکرے،
الملوک والشعراء وطبقات المشایخ	طبقات مشائخ، ان کے مکتوبات وملفوظات
ومکتوباتھم وملفوظاتھم	کی ورق گردانی کی اور سب معلومات جمع
واخذت شیئاً شیئاً منھا حتی	کرتا گیا، یہاں تک کہ اتنا مواد فراہم ہوگیا جتنا
احطت بما لم یحط بہ قبلی	اس سے پہلے کسی نے فراہم نہیں کیا تھا۔
وذالک من منن اللہ علی	اور یہ میرے اوپر خدا کا احسان ہے۔

اس کتاب کی دوسری خصوصیت سلامت فکر اور اظہار رائے میں اعتدال ہے، مولف انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع کے آدمی ہیں اور یہی زمانہ ہے جس میں مختلف مسلمان فرقوں اور گروہوں میں مناظرہ بلکہ مجادلہ کا بازار گرم تھا۔ مخالف گروہ یا فرقہ کا آدمی خواہ اپنے علم و فضل اور دیانت و تقوی میں کتنا ہی اونچا مقام کیوں نہ رکھتا ہو، دوسرے گروہ کا آدمی یہی نہیں کہ اس کا اعتراف نہیں کرتا تھا، بلکہ اس کی تفسیق و تکفیر تک میں اپنی زبان اور قلم کو ملوث کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا تھا، چنانچہ اس دور کی بیشتر علمی و دینی کتابوں میں اس کی جھلک نظر آئے گی، اس کشمکش کا بنیادی سبب جزئیات میں غلو اور اپنے مسلک سے مخالفت کرنے والے کے علم و فضل اور دیانت و تقوی کے اظہار میں بے اعتدالی تھی، جو عوام و خواص سب میں عام تھی، لیکن اسی بے اعتدال ماحول میں کچھ ایسے صاحب اعتدال اور

سلیم الفکر افراد بھی موجود تھے، جنھوں نے نہ صرف یہ کہ اس کشمکش میں کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ اس کے خلاف آواز بلند کی، ان ہی میں مولانا سید عبد الحئی رحمہ اللہ بھی ہیں، اسی سلامت روی اور اعتدال کی وجہ سے وہ مجلس ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم بھی بنائے گئے، جس کا ایک بنیادی مقصد اس کشمکش کو دور کرنا بھی تھا۔

مولف مرحوم نے اس کتاب میں اہل سنت والجماعت کے مختلف گروہوں اور ان کے مخالف فرقوں مثلاً شیعوں اور اسماعیلیوں اور غیر مسلموں کے مختلف فرقوں کے علمی کاموں کا ذکر کیا ہے، مگر انکا قلم حد اعتدال سے شاذونادر ہی ہٹا ہے، جو جس قدر تعریف کا مستحق ہے اس کی اسی قدر تعریف کی ہے، اور جس کی جو چیز قابل تنقید و مذمت ہے اس پر اسی قدر تنقید اور مذمت کی ہے، مثال کے طور پر ہم دو چار مقامات کی عبارتیں پیش کرتے ہیں، گو تبصرہ لمبا ہو رہا ہے مگر اپنے اس تاثر کو بے دلیل چھوڑ دینے کی صورت میں ناظرین تشنگی محسوس کریں گے، اس لیے دو تین مثالیں پیش کرتا ہوں،

گیارہویں صدی سے پہلے، یہاں فقہ، اصول فقہ، منطق و فلسفہ کے ساتھ غیر معمولی شغف اور حدیث سے بے اعتنائی تھی، اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

فکان الفقه واصوله معيار	فقہ و اصول فقہ کا حصول اس عہد میں
الفضيلة لاهل هذه الطبقة	اسی طرح معیار فضیلت بنا ہوا تھا،
كما ان المنطق والحكمة معيارها	جس طرح منطق و فلسفہ معیار
فی هذا الزمان (ص ۱۲)	فضیلت تھا،

حدیث سے بے اعتنائی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ورفض عرض الفقه على	فقہ کو کتاب وسنت پر پیش کرنے اور

الکتاب والسنۃ وتطبیق المجتہدات بالسنن الماثورۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم وکان قصاری نظرھم فی الحدیث مشارق الانوار للصغانی فان ترفع احد الی مصابیح السنۃ للبغوی ظنوا انہ قد وصل الی درجۃ المحدثین وما ذالک الا لجہلھم بالحدیث (ص ۱۲)

مجتہدات کو سنن ماثورہ کے ساتھ تطبیق دینے کا کام بالکل ختم ہوگیا تھا، اور ان کی نظر علم حدیث میں صرف مشارق الانوار صغانی تک محدود ہوکر رہ گئی تھی، اگر کسی کی رسائی مصابیح السنۃ بغوی تک ہوگئی تو اس کو لوگ مرتبۂ محدثیت پر فائز سمجھتے تھے اور یہ سب کچھ حدیث سے ناواقفیت کی بنا پر تھا۔

پھر اس سلسلہ میں شیخ عبد الحق محدث دہلوی، اور خانوادۂ ولی اللہی کی خدمات کو سراہا ہے، نظام الدین سہالوی رحمہ اللہ کے مرتب کردہ درس نظامیہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ولہذا یحصل للطلبۃ بعد دراستہم لذالک قوۃ المطالعۃ ودقۃ النظر والاستعداد لتحصیل الکمالات العلمیۃ وان کانوا لا یکملون بالفعل

اس درس سے طلباء میں قوت مطالعہ، دقت نظر اور علمی مہارت اور کمال کے حصول کی استعداد پیدا ہوجاتی تھی، اگرچہ وہ بالفعل کامل وماہر نہیں ہوتے تھے۔

لیکن اسی کے ساتھ درس نظامیہ میں جو نقص ہے اس پر بھی بحث کی ہے، اٹھارہویں صدی کے آخر اور انیسویں صدی کے شروع میں کتاب وسنت سے براہ راست اخذ واستفادہ اور احیائے سنت کا جو جذبہ سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور خانوادۂ ولی اللہی کی سعی مشکور سے پیدا ہوا، اس کے نتیجہ میں فقہ وحدیث کے مختلف مکاتب فکر پیدا ہوگئے جن میں سے بعض تو

اعتدال پر قائم رہے اگرچہ بعض افراط و تفریط کا شکار ہو گئے، ان سب کی مختصر تفصیل مولانا نے کی ہے ہندوستان میں حنفی و شافعی مسلک کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ہندوستان کے عام لوگ قدیم زمانہ سے امام ابو حنیفہ کے مسلک کے پیرو ہیں، البتہ بعض ساحلی علاقے مثلاً مدراس، مالابار، کوکن وغیرہ میں شافعی المسلک بھی ملتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں زیادہ تر اہل یمن اور اہل حجاز آئے جو عام طور پر شافعی ہوتے تھے اور ان کے اثر سے یہ بھی شافعی المسلک ہو گئے، اس کے بعد ان ہی مقلدوں میں سے کچھ اہل علم پیدا ہوئے جنھوں نے کسی متعین فقہی مسلک کو ترک کر کے براہ راست کتاب و سنت سے تمسک کیا، لیکن ان میں مختلف گروہ ہو گئے تو ان میں جن لوگوں نے افراط و تفریط کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی، انھوں نے یہ رائے دی کہ اگر کوئی عالم براہ راست کتاب و سنت سے استفادہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسے اپنے امام کے کسی قول کے خلاف کوئی روایت مل جاتی ہے تو اس صورت میں کسی خاص امام کی تقلید کرنی جائز نہیں ہے بلکہ اسے روایت پر اعتماد کرنا چاہیے گو فی نفسہ تقلید امام جائز ہے، اس لیے اس کو جائز نہ قرار دیا جائے تو عام لوگوں کو بڑی زحمت پیش آئے گی، یہی مسلک شاہ ولی اللہ دہلوی کا، اور ان کے پوتے شاہ اسمٰعیل شہید اور سید احمد شہید کے اکثر متبعین کا تھا،

ان میں بعض لوگوں نے تقلید کو حرام قرار دیا، اور صرف کتاب و سنت کے صریح احکام کی پابندی کو واجب قرار دیا اور قیاس اور اجماع کو بالکل باطل قرار دیا، یہ مسلک مولوی فاخر بن یحییٰ عباسی، شیخ نذیر حسین، جواد علی دہلوی، نواب صدیق حسن اور ان کے اتباع کا ہے، ان ہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جنھوں نے حرمت تقلید میں حد درجہ افراط سے کام لیا اور حد سے گزر گئے، مقلدین کو بدعتی قرار دیا اور ان کو اہل اہواء میں داخل کیا، ائمہ کے

اور سخت تنقید کی ہے یہ مسلک شیخ عبد الحق بنارسی اور شیخ عبد اللہ الہ آبادی وغیرہ کا تھا۔"

یہ تو متبعین حدیث کا حال تھا، اہل تقلید کے بارے میں لکھتے ہیں:

"احناف میں بھی دو قسم کے لوگ تھے، ایک تو وہ لوگ تھے جنھوں نے تحقیق و انصاف سے کام لیا، مثلاً علامہ بحر العلوم عبد العلی بن نظام الدین لکھنوی صاحب رسائل الارکان اور مولانا عبد الحئی بن عبد الحلیم صاحب التعلیق الممجد وغیرہ اور ان ہی میں بعض نہایت ہی سخت قسم کے جامد مقلد تھے، جیسے شیخ فضل رسول اور ان کے اتباع۔"

اسی طرح انھوں نے تصوف اور شیعیت وغیرہ کے بارے میں نہایت ہی متوازن اور صائب رائے دی ہے، خاص طور پر تصوف کے بارے میں یہ رائے دیکر انھوں نے اس پر بہت اچھا تبصرہ کر دیا ہے۔

علمائے امت میں بعض لوگوں نے تصوف اور اہل تصوف پر تنقید کی ہے، اور بعض نے اس کو پسند کیا ہے لیکن اس کے رد و قبول کرنے کے سلسلہ میں دلیل و حجت کچھ زیادہ سود مند نہیں ہے، ایک خالص ذوقی اور وجدانی چیز ہے،

ایجاز و لطف بیان اس کتاب کی تیسری اور چوتھی خصوصیت ایجاز اور لطف بیان ہے، ادب اور محاضرات کی کتابوں میں تو ان خوبیوں کو نباہ لے جانا آسان ہوتا ہے لیکن خالص علمی کتابوں میں دونوں خوبیوں کو یکجا کرنا مشکل ہوتا ہے۔

ہندوستان میں جو ادبی کتابیں لکھی گئیں، ان میں عام طور پر حریری کے مصنوعی طرز تحریر کی نقل کی گئی، اور جو کتابیں علوم و فنون پر لکھی گئیں ان میں یا تو پیچیدہ اور منطقیانہ رنگ اختیار کیا گیا یا پھر کان اکون والی ہندوستانی عربی لکھی گئی، اس سے جو لوگ مستثنیٰ تھے، ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ ان سب کے سرخیل ہیں، شاہ صاحب کے بعد اور آج سے تیس برس پہلے

کے جن علما کی عربی تحریروں کو بطور نمونہ پیش کیا جا سکتا ہے، راقم کے نزدیک ان میں مولانا عبدالحئی کا علم نام سرفہرست ہوگا، طوالت کا خیال ہے ورنہ ہم انکی تحریروں کے مختلف ٹکڑے نقل کر کے ناظرین کو بھی اس لطف میں شریک کرتے، اسکا کچھ اندازہ تو اوپر کی بعض عبارتوں سے بھی ہو گیا ہوگا، مگر اسکے لیے خاص طور پر اس کتاب کے ابتدائی ۱۶ صفحے اور ہر باب کی تمہید کا مطالعہ کرنا چاہیے،

اپنی جامعیت کے باوجود کتاب میں بعض کمیاں ہیں جو پوری ہو جائیں تو یہ کتاب مسلمان عہد کی ہندوستانی تصانیف کی دوسری کشف الظنون بن جاتی،

اس کتاب میں تفسیر کی بعض قدیم اور بعض جدید کتابوں کا ذکر مصنف کے جامع قلم سے رہ گیا ہے، خاص طور پر سندھی زبان میں قرآن کے سب سے پہلے ترجمہ کا ذکر مصنف نے نہیں کیا ہے جس کے بارے میں بزرگ ابن شہریار نے لکھا ہے کہ سندھ کے ایک ہندو حاکم نے ایک ہندوستانی عالم سے یہ فرمایش کی تھی کہ وہ قرآن کی تفسیر ہندی (سندھی) میں کر دیں،

بعض اور تفسیر کی کتابوں کا ذکر رہ گیا ہے، اسی طرح قرآن کی کئی اردو لغت کی کتابوں کا ذکر بھی نہیں ہو سکا ہے، ان میں ایک مولانا محمد سلیم صاحب کی تیسیر القرآن وتسہیل الفرقان ہے جو پہلی بار ۱۲۶۰ھ میں چھپی اور دس برس میں اس کے کئی اڈیشن نکلے، دوسری کتاب میر حسن کی انفس النفائس ہے اور جو پہلی بار ۱۲۶۱ھ میں چھپی، تیسری کتاب مولوی اوحدالدین صاحب بلگرامی کی منتخب النفائس ہے جو پہلی بار ۱۲۷۱ھ میں چھپی،

انکے علاوہ بعض دوسرے فنون کی بعض اہم کتابوں کا ذکر بھی اس میں نہیں ہو سکا ہے، اس سلسلہ میں راقم کا مشورہ ہے کہ آیندہ اڈیشن میں کتاب کا ایک ضمیمہ بھی شائع کیا جائے جس میں مصنف کے بعد سے ابتک جو اہم علمی کتابیں لکھی گئی ہیں ان کا ذکر آجائے،[۱] نیز اسی کے ساتھ کتاب کا ایک مفصل انڈکس بھی ہونا چاہیے جس میں مصنفین اور کتابوں کے اسماء کا حروف تہجی کے اعتبار سے علحدہ علحدہ ذکر ہو، اس سے کتاب سے فائدہ اٹھانے میں بڑی آسانی ہو جائے گی،

---

[۱] معلوم ہوا ہے کہ مولانا ابوالحسن علی صاحب ندوی کی نگرانی میں مولوی شبیر عطا ندوی نے اس کا ضمیمہ تیار کر لیا ہے جو مولانا زکریا صاحب شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر العلوم کی نظر ثانی کے بعد پریس میں جا چکا ہے۔

مطبوعاتِ جدیدہ

دین و شریعت - از مولانا محمد منظور نعمانی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۸۸ مجلد مع گرد پوش، قیمت سے، پتہ: کتبخانہ الفرقان کچہری روڈ، لکھنؤ۔

یہ کتاب مصنف کی چند تقریروں کا مجموعہ ہے، جو نظرِ ثانی اور اضافوں کے بعد کتابی شکل میں شائع کی گئی ہے، اس میں دین و شریعت کے بنیادی اصول یعنی ایمانیات و اعتقادات، عبادات، معاملات، اخلاق اور حکومت و سیاست و تصوف و احسان سے بحث کی گئی ہے اور ان کی اہمیت و ضرورت اور ان سے متعلق ضروری باتوں کا ذکر کیا گیا ہے، غیر موثر اور بے روح عبادات کو خالص اور موثر بنانے کے طریقے بتائے گئے ہیں، ایک باب میں دین کی خدمت و نصرت کی مختلف صورتوں دعوت الی الخیر، امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تبلیغ و ارشاد، تعلیم و تربیت اور قتال فی سبیل اللہ کا ذکر ہے، حکومت و سیاست کے باب کا وہ حصہ خاص طور سے زیادہ مفید ہے، جس میں غیر اسلامی ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کے مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے، فاضل مصنف دینی بصیرت اور اسلام کی خدمت کا مخلصانہ جذبہ رکھنے کے ساتھ اس دور کے حالات اور تقاضوں سے بھی باخبر ہیں، اس لیے ملحدین اور اہل زیغ و ضلال کے شکوک و شبہات اور مغالطوں کا جواب بھی دیتے گئے ہیں، اس لیے یہ کتاب ہر حیثیت سے بڑی قابل قدر ہے، مصنف کے پختہ قلم اور موثر اسلوب تحریر نے اس میں مزید دلنشینی اور تاثیر پیدا کر دی ہے، جس سے ایمان میں تازگی اور عمل میں درستگی

پیدا کی ہے، یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس سے اوسط درجہ کے پڑھے لکھے لوگ فائدہ اٹھائیں،

اردو میں تنقید - از ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۸۷ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت عہ، پتہ ادارۂ فروغ اردو، لکھنؤ،

یہ لائق مصنف کے چند مضامین کا مجموعہ ہے، جن میں آزاد، حالی، شبلی اور عبد الحق کی تنقیدی مساعی کا جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کے متعلق اظہار خیال کیا گیا ہے، شروع میں ایک مختصر مقدمہ اور آخر میں "اردو تنقید کا مستقبل" کے عنوان سے ایک مقالہ ہے جس میں کلیم الدین احمد صاحب سے اردو تنقید کے خوشگوار مستقبل کی امید وابستہ کی گئی ہے، مصنف نے اگرچہ مذکورۂ بالا ناقدین کی تنقیدی خدمات کی داد دی ہے، اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا ہے، مگر ان کی خوبیوں کے مقابلہ میں خامیوں کو زیادہ نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ان کی تحریر میں اعتدال و توازن قائم نہیں رہ سکا، اور تنقید کا لہجہ جابجا درشت ہو گیا ہے، آزاد اور شبلی کے خیالات سے کسی کو لاکھ اختلاف ہو مگر ان کے علمی و ادبی خدمات اور ان کی عظمت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا، جس کا اعتراف خود مصنف کو بھی ہے، اس لیے ایسے اساطین ادب کے مقابلہ میں اس قسم کا لہجہ مناسب نہیں ہے، مگر مصنف کے حسن نیت میں شبہہ نہیں، انھوں نے تلاش و محنت سے یہ کتاب لکھی ہے، اور اس سے ان کی جدت و ذہانت کا پتہ چلتا ہے،

لغات القرآن جلد ششم } تالیف مولانا سید عبد الدائم الجلالی، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت معیاری، صفحات ۳۲۴ مجلد مع گرد پوش، قیمت صہ، غیر مجلد للعہ

ناشر ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد دہلی،

اس مفید کتاب کے پانچ حصے پہلے شائع ہو چکے ہیں جن پر معارف میں ریویو کیا جا چکا ہے، اس آخری حصہ میں بھی وہ خصوصیات موجود ہیں جو پہلی جلدوں میں تھیں، اللہ تعالیٰ ناشر اور مولف کو اس خدمت قرآنی کا اجر اور مسلمانوں کو اس سے استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔

"ض"

سلسلہ تابعین و تبع تابعین رضؓ

اہل کتاب صحابہ و تابعین رضؓ

شروع میں عرب کے یہود و نصاریٰ کی قدیم تاریخ اور اُن کے تمدنی و سیاسی اثرات اور اُن کی دینی و اخلاقی حالت کی تفصیل اور اس کے بعد حروفِ تہجی کے اعتبار سے (۹۲) اہل کتاب صحابہ اور تابعین اور اُن کے بعد صحابیات اور تابعات کا تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے، مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

ضخامت ۲۷۵ صفحے قیمت: للعہ

تابعین رضؓ

اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حسن بصریؒ، اویسؒ قرنی، امام زین العابدینؒ، سعید بن مسیبؒ، محمد بن سیرینؒ ابن شہاب زہری، اور قاضی شریح وغیرہ وغیرہ، اکابر تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور علمی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

طبع دوم ضخامت ۵۵۶ صفحے قیمت ہیر

تبع تابعینؒ

(حصّہ اوّل)

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں جس طرح صحابۂ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے اور صحابۂ کرام کے بعد اُنہی کی زندگی ملتِ اسلامیہ کے لئے نمونۂ عمل بنی، بالکل اسی طرح تابعین کرامؒ کے جانشین اور اُن کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، سیر الصحابہ کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین تابعینؒ کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کر چکا ہے اب اُس نے اُن کے بعد کے مقدس آب بزرگوں اور ائمۂ دین کا مرقع تیار کرایا ہے، اس کے دو حصّے ہیں، پہلے حصّہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور اُنکے فقہی مسلک کے داعی و علمبردار امام ابو یوسفؒ امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں اور فقہی اجتہادات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی حصّہ اول ضخامت صفحے

قیمت:

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دو کتابیں

خطباتِ مدراس

یہ وہی خطبات ہیں جو سید صاحب مرحوم نے ۱۹۲۵ء میں مدراس میں سیرۃ نبوی کے مختلف پہلوؤں پر دیئے تھے، یہ اپنے معلومات کی وسعت، مباحث کی ندرت اور افادہ کے لحاظ سے سیرۃ کی ضخیم کتابوں پر بھاری اور سیرۃ کے مقررین کے لئے بہت کارآمد ہیں دار المصنفین نے اس کا نیا اڈیشن بڑے اہتمام و نفاست سے تیار کرایا ہے ضخامت: ۱۸۲ صفحے، قیمت سے ر

رحمتِ عالم

مولانا سید سلیمان ندوی نے رحمتِ عالم کے نام سے سیرۃ پر نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں ایک ا[illegible] چھوٹا سا رسالہ لکھا تھا جو بہت مشہور و مقبول ہوا بعض مدارس کے نصاب تعلیم میں بھی شامل کر لیا گیا اس رسالہ کو مطبع معارف نے نہایت اہتمام سے د[illegible] چھاپا ہے یہ رسالہ پاکستان میں مکتبۃ الشرق آرام باغ کراچی سے بھی مل سکتا ہے ضخامت: ۱۰۰ صفحے قیمت ۱۲ر

(دار المصنفین کی نئی کتاب)

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

یہ تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی، اور معاشرتی تاریخ ہے اس میں اس عہد کے ہندو مسلمان مورخین کی کتابوں اور مضامین کے وہ تمام اقتباسات جمع کئے گئے ہیں جن سے اس عہد کے سیاسی، اقتصادی، تجارتی، تمدنی اور معاشرتی حالات معلوم ہوتے ہیں پھر مسلمانوں کی تاریخ کے روشن پہلو ہندو مورخوں کی زبان سے اور ہندوؤں کے علمی کارنامے مسلمان مورخوں کے قلم سے نقل کئے گئے ہیں جن کو مربوط طور پر پہلی مرتبہ اردو میں پیش کیا گیا ہے۔

ضخامت: [illegible] صفحے قیمت: [illegible]

مرتبہ سید صباح الدین عبد الرحمن ایم اے علیگ

جسٹرڈ نمبر ا۰۲۵

اگست ۱۹۵۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

تاریخ دعوت وعزیمت حصّہ دوم

یعنی

علّامہ ابنِ تیمیہؒ کے سوانح حیات

اس میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ تقی الدین ابن تیمیہ حرانی کے سوانحِ حیات، اُن کے صفات و کمالات، اُن کی علمی و تصنیفی خصوصیات ان کا تجدیدی واصلاحی کام اور مقام اور اُن کی اہم تصنیفات الجواب الصحیح، منہاج السنۃ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ کا مفصّل تعارف اور اُن کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ، ابن الہادی، ابن کثیر اور حافظ ابنِ رجب وغیرہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ضخامت ۳۹۲ قیمت : ۸ر

مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی

قیمت .... ے ر

جلد ۸۴ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۹ء نمبر ۲

مضامین

شذرات

ہندوستان کی تقسیم کے بعد سے یہاں کے دینی مدارس اور اسلامی ادارے جن مشکلات میں مبتلا ہیں، وہ سب پر عیاں ہے، مگر یہ شکر و مسرت کا مقام ہے کہ ان مخالف حالات میں بھی الحمدللہ دارالعلوم ندوۃ العلماء روز افزوں ترقی پر ہے، اسکی تعلیمی شہرت ہندوستان سے نکل کر بیرونی دنیا تک پہنچ گئی ہے، چنانچہ اس وقت دارالعلوم میں مختلف اسلامی بلکہ خاص عرب ملکوں کے بہت سے طلبہ زیر تعلیم ہیں، عام طلبہ کی اتنی کثرت ہوگئی ہے کہ پرانی اقامت گاہیں ان کے لیے ناکافی ہو رہی ہیں اور شبلی ہوسٹل کی وسیع عمارت کو دو منزلہ کیا جا رہا ہے، اس کا ایک حصہ رواق رحمانی کے نام سے بن چکا ہے اور دوسرے حصہ رواقِ سلیمانی کی تعمیر عنقریب شروع ہونے والی ہے، اساتذہ کے لیے چند کوارٹر بن گئے ہیں، دارالعلوم کی ترقی کے منصوبوں کو پورا کرنے کے لیے تنظیم و ترقی کے نام سے ایک مستقل شعبہ قائم کیا گیا ہے جو نہایت مستعدی اور سرگرمی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے،

دینی اصلاح و ترقی کے لیے یہ سند کافی ہے کہ دارالعلوم تبلیغی جماعت کا ایک اہم مرکز ہے۔ ابھی حال میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام کے نام سے ایک شعبہ قائم کیا گیا ہے جس کا مقصد ایسا اسلامی لٹریچر پیدا کرنا ہے، جو موجودہ مادی و لادینی تہذیب کے پیدا کردہ فتنوں اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے ذہنی ارتداد کا تدارک اور ان میں ایمان و یقین کا نور پیدا کر سکے، اور جدید نسل کے دماغوں کی تسکین کا سامان فراہم اور عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور جو غیر مسلم اسلام کی حقیقت کو سمجھنا چاہیں ان کے سامنے اسکی صحیح تصویر پیش کر سکے، اس فرض کفایہ میں شرکت ان تمام اصحابِ علم و قلم کا فرض ہے جو اس کام کی اہمیت رکھتے ہیں،

دار العلوم کے بعض تعلیم یافتہ نوجوان کچھ عرصہ سے البعث کے نام سے عربی کا ایک رسالہ نکال رہے ہیں، یہ ہندوستان میں تنہا عربی کا علمی و دینی رسالہ ہے جو عرب ملکوں میں بھی وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور وہ ان ملکوں سے ربط و تعلق اور ان میں دار العلوم کے اغراض و مقاصد کی تبلیغ و اشاعت کا موثر ذریعہ ہو سکتا ہے، اس لیے دار العلوم عنقریب اس رسالہ کو اپنی تحویل میں لینے والا ہے، خوبصورت ٹائپ کا ایک پریس قائم کیا گیا ہے جس میں کتابیں چھپنے لگی ہیں، اور ابھی اسکی مزید توسیع و ترقی پیش نظر ہے، غرض اس وقت دار العلوم ہر حیثیت سے الحمد للہ ترقی پر ہے اور یہ سب ہماری جماعت کی لائق فخر شخصیت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سلمہ اللہ تعالیٰ کے اخلاص و للٰہیت کا فیض ہے، ندوہ کے خدام و متوسلین کا جو کام ہے اس کو وہ پورا کر رہے ہیں، مگر اسی کے ساتھ مسلمان قوم کے بھی کچھ فرائض ہیں، سر دست رواق سلیمانی کی تعمیر اور بعض ضروریات کے لیے سرمایہ کی بڑی ضرورت ہے، ہم کو توقع ہے کہ مسلمان اصحاب ثروت اس کار خیر میں پوری مدد دیں گے۔

مسلم یونیورسٹی مسلمانوں کا محض تعلیمی نہیں بلکہ قومی و ملی ادارہ بھی ہے، اس لیے اس کا شعبۂ دینیات باوقار ہونا چاہیے، اس کا کام محض مقررہ نصاب پڑھا دینا نہیں بلکہ یونیورسٹی میں دینی فضا اور دین کا وقار قائم کرنا بھی ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب خود یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اسکی جانب توجہ کریں، شعبۂ دینیات کو پوری اہمیت دیجائے اور اس کے لیے ایسے اساتذہ کا انتخاب کیا جائے جنکی علمی و دینی شہرت مسلّم ہو، ہم کو خوشی ہے کہ اب اس شعبہ کی صدارت کے لیے ہمارے فاضل دوست مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی کا انتخاب کیا گیا ہے جن میں وہ تمام اوصاف و شرائط موجود ہیں، جو اس عہدہ کے لیے درکار ہیں، اس سے نہ صرف اس شعبہ کا وقار قائم ہوگا بلکہ یونیورسٹی کی علمی و دینی فضا پر بھی اس کا اثر پڑے گا، شعبۂ فارسی کے ریڈری کے لیے ڈاکٹر نذیر احمد صاحب کا انتخاب بھی نہایت موزوں و مناسب ہے، وہ صحیح معنوں میں اسکالر ہیں، علم کا سچا ذوق رکھتے ہیں اور مرد مسلمان بھی ہیں، اور آیندہ محققین کی صف میں وہ ایک ممتاز مقام حاصل کریں گے۔

مسلم یونیورسٹی کو ایسے اساتذہ نہیں چاہئیں جن کا مایۂ فخر محض ڈگریاں، نمود و نمایش کی زندگی اور

اپنی دینی و ملی روایات سے آزادی و بیزاری ہو، بلکہ ایسے اساتذہ کی ضرورت ہے جو علم کا صحیح ذوق رکھنے کے ساتھ قومی و ملی جذبہ بھی رکھتے ہوں، اور جن کی زندگی علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے نوجوانوں کے لیے نمونہ ہو،

سرسید احمد خاں نے جس زمانہ میں علیگڈھ کالج قائم کیا ہے، اس زمانہ میں کالجوں کی کمی نہ تھی، مگر ان کی تعلیم، ان کا مقصد اور ان کا ماحول مسلمانوں کی ملی ضروریات کے مطابق نہ تھا، اور سرسید احمد خاں کی دوربین نگاہ نے دیکھ لیا تھا کہ ہندوستان جس راہ پر جا رہا ہے اگر اس میں مسلمانوں کی جدید تعلیم کے ساتھ ان کی ملی خصوصیات کے تحفظ کی طرف توجہ نہ کی گئی تو ان کا قومی وجود ختم ہو جائے گا، اسی مقصد کے لیے انھوں نے مسلمانوں کے لیے الگ کالج قائم کیا تھا، حالانکہ جس زمانہ میں کالج قائم ہوا ہے اس زمانہ میں اگرچہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہو چکی تھی، مگر انکی ایک حیثیت قائم تھی، اور ان کی تہذیبی خصوصیات بھی بہت کچھ باقی تھیں، اور اب آزاد ہندوستان کے مستقبل کا جو نقشہ ہے اور مسلمان جن حالات سے گذر رہے ہیں، ان میں ان کے لیے سرسید احمد خاں کے زمانہ سے کہیں زیادہ خطرات ہیں، اس لیے مسلم یونیورسٹی کو اس کی ملی خصوصیات پر قائم رکھنے کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے،

یہ نہیں کہا جاتا کہ یونیورسٹی سے پرانی خصوصیات بالکل ختم ہو گئی ہیں یا وہ دینی و ملی جذبہ رکھنے والے اساتذہ سے بالکل خالی ہے، لیکن ان کے ایک طبقہ میں دین و ملت سے آزادی کے جو رجحانات پیدا ہو رہے ہیں اور جس کا اثر طلبہ پر بھی پڑتا ہے، وہ یونیورسٹی کی روح اور اس کے مقاصد کے سراسر خلاف ہیں، اور ان کو روکنے کی سخت ضرورت ہے، ورنہ اگر اس کی اصل روح ختم ہو گئی تو مسلمانوں کے لیے اس میں اور دوسری یونیورسٹیوں میں کوئی فرق نہ رہ جائیگا،

مقالات

امام حسن بن محمد الصغانی لاہوری

از جناب مولانا عبد الحلیم صاحب چشتی فاضل دیوبند

(۷)

رضیہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے صغانی کو ہندوستان کا قیام پسند نہیں رہا اور آپ ۶۳۴ھ میں حج کے ارادہ سے حجاز روانہ ہوگئے، یہ بات وثوق سے تو نہیں کہی جا سکتی کہ آپ نے اسی سال حج کیا یا ۶۳۵ھ میں یہ سعادت نصیب ہوئی، لیکن اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ صفر ۶۳۵ھ تک آپ کا قیام حجاز ہی میں رہا، کیونکہ آپ نے یہیں رہ کر تکملۃ الصحاح کو مکمل کیا تھا، آستانہ (ترکی) میں صغانی کے قلم کا لکھا ہوا تکملۃ الصحاح کا جو نسخہ محفوظ ہے اس کے خاتمہ پر تحریر ہے،

فرغ من تالیفه امام بیت الله	مولف اس تکملہ کی تالیف سے بیت اللہ شریف
الحرام صبیحة یوم الجمعة وقت	کے سامنے صبح کو جمعہ کے دن بیت اللہ کا
فتح باب بیت الله الحرام العاشر	دروازہ کھلنے کے وقت دس صفر ۶۳۵ھ
من صفر سنة خمس وثلاثین	کو فارغ ہوا،

له ملاحظہ ہو تہذیب الصحاح (مقدمہ از عبد الغفور عطار طبع دار المعارف مصر ۱۳۷۱ھ ص ۹۴ وصحاح اللغۃ للجوہری (مقدمہ احمد عبد الغفور عطار) دار الکتاب العربی مصر ۱۹۵۶ء ص ۱۲۹

صحاح جوہری کا تکملہ پورا کرنے کے بعد حجاز سے ہندوستان واپس آگئے،

اسلام نے چونکہ عورت کو امام اور خلیفہ کے اختیارات کا مستحق قرار نہیں دیا ہے، اس لیے اہل علم نے رضیہ کی حکمرانی کو کبھی اچھی نظروں سے نہیں دیکھا، اسی لیے صغانی کو بھی یہاں کا قیام پسند نہ تھا، چنانچہ اس کے تخت شاہی پر متمکن ہونے کے بعد ہی یہاں سے رستگاری کی تدبیریں شروع کر دیں لیکن رضیہ نے برسراقتدار ہونے کے بعد خلافت بغداد سے تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہیں آنے دیا تھا، اس لیے آپ کی خواہش کے باوجود آپ کو بغداد نہیں بلایا گیا، مگر صغانی یہاں کا قیام اپنے لیے ایک قید خانہ سے کم نہ سمجھتے تھے، (جیسا کہ آیندہ اشعار سے معلوم ہوگا) یہاں سے نکلنے کے لیے اپنے فرزندوں کو بھی لکھا، انھوں نے بھی کوششیں کیں مگر کامیاب نہ ہوسکے، اور خلیفہ مستنصر باللہ نے ان حالات میں آپ کو بغداد بلانا غالباً مصلحت کے خلاف سمجھا اور یونہی ڈیڑھ دو برس کی مدت گذر گئی، اس کے بعد ۶۳۷ھ میں آپ کو بغداد بلایا گیا، ان حالات سے متاثر ہوکر صغانی نے ۹۵ شعروں کا ایک قصیدہ لکھا، جو ہندوستان کی سرزمین میں عربی زبان میں ادبی طرز کا واحد قصیدہ ہے، اس میں صنائع لفظیہ و معنویہ اور الفاظ عربیہ کے باوجود یہ خوبی ہے کہ اس میں آپ نے اپنے حالات قلمبند کیے ہیں، زمانہ کی سازگاری اور ناسازگاری کو بیان کیا ہے، اور شاعرانہ انداز میں آپ بیتی لکھی ہے، یہ پورا قصیدہ تجنیس[1] میں ہے اس لیے کچھ اشعار نمونۃً نقل کیے جاتے ہیں

(۱) انسانی الدهر اعطانی داوطانی وحطنی ووهاد الخسف اوطانی

زمانہ نے (میرے دل سے) میرے وطن اور میری نشست گاہوں (کی یاد) کو بھلا دیا اور مجھے قعر ذلت میں گرا کر روندا ہے،

---

[1] صنائع لفظیہ کے اقسام میں سے ایک قسم کا نام صنعت تجنیس ہے، اسکی بھی کئی قسمیں ہیں جس میں ایک قسم تجنیس تام کہلاتی ہے، یہ ایسی صنعت ہے جس میں دو لفظ انواع حروف، اعداد حروف، ترتیب حروف اور حرکات و سکنات میں متفق اور معنی میں مختلف استعمال ہوتے ہیں، یہ پورا قصیدہ اسی صنعت پر مشتمل ہے،

(۲) وکنت افنیت عمری فی رفاھیۃ فقطنی ولذیذ العیش انسانی

حالانکہ میں نے اپنی زندگی عیش و عشرت میں گذاری۔ پھر اس نے مجھے تکلیف پہنچائی اور میری پسندیدہ اور پرخوش زندگی کو بھلا دیا

(۳) وکان قد منی قدرا واکرمنی فالآن اخرنی غدرا وانسانی

حالانکہ اس نے میری بڑی عزت افزائی کی تھی اور یہ میرا بڑا اکرام کرتا تھا اور اب اس نے مجھ سے بیوفائی کرکے

مجھے چھوڑ دیا اور بھلا دیا۔

(۴) وکم غنیت بمغنی العز اشرف اجرفی المجد اذیالی وارادنی

میں بہت سے عز و شرف کے مقامات میں رہا ہوں اور مجد و بزرگی میں اپنے دامن اور آستین گھسیٹتا رہا ہوں

(۵) لا استکین لسلطان ولا ملک یعظمہ فرد انی ثم ارادنی

میں کبھی کسی سلطان اور بادشاہ کے آگے اس کے جاہ و جلال کی وجہ سے سرنگوں نہیں ہوا مگر زمانہ نے

مجھے پارہ پارہ اور ہلاک کر دیا ہے

(۶) ردنی خائبا صفر الیدین لقی من بعد ما کان بالترحیب حیانی

اس نے مجھے گری پڑی چیز کی طرح نامراد اور خالی ہاتھ لوٹا دیا، حالانکہ وہ پہلے مجھے خوش آمدید او

عمر دراز باد کہہ چکا تھا۔

(۷) وکان احیاء ھذا الصقع لی تبعا فھل یدین من الاحیاء حیان

اور اس زمین پر رہنے بسنے والے میرے فرمانبردار تھے، اب کیا دو قبیلے بھی میری اطاعت قبول کر سکتے ہیں

اور فرماں بردار ہو سکتے ہیں؟

(۸) ومسنی بالسیم الضر معتسفا لما طوی لی اعوانی واعیانی

اور اس نے ظلم پر کمربستہ ہو کر مجھے بڑی دردناک تکلیف پہنچائی ہے، اس نے میرے سرداروں اور

ممتاز ساتھیوں کو مار ڈالا ہے

(۹) وکنت اعیی زمانا عزة وسنا — فالآن جور زمان السوء اعیانی

میں زمانہ کو عزت اور وقار کے اعتبار سے تھکا چکا تھا، اور اب زمانۂ بد کے ظلم وستم نے مجھے تھکا مارا ہے

(۱۰) وکان لو خضعت نفسی لترضیة — الفی القیاد فاعلانی و اسمانی

اور اگر میرا نفس اسکی رضا جوئی کیلئے آمادہ ہوگیا ہوتا تو قیادت میرے ہاتھ میں رہتی اور اس نے مجھے بام عروج پر پہنچایا ہوتا

(۱۱) وحین کنت حدیث السن ذا اشر — سنی عطائی واغنانی واسنانی

اور جس وقت میں نوعمر اور سربلند تھا تو اس نے مجھے انعامات سے سرفراز، مالامال اور ممتاز و نمایاں کیا

(۱۲) ثم ازدرانی اخیرا والتحی غصنی — من بعد ما نغضت للشیب اسنانی

پھر اس نے آخر میں مجھے حقیر اور ناکارہ سمجھا اور شاخوں (گوشت پوست) کو نوچنا شروع کر دیا، جبکہ

بڑھاپے کی وجہ سے دانت ہلنے شروع ہوگئے اور خراب ہوگئے

(۱۳) وکان دوحة عیشی غضّة زمنا — قصیرة ذات اغصان وافنان

اور میرے عیش کا برگ وبار والا درخت بہت تھوڑے سے زمانہ تک تر و تازہ رہا

(۱۴) وکنت مهما ارتجلت الشعر مقتضبا — یزری علی ابن ابی النهی وحسّان

اور جس وقت میں فی البدیہہ شعر کہتا تھا تو اس کے مقابلہ میں ابن ابی النہی اور (حضرت)

حسانؓ کے شعر بے حقیقت معلوم ہوتے تھے

(۱۵) فالآن انی لأعیی الناس قاطبة — مذ ضامنی وجمیع الضیم حسّانی

اب میں تمام لوگوں سے زیادہ تھکاماندہ ہوں، جب سے اس نے مجھ پر ظلم کیا اور ظلم کو مجھے گھونٹ گھونٹ کرکے پلایا ہے

(۱۶) وکان قصری من وافاه قال له — یا بانی القصر نعم القصر والبانی

اور میرا محل ایسا تھا کہ جو اس کو دیکھتا تھا، کہتا تھا کہ محل بنانے والا اور محل دونوں خوب ہیں،

(۱۷) فهدّه الدهر هدا لا انتظام له — ضرب المعوّل غصن الطلح والبان

پس زمانہ نے جسکا کوئی اصول نہیں ہے اسکو منہدم کر دیا اور ایسی ضرب لگائی جیسے کدال والا ببول اور بان کی

(۱۸) ولی ببغداد دار العز دار بها خلّ الامام الراضی المستنصر ابنا

اور بغداد جو عزو شرف کا گھر ہے اس میں ہمیشہ میرے عزیز خلیفہ مستنصر باللہ کا سایہ رہا وہاں میرے دو لڑکے ہیں

(۱۹) وها انا الآن کرها لاطواعیةً[1] بالهند والسند ذو عدان وابنان

اور میں اسوقت خوشی سے نہیں، مجبوری سے ہندوستان اور سندھ میں اقامت گزیں اور مقیم ہوں،

(۲۰) ان کان غیری فی خفض وفی دعة یخلو بدف ومزمار وعیدان

میرے علاوہ اور لوگ عیش وعشرت میں ہیں اور خلوت میں دف، بانسری اور باجوں کے مزے لے رہے ہیں

(۲۱) فلی من الدهر فی یومی ولیلته من التهدد فی غیظ وعیدان

میرے لیے زمانہ کی طرف سے شب و روز میں غضبناک تہدید اور دو وعیدیں ہیں (ایک صبح اور ایک شام)

(۲۲) وکنت من قبل لو همت بدا اثرة صروف دهری علی حر انا الثانی

حالانکہ میں پہلے ایسا تھا کہ اگر زمانہ اپنی گردشیں کسی شریف اور آزاد مرد پر لانا چاہتا تو میں اسکا منہ پھیر دیتا تھا۔

(۲۳) امر عیشی ما قاسیت فی سفری من بعد ما کان حلاه وحلانی

میری زندگی کا سب سے تلخ حصہ وہ ہے جو میں نے اپنے سفر میں گذارا، جبکہ اس سے پہلے زمانہ نے اسکو

خوشگوار اور شیریں تر بنا دیا تھا۔

(۲۴) معطلا جسمی المرهون منتقیا من بعد ما کان حلاه وحلانی

اب وہ میرے نحیف و کمزور جسم کو بیکار کر چکا ہے، جب کہ پہلے اسکو سنوارا اور مجھکو مزین کر چکا تھا

(۲۵) وعاد قوتی کفا من نوی حشف وکان من صدر دراج وحلان

اور اب میری خوراک ایک مٹھی بھر کھجور رہ گئی ہو حالانکہ پہلے تیتر اور بکرے کے سینہ کا گوشت میری خوراک تھی،

(۲۶) یا قرتی عینی الناد بین ان تجدا یداً الی فلک ماسور فخلانی[2]

اے میری آنکھوں کی ٹھنڈک، شریف و دانا فرزندو! اگر تم میں ایک قیدی کے چھڑانے کی طاقت ہو تو تم مجھے چھڑا لو۔

---

[1] یہ اور اس سے پہلے والا شعر ہمارے اس دعوی کی کہ یہ قصیدہ یہیں لکھا گیا ہے، نہایت بین دلیل ہے [2] یہ شعر سلطانہ رضیہ کے دور قیام کی پوری پوری غمازی کر رہا ہے، اور اس دعوی کی صریح دلیل ہو کہ قصیدہ یہیں نظم ہوا ہو۔ اسی لیے کہ [illegible]

(۲۷) من بعد ما ربی طولاً واکرمنی قولاً واجزل لی نولاً وفتانی

اس کے بعد کہ زمانہ نے مجھے بڑی ناز و نعمت سے پالا، زبان سے بڑا اکرام کیا، بڑے بڑے انعامات سے نوازا، جوان کیا، طاقتور بنایا، جوانمردی اور سخاوت کا جامہ پہنایا،

(۲۸) حتی اذا اصرت اخشی الذئب من کبری الاذنی بصفیق الوجه فتان

یہانتک کہ جب میں بڑھاپے کی وجہ سے ایسی حالت میں ہوگیا کہ بھیڑیے سے ڈرایا جائے تو اس نے مجھے اپنے فتنہ انگیز چہرے کی پناہ میں لے لیا

(۲۹) وکنت من قبل من اودعته ذهبا کانما حاطه للحفظ برجان

اور پہلے میں جس کے پاس سونا امانت رکھا تھا تو گویا اس کی حفاظت کے لیے دو برج ہوتے تھے،

(۳۰) والآن کل من استودعته اهبا الصّ من سارق العریان برجان[1]

اور اب ہر وہ شخص جس کے پاس میں کچا چمڑا امانت رکھتا ہوں تو وہ عربوں کے برجان نامی چور سے بھی زیادہ چور نکلتا ہے

(۳۱) فقلت یا دهر سالمنی مسالمة فانی عمری تم صاغانی

میں نے زمانہ سے کہہ دیا ہے کہ تو مجھ سے پوری مصالحت کرلے، ورنہ جان لے کہ میں عمر بن خطاب کی اولاد سے ہوں اور صاغانی ہوں

(۳۲) فانصاع ینقاد اذعانا د سالمنی ومدضبعی وناغانی وصاغانی

اب وہ سچا منقاد ہوگیا ہے، اس نے مجھ سے مصالحت کرلی ہے، میرے بازو پھیلا دیے ہیں، مجھ سے قریب اور میری طرف ہمہ تن گوش ہوگیا ہے،

---

[1] یہ بھی ضرب المثل اسرق من برجان سے ماخوذ ہے، برجان نامی کوفہ میں ایک چور تھا جسے چوری کے جرم میں پھانسی کی سزا ہوئی تو سزا کے موقعہ پر بھی چوری سے باز نہیں رہا۔ ملاحظہ ہو مجمع الامثال از نجمی کرمانی طبع طہران ۱۲۹۰ھ ص ۳۰۶

(۳۳) فصار شکوای شکرا والجوی فرحاً والعتب عتبی وفادانی[1] وناجانی

اسلیے اب میرا شکوہ شکر سے اور غم خوشی سے بدل گیا اور ناراضگی رضامندی میں تبدیل ہوگئی اور اس نے مجھ سے سرگوشیاں کیں اور کہا میں تیرے قربان!

(۳۴) وذالک للصفح منی عن جنایته[2] والصفح یجدی کثیراً ان جنی جان[3]

یہ تبدیلی اسلیے ہوئی کہ میں نے اس کے قصور سے درگذر کیا اور گنہگار کے گناہ سے درگزر کرنا بڑا فائدہ مند ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہے کہ ہندوستان میں سفارت کے عہدہ پر فائز ہونے سے پہلے صغانی کو کبھی ملکی معاملات سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا، وہ لغت کے امام اور فن حدیث کے ناقد تھے اور یہی ان کا اصلی مذاق تھا، لیکن اس زمانہ کے طریقۂ تعلیم کی یہ خوبی تھی کہ ایک عالم کو جس قسم کی خدمت سپرد کی جاتی تھی، اس کو انجام دے سکتا تھا، صغانی نے قیام ہندوستان کے زمانہ میں ہندوستان کے خلافتِ بغداد سے تعلقات ایسے مستحکم اور استوار کر دیے تھے کہ سفارت کا تعلق ختم ہونے کے بعد بھی خلفاء کی عظمت بادشاہوں کے قلوب میں بدستور قائم رہی اور خلافت بغداد کی تباہی بھی ایک زمانہ تک اس کی یاد ان کے دل سے فراموش نہیں کرا سکی اور شاہان ہند خلفاء کا نام اپنے سکوں پر برابر لکھواتے رہے اور ان کی نیابت کا دم بھرتے رہے۔[4]

صغانی کے ہندوستان میں قیام کی مجموعی مدت

صغانی کی زندگی کے واقعات چونکہ تذکروں کی کتابوں میں مرتب نہیں ہیں اور جن ارباب تذکرہ نے کہیں کہیں سنہ کا تعین کیا ہے، ان میں سے بھی بعض خود صغانی کی تصریح کے خلاف ہیں، صغانی کا بھی یہی دستور ہے کہ کہیں تو معمولی معمولی واقعات

---

[1] فی الاصل فادانی [2] فی الاصل الکثیر [3] یہ پورا قصیدہ ابن ابی مخرمہ نے تاریخ ثغر عدن میں مجدالدین فیروزآبادی کے حوالہ سے نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو تاریخ ثغر عدن طبع لیڈن ۱۹۳۶ء ج ۲ ص ۸ [4] ملاحظہ ہو

The Coinage and Metralugy of The Sultan of Dehli by H.N. Wright. Dehli: 1936

سنہ کو لکھ دیتے ہیں اور کہیں اہم مواقع پر بھی سنہ کا ذکر نہیں کرتے، چنانچہ عنبر مچھلی کی کھال کی جو
بنوائیں تو اس کا سنہ لکھ دیا، لیکن مجمع البحرین کی تالیف کا کام کس سنہ میں شروع کیا اور
ختم ہوا، اس کا پوری کتاب میں کہیں کوئی تذکرہ نہیں، اسی طرح مشارق الانوار اور العباب
کی تاریخ تحریر کا بھی کچھ پتہ نہیں، ایسی صورت میں واقعات کی ترتیب اور سنین کی تعیین
جو دشواریاں پیش آئی ہوں گی وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ تاہم جہانتک واقعات کے
میں سنین کا سراغ مل سکا ہے انھیں نقل کر دیا گیا ہے، لیکن صغانی کا کل قلمی سرمایہ پیش
نہیں ہے، اس لیے ممکن ہے کہیں اور بھی سنین کا ذکر آیا ہو، جن واقعات میں سنین کو نقل کر
ہے وہ گذر چکے ہیں، اگر ان سنین کو سامنے رکھا جائے تو جمہور مورخین کے قول پر صغانی کے
بیان الی ان شرقت وغربت بالھند والسند نیفا وار بعین سنۃ کی صحت اسی
ممکن ہے جب ان کے بچپن کے ابتدائی دس سال لاہور ہی میں تسلیم کیے جائیں (جس کی تردید
کے لیے کوئی واضح دلیل موجود نہیں) کیونکہ اس صورت میں صغانی کے ہندوستان اور سندھ
میں قیام کی مجموعی مدت ۴۱ اور کسور کو شامل کرنے کے بعد ۴۲ سال پوری ہو جاتی ہے،

صغانی ۶۳۰ھ میں ہندوستان کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہکر بغداد چلے گئے، مورخ ذہبی تاریخ
الاسلام میں رقمطراز ہیں،

قدم بسنۃ اربع وعشرین ثم	صغانی ۶۲۴ھ میں بغداد آئے، پھر سفیر
اعید الیھا رسولاً عامئیذ فما	ہوکر اسی سال ہندوستان واپس چلے گئے
رجع الی بغداد سنۃ سبع وثلاثین[۱]	اور ۶۳۷ھ تک بغداد واپس نہیں آئے۔

ذہبی کے مذکورہ بالا بیان سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ۶۳۷ھ میں صغانی حجاز جاتے

---

[۱] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام تذکرہ حسن بن محمد الصغانی، مخطوطہ رضا لائبریری رامپور۔

اور ۶۳۵ھ میں وہاں سے واپس آتے ہوئے بغداد نہیں گئے تھے، بلکہ حجاز سے سیدھے ہندوستان آگئے تھے، اس سے مولانا عبدالحئی لکھنوی کے اس خیال کی بھی تردید ہو جاتی ہے کہ انھیں خلیفۂ بغداد نے سلطانہ رضیہ کے دربار میں سفیر بنا کر بھیجا تھا[1] جیسا کہ گذر چکا۔

کدراء میں ورود صغانی ہندوستان سے جاتے ہوئے یمن کے ایک شہر کدراء میں بھی اترے تھے، چنانچہ مجمع البحرین میں فرماتے ہیں:

الکدراء بلدة بالیمن علی وادی[2]	کدراء یمن کا ایک شہر ہے جو وادی سہام
سہام والیہا ینسب الادیم	کے پاس آباد ہے، کچا چمڑا اس کی طرف منسوب
قال الصغانی مولف ھذا الکتاب	ہے، صغانی اس کتاب کا مولف کہتا ہے
وقد وردتہا سنة سبع وثلاثین	میں ۶۳۷ھ میں ہندوستان سے بغداد
وستمائة منصرفی من الہند الی	(اللہ تعالے اس کو اپنی حفاظت میں
مدینة السلام حماہا اللہ تعالے[3]	رکھے) جاتے وقت یہاں اترا تھا۔

کدراء سے بغداد گئے تھے۔

بغداد میں آمد اور رباط مرزبانیہ کی صدارت صغانی نے ہندوستان کے قیام کے زمانہ میں تصوف میں جو مقام حاصل کیا تھا اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب آپ بغداد پہنچے تو خلیفہ مستنصر باللہ نے آپ کو رباط المرزبانیہ (جس کی تفصیل آگے آرہی ہے) کا صدر مقرر کیا، صغانی مجمع البحرین میں رقمطراز ہیں:

المرزبانیة قریة علی نہر عیسی	مرزبانیہ نہر عیسی کے پاس اور محول کے بالائی
فوق المحول بنی بہا الامام الناصر	حصہ میں ایک بستی ہے، الناصر لدین اللہ قدس اللہ روحہ

---

[1] نزہۃ الخواطر طبع دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ج ۱ ص ۱۴۸ [2] معجم البلدان ج ۷ ص ۲۲۳ [3] مجمع البحرین (روٹوگراف کاپی) اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کراچی، مادہ "کدر"

لدین اللہ قدس اللہ روحہ	نے یہاں ایک مکان اور صوفیوں کے لیے
داراً ورباطاً لاهل التصوف	ایک سرائے بنوائی تھی، اللہ تعالیٰ ان کی اس
تقبل اللہ منہ وجعلنی الامام	خدمت کو قبول فرمائے، خلیفہ مستنصر باللہ
المستنصر باللہ انار اللہ برهانہ	نے (اللہ تعالیٰ اس کی خلافت کو برقرار رکھے)
شیخ ذالک الرباط واوزعنی شکر	مجھے اس سرائے اور خانقاہ کا صدر بنایا اور
نعمهم[1]	اللہ تعالیٰ مجھے ان نعمتوں پر شکر کی توفیق عطا فرمائے،

مرزبانیہ بغداد کی ایک بستی کا نام ہے جو اپنی سرسبزی اور شادابی میں مشہور تھی، خلیفۂ بغداد الناصر لدین اللہ چونکہ شیخ شہاب الدین عمر بن محمد السہروردی المتوفی ۶۳۲ھ کا بڑا عقیدتمند تھا، اور ان کے فضل و کمال اور زہد و ورع سے اتنا متاثر تھا کہ مسلمان بادشاہوں کے دربار میں ان کو سفیر بنا کر بھیجتا تھا، اس لیے اس نے آپ کے رہنے کے لیے ایک نہایت کشادہ اور عالیشان مکان تعمیر کرایا، جس میں حمام بنوایا اور باغ لگوایا اور ایک سرائے اور خانقاہ تعمیر کرکے فقراء اور اہل اللہ کے لیے وقف کی، یہی وہ سرائے ہے جو رباط المرزبانیہ کے نام سے مشہور تھی، ابن الفوطی المتوفی ۷۲۳ھ شیخ شہاب الدین سہروردی کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:

بنی لہ الخلیفۃ الناصر لدین اللہ	خلیفہ الناصر لدین اللہ نے آپ کے لیے ایک سرا
رباطاً بالمرزبانیۃ علی نہر عیسیٰ	مرزبانیہ میں نہر عیسیٰ کے کنارے تعمیر کرائی تھی،
وبنی الی جنبہ داراً واسعۃ	اور اس کے پہلو میں ایک نہایت کشادہ
وحماماً وبستاناً یسکنہا باھلہ	مکان اور حمام بنوایا اور باغ لگوایا تھا،
وینفذہ الخلیفۃ رسولاً الی	یہاں آپ اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہتے تھے،

---

[1] تذکرہ مجمع البحرین اور [illegible]

عدۃ جہات وکان الملوک الذین	خلیفہ نے آپ کو مختلف شہروں میں سفیر بناکر
یرد علیھم یبالغون فی اکرامہ	بھیجا تھا، جن بادشاہوں کے دربار میں
وتعظیمہ واحترامہ اعتقاداً	آپ جاتے تھے وہ حصول برکت کے لیے اور
فیہ وتبرکاً [۱]	ارادتمندی کی وجہ سے آپ کی تعظیم وتکریم کرتے تھے،

شیخ شہاب الدین سہروردی شافعی المذہب عالم اور بڑے خدا ترس بزرگ تھے، اگرچہ علامہ سبکی بعض مسائل
ں ان کے تفرد کی وجہ سے ان سے زیادہ خوش نہیں ہیں [۲]، انھوں نے خلیفہ ناصر لدین اللہ سے
قف کے وقت غالباً یہ شرط کرالی تھی کہ اس کا صدر ہمیشہ شافعی الذہب عالم ہوگا، صغانی کو
ں شرط کا علم نہ تھا، مگر آپ کئی برس تک اس کی صدارت کے فرائض انجام دیتے رہے، ایک
ت کے بعد کسی ضرورت سے وقف نامہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، اس وقت معلوم ہوا کہ واقف نے
شرط رکھی ہے کہ اس کا صدر شافعی المسلک عالم ہی ہوگا تو آپ فوراً صدارت سے دستبردار
ہوگئے، مورخ ابن الفوطی لکھتے ہیں:

فرتب شیخاً برباط المرزبانیۃ	پس آپ کو رباط مرزبانیہ کا صدر مقرر کیا گیا
فلم یزل الی اٰخر ایام المستنصر	اور آپ مستنصر باللہ کے آخری زمانہ تک
ثم نظر فی شرط الواقف فوجد	اس کے صدر رہے، اتفاق سے آپ نے
فیہ ان یکون شافعیا فعزل	وقف نامہ پڑھا تو دیکھا کہ وقف کرنے والے نے
نفسہ [۳]	اس میں یہ شرط رکھی ہے کہ اس کا صدر شافعی
	مسلک عالم ہوگا تو آپ فوراً اس منصب سے

۱ ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ، مکتبۃ العربیہ بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۴، ۲ ملاحظہ ہو الطبقات الشافعیہ
الکبریٰ مطبعۃ الحسینیۃ مصر ج ۵ ص ۱۴۴، ۳ ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۲۹۳

مستنصر باللہ کا انتقال جمادی الآخری ۶۴۰ھ کو ہوا ہے، جس سے معلوم ہوا کہ صغانی ۶۳۹ھ تک اس خدمت پر مامور رہے، لیکن یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ الحوادث الجامعہ ہی میں "تتمۃ اخبار سنۃ ۶۴۳" کے ضمن میں یہ بھی موجود ہے کہ اسی سال (۶۴۳ھ میں) صغانی رباط المرزبانیہ کی صدارت سے مستعفی ہو گئے اور شیخ الشیوخ علی بن النیار کو جو شافعی المذہب عالم اور صوفی مشرب بزرگ تھے، صغانی کی جگہ صدر مقرر کیا گیا، چنانچہ فرماتے ہیں:

فیھا عزل رضی الدین الحسن بن محمد الصغانی عن مشیخۃ رباط المرزبانیۃ لکونہ حنفیا وشرط الواقف ان یکون شافعیا واضیف الرباط الی الشیخ علی بن النیار[۱]	رضی الدین حسن بن محمد الصغانی اسی سال ۶۴۳ھ میں رباط مرزبانیہ کی صدارت سے کنارہ کش مستعفی ہوئے، کیونکہ وہ حنفی تھے اور وقف یہ شرط تھی کہ صدر شافعی مسلک کا عالم ہوگا، اس کے بعد رباط مرزبانیہ کی زمام شیخ علی ابن النیار کے ہاتھ میں دیدی گئی۔

مذکورہ بالا بیان میں اس امر کی تصریح ہے کہ صغانی کے بعد رباط مرزبانیہ کا صدر شیخ علی ابن النیار کو بنایا گیا تھا، اس لیے یہی قول زیادہ صحیح ہے، لیکن مورخین کا اس امر میں اختلاف ہے کہ علی بن النیار کو شیخ الشیوخ ۶۴۲ھ میں بنایا گیا ہے یا ۶۴۳ھ میں، یہ اختلاف بھی دراصل اس امر پر مبنی ہے کہ وزیر نصیر الدین احمد بن الناقد کا انتقال ۶۴۲ھ میں ہوا یا ۶۴۳ھ میں، کیونکہ اس کے

---

[۱] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۲۰۷، علی بن محمد بن الحسین نام، ابو المظفر کنیت اور شمس الدین لقب تھا بڑے جید عالم اور صوفی مشرب بزرگ تھے، خلیفہ مستعصم باللہ کے مربی رہ چکے تھے، آپ ہی نے مستعصم کو قرآن مجید حفظ کرایا، تجوید کی تعلیم دی اور خوشنویسی سکھائی تھی، اس لیے مستعصم باللہ کے دور خلافت میں انھیں بڑا اعزاز حاصل رہا ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کیا، حالات کے لیے ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۳۲۲ البدایہ والنہایہ مطبعۃ السعادہ مصر ج ۱۳ ص ۲۱۳

انتقال کے بعد خلیفہ مستعصم باللہ نے قلمدان وزارت شیخ علی بن النیار کو سپرد کرنا چاہا تھا، مگر انھوں نے یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ میں نے صوفیانہ لباس پہن لیا، اسے نہیں اتار سکتا، ان کا مکالمہ بھی پڑھنے کے لائق ہے، ابن الفوطی لکھتے ہیں:

فلما توفی الوزیر ابن الناقد خاطبه	جب وزیر ابن الناقد نے وفات پائی تو خلیفہ
فی تقلید الوزارة فابی وقال	نے انکو وزیر بنانا چاہا، انھوں نے اس سے انکار
انی عاهدت الله ان لا اغیر	کر دیا اور فرمایا میں نے خدا سے عہد کیا ہے کہ
لبس المتصوفین ولا انزع عنی	فقیرانہ لباس نہیں بدلوں گا اور جس کو میں نے
ما تعودته فقیل له نحن نوافقك	اختیار کر لیا ہے اس کو نہیں چھوڑوں گا، ان سے
علی ذلك بحیث تؤرخ الناس	کہا گیا ہم اس پر بھی آپ کی وزارت سے اتفاق
ان شخصا یختص بنا ندبناه الی	کرتے ہیں تاکہ مورخین یہ لکھیں کہ ایک ایسے شخص
الوزارة فابی ان یغیر زیه	کو جو ہم سے وابستہ تھا، ہم نے وزارت قبول
فاجبناه الی ذلك فقال لان	کرنے کی دعوت دی مگر اس نے اپنے فقیرانہ
تؤرخ الناس ان شخصا متصوفا	لباس کے بدلنے سے انکار کر دیا لیکن ہم نے
حسن فیه الظن وندب الی	اس شرط کو بھی قبول کر لیا، اس پر انھوں نے
الوزارة فامتنع احسن من ذلك	کہا کہ مورخین کا یہ لکھنا کہ ایک صوفی مشرب
فحینئذ فوضت الیه مشیخة	انسان کو جس کے ساتھ انھیں حسن ظن تھا
الشیوخ ببغداد ... خوطب بشیخ	وزارت کی دعوت دی گئی مگر اس نے انکار کیا
الشیوخ ..... ثم اضیف الیه مشیخة	بار وزارت اٹھانے سے بہتر ہے، اس وقت
رباط المرزبانیة [1]	انھیں مشائخ بغداد کا صدر بنایا گیا اور شیخ الشیوخ

[1] الحوادث الجامعہ ص ۲۸۵

ان کی اس غلطی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابن العلقمی کو وزارت کا عہدہ ملا جس نے تاتاریوں سے مل کر خلافت اور عروس البلاد بغداد کا خاتمہ کر دیا، ابن کثیر نے ان ہی بزرگ کی وفات پر یہ فقرہ لکھا ذبح بدار الخلافۃ کما تذبح الشاۃ (دار الخلافت بغداد میں انھیں اس طرح ذبح کر دیا گیا جس طرح بکری کو ذبح کیا جاتا ہے)

ابن الفوطی کا خیال بھی یہی ہے، وزیر نصیر الدین کا انتقال ۶۴۳ھ میں ہوا ہے، لیکن ابن الطقطقی نے الآداب السلطانیہ[1]، ذہبی نے دول الاسلام[2] اور ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ[3] میں تصریح کی ہے کہ اس کا انتقال ۶۴۲ھ میں ہوا تھا، ابن کثیر نے یہ بھی لکھا ہے کہ اسی سال علی بن النیار کو شیخ الشیوخ بنایا گیا۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ صغانی اس اہم خدمت پر کم و بیش پانچ برس مامور رہے اور مستنصر باللہ کے زمانۂ خلافت میں نہیں بلکہ مستعصم باللہ کے دور خلافت میں اس خدمت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ (باقی)

---

[1] ملاحظہ ہو الآداب السلطانیہ طبع مصر ص ۲۴۴ [2] دول الاسلام طبع اول دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۳۷ھ ج ۲ ص ۱۱۲ [3] البدایہ والنہایہ مطبعۃ السعادہ مصر ج ۳ ص ۱۷۴

الفریڈگل لیوم کے ورثۂ اسلام پر ایک نظر

از

جناب شبیر احمد خاں غوری ایم اے، ایل ایل بی، پی ٹی ایچ، رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی، اتر پردیش۔

۳ ۔ مسئلہ کلام باری

کلام باری تعالیٰ کی بحث اسلامی فکر کا ایک نہایت اہم اور نازک مسئلہ ہے، جس کے اختلافات تعبیر و توجیہ کی وجہ سے بیشمار بندگان خدا کو قید و محن کی مشقتیں جھیلنا پڑیں اور دنیا کے منصف ترین اور فراخ مشرب حکمرانوں کے عہد حکومت پر تعصب و تشدد کا بدنما داغ لگ گیا، اس لیے ایک فاضل پروفیسر سے بجا طور پر توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ اس نازک مسئلہ کی مختلف تعبیرات میں اپنی ذمہ داری کو ملحوظ رکھتے، لیکن بدقسمتی سے پروفیسر گل لیوم نے اس توقع کو پورا نہیں کیا۔

بہتر تو یہ ہوتا کہ فاضل پروفیسر مختلف فرقوں کے نقل و حکایت مذاہب ہی پر اکتفا فرماتے لیکن اگر نقل مذاہب مع دلائل ہی کرنا تھا تو پھر ہر فرقہ کے سلسلے میں اس کا التزام کرتے، ایک فرقہ کے موقف کو دلائل و براہین کے ساتھ بیان کرنا اور دوسرے فرقہ کے موقف کو بغیر دلیل و برہان نقل کرنا انفیاتی طور پر قارئین کے ذہن میں ضرور یہ غلط فہمی پیدا کرے گا کہ پہلے فرقہ کا موقف معقولیت پسندی پر موقوف ہے، اور دوسرے فرقہ کا عقیدہ محض لال بجھکڑ پن کا نتیجہ ہے جس پر وہ محض بربنائے تعصب و جہالت مصر ہے۔ مثلاً پروفیسر موصوف نے معتزلہ کے مسلک کی توضیح میں لکھا ہے:

"معتزلہ کا کہنا تھا کہ اگر کلام اللہ کی صفت ہے تو لازمی طور پر سے ازلی، قدیم اور تمام عالم

سے پہلے موجود ہونا چاہیے ورنہ اگر اللہ نے زمان میں تکلم کیا تو اس سے اللہ کی ذات میں تغیر لازم آیا اور اللہ وہ ہوگیا جو وہ اس سے پہلے نہ تھا۔ اس طرح کا استحالہ اللہ سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ لہذا اگر کلام اللہ کی صفت ہے اور قرآن اس کلام کی دستاویز ہے تو اس مفروضہ کی بنا پر قرآن کو بھی اللہ کا کلام ہونے کی حیثیت سے قدیم ہونا چاہیے لیکن یہ خلاف قیاس بات تھی، کیونکہ قرآن واضح طور پر عالم حادث کی چیز تھی۔ اسے نازل کیا گیا اور زمان و مکان میں اسے ضبط تحریر میں لایا گیا، چنانچہ اس کی بعض آیتیں واضح طور پر وقتی اور مقامی حوادث سے متعلق ہیں۔"[1]

اس کے برعکس اہل سنت کے موقف کے بارے میں صرف اتنا ہی فرمانے پر اکتفا کیا ہے:

اہل سنت یہ مانتے تھے کہ قرآن قدیم ہے، اور اس کے لفظی و ظاہری معنی بھی درست ہیں، اسکے ساتھ ساتھ وہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کیجانب منسوب بہت سی حدیثوں کو بھی تسلیم کرتے تھے۔"[2]

حالانکہ معتزلہ کا موقف اور اس موقف کی تائید میں جو دلائل دیے جاتے ہیں وہ عموماً اہل سنت ہی کے کلامی لٹریچر سے ماخوذ ہیں، یعنی اہل سنت نے کمال فراخ دلی کے ساتھ اپنے مخالفین کے دلائل کو اپنی کتابوں میں قلمبند کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے بڑی دقت نظری سے تجزیہ کرکے ان دلائل کا جائزہ لیا ہے نیز انھوں نے اپنے موقف کی ایک معقول توجیہ بھی پیش کی ہے، مگر فاضل پروفیسر کی تحریر میں ان باتوں کا ادنیٰ الم ام بھی نہیں پایا جاتا، اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ پروفیسر گل لیوم کے مقالہ میں اہل سنت کا مسلک بڑا ہی مضحکہ خیز بن گیا ہے، اور اعتزال کی مدلل توجیہ کے مقابلہ میں مسلک اہل سنت کے پیرو کچھ لال بجھکڑ سے ہی معلوم ہوتے ہیں،

ظاہر ہے یہ کوئی پسندیدہ صورت حال نہیں ہے۔ اس لیے مستحسن معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس مسئلہ کی ایک مختصر تاریخ پیش کردی جائے اور پھر ہر فریق نے جس انداز میں اسے سمجھا ہے اور جن وجوہ سے ایسا سمجھا ہے اسے بلاکم وکاست بیان کردیا جائے۔

---

[1] معارف ماہ جولائی ۱۹۵۵ء ص ۷۶ [2] ایضاً ص ۷۷

تاریخی پس منظر | تمام الہامی مذاہب کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہے یعنی صفت کلام سے متصف ہے، چنانچہ توریت میں بار بار اللہ تعالیٰ کو "کہتے ہوئے" said اور "کلام کرتے ہوئے" spake بیان کیا گیا ہے، مثلاً

"And The Lord God Commanded The man, saying, of every Tree of The garden Thou mayest freely eat" (Gen. 2, 16)

And The Lord said Noah, come Thou and Thy house in The ark" (Gen. 7, 1)

And God said unto Abraham Thou shalt keep my convenant Therefore, Thou and Thy seed after Thee in Their generation. (Gen, 7, 1)

And The Lord spake unto Moses, Go unto Pharaoh and say unto him, Thus said The Lord, let my people go That They may serve me. (Exod.:

بالخصوص سفر لویان کا تو ہر باب And The Lord spke unto Moses saying سے شروع ہوتا ہے۔

اسی طرح انجیل میں متعدد مقامات پر خدا کے کلام کرنے اور "کہنے" کا ذکر آیا ہے، مثلاً

"For God commandod saying, Honour Thy father and mother." Mat. 15, 4

Have ye not read in the book of Moses, how in the bush God spake unto him, saying I am the God of Abraham." (Mark. 12.26)

انجیل نے صرف "کہنے" ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ "خدا کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ" تک کی تصریح کی ہے،

Man shall not live by bread alone, but by every word that proceedeth out of the mouth of God." (Mat. 4,4)

اس "کلام خدا" کے تصور نے یہانتک اہمیت حاصل کر لی تھی کہ انجیل یوحنا کا افتتاح ہی "کلمہ" کے ذکر سے ہوتا ہے:

"In the begining was the word, and the word was with God and the word was God." (John. 1,1)

رہا قرآن تو اس کا نام ہی "کلام اللہ شریف" ہے، حتی کہ عام گفتگو میں علوم دینیہ کو "قال اللہ او قال الرسول" سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی بنا پر قاضی بیضاوی نے "طوالع الانوار" میں لکھا ہے:

الثانی فی الکلام تواتر اجماع الانبیاء	دوسری بحث کلام باری کا مسئلہ: انبیاء علیہم السلام
علیہم السلام واتفاقہم علی انه	کا اس [illegible] اجماع و اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ متکلم ہے
سبحانه وتعالیٰ متکلم [1]	اور یہ اجماع و اتفاق بر سبیل تواتر ثابت ہے،

اسی طرح قاضی عضد الدین الایجیؒ نے "المواقف" میں لکھا ہے:

انه تعالیٰ متکلم والدلیل علیه	اللہ تعالیٰ متکلم ہے اور اسکی دلیل انبیاء علیہم السلام
اجماع الانبیاء علیہم السلام تواترا	کا اجماع ہے، ان سے بر سبیل تواتر ثابت ہے کہ وہ
انہم کانوا یثبتون له الکلام [2]	اللہ تعالیٰ کے واسطے صفت کلام کو ثابت کرتے تھے،

---

[1] طوالع الانوار ص ۶۰ [2] شرح المواقف ج ثامن ص ۹۱

بہرحال تمام انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم کی تعلیمات کی بنیاد کلام باری کے عقیدے پر قائم تھی، ان میں زیادہ تر قدیم مذہب یہودیت ہے لیکن بعد میں مشرک اقوام کے اختلاط و امتزاج اور وثن پرست جابر کے ہاتھوں میں اسیری و استعباد نے ان میں تشبیہ و تجسیم کی بدعات پیدا کر دیں، لہذا جب بطالمۂ مصر کے عہد میں یونانی فلسفہ سے ان کا سابقہ پڑا اور خود کو اس تشبیہ مفرط کی توجیہ سے قاصر پایا تو اس سے بچنے کے لیے تنزیہہ کے نام پر "تعطیل" کی جانب ان کا میلان بڑھنے لگا، اس انداز فکر کا سب سے مشہور نمایندہ فائلو (Philo) اسکندروی ہے جس نے "تجریدی توحید" اور "تنزیہہ نما تعطیل" کی دھن میں نو فلاطونیوں سے پہلے "صفات باری" کا انکار کیا، ولیم ٹینس لکھتا ہے:

"خدا کا تصور اس کے ہاں تمام محدود ذات سے اس قدر بلند ہے کہ کوئی تصور اور کوئی نام خدا کی عظمت کو ظاہر نہیں کر سکتا، خدا تمام کمالات سے زیادہ اکمل اور تمام خوبیوں سے زیادہ خوب ہے، کسی نام اور صفت اور تصور کا اس پر اطلاق نہیں ہو سکتا۔"[1]

اسی زمانہ میں مسیحیت مبعوث ہوئی مگر اسے بہت جلد پہلے یہودی تعصب کا اور پھر رومن ظلم و تشدد کا مقابلہ کرنا پڑا، ان مصائب کو تو وہ اپنی بلندی کردار اور صبر و استقامت کی مدد سے برداشت کر گئی مگر بڑی مصیبت یہ آئی کہ بعض فلسفی فرقے اس میں گھس آئے اور مسیحیت کے ترجمان بننے کے مدعی ہو گئے، ان میں سب سے خطرناک "غنوصی فرقہ" (Gonostics) تھا، ان کی بدعتوں میں سے ایک بدعت یہ تھی کہ انھوں نے توریت کو الہ العلمین کے بجائے "الہ ادنیٰ" کا کلام قرار دیا اور اس طرح بعد کی تنزیہہ نما تعطیل کے لیے راستہ ہموار کر دیا، پروفیسر تھلی ان کے بارے میں لکھتا ہے:

They thought that .... Judaism (is) a corrupt from of religion, the revelation of an inferior being
(Thilly: Hist. of Philosophy. P.125)

---

[1] مختصر تاریخ فلسفۂ یونان ص ۲۶۸

یہودی اس وقت موت وحیات کی کشمکش میں گرفتار تھے، بایںہمہ دنیا میں جو ایک عام فکری بحران برپا تھا، اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے، اس فکری بحران کا گہوارہ "نوفلاطونیت" تھا، جس کا اصل الاصول "تجریدی توحید" تھا، اور جس کے اندر بقول پروفیسر تھلی خدا کا تصور حسب ذیل تھا کہ :

He is so Transcendent that whatever we say of him merely limits him; hence we cannot attribute to him beauty or goodness or thought or will for all such attributes are limitations and really imperfections. we cannot say what he is, but only what he is not."

(History of Philosophy P. 114)

اس تجریدی توحید کے نتیجہ میں پیدا شدہ "تنزیہ تا تعطیل" کے رجحانات یہود کے دینی حلقوں میں بھی پرورش پانے لگے، چنانچہ اس عہد کے (Apocalyptic) ادب میں "تنزیہ" و "ماورائیت" (Transcendentalism) کے رجحانات نمایاں ہیں،[۱] اسی طرح ترگوم میں قدیم تشبیہ مفرط کی تعدیل کی طرف ایک میلان پایا جاتا ہے،[۲] بعد میں ان ہی رجحانات کو دوسرے دینی و علمی سرمایہ کے ساتھ لیکر یہودی تلاش امن میں باہر نکلے، ایک جماعت حجاز پہنچی جہاں مختلف مقامات میں اس نے اپنی نو آبادیاں قائم کیں، ایک نو آبادی مدینہ منورہ میں تھی جہاں انھوں نے مشرکین و منافقین کے ساتھ اشاعت اسلام میں روڑے اٹکائے اور مسلمانوں کو ہر طرح کی اذیتیں پہنچائیں، ان ہی مسلم آزاروں میں ایک شخص لبید بن اعصم تھا جس نے جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو کیا تھا، لبید بن اعصم "خلق توریت" کا قائل تھا،

---

[۱] New commentary on Holy scripture, Part III. [۲] P. 1[illegible]

اس کا بھانجا اور شاگرد طالوت تھا، جس نے مورخین کی تصریح کے مطابق سب سے پہلے "خلقِ توریت" کے موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی اور اس طرح نئے زندقہ کو پھیلایا، (تفصیل آگے آرہی ہے)

فتح خیبر اور جلاوطنی کے بعد یہودی عراق اور شام کی طرف چلے گئے۔ طالوت سے "خلق توریت" کا عقیدہ ابان بن سمعان نے لیا اور ابان بن سمعان نے "تعطیل" اور "نفی صفات باری" کی تعلیم جعد بن درہم حرانی سے حاصل کی، حران ہمیشہ سے صابئیت کا گہوارہ رہا ہے، اور یونانی فلسفہ کے عہد زوال میں فلاسفہ کا ملجا و ماویٰ تھا، چنانچہ وہ اپنی یونانیت پسندی کی وجہ سے "مدینۃ الیونانیین" (Hellenopolis) کہلاتا تھا، اسی حران کا باشندہ جعد بن درہم تھا، لہذا ظاہر کیجیے کہ رجحانات کیا ہوں گے۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے "عقیدۂ حمویہ" میں لکھا ہے:

ثم اصل هذه المقالة انما هو ماخوذ	پھر اس قول (خلق قرآن اور نفی صفات) کی اصل
عن تلامذة اليهود والمشركين و	یہود و مشرکین اور گمراہ صابئین کے شاگردوں سے
ضلال الصائبين.... اول ماظهرت	ماخوذ ہے۔۔۔ سب سے پہلے یہ قول جعد بن درہم سے
هذه المقالة من جعد بن درهم	مسلمانوں میں ظاہر ہوا، اسے جہم بن صفوان نے
واخذها عنه الجهم بن صفوان	سیکھ کر اسے ظاہر کیا، لہذا عقیدۂ جہمیہ اسی کی جانب
واظهرها فنسب مقالة الجهمية	منسوب ہوتا ہے، جعد بن درہم نے اس عقیدہ کو
اليه والجعد اخذ مقالته عن ابان	ابان بن سمعان سے سیکھا تھا، اور ابان بن سمعان
بن سمعان واخذها ابان من طالوت	نے طالوت سے حاصل کیا تھا جو لبید بن عاصم کا بھانجا
ابن اخت لبيد بن اعصم واخذها	تھا، طالوت نے اسے لبید بن اعصم یہودی جادوگر
طالوت من لبيد بن اعصم اليهودي	سے اخذ کیا تھا جس نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر جادو
الساحر الذی سحر النبی صلی اللہ علیہ وسلم	کیا تھا اور جیسا کہ کہا جاتا ہے یہ جعد حران کا باشندہ تھا،

وكان الجعد هذا فيما قيل من اهل حران وكان فيهم خلق كثير من الصابئة والفلاسفة ..... ومذهبهم في الرب انه ليس له الا صفات سلبية او اضافية او مركبة منهما ..... فيكون الجعد قد اخذها عن الصابئة الفلاسفة

اور وہاں صابئین اور فلاسفہ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی ..... اور ان لوگوں کا مذہب اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ ہے کہ سوائے سلبی یا اضافی صفات کے یا ایسی صفات کے جو سلبی و اضافی صفات سے مرکب ہوں اس کی کوئی صفت نہیں ہے .. پس جعد نے اس عقیدہ کو صابی

بیان کیا جاتا ہے کہ جعد حرانی تھا

جعد بن درہم نے ابان بن سمعان اور اس کے اساتذہ کی "بدعت خلق توریت" کو قرآن پر جاری کیا اور "خلق قرآن" کی بدعت کا آغاز کیا، چنانچہ ابن تیمیہ نے حافظ ابوالقاسم لالکائی کی "شرح اصول السنہ" سے نقل کیا ہے،

ولا خلاف بين الامة ان اول من قال القرآن مخلوق الجعد بن درهم[1]

اس بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جس نے سب سے پہلے قرآن کو مخلوق کہا وہ جعد بن درہم تھا،

جعد بن درہم کچھ تو اپنی امن سوز کارروائیوں اور کچھ اس الحاد و زندقہ کی وجہ سے حکمراں طبقہ میں مبغوض تھا، چنانچہ ہشام بن عبدالملک نے عراق کے والی خالد بن عبداللہ القسری کو لکھا کہ جعد بن درہم کو گرفتار کرکے قتل کردو، خالد بن عبداللہ نے اس حکم کی تعمیل کی، حافظ ابن تیمیہ نے "الفرقان بین الحق والباطل" میں لکھا ہے،

وقد قيل ان اول من عرف انه اظهر في الاسلام التعطيل الذي تضمنه قول فرعون هو الجعد بن درهم فضحى به خالد بن عبد الله القسري وقال ايها الناس ضحوا تقبل الله ضحاياكم

اور کہا گیا ہے کہ سب سے پہلے جو شخص مسلمانوں میں عقیدۂ تعطیل کے اظہار کے لیے مشہور ہوا جو فرعون کے قول پر مشتمل ہے، وہ جعد بن درہم ہے، پس اسے خالد بن عبداللہ القسری نے ذبح کیا، اس نے اس سے پہلے لوگوں سے کہا لوگو! تم جاکر اپنی اپنی قربانی ذبح کرو

۱؎ عقیدہ حمویہ مشمولہ رسائل الکبریٰ لابن تیمیہ ج اول ص ۴۲۴ - ۴۲۵

انی مضح بالجعد بن درهم انه	اللہ تعالیٰ تمھاری قربانیاں قبول فرمائے اور
زعم ان الله لم یتخذ ابراهیم	میں جعد بن درہم کی قربانی کروں گا کیونکہ اس کا
خلیله ولم یکلم موسیٰ تکلیما	گمان ہے کہ نہ تو اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام
تعالی الله عما یقول الجعد علوا	کو اپنا دوست بنایا اور نہ موسیٰ علیہ السلام سے کلام
کبیرا۔ ثم نزل فذبحه[1]	کیا، اللہ تعالیٰ کی شان اس سے کہیں بلند ہے جو [جعد کہتا ہے، پھر منبر سے اتر کر جعد کو ذبح کر دیا]

جعد بن درہم سے "خلق قرآن" اور "تعطیل" کے عقائد کو جہم بن صفوان نے اخذ کیا، اس نے نفی صفاتِ باری پر اس قدر زور دیا کہ یہ مذہبِ فکر اسی کے نام سے موسوم ہو کر "تجہم" یا "جہمیت" کہلانے لگا۔ عبد القاہر بغدادی نے لکھا ہے،

وامتنع من وصف الله تعالیٰ بانه	اور جہم اللہ تعالیٰ کی اس طور پر توصیف سے منع کرتا تھا
شئ او حی او عالم او مرید وقال	کہ وہ شئ ہے یا حی ہے یا عالم ہے یا مرید (ارادہ کرنے والا)
لا اصفه بوصف یجوز اطلاقه	ہے اور وہ کہتا تھا کہ میں اللہ تعالیٰ کو کسی ایسی صفت
علی غیره..... وقال بحدوث	سے متصف نہیں کرتا جس کا اطلاق غیر اللہ پر
کلام الله تعالیٰ کما قالته القدریة[2]	..... اور وہ فرقہ قدریہ کی طرح اللہ تعالیٰ کے کلام [کو حادث کہتا تھا]

جہم کے "تجہم" سے معتزلہ متاثر ہوئے، اگرچہ یہ اثر ان کے طبقۂ اولیٰ میں زیادہ نمایاں نہیں ہے، شہرستانی کا خیال ہے کہ واصل بن عطاء الغزال بھی صفاتِ باری کا منکر تھا، مگر یہ خیال اس کے یہاں زیادہ مکمل اور واضح شکل میں نہیں پایا جاتا،

القاعدة الاولیٰ بنفی صفات الباری	فرقہ واصلیہ کا دوسرا اصول صفاتِ باری تعالیٰ
من العلم والقدرة والارادة	مثلاً علم، قدرت، ارادہ اور حیات کی نفی ہے

---

[1] الفرقان بین الحق والباطل مشمولہ رسائل الکبریٰ لابن تیمیہ ج اول ص ۱۰۲ [2] الفرق بین الفرق ص ۱۹۹

والحیاۃ۔ وکانت ھذہ المقالۃ — اور یہ عقیدہ ابتدا میں غیر مکمل اور
فی بدوھا غیر نضیجۃ[1] — خام شکل میں تھا۔

لیکن امام احمد بن حنبل نے اپنے رسالہ "الرد علی الزنادقۃ والجہمیہ" میں تصریح کی ہے کہ جہم کے "مذہب نفی صفات" کو معتزلہ میں سے واصل کے دست راست عمرو بن عبید اور اس کے پیروؤں نے اختیار کیا، یہ بھی ممکن ہے کہ عبارتِ ذیل میں "ابو حنیفہ" "ابو حذیفہ" کی تحریف ہو جو واصل کی کنیت تھی، اس صورت میں واصل کا جہم سے متاثر ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

واتبعہ علی قولہ رجال من اصحاب — اور جہم کے اس عقیدہ کی پیروی ابو حنیفہ (ابو حذیفہ)
ابی حنیفۃ واصحاب عمرو بن عبید بالبصرۃ[2] — اور عمرو بن عبید کے متبعین نے بصرہ میں کی۔

مگر "خلق قرآن" کا عقیدہ نہ تو واصل کے یہاں اپنی مکمل شکل میں ملتا ہے اور نہ ابو موسیٰ المزدار سے پہلے متاخرین معتزلہ کے یہاں، البتہ جہم کا خاص شاگرد جس کا نام عقیدۂ خلقِ قرآن سے خصوصی طور پر وابستہ ہے وہ بشر بن غیاث المریسی ہے (تفصیل آگے آرہی ہے) بشر معتزلی نہیں تھا، مگر عقیدۂ "خلق قرآن" کا بڑا سرگرم مبلغ تھا اور اس کی اسی بدعت کی وجہ سے امام ابو یوسفؒ نے اس سے مفارقت اختیار کرلی تھی، امام عبد القاہر بغدادی نے لکھا ہے:

(بشر المریسی) وکان فی الفقہ علی رای — بشر المریسی فقہیات میں امام ابو یوسف کا تبع تھا
ابی یوسف القاضی غیر انہ لما اظھر — لیکن جب اس نے اپنے عقیدۂ خلق قرآن کا اظہار کیا
قولہ بخلق القرآن ھجرہ ابو یوسف[3] — تو امام ابو یوسف نے اس سے مفارقت اختیار کرلی۔

بشر عہد مامونی کا زبردست متکلم تھا جب علمائے اہل سنت نے متکلمین معتزلہ کے ساتھ مناظرہ سے انکار کیا تو امام عبد العزیز مکی صاحب کتاب الحیدہ مامون کے دربار میں پہنچے اور مجمع عام میں بشر بن غیاث المریسی

[1] الملل والنحل للشہرستانی ج اول ص ۲۰ [2] مذہب اللہ عند المسلمین ص ۱۲۶ [3] الفرق بین الفرق ص ۱۹۲

کو مسئلہ خلق قرآن کے باب میں عقلی و شرعی دلائل سے شکست دی (اس کی تفصیل آگے آئے گی)

مامون الرشید کا عہد حکومت ہر طرح سے تاریخ اسلام کا "عصر زریں" کہلانے کا مستحق ہے، روشن خیالی، فراخ مشربی اور علم و حکمت کی سرپرستی کی اس سے بڑھ کر اور کوئی مثال نہیں ملتی، مگر اس خورشید درخشاں پر "فتنۂ خلق قرآن" اور "امتحان ائمہ" کا بدنما داغ لگا ہوا ہے، وہ طبعاً عقلیت کا پرستار تھا، اور علوم الاوائل کا دلدادہ، اور جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی اس کا یہ میلان بھی بڑھتا گیا، ابن شاکر کتبی نے لکھا ہے:

ولما كبر عني بالفلسفة وعلوم الاوائل	مامون جب بڑا ہوا تو اسے یونانی علوم کا شوق ہوا اور فلسفہ
ومهر فيها فجره ذلك الى القول بخلق القرآن[1]	میں مہارت حاصل کی، اسی وجہ سے وہ خلق قرآن کا قائل ہو گیا،

چنانچہ ربیع الاول ۲۱۲ھ میں اس نے معتزلۂ دربار کے اثر سے جو مہدی کے زمانہ سے دربار خلافت پر چھائے ہوئے تھے "خلق قرآن" کا اظہار کیا، مگر رائے عامہ عرصہ سے متکلمین کی سرگرمیوں سے بیزار تھی، لہذا اس میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی اور اس تحریک کو ملتوی کرنا پڑا، سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے:

وفي سنة اثنتي عشر اظهر المامون	۲۱۲ھ میں مامون نے عقیدہ خلق قرآن کا اعلان
القول بخلق القرآن.... فاشمأزت	کیا، اس سے رائے عامہ بھڑک اٹھی اور قریب تھا کہ
النفوس وكاد البلاد يفتتن ولم يلتئم	شہروں میں فتنہ و فساد پھیل جائے، لہذا اس میں کامیابی
له من ذلك فكف عنه الى سنة ثمان عشرة[2]	نہیں ہوئی، اس لیے وہ ۲۱۸ھ تک اس سے رکا رہا،

۲۱۸ھ میں مامون رومیوں سے جنگ کرنے گیا، میدان جنگ سے اس نے وہ مشہور خط بغداد میں اپنے نائب کو بھیجا جس میں باضابطہ عقیدۂ خلق قرآن کی بالجبر اشاعت پر زور دیا تھا، اس طویل خط کو طبری نے نقل کیا ہے، اس حکم کے بموجب اس عقیدے کی جبریہ اشاعت کرائی گئی اور اکابر علما، مثلاً محمد ابن سعد کاتب واقدی اور یحییٰ بن معین وغیرہ کو مامون کے پاس بھیجا گیا، جہاں انھیں اس "امتحان" سے دوچار ہونا پڑا،

---

[1] فوات الوفیات ج ۱ ص ۲۳۹ [2] تاریخ الخلفاء ص ۲۱۰

اس کے بعد کی تفاصیل غیر ضروری ہیں. مگر مامون کے آخری خط میں مشاہیر علما، کی ذاتی کمزوریوں پر بھی حملہ کیا گیا ہے، مامون کی عالی ظرفی سے تو یہ بعید تھا کہ وہ ان افراد رعایا کی کمزوریوں کی ٹوہ میں رہا ہو، البتہ درباری علما، ائمۂ اہل سنت سے خار کھائے بیٹھے تھے، اور غالباً ان ہی کے ایما سے یہ خط لکھا گیا تھا، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ "من طلب الدین بالکلام تزندق" کا انتقام لیا جا رہا تھا، اور "حکمی فی اھل الکلام ان یضربوا بالجرید والنعال" تو ایک دھمکی بنکر ہی رہ گیا تھا، مگر معتزلۂ دربار نے اس دھمکی کا بدلہ عملی جامہ ضرب حتیٰ کہ قتل سے لیا، بیشمار بندگان خدا پابجولاں دربار میں "امتحان" کے لیے لائے جاتے، امام احمد بن حنبل کے اس شدت سے تازیانے لگائے گئے کہ وہ بیہوش ہوگئے، نصر بن احمد خزاعی کو صرف اسی جرم میں قتل کرکے ان کی لاش بابک خرمی کے برابر صلیب دی گئی،

بہر حال یہ باور کرنے کے کافی وجوہ ہیں کہ ۲۱۲ھ سے ۲۳۳ھ تک قلمرو ئے خلافت میں جو کچھ ہوتا رہا وہ صرف ایک "اصولی نظریاتی" جنگ نہ تھی بلکہ بہت کچھ تنگ نظر علما کے ذاتی تحاسد و تباغض کا نتیجہ تھا، اگر دیانتداری کے ساتھ محض احقاق حق ہی اس تحریک کا مقصد ہوتا تو غالباً جب دربار میں امام عبد العزیز مکی نے بشر بن غیاث المریسی کو خلیفہ کے روبرو مناظرے میں عقلی و شرعی دلائل سے لاجواب کر دیا تھا، تو مامون کو اس سے دستبردار ہو جانا چاہیے تھا، یا کم از کم اس تشدد کو روا نہ رکھنا تھا، مگر متکلمین دربار خلفا کے کان بھرتے رہتے تھے، اور وہ اس سے متاثر ہو کر یہ ظالمانہ اعلانات نکالتے رہتے تھے۔

فتنۂ خلق قرآن کی تاریخ میں امام عبد العزیز مکی اور بشر بن غیاث المریسی کے مناظرے کی خاص اہمیت ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احقاق حق کے علاوہ سخن پروری بھی اس تحریک میں کارفرما تھی، اس حیثیت سے اس کی تفصیل ضروری تھی مگر خوف طوالت مانع ہے تاہم دو چار کلمے اس سلسلے میں کہنا از بس ضروری ہیں،

پہلے تو "کتاب الحیدۃ" جس میں اس مناظرے کی تفاصیل مرقوم ہیں، اس کے قابل اعتماد ہونے کا مسئلہ ہے، اس سلسلے میں تین شک کیے جا سکتے ہیں،

ا۔ امام عبدالعزیز مکی کوئی فرضی شخصیت ہے،

ب۔ کتاب "الحیدہ" کسی بعد کے غیر معتزلی کی تصنیف ہے جس نے اسے امام عبدالعزیز مکی کی طرف منسوب کر دیا ہے،

ج۔ امام عبدالعزیز مکی نے اس کتاب میں اظہار واقعہ کے بجائے مشیخت طرازی سے کام لیا ہے،

پہلے دو شکوک کا ازالہ تو اس بات سے ہو جاتا ہے کہ ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں مصنف اور تصنیف دونوں کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

عبد العزیز بن یحیی المکی:۔ فی طبقة	عبدالعزیز بن یحیی المکی: حارث المحاسبی کے
الحارث وھو عبد العزیز بن یحیی بن	ہمعصر ہیں، ان کا نام عبدالعزیز بن یحیی بن
عبد الملك بن مسلم ابن میمون	عبد الملک بن مسلم بن میمون الکنانی تھا، وہ
الکنانی۔ وکان متکلما مقدما و	مشہور متکلم اور زاہد و عابد تھے، علم کلام اور
زاھدا وعابدا وله فی الکلام	زہد میں کئی کتابوں کے مصنف تھے، ان کی
والزھد کتب۔ وتوفی وله من الکتب:	کتابوں میں کتاب الحیدہ مشہور ہے،
کتاب الحیدة فیما جری بینه وبین	جس میں ان کے اور بشر المریسی کے
بشر المریسی[1]	مناظرے کا ذکر ہے،

تیسرے شک کا ازالہ کتاب کا اسلوب بیان کرتا ہے: غیر متعلق واقعات، بدوی اکھڑپن اور دربار سے ناشناسائی صدق بیان کی شاہد ہے،

کتاب کے مستند اور قابل اعتماد ثابت ہو جانے کے بعد اس کے بیانات حکمراں طبقہ کی سخن پروری اور علمائے دربار کے بغض و حسد کو بے نقاب کرتے ہیں اس کی تفصیل تو موجب تطویل ہوگی، چند واقعات نقل کیے جاتے ہیں،

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۲۶۱

(۱) مناظرے کے آغاز میں یہ اصول طے ہوا تھا کہ ہر اختلافی امر میں کتاب سنت کا فیصلہ آخری اور انقطاعی ہوگا، چنانچہ امام عبد العزیزؒ نے یہ شرط رکھی تھی:

اذا اختلفنا فی شیٔ من الفروع رددنا [۱]	اگر ہم کسی فروعی مسئلے میں اختلاف کریں تو قرآن مجید
الی کتاب اللہ عزوجل فان وجدناہ فیہ	سے رجوع کرینگے، اگر وہاں اس کا حل ملجائے تو
والا الی سنۃ نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم	خیر ورنہ حدیث شریف سے رجوع کرینگے اگر وہاں سے
فان وجدناہ فیہا والا ضربناہ فی الحائط [۱]	جواب ملجائے تو خیر ورنہ اس مسئلہ کو دیوار سے دے مارینگے

اور مامون نے اس شرط کو منظور کرکے یقین دلا دیا تھا،

قال المامون ذا فعلا واصلا ہذا بینکما	مامون نے کہا اچھا اس بات کو دونوں اصول بنا لو
واتفقا علیہ وانا الشاہد علیکما [۲]	اور اس پر اتفاق کر لو اور میں تم دونوں کا گواہ ہوں

بلکہ آخر میں تو امام عبد العزیزؒ سے یہاں تک کہہ دیا تھا۔

قال فناظرہ بالتلاوۃ ونص التنزیل [۳]	مامون نے امام عبد العزیزؒ سے کہا تم بشر سے صریح آیات قرآنی
	کے استشہاد کے ساتھ مناظرہ کرو۔

لیکن آخر میں جب بشر بن غیاث المریسی کا قافیہ تنگ ہونے لگا تو اس نے اس اصول سے پیٹھ پھیر لی اور مامون سے صاف کہدیا:

قال بشر یا امیر المومنین عندی اشیاء	بشر نے کہا یا امیر المومنین میرے پاس بہت سے دلائل ہیں
کثیرۃ الا انہ یقول بنص التنزیل وانا	مگر عبد العزیز صریح آیات قرآنی سے استشہاد کیا کرتے
اقول بالنظر والقیاس [۴]	بحث کرتے ہیں اور میں نظر و قیاس (عقلی دلائل) کیا کرتا ہوں

(۲) علمائے دربار اپنے اور مخالفوں کی طرح امام عبد العزیزؒ کے قتل کے بھی خواہاں تھے، لیکن دوران مناظرہ

---

[۱] کتاب الحیدہ ص ۱۲ [۲] ایضاً [۳] ایضاً ص ۳۰ [۴] ص ۵۰

میں جب بشر نے خلق قرآن کے ثبوت میں آیۂ کریمہ " انا جعلناہ قرآناً عربیاً " پڑھی تو امام عبدالعزیز نے پوچھا کہ کیا قرآن میں جہاں بھی جعل کا لفظ آیا ہے وہ " خلق " ہی کے معنی میں ہے، بشر نے کہا " جی ہاں پورے قرآن میں "

اس پر امام عبدالعزیز نے کہا

اخبرنی عمن قال لبعض ولد آدم خلق	مجھے اس شخص کے بارے میں بتاؤ جو یہ کہتا ہو کہ قرآن کو
القرآن من دون اللہ امومن ھو ام کافر	اللہ نے نہیں بلکہ بنی آدم میں سے کسی نے پیدا کیا ہے، ایسا شخص
قال بشر کافر حلال الدم[1]	مومن ہے یا کافر، بشر نے جواب دیا وہ کافر ہے جس کا

اسی طرح انھوں نے متعدد سوالوں کے جواب میں بشر سے " کافر حلال الدم " کہلوا لیا، اسکے بعد اس پر حجتیں قائم کرنا شروع کیں، مثلاً

قال سبحانہ علی المقتسمین الذین	اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا " بانٹنے والوں پر جنھوں نے
جعلوا القرآن عضین فزعم بشر	کلام الٰہی کو تکے بوٹی کر لیا " ۔ پس بشر نے گمان کیا کہ ان
ان المقتسمین خلقوا القرآن[2]	مقتسمین (بانٹنے والوں) نے قرآن کو پیدا کیا ہے،

اور اس سے زیادہ یہ کہ

قال اللہ عزوجل ولا تجعلوا اللہ عرضۃ	اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ " اور اللہ کو اپنی قسموں کا
لایمانکم فزعم بشر ان معنی ولا تجعلوا	نشانہ نہ بنالو " پس بشر نے گمان کیا کہ ولا تجعلوا اللہ
اللہ ولا تخلقوا اللہ لا معنی لہ عندہ	کے معنی ہیں " مت پیدا کرو اللہ کو " اسکے علاوہ اسکے
غیرہ الا ثم قال من قال ھذا فھو	نزدیک دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے، پھر کہتا ہے جو ایسا
کافر حلال الدم[3]	کہے وہ کافر ہے جس کا خون بہانا جائز ہے.

لیکن امون پر ان حجتوں کے قیام کا کوئی اثر نہیں ہوا، اس نے اعتراف تو کیا مگر رجوع نہیں کیا.

---

[1] کتاب الحیدہ ص ۳۷ [2] ایضاً ص ۳۹ [3] ایضاً ص ۳۷

فاقبل علی المامون وقال حسبك	پس مامون میری طرف متوجہ ہوکر بولا عبد العزیز
یا عبد العزیز فقد اقر بشر علی نفسه	بس کرو کیونکہ بشر نے اپنے کافر ہونے اور جائز القتل
بالکفر واحلال الدم واشهدنی	ہونے کا اقرار کر لیا اور اس باب میں مجھے اپنے پر
علی نفسه بذلك وقد صدقت فیما	گواہ بنایا، جو کچھ تم نے کہا سچ کہا لیکن بشر نے جو کچھ کہا
قلته ولکنه قال ما قال وهو لا یعقل	ایسی حالت میں کہا کہ نہ اسے اتنی عقل تھی اور نہ اس کا
ولا یعلم ما علیه فیه[1]	علم تھا کہ ایسا کہنے سے اس پر کیا اعتراض وارد ہونگے،

یہ واقعہ اس بات پر شاہد عدل ہے کہ خود مامون کو احقاق حق سے زیادہ سخن پروری منظور تھی،

(۳) آخر میں بشر نے خود تجویز پیش کی تھی کہ اگر عبد العزیز کتاب و سنت کے بجائے عقلی طور پر مجھ سے مناظرہ کرے اور میں اسے قائل نہ کر دوں تو میرا خون حلال ہے:

فلیدع مناظرتی بنص التنزیل و	مجھ سے آیات قرآنی کے ذریعے مناظرہ کرنا چھوڑ دے
لیناظرنی بغیره فان لم یدع قوله	اور اسکے بجائے دوسرے (عقلی) دلائل سے مناظرہ کرے
ویرجع عنه ویقول بقولی بخلق القرآن	تو اگر وہ اپنے عقیدے سے باز نہ آئے اور میرا مذہب
الساعة فدمی لك حلال[2]	اختیار نہ کرلے اور قرآن کے مخلوق ہونے کا فوراً اقرار کرے تو میرا خون حلال ہے

امام عبد العزیز نے عقلی دلائل سے بھی بشر کو لاجواب کر دیا، لیکن ایفائے مشروط کے بجائے مامون نے احسنت و مرحبا کا نعرہ بلند کر کے اور دس ہزار درہم دیکر سخن پروری کی حیثیت ثابت کی۔

فقال المامون احسنت یا عبد العزیز	مامون نے کہا اے عبد العزیز شاباش! پھر مجھے
ثم امر لی بعشرة آلاف درهم[3]	دس ہزار درہم دینے کا حکم دیا،

(۴) اور کتاب کا خاتمہ جن الفاظ پر ہوا ہے ان سے تو یہ حقیقت صاف ہو جاتی ہے کہ جابرہ عہد کی

---

[1] کتاب الحیدہ ص ۴۹ [2] ایضاً ص ۵۰ [3] ایضاً ص ۵۵

طوت سے اہل سنت سکوت عن الحق پر مجبور رہتے، اسی لیے امام عبد العزیز نے اس کی پوری تفصیل نہیں دی،

ولم یتهیأ لی ان اشرح هذا کله	اور میرے لیے اس واقعہ کو شرح و بسط سے بیان کرنا
مما تخوفت علی نفسی مما قد یلحقنی	ممکن نہ ہو سکا کیونکہ مجھے اپنی جان کا خوف تھا کہ
بعد هذا المجلس وما جری بسبب	اس مجلس مناظرہ کے بعد مجھ پر کیا آفت آئے
الاوراق علی الناس[1]	اور ان اوراق کے سبب لوگوں پر کیا افتاد پڑے،

یہ واقعات ثابت کرتے ہیں کہ مامون اور اس کے درباری علما محض خود رائی کی خاطر اس فتنہ کو فروغ دے رہے تھے، ورنہ نہ عقل اس کی مؤید تھی، نہ شریعت،

مامون کی وفات پر معتصم اس کا جانشین ہوا اور ایک جانشین کی حیثیت سے اس نے اپنے پیشرو کی پالیسی کو جاری رکھا، سیوطی نے لکھا ہے:

فسلك ما کان المامون علیه وختم به	معتصم بھی مامون کی روش پر چلا اور لوگوں کو
عمره من امتحان الناس بخلق القرآن	خلق قرآن کے عقیدہ پر مجبور کرنے میں اپنی عمر ختم
.... وقتل علیه خلقا من العلماء وضرب	کر دی، .... اور اس جرم میں بہت سے علما کو قتل کیا
الامام احمد بن حنبل وکان ضربه	اور امام احمد بن حنبل کو بلوایا اور یہ سزا انھیں
سنة عشرین ....[2]	۲۲۰ھ میں دی گئی،

خلفا، اس قول کی سخافت اور اس فتنہ کی شناعت سے اچھی طرح واقف تھے مگر دربار پر معتزلہ چھائے ہوئے تھے، اور انھوں نے اس مسئلہ کو حق و باطل کے بجائے دربار خلافت کے وقار اور کمزوری کا مسئلہ بنا دیا تھا، معتصم باللہ اس "محنۃ" کو ختم کر دینا چاہتا تھا، مگر احمد بن ابی داؤد جو بشر بن غیاث المریسی کا شاگرد صحیح معنوں میں جانشین تھا اور اس کے ساتھ ساتھ معتصم کے مزاج میں بھی دخیل تھا، اسے اس کے جاری

---

[1] کتاب الحیدہ ص ۵۵ [2] تاریخ الخلفا ص ۲۲۹

رکھنے پر برانگیختہ کرتا رہا، حافظ ابن تیمیہ نے لکھا ہے:

وظهر للخليفة المعتصم امرهم وعزم على رفع المحنة حتى الح عليه ابن ابى دؤاد يشير عليه انك ان لم تضربه انكسر ناموس الخلافة تضربه فعظمت الشناعة من العامة والخاصة فاطلقوه[1]

خلیفہ معتصم باللہ پر اس مسلک کی کمزوری واضح ہوگئی تھی اور اس نے اس "محنۃ" کو موقوف کرنے کا تہیہ کر لیا تھا، مگر احمد بن ابی داؤد نے اصرار کیا اور کہا کہ اگر آپ احمد بن حنبل کو کوڑے نہ لگوائیں گے تو خلافت کا وقار ختم ہو جائیگا، اسلیے انکے کوڑے لگوائے، مگر عوام وخواص سبھی نے اس بات کی مذمت کی

معتصم نے ۲۲۷ھ میں وفات پائی مگر عموریہ کی فتح سے اس نے جو نیکنامی حاصل کی تھی امام احمد ابن حنبل کی جلد وضرب سے وہ ماند ہو کر رہ گئی، اس کا جانشین واثق ہوا، وہ اس سے زیادہ اکھڑ تھا لیکن معتزلہ دربار بالخصوص قاضی احمد بن ابی داؤد کے اثر ورسوخ سے اس نے بھی با دل ناخواستہ اس ظلم وتشدد کو جاری رکھا، خطیب بغدادی نے لکھا ہے:

كان احمد بن ابى داؤد قد استولى على الواثق وحمله على التشدد فى المحنة ودعا الناس الى القول بخلق القرآن

احمد بن ابی داؤد واثق کے مزاج پر غالب تھا اور اسی نے اسے اس "محنت" [لوگوں کو بالجبر قرآن کے مخلوق ہونے کا عقیدہ رکھنے] کے بارے میں تشدد ومبالغہ برتنے پر آمادہ کیا اور لوگوں کو خلق قرآن کے عقیدے کی طرف دعوت دی۔

چنانچہ ۲۳۱ھ میں اس نے بصرہ کے ائمہ وموذنین کو "محنۃ" کے شکنجے میں کسنے کا حکم دیا، سیوطی نے لکھا ہے:

وفى سنة احدى وثلثين ورد

۲۳۱ھ میں واثق کا حکم نامہ بصرہ کے گورنر کے پاس

---

[1] منہاج السنۃ ج ۱ ص ۲۵۶، ۲۵۷

كتابه الى امير البصرة يامره ان يمتحن	پہنچا جس میں اسے حکم دیا گیا تھا کہ ائمہ و موذنین
الائمة والموذنين بخلق القرآن	سے قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کرائے، اس باب
وكان قد تبع اباه في ذلك[1]	میں واثق نے اپنے باپ کی پیروی کی تھی،

اس تعصب و تشدد کا انتہائی شرمناک پہلو یہ تھا کہ اسی سال جب رومیوں سے مسلمان قیدیوں کی رہائی کا معاملہ طے ہوا تو احمد بن ابی داؤد نے حکم دیا کہ جو قیدی قرآن کے مخلوق ہونے کا اقرار کریں انھیں تو چھڑایا جائے اور جو انکار کریں انھیں رومیوں کی قید ہی میں چھوڑ دیا جائے لیکن اب اس ظلم و ستم کے دن ختم ہو چکے تھے، ہاں آخری شہادت درکار تھی، اور یہ مقدس فریضہ شہید نصر بن احمد خزاعی نے انجام دیا، انھوں نے قرآن کو مخلوق کہنے سے انکار کیا اور واثق نے فقہائے معتزلہ کے فتوی سے انھیں اپنے ہاتھ سے شہید کیا، سر بدن سے الگ کیا، پھر سر تو بغداد میں نصب کیا گیا اور لاش سامرا میں بابک خرمی کے برابر صلیب دی گئی،

واثق نے یہ خون ناحق اپنے ہی ہاتھ سے بہایا مگر اس کا ضمیر اسے اس ظلم و تشدد پر ضرور ملامت کرتا رہا ہوگا، اور عام خیال یہی ہے کہ اس نے موت سے پہلے اس ظالمانہ "محنۃ" سے رجوع کر لیا، سیوطی نے لکھا ہے:

وكان قد تبع اباه في ذلك ثم رجع في آخر امره[2]	اور واثق نے اس محنہ کے باب میں اپنے باپ کے نقش قدم پر چلا تھا مگر آخر میں اس نے اس سے رجوع کر لیا

اسی طرح خطیب بغدادی نے لکھا ہے

ويقال انه رجع عنه قبل موته	اور کہا جاتا ہے کہ واثق نے مرنے سے پہلے "محنۃ" سے رجوع کر لیا تھا

یہ کس طرح ہوا؟ کہتے ہیں کہ ابو عبد الرحمن عبد اللہ بن محمد الازدی جو امام ابو داؤد سجستانی ؒ اور

[1] تاریخ الخلفاء، ص ۲۳۲ [2] ایضاً

امام نسائی کے اساتذہ میں سے ہیں، پابجولاں واثق کے پاس "محنۃ" کے لیے لائے گئے، ابن ابی داؤد بھی وہاں موجود تھا، ابو عبد الرحمٰن نے پوچھا" بتاؤ جس چیز کی طرف تم دعوت دیتے ہو اسے جناب نبی کریمؐ جانتے تھے اور جانتے ہوئے لوگوں کو اس کی دعوت نہیں دی یا جانتے ہی نہیں تھے، ابن ابی داؤد نے جواب دیا "نہیں بلکہ جانتے تھے،" ابو عبد الرحمٰن نے فرمایا کہ رسول کے لیے تو گنجایش تھی کہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت نہ دیں اور تمھارے لیے گنجایش نہیں ہے، اس برمحل اعتراض سے سب لاجواب ہوگئے[1] اور واثق باوجود کوشش کے ہنسی ضبط نہ کرسکا، اس لیے جلد ہی اندر چلا گیا جہاں وہ بار بار کہتا تھا۔

وسع النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان یسکت عنہ ولم یسعنا[2]

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے تو گنجایش تھی کہ وہ اس سے سکوت برتیں مگر ہمارے لیے گنجایش نہیں ہے!

غرض واثق کا ضمیر اسے ملامت کرتا تھا مگر جھوٹا وقار اس کے اعلان سے مانع تھا، اگلے سال اس کی وفات پر اس کا بھائی متوکل علی اللہ خلیفہ ہوا، اس نے زیادہ حقیقت پسندی سے کام لیا، وہ جانتا تھا کہ نہ صرف رائے عامہ ہی اس "محنہ" کے خلاف ہے بلکہ عقل و شرع کوئی اس کی تائید نہیں کرتا، لہٰذا خلیفہ ہوتے ہی اس نے اس مسئلہ میں مناظرہ بازی کی ممانعت کردی:

وکان المتوکل لما ولی نهی عن الجدال فی القرآن وغیرہ وکتب الی الآفاق بذلك[3]

جب متوکل خلیفہ ہوا تو اس نے قرآن کے مخلوق یا غیر مخلوق ہونے کے بارے میں مناظرہ کی ممانعت کردی اور سارے قلمرو میں (اس کے متعلق احکام بھیج دیے)

اسکے ساتھ اس نے احیاءِ سنت کیلیے محدثین کو بلا کر انکی ہر طرح ہمت افزائی کی، سیوطی نے لکھا ہے:

المتوکل علی اللہ ... فاظهر المیل الی السنة ونصر اهلها ورفع المحنة وکتب بذلك الی الآفاق وذلك فی سنة اربع وثلاثین

متوکل علی اللہ خلیفہ ہوا ..... اسکا سنت کیجانب میلان تھا، اور اس نے اہل سنت کی مدد کی، محنت کو موقوف کردیا اور قلمرو خلافت میں اس کا اعلان کردیا،

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۳۴۰ [2] ایضاً [3] کامل لابن اثیر ج ۷ ص ۲۱

واستقدم المحدثین الی سامرا و	یہ ۲۳۴ھ کا واقعہ ہے، اس کے علاوہ اس نے
اجزل عطایاھم واکرمھم وامرہان	محدثین کو سامرا میں بلا کر گراں بہا عطیات دیے اور
یحدثوا باحادیث الصفات والرؤیۃ[1]	تعظیم و تکریم کی، انھیں حکم دیا کہ صفات باری اور
	رویت باری کے متعلق احادیث کی روایت کریں،

بہرحال تجہم و اعتزال کے دن پورے ہو چکے تھے معتزلہ کا اثر دربار سے زائل ہونا شروع ہوا ان کا زعیم ابن ابی داؤد معرض عتاب میں آیا، اس لیے نہیں کہ اس کے اشارے پر علمائے اہل سنت کو "محنۃ" کے شکنجے میں کسا گیا تھا، یا بیگناہ نصر بن احمد خزاعی کا خون بہایا گیا تھا، بلکہ اس لیے کہ اس نے اپنے دامن کو ان انسانی کمزوریوں سے جن کا الزام معتزلۂ دربار دوسرے علما پر لگاتے تھے، زیادہ گھناؤنی بدکاریوں، رشوت ستانی، خیانت اور تغلب بیجا سے ملوث کر رکھا تھا، ابن الاثیر نے ۲۳۷ھ کے واقعات میں لکھا ہے:

وفیھا غضب المتوکل علی احمد بن ابی داؤد	اور اس سال متوکل احمد بن ابی داؤد سے ناراض
وقبض ضیاعہ واملاکہ وحبس ابنہ[2]	ہوا، اسکی جائداد ضبط کر لی گئی اور اولاد قید کردی گئی،

اسی عالم میں قاضی احمد بن ابی داؤد نے ۲۴۰ھ میں وفات پائی اور اسکے ساتھ معتزلی تعصب و تشدد کا دور ختم ہوا، یہ پس منظر تھا جس میں "کلام باری" کے متعلق مختلف اسلامی فرقوں کے مذاہب متعین ہوئے، ان مذاہب کی تفصیل سے پیشتر اس تاریخی پس منظر پر ایک نگاہ بازگشت ڈال لینا مناسب ہوگا،

۱- تمام الہامی مذاہب میں "کلام باری" کے تصور کو اساسی حیثیت حاصل ہے،

۲- تجریدی توحید (Abstract Monotheism) سرا سر باہر کا اثر ہے کسی الہامی مذہب کی داخلی تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے،

۳- تنزیہہ تا تعطیل" اور کلام باری کی دور از کار توجیہات سرا سر غیر اسلامی ہیں،

۱؎ تاریخ الخلفاء ص ۲۳۰ ۲؎ کامل لابن اثیر ج سابع ص ۱۹

ٹونک کے دو قدیم کتب خانے

از جناب مولوی سید منظور الحسن صاحب برکاتی استاد دارالعلوم خلیلیہ ٹونک

ٹونک میں کتب خانوں کے باضابطہ قیام کی ابتدا دوسرے فرمانروا نواب وزیر الدولہ کے عہد سے ہوتی ہے لیکن اس سے پہلے کہ اصل موضوع پر سلسلۂ سخن شروع کیا جائے، ماحول اور پس منظر کو سمجھنے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاست ٹونک کے قیام اور اس کی سیاسی و بنیادی تاریخ پر مختصراً روشنی ڈال دی جائے، نیز اجمالاً ان سیاسی اسباب کا بھی تذکرہ کر دیا جائے کہ جن کی بنا پر اس ریاست کی تاسیس عمل میں آئی،

یہ ریاست جو آج راجستان کے ایک ضلع کی حیثیت رکھتی ہے، راجستان کی ریاستوں میں واحد مسلم ریاست تھی، اور آج سے پورے ایک سو بیالیس سال پہلے ۱۸۱۷ء میں عالم وجود میں آئی تھی، اس کے بانی نواب امیر الدولہ محمد امیر خاں بہادر سنبھل کے ایک منچلے اور بہادر افغان تھے جنھوں نے ہندوستان کی مختلف ریاستوں کو جنگی خدمات میں نمایاں مدد دی تھی، اور مہارانا ہلکر کی معاونت میں انگریزوں سے جنگ کر کے بہت سے علاقے فتح کر لیے تھے،

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کی بنا پر عام طور پر طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی، صوبے اور ریاستیں خود مختار ہو چکی تھیں، اور انگریزوں نے ملک میں ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کیے تھے، اس وقت مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور نواب امیر خاں بہادر نے باہمی معاہدہ کر کے انگریزوں سے مقابلہ کیا اور آزادی کی جنگ کی اس ملک میں ابتدا کی اور باہمی اتحاد سے متحدہ قومیت کا سنگ بنیاد رکھا،

۱۸۱۶ء میں جب مہاراجہ ہلکر نے انگریزوں سے صلح کرلی اور ان کے ورغلانے سے ساتھیوں نے ساتھ چھوڑنا شروع کردیا تو امیرالدولہ بہادر نے مجبور ہو کر اس چھوٹی سی ریاست پر انگریزوں سے مصالحت کرلی اور ۱۸۱۷ء میں بتوسط لالہ نرنجن لال مختار، عہدنامہ پر دستخط کردیے۔

نواب امیر خاں قیام ریاست کے بعد سترہ سال تک حکمراں رہے، ۱۸۳۴ء میں انکا انتقال ہوا، ان کا پورا عہد حکومت ریاست کی بنیاد مستحکم کرنے میں ختم ہوا، انھیں اتنی مہلت ہی نہ مل سکی کہ وہ ریاست میں باقاعدہ عدالتی یا تعلیمی نظام قائم کرتے، ان کے زمانہ میں ریاست کا نظام فوجی طاقت پر قائم تھا۔

نواب امیر خاں کے بعد نواب وزیر محمد خاں "وزیرالدولہ امیرالملک" مسند ریاست پر جلوہ فگن ہوئے، عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد انھوں نے ریاست کی تنظیم جدید کی طرف توجہ مبذول کی، اور پٹھانوں کے غیر منظم جرگے کو آئینی ریاست کے قالب میں ڈھال دیا، آپ نے اپنی دوربین نگاہوں سے جب ریاست کے حالات کا جائزہ لیا تو سب سے بڑی کمی یہ محسوس کی کہ اس نئی ریاست میں اہل سیف تو بہت زیادہ جمع ہوگئے ہیں، لیکن اہل قلم اور اہل علم کی بڑی کمی ہے، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے آپ نے تہیہ کیا کہ جہانتک ممکن ہو اصحاب کمال کو ریاست میں جمع کیا جائے۔

وہ خود صاحب علم تھے، اور اہل علم وارباب فن کی قدر و منزلت کرتے تھے، انکی قدردانی اور فیض رسانی کی اتنی شہرت ہوئی کہ اطراف ہند سے ارباب فضل و کمال کھنچ کھنچکر ٹونک آنے لگے، ان میں بہترے خود سے آئے اور بہتوں کو وزیرالدولہ نے بلایا، اس طرح بڑے بڑے علما، اور فضلا نے وزیری اقبال کے سایہ میں پناہ لی، مصنف تاریخ ٹونک مولوی سید اصغر علی آبرو کا بیان ہے کہ

> ان کی شاہانہ فیاضیوں سے ان کا آستانۂ فیض ہر ایک علم و فن کے اہل کمال کا قبلۂ حاجات اور مرکز عقیدت بنا ہوا تھا، شہنشاہ اکبر کے نورتن ہی نہیں بلکہ سیکڑوں یگانۂ روزگار اور باکمال ہستیاں دربار وزیری میں جمع ہوگئی تھیں، اور ان کی بارگاہ سلیمان جاہ مرجع ارباب

فضل وکمال و مجمع دانایان روزگار و پختہ کاران باوقار تھی"۔ (ص ۳۲)

وزیر الدولہ صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تصنیف بھی تھے، آپ نے متعدد کتابیں تصنیف فرمائی ہیں، جن میں "وصایائے وزیری" فارسی میں علم اخلاق کی بہترین کتاب ہے،

"اس کتاب میں مختلف مناسبتوں سے ۵۶ مقام پر نواب صاحب نے عاشقانہ وارفتگی اور مریدانہ عقیدت مندی کے ساتھ حضرت سید صاحب (سید احمد شہیدؒ) اور آپ کے رفقا کا تذکرہ کیا ہے، اور ان کے حالات وکمالات درج کیے ہیں، جن میں اکثر آپ کے چشم دید ہیں"

(سیرت احمد شہید مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ص ۹)

وزیر الدولہ کو علمی، ادبی، اسلوبی اور تاریخی کتابیں جمع کرنے کا بے حد شوق تھا، آپ کے عہد میں جس قدر نایاب اور نادر کتابیں زر کثیر صرف کرکے جمع کی گئی تھیں، ان کے لیے ایک خاص عمارت قلعہ معلی میں تعمیر کرائی گئی تھی، اس کتب خانہ کی اکثر کتابیں مطلا اور مذہب اور نقاشی اور طلاکاری کا بہترین نمونہ تھیں، اور اپنے مخطوطات ونوادرات کے لحاظ سے ہندوستان کے کتب خانوں میں خاص امتیاز رکھتا تھا، دور دور اس کی شہرت تھی، اس کی فہرست برٹش میوزیم کے لیے سرہنری ایلیٹ کی خواہش پر فرمانروائے ٹونک نے بھیجی تھی، جس کا تذکرہ جناب محمد عباس خاں شروانی ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے بھی اپنے ایک مضمون "تاریخ التواریخ" میں کیا ہے،

"آیئے سب سے اول ریاست ٹونک کے کتب خانوں کی سیر کریں، یہاں دو کتب خانہ ہیں، ایک تو پبلک لائبریری ہے، مگر جامعیت یا نوعیت کے لحاظ سے یہ کوئی بڑا اور مشہور ذخیرہ نہیں ہے، دوسرا مشہور کتاب خانہ ہندوستان میں اور ایک زمانہ میں ہندوستان سے باہر بھی معروف، ہز ہائی نس نواب صاحب کا کتب خانہ ہے، جو قلعہ کے اندر ہے، اس میں چند نادر الوجود نسخے ہیں، ایک زمانہ میں اس کتاب خانہ کی کتابوں کی فہرست فرمانروائے ریاست نے

سرہنری ایلیٹ کو دی تھی اور یہ اب برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے۔"

(اخبار نیا ہندوستان علی گڈھ، یکم اکتوبر ۱۹۴۸ء)

قلعۂ معلّیٰ کے اس کتب خانہ سے نواب صاحب کے متوسل علماء اور ندما ہی فائدہ اٹھا سکتے ...ے، ہر شخص آسانی سے اور بلا اجازت نہیں دیکھ سکتا تھا۔

عہد وزیری سے لیکر موجودہ ہز ہائی نس نواب محمد اسمٰعیل علی خاں بہادر کے عہد تک یہ نادر الوجود ...ب خانہ اسی شان و اہتمام سے قلعۂ معلّیٰ ہی میں تھا لیکن ریاست کے راجستان میں شامل ہونے ...بعد موجودہ نواب صاحب نے اس کو قلعۂ معلّیٰ سے "ہز ہائی نس ہیلس نذر باغ" میں منتقل فرما دیا ...ر اس سے استفادہ کی عام اجازت بھی دیدی۔

اس کتب خانہ کو جب وہ قلعۂ معلّیٰ کی ایک شاندار عمارت میں سجا ہوا تھا، میں نے بھی دیکھا تھا۔ ...ابیں فن وار الماریوں میں بڑے سلیقے سے جمی ہوئی تھیں، کتابوں کی کئی فہرستیں تھیں، جو جدید طرز ...ریاست کے چوتھے فرمانروا نواب ابراہیم علی خاں بہادر کے عہد میں جناب شیخ محمد یعقوب صاحب ...نگرانی میں تیار کرائی گئی تھیں، ان میں کتاب کے نام اور فن کے ساتھ صاحب تصنیف کا بھی ...ضر حال درج تھا، کتابوں پر خوبصورت اور بھولدار کپڑے کی چولیاں چڑھی ہوئی تھیں، جو مختلف ...وں کی تھیں، ہر فن کے لیے ایک قسم کی چھینٹ یا جامہ وار مخصوص تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک ...شنما گلزار ہے، جس میں مختلف رنگ و بو کے پھول کھلے ہوئے ہیں، الماریوں پر رنگین اور ...بصورت پردے آویزاں تھے، اور پٹیوں پر جو پوشش تھی وہ بھی دیدہ زیب اور خوشنما چھینٹ کی تھی، کتابوں کو پڑھنے اور مطالعہ کرنے سے قبل ہی ان کے ظاہری حسن سے جو خوشگوار اثر قلب و نظر ...پڑا اس سے ایک خاص سرور حاصل ہوا، بہت دیر تک تو مجھے اس دلفریب نظارہ ہی سے ...مہلت نہ ملی۔ اس کے بعد جب کتابوں کا مطالعہ کیا تو ہر فن میں بیسیوں نوادر نظر آئے۔ مثلاً

فن وعظ میں ایک کتاب بزبان فارسی "وصایاے بادشاہان جغتائیہ" نظر پڑی، کتاب کا ہر صفحہ طلائی کام سے آراستہ تھا، بہترین نقش و نگار کے ساتھ خط بھی نہایت پاکیزہ تھا، شاہان جغتائیہ میں سے جلال الدین محمد اکبر بادشاہ، نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ، شہاب الدین محمد شاہجہاں، اور اورنگ زیب عالمگیر کی تصاویر بھی کتاب کی زینت تھیں،

ایک اور کتاب چہار گلشن فارسی نظر سے گذری، کتاب کے شروع میں دو مہریں ثبت تھیں، ایک مربع تھی جس پر وزیر الدولہ امیر الملک نواب محمد وزیر خاں نصرت جنگ اور دوسری بیضوی تھی جس پر امیر و وزیر محمد علی ۱۲۸۱ھ کندہ تھا، کتاب کا سنہ تصنیف ۱۱۹۵ھ درج تھا، فہرست اس طرح تھی؛ گلشن اول در احوال بادشاہ ہندوستان، گلشن دوم در احوال صوبجات جنوبستان، گلشن سوم در مسافت و منازل از شاہجہاں آباد دہلی، گلشن چہارم در ذکر سلاسل فقرا و درویشان ہند۔

ایک چوبی اور منقش صندوق میں شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کا قلمی قرآن مجید تھا،

غرض اس قسم کے سینکڑوں نوادر و مخطوطات نظر سے گذرے اور کئی گھنٹے اس علمی گلزار میں گزارے جس سے روح و دماغ کو تازگی و بالیدگی حاصل ہوئی،

عہد وزیری میں مولوی عبد الکریم خاں صاحب ٹونکی، اس کتب خانہ کے ناظم تھے، موجودہ نواب صاحب کے عہد میں مولوی صاحبزادہ احمد خاں نازش اور نواب صاحب کے مشیر سخن مولانا سید عبد القادر صاحب خنداں یکے بعد دیگرے اس کتب خانہ کے ناظم رہے،

۱۹۵۴ء میں یہ کتب خانہ امام الہند مولانا ابو الکلام آزاد وزیر تعلیمات کی تحریک پر مرکزی حکومت نے "انڈین نیشنل لائبریری" کے لیے نواب صاحب سے خرید لیا اور یہ انمول و بے بہا ذخیرہ ٹونک سے دہلی منتقل ہو گیا،

یمین الدولہ نواب محمد علی خاں کا کتب خانہ | نواب وزیر الدولہ کے بعد دوسرا نمبر تیسرے فرمانروا نواب محمد علی خاں بہادر کے کتب خانہ کا ہے، جو ایک عرصہ تک "کتب خانہ سعیدیہ" کے نام سے مشہور تھا، اور اب "ڈسٹرکٹ لائبریری ٹونک" کے نام سے موسوم ہے،

یہ کتب خانہ بھی اپنے بیش بہا نوادر اور مخطوطات کے اعتبار سے بڑا قیمتی اور بے نظیر ہے، اس نے ریاست کے بڑے اہم دور دیکھے ہیں، اور یہ خود بھی اپنی نشو و نما میں بڑی بڑی دشوار گذار منزلوں سے گزرا ہے، مختلف آزمایشوں سے دوچار ہوا ہے، اس کے عروج و زوال کی کہانی بڑی درد انگیز اور عبرت خیز ہے، اس نے شہریاری بھی کی ہے، اور مسافرت و غربت کی کٹھن منزلیں بھی طے کی ہیں، یہ شاندار محلوں اور عالیشان ایوانوں میں نہایت عزت و احترام سے سجایا بھی گیا ہے اور بے بسی و کس مپرسی کی حالت میں ویران اور شکستہ عمارتوں میں بھی پڑا رہا ہے۔

اس کتب خانہ کی داغ بیل جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، یمین الدولہ نواب محمد علیخاں بہادر نے ڈالی تھی، نواب محمد علی خاں، وزیری علماء و فضلا کے سایہ میں پلے بڑھے تھے، حکومت و ریاست کے ساتھ دینداری اور علم و فضل بھی آپ کو ورثہ میں ملا تھا، علوم دینیہ میں یمین الدولہ کو کامل دستگاہ حاصل تھی، اور ان کا شمار اُس زمانہ کے جید علماء میں ہوتا تھا، زمانہ ولیعہدی ہی سے تصنیف و تالیف کا ذوق رکھتے تھے، اس لیے مسند نشین ریاست ہوتے ہی آپ نے تصنیف و تالیف کا کام سرگرمی کے ساتھ شروع کر دیا، اور ارباب علم و فن کو خاص طور پر اس اہم کام کے لیے متعین فرمایا، چنانچہ آپ کے مختصر دور حکومت میں بہت سی اعلیٰ تصانیف وجود میں آئیں اور زیور طبع سے بھی آراستہ ہوئیں، اس سلسلہ میں سب سے اہم تصنیف "قرۃ العیون" ہے، جس میں علوم عربیہ اور تاریخ اسلامیہ کے دقیق مسائل بڑی تحقیق و تنقید کے ساتھ بیان کیے ہیں، یہ کتاب پانچ ہزار صفحات پر مشتمل ہے۔

قیام ریاست سے ابتک دفاتر سرکاری کی زبان فارسی تھی، آپ نے اس کے بجائے اردو زبان

کو حکومت کے سنگھاسن پر بٹھایا اور خاص فرمان کے ذریعہ ریاست کی سرکاری زبان اردو کو قرار دیا،

نواب محمد علی خاں اپنے دادا نواب امیرالدولہ کی طرح جوشیلے تھے، اختیار ملتے ہی دہلی کے غدر کے بعد انگریزوں سے اس کا انتقام لینے کی فکر میں رہتے تھے لیکن ان کے پاس سرفروش آدمیوں کی کمی تھی، خود ان کے قریبی لوگ انگریزوں کے وفادار تھے، اور ان کے عزائم سے انگریزوں کو خبردار کرتے رہتے تھے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تین سال آٹھ ماہ کی حکومت کے بعد ہی لاوہ کے ٹھاکروں کے قتل کے الزام میں سرغنہ قرار دیکر معزول کرکے بنارس بھیجدیا گیا ؂

گرا جو دامن گلچیں میں گل نے رو کے کہا کہ میری جان کا دشمن تھا رنگ و بو میرا

بنارس پہنچکر نواب محمد علی خاں نے اپنی تمام توجہ تصنیفی و تالیفی کاموں کی جانب پھیر دی، ٹونک سے رخصت ہوتے وقت وہ اپنے تمام ندماء اور علماء کو اپنے ساتھ بنارس لے گئے، وہاں آپ نے "الاصلاح" کے نام سے ایک مدرسہ بھی قائم کیا تھا۔

جب آپ بنارس پہنچے تو چیدہ چیدہ کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ آپ کے ساتھ تھا جس میں آئے دن نئی نئی اور نادر و نایاب کتابیں اضافہ فرماتے رہے، اس طرح مختلف علوم و فنون کی نفیس اور نادر قلمی کتابوں کا ایک بیش بہا خزانہ آپکے کتب خانہ میں جمع ہوگیا،

بنارس میں کتب خانہ کی نگرانی جن حضرات کے سپرد تھی، ان میں محمد امین خلف فتح اللہ خاں ملیح آبادی، منشی ظہوراللہ خاں، منشی احمد زماں خاں نصیر آبادی، منشی سید محمد صدیق اور مولوی عبدالکریم خاں صاحب ٹونکی کے اسماء قابل تذکرہ ہیں، مولوی عبدالکریم صاحب کتب خانہ کی نظامت کے عہدہ پر فائز تھے، اور اس سے قبل وزیرالدولہ بہادر کے کتب خانہ قلعہ معلی کی بھی نگرانی فرما چکے تھے،

منشی محمد صدیق کی نگرانی میں کتابوں کی فہرستیں تیار ہوتی تھیں، اور سلیقے سے فن وار ترتیب

دیا جاتا تھا، ایک جماعت نادر اور کمیاب کتابوں کی نقلیں کرنے کے لیے متعین تھی۔

نواب محمد علی خاں معزولی کے بعد تیس سال تک حیات رہے۔ ۱۸۹۸ء میں بنارس ہی میں انتقال کیا۔ تاریخ ٹونک میں مولوی اصغر علی آبرو لکھتے ہیں:

حضور مغفور (محمد علی خاں) کا تیس سال تک بنارس میں قیام رہا، اس قیام کی مدت میں بڑے بڑے کام رفاہ عام و انتفاع عوام جاری فرمائے، ایک عالیشان مسجد ساٹھ ہزار روپیہ کی لاگت سے بنوائی، مدرسہ علوم اسلامیہ کی بنا ڈالی، مدرسین لایق و فایق معقول تنخواہ کے ملازم رکھے، طلبہ کے وظائف مقرر فرمائے، شبانہ روز علما کی صحبت، اہل علم سے رغبت، کتب دینیہ کا شوق، قال اللہ، قال الرسول کا ذوق پیرامون خاطر عاطر تھا، اکثر عمدہ عمدہ کتب دینیہ مفید عام تصنیف فرمائیں اور ہزارہا روپیہ کے صرفہ سے چھپوائیں، اور بغرض حصول ثواب عقبیٰ غربا و طلبہ اور ہر ایک اہل طلب کو مفت تقسیم کیں۔" (ص ۲۲۹)

یمین الدولہ کے انتقال کے بعد یہ کتب خانہ بنارس سے ٹونک منتقل ہوا، اور بطور ترکہ صاحبزادہ عبد الرحیم خاں کو ملا، صاحبزادہ صاحب یمین الدولہ کے تیسرے فرزند تھے، اور ایک عرصہ سے اپنے پدر بزرگوار کے سایہ میں بنارس ہی میں اقامت گزیں رہے تھے، یہ بھی علم دوست اور علم و فن کے قدر دان تھے، آپ نے اپنی عالیشان کوٹھی جو بازار علی گنج میں ہے، کتب خانہ کے لیے مخصوص کردی تھی، اور مطالعہ کرنے والوں کے لیے خاص انتظام کیا تھا، جو عملہ بنارس میں کتب خانہ پر مقرر تھا، صاحبزادہ عبد الرحیم خاں اس کو بھی کتب خانہ کے ساتھ ٹونک لے آئے تھے اور ان کی تنخواہیں اپنی جیب خاص سے ادا کرتے تھے۔

صاحبزادہ صاحب نے بھی اپنے ذاتی شوق سے اس کتب خانہ میں کافی کتابوں کا اضافہ کیا، دیوان مولوی شمس الدین صاحب (جن کا محلہ کالی پلٹن میں گھر مشہور ہے) عربی فارسی کے جید عالم تھے،

اور ٹونک کے عمائد و اراکین سلطنت میں شمار ہوتے تھے، ان کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، جو ایک مستقل کتب خانہ کی حیثیت رکھتا تھا، اس کتب خانہ میں بھی مختلف فنون کی کتابیں تھیں، جن میں نوادر بھی تھے، ان کے انتقال کے بعد یہ کتب خانہ بھی یمین الدولہ کے کتب خانہ میں شامل کر دیا گیا، بعض واقف کار حضرات کا بیان ہے کہ صاحبزادہ عبد الرحیم خاں نے دیوان جی کا کتب خانہ خرید لیا تھا، اور بعض لوگ اس کی تردید کرتے ہیں، بہر حال شمولیت کی نوعیت کچھ بھی ہو، یہ امر واقعہ ہے کہ وہ کتب خانہ بھی اس میں شامل ہوا،

ایک اور کتب خانہ جو مولوی عبد الحق صاحب ٹونکی کا ذاتی تھا، ان کی وفات کے بعد اسی کتب خانہ میں وقف کر دیا گیا، ۱۹۴۸ء میں ٹونک کے راجستان میں شمولیت کے بعد جب یہاں کا محکمۂ شریعت ختم کیا گیا تو اس کا کتب خانہ بھی جس میں زیادہ تر فقہ، حدیث اور تفسیر کی کتابیں تھیں، حکومت راجستان نے اسی کتب خانہ میں منتقل کر دیا، اسی طرح یہ کتب خانہ کئی کتب خانوں کا جامع ہو گیا، صاحبزادہ عبد الرحیم خاں کی وفات ۱۹۲۱ء میں ہوئی، ان کی وفات کے بعد یہ کتب خانہ جو اس وقت "عبد الرحیم خاں کے کتب خانہ" کے نام سے مشہور تھا، ان کے فرزندوں صاحبزادہ عبد السمیع خاں اور صاحبزادہ مولوی عبد المنعم خاں کی ملک میں منتقل ہو گیا اور صاحبزادہ عبد السمیع خاں اس کی نگرانی و سرپرستی فرماتے رہے،

کچھ عرصہ بعد جب صاحبزادہ عبد السمیع خاں نے رحلت کی تو صاحبزادہ عبد المنعم خاں اور صاحبزادہ عبد السمیع خاں کے فرزند عبد البصیر خاں کے درمیان کتب خانہ کے سلسلہ میں نزاع ہو گئی، رفع نزاع کے لیے جو تھے فرمانروا نواب ابراہیم خاں بہادر نے اس کی نگرانی اور انتظام صاحبزادہ محمد اسحاق خاں بہادر ممبر کونسل ریاست کے سپرد کر دیا، جو صاحبزادہ عبد الرحیم خاں کے بھائی بھی تھے۔ صاحبزادہ اسحاق خاں بہادر نے اس نزاع کو دور کرنے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ کتب خانہ کو

چچا بھتیجوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ لیکن صاحبزادہ عبد المنعم خاں نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا اور کتب خانہ پر بدستور ممبر صاحب کونسل کا انتظام بحال رہا، یہاں تک کہ نواب ابراہیم خاں بہادر خلد آشیاں ہوگئے اور ۱۹۳۰ء میں ان کے فرزند نواب سعادت علی خاں مسند ریاست پر متمکن ہوئے۔

نواب سعادت علی خاں بہادر نے اپنے جد امجد نواب محمد علی خاں کی صحبت میں بنارس ہی میں اکتساب علوم کیا تھا، والی ریاست ہونے کے بعد بھی ان کا یہ علمی ذوق باقی رہا اور قیام بنارس سے اس کتب خانہ کے حصول کی فکر میں تھے۔

اسے حسن اتفاق کہیے کہ ایک مرتبہ نواب صاحب کو کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت پیش آئی، اس کتاب کے کتب خانہ سے آنے میں غیر معمولی تاخیر ہوئی، اس دشواری کو محسوس کر کے نواب صاحب نے اس کتب خانہ کو "کوٹھی صاحبزادہ عبد الرحیم خاں" سے باغ عرب صاحب کی کوٹھی میں منتقل فرما دیا، اور اس کی نگرانی توشہ خانہ خاص کے سپرد فرما دی اور مہتمم توشہ خانہ منشی مرزا محمد بیگ صاحب مرحوم کو اس کتب خانہ کا ناظم مقرر فرما دیا، اور کتب خانہ کے عملہ کی تنخواہیں توشہ خانہ سرکاری کے بجٹ سے دیے جانے کا حکم صادر فرمایا۔

اس وقت اس کتب خانہ میں منشی رحمت اللہ خاں اور منشی فخر زماں خاں بحیثیت کارکن کام کر رہے تھے، تقریباً آٹھ سال یہ کتب خانہ عرب صاحب کی کوٹھی میں رہا، لیکن یہ عمارت شہر سے دور پڑتی تھی، مطالعہ کرنے والوں کو جانے آنے میں دقت ہوتی تھی، اور وہ جگہ کچھ ویران سی تھی، اس لیے نواب سعادت علی خاں مرحوم کے حکم سے ٹونک کی عالیشان کوٹھی "ناتمام" میں منتقل ہوگیا، یہ کوٹھی ہز ہائی نس پیلس نذر باغ سے متصل تال کٹورہ پر نواب ابراہیم علی خاں بہادر کی تعمیر کردہ ہے، نواب ابراہیم علی خاں مرحوم ٹونک میں تعمیر کے باب میں اپنے وقت کے شاہجہاں تھے، ٹونک کی اکثر قابل دید عمارتیں ان ہی کی تعمیر کردہ ہیں۔

۱۹۴۶ء میں نواب سعادت علی خاں نے اس کتب خانہ کو "کتب خانۂ سعیدیہ" کے نام سے ریاست کو دیدیا، اور اس کا تعلق محکمۂ تعلیمات ریاست سے کر دیا، محکمۂ تعلیمات نے اس کی ترقی و توسیع کے لیے اپنے بجٹ میں ایک خاص رقم منظور کی، اور صاحبزادہ عبد العظیم صاحب بی اے ایل ایل بی کو لائبریرین کے عہدہ پر فائز کیا، اور اس کے عملہ میں بھی اضافہ کیا،

صاحبزادہ عبد العظیم خاں صاحب نے اپنے زمانہ میں کتب خانہ کی جدید ترتیب کا کام شروع کیا اور اپنے معاون کے طور پر مولانا محمد عمران خاں کی خدمات حاصل کیں اور بحیثیت نائب ناظم انکا تقرر فرمایا،

مولوی محمد عمران خاں ایک جوان صالح اور عالم دین ہیں، آپ نے اپنے ذاتی شوق اور علمی ذوق کی بنا پر بڑی محنت اور جانفشانی سے اس نایاب اور انمول علمی ذخیرہ کو جو امتداد زمانہ سے "کس مپرسی" کے عالم میں تھا، بڑی حسن و خوبی سے آراستہ کیا، کئی فہرستیں تیار کیں، کتابوں پر از سر نو نمبر اندازی کی، اور ان کی فن وار جدید تقسیم و تنظیم کی، ہر فن کی علحدہ علحدہ فہرستیں مرتب کیں، مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتب کے علحدہ سیکشن قائم کیے، قلمی نوادر و مخطوطات کی خود وضاحتی فہرستیں ترتیب دیں، جن میں کتاب کے نام کے ساتھ ساتھ مصنف کا نام، اس کے مختصر حالات، کتاب کا موضوع، سنہ کتابت اور اس کی اہمیت، غرضکہ جملہ ضروری معلومات درج کیں،

۱۹۵۷ء میں جب "ناسنام کوٹھی" میں "گورنمنٹ انٹر کالج" قائم کر دیا گیا تو پھر اس غریب کتب خانہ کو محل بدر ہونا پڑا، اور وہاں سے صاحبزادہ محمد حیات خاں کی حویلی (واقع علی گنج) میں منتقل کیا گیا، لیکن یہاں بھی اس کو قرار و قیام نصیب نہ ہوا اور ابھی ایک سال اور کچھ ماہ ہی گذارے تھے کہ جولائی ۱۹۵۸ء میں یہاں سے بھی رخت سفر باندھنا پڑا اور وہ بازار علی گنج کی نو تعمیر "اسماعیل بلڈنگ" میں پہنچ گیا، اب دیکھئے یہاں کب تک رہتا ہے، یہ جگہ وسط شہر میں ہے اور بہت ہی مناسب ہے، اگرچہ وسعت اور کشادگی کے لحاظ سے کتب خانہ کے لیے بہت ہی ناکافی ہے،

تشکیل راجستان کے بعد سے اس کتب خانہ کا تعلق محکمہ تعلیمات راجستان سے ہوگیا ہے، صاحبزادہ شوکت علی خاں ایم اے لائبریرین کے عہدہ پر فائز ہیں، جن کی وجہ سے کتب خانہ میں شان وشوکت کی ایک نئی بہار آگئی ہے، محکمہ تعلیم راجستان نے کتب خانہ کے ساتھ ایک ریڈنگ روم کا بھی اضافہ کردیا ہے، روزانہ اخبار اور ماہانہ رسائل جاری ہیں، جن میں زیادہ تعداد ہندی رسائل واخبارات کی ہے،

جنوری ۱۹۵۲ء میں نادر مخطوطات کی تحقیقات کے سلسلہ میں مصری علماء کا ایک وفد حضرت امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی نشاندہی پر ٹونک آیا تھا، اس وفد نے چار روز تک اس کتب خانہ کی کتابوں کا مطالعہ کیا، اور تقریباً تین سو کتابیں دیکھیں، ان میں سے مندرجہ ذیل اکیس مخطوطات کا (جو اپنی نوعیت اور اہمیت کے لحاظ سے نایاب تھے) عکس لیا تھا،

۱ - تلقیح فهوم الاثر		(اسماء الرجال)

یہ نسخہ مصنف کے زمانہ سے قریب کا لکھا ہوا ہے، قدیم نسخہ ہے، اول صفحہ پر طلاکاری ہے، یہ نسخہ مختلف شاہی کتب خانوں میں رہ چکا ہے،

۲ - فهرست ابن ندیم قلمی		(تاریخ علوم)

یہ نسخہ ناقص ہے اور آٹھویں یا نویں صدی کا مکتوب ہے، تاریخ کتابت درج نہیں ہے، خضر بن عبداللہ جو کہ یحییٰ جوہری کے پوتے ہیں، کاتب ہیں،

۳ - فهرست مولفات سیوطی		(فهرست)

۴ - مرآة الجنان وعبرة الیقظان		(〃)

۵ - غریبین		(لغت)

۶ - قواعد المطارحه		(ادب عربی)

یہ نسخہ قدیم ہے اور غالباً اب تک طبع نہیں ہوا ہے،

۷۔ شرح الحماسہ للخطیب تبریزی ۔ (ادب)

چھٹی یا ساتویں صدی کا لکھا ہوا ہے، اگرچہ یہ کتاب چھپ چکی ہے، مگر یہ نسخہ قدیم اور نادر ہے،

۸۔ شمس العلوم ۔ (لغت)

یہ نسخہ اگرچہ طبع ہو چکا ہے، مگر یہ نسخہ نہایت صحیح، نادر اور قیمتی ہے، آٹھویں صدی کا لکھا ہوا ہے،

اس کا ایک قلمی نسخہ مصر میں ہے، جو مصنف کے بیٹے کے پاس رہا ہے،

۹۔ تحفۃ الکرام (سیر)

یہ نسخہ مختلف خطوں کا لکھا ہوا ہے،

۱۰۔ قواطع الادلہ (اصول فقہ)

اس کتاب کا واحد نسخہ استنبول میں ہے، اصولِ فقہ کی نہایت معتبر کتاب ہے،

۱۱۔ مصنف عبد الرزاق

اگرچہ یہ نسخہ قریب زمانہ کا مکتوب ہے، مگر اس وجہ سے نادر ہے کہ اس کے صرف دو نسخے اور ہیں، ایک استنبول کے کتب خانہ میں اور دوسرا مکہ شریف میں، یہ نسخہ مکہ شریف سے نقل کرایا گیا ہے، اس نسخہ کے بارے میں مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب نظام تعلیم و تربیت میں تحریر فرماتے ہیں کہ

ریاست ٹونک کے ایک امیر مرحوم عبد الرحیم خاں کے کتب خانہ میں مصنف عبد الرزاق (متن حدیث کی نادر معتبر کتاب) کے ایک نسخہ کی نقل عرب سے خرید کرائی تھی۔ اس وقت کسی نے مجھ سے کہا تھا کہ عرب میں مصنف کا جو نسخہ ملا تھا، وہ شاہ ولی اللہ صاحب کے کتب خانہ ہی سے منتقل ہو کر عرب پہنچا تھا، غالباً شاہ صاحب کی مہر یا دوسرے علامات اس پر موجود تھے۔ (ص ۳۳)

۱۲۔ حادی الارواح ۔ (وعظ)

یہ نسخہ مصنف کے زمانۂ قریب کا لکھا ہوا ہے، ۷۷۳ھ میں یہ نسخہ بعلبک میں لکھا گیا ہے، اول و آخر صفحہ پر ایک مہر ثبت ہے،

۱۳- وفیات الاعیان (طبقات وتراجم)

یہ کتاب کئی مرتبہ چھپ چکی ہے، مگر یہ نسخہ قدیم ہے، اور مصنف سے ایک صدی بعد کا لکھا ہوا ہے، اول صفحہ پر نواب وزیر الدولہ اور محمد علی خاں کی مہریں ثبت ہیں، محمد بن احمد بن ناصر ابن سلیمان کاتب ہیں،

۱۴- زاد المسیر (تفسیر)

یہ کتاب ابھی تک نہیں چھپی ہے۔ یہ نسخہ نہایت صحیح اور نادر ہے، مصنف سے تقریباً پچاس سال بعد کا لکھا ہوا ہے۔ ابو الفرج عبد الرحمٰن بن ابی الحسن علی بن محمد بن علی القرشی التیمی البکری البغدادی الفقیہ الحنبلی الواعظ الملقب بہ جمال الدین الحافظ (م ۵۹۷ھ) کی تصنیف ہے، یہ نسخہ ۶۴۵ھ میں کسی صاحب کے پاس رہا ہے، جن کا نام پڑھنے میں نہیں آتا، اول صفحہ طلائی کام سے آراستہ ہے،

۱۵- تلخیص (تفسیر)

بہت قدیم نسخہ ہے، مصنف کے زمانۂ حیات کا لکھا ہوا ہے۔

۱۶- جامع ابن بیطار (طب)

نسخہ نہایت قدیم ہے،

۱۷- ایجاز البیان لمعانی القرآن (تفسیر)

نادر نسخہ ہے۔ یہ تفسیر نجم الدین ابو القاسم محمود بن ابی الحسن النیشاپوری القزوینی کی تصنیف ہے، مصنف نے یہ کتاب شہر (خجند) میں تصنیف فرمائی ہے، کتابت قدیم طرز کی ہے،

۱۸- آداب الصوفیہ (تصوف)

یہ نسخہ آٹھویں یا نویں صدی کا مکتوبہ ہے،

۱۹- نقش الجانی والروح الریحانی تا ارشاد الی مہمات علم الاسناد،

یہ سات رسالے ایک جلد میں مجلد ہیں، اور اس میں مختلف علما کی اجازتیں اور حالات ہیں، امام شوکانی کی بھی اجازتِ حدیث ہے،

۲۰ - تاریخ ابن حجر

۲۱ - مصنّف ابن ابی شیبہ (حدیث)

یہ نسخہ مختلف خطوں میں مکتوب ہے، جدولی شنجرفی، آخر سے ناقص ہے، اس وجہ سے کاتب کا نام اور تاریخ درج نہیں ہے،

قائدِ وفد محمد رشاد عبد المطلب نے کتب خانہ کے رجسٹر پر عربی زبان میں حسب ذیل تاثرات تحریر کیے ہیں،

"میں ٹونک کا کتب خانہ دیکھکر بہت خوش ہوا، اس لیے کہ میں نے یہاں قلمی کتابیں اور نادر نفیس نسخے پائے۔ اور کارکنانِ کتب خانہ نے بھی میری بہت مدد کی، مجھے امید ہے کہ یہ کتب خانہ اپنا اصلی مقام حاصل کرے گا اور قلمی کتابوں کی طرف خاص طور پر توجہ کی جائے گی"،

متذکرۂ بالا نوادر و مخطوطات کے علاوہ اور بھی سینکڑوں نادر اور نایاب کتابیں ہیں، ان میں سے مشتے نمونہ از خروارے، چند مخطوطات کا اور تذکرہ کیا جاتا ہے۔

۱- شرح شمائل - مولانا عصام الدین ابراہیم بن محمد الاسفراینی (م ۹۴۳ھ)

۲- الخیر الکثیر اور التفہیمات :-

شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ دونوں رسالے ایک مجموعہ میں نہایت پاکیزہ خط میں لکھے ہوئے ہیں، اگرچہ یہ دونوں چھپ چکے ہیں، لیکن حضرت شاہ صاحب کے پہلے مسودہ سے منقول ہونے کے باعث ان کی قدر و قیمت باوجود چھپ جانے کے بہت زیادہ ہے۔

مجموعہ کے سرورق پر یہ عبارت ہے :

" تفہیمات حضرت قدوۃ العلماء مولوی شاہ ولی اللہ صاحب منقول از مسودۂ اول قلمی خط فارسی ، کاغذ سفید ،

درکتب خانہ یمین الدولہ وزیر الملک نواب محمد علیخاں بہادر دام اقبالہ والی ٹونک در ۱۲۹۰ھ داخل گردید "

اس عبارت کے ذیل میں دو مہریں ثبت ہیں ، ایک مہر محمد علی خاں بہادر کی ، دوسری وزیر الدولہ کی ،

۳ ۔ کثیر الفوائد فی تصریح و توضیح امثال القرآن ۔

اس کتاب کا موضوع نام سے ظاہر ہے ، امثال القرآن کے موضوع پر یہ بہترین کتاب ہے ۔

چھوٹی تقطیع کے ۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے ، ۱۲۷۷ھ سنہ تصنیف ہے ۔

۴ ۔ حاشیہ مشکوٰۃ (عربی) :۔ مصنف کا نام عطاء اللہ بن فضل شیرازی نیشاپوری المعروف

بجمال حسنی ہے ، یہ نسخہ بخط عربی خوشخط ہے ۔ اول صفحہ مطلا اور جدول آسمانی ہے ،

۵ ۔ لمعات التنقیح علی مشکوٰۃ المصابیح للشیخ عبد الحق حقی المحدث الدہلوی ۔ (م ۱۰۵۲ھ)

یہ نسخہ قدیم الخط دو ضخیم جلدوں میں ہے ، پہلی جلد نہایت خوشخط خفیف سی کرم خوردہ ، جلد دوم

با دامی مجدول شنجرفی و سیاہی ، پہلے ورق کے صفحہ پر یہ عبارت ہے ،

حاجی عبد اللہ خلیفہ شیخ عبد الرزاق بن شیخ امام الدین قادری ۔ اور یہ مہر ثبت ہے :۔ شیخ عبد القادر

۶ ۔ لباب الاصول فی اصول الحدیث :۔ یہ عربی میں اصول حدیث میں مختصر رسالہ ہے ،

۷ ۔ اسئلۃ القرآن :۔ یہ کتاب محمد بن ابی بکر عبد القادر الرازی المتوفی ۶۶۰ھ کی تصنیف ہے ۔

۸ ۔ غریب القرآن المسمی بنزہۃ الخاطر و سرور الناظر للامام اللغوی فخر الدین محمد بن علی النجفی الطریحی :۔ یہ نسخہ بھی قدیم الخط ہے

۹ ۔ مجموعہ رسائل حجۃ الاسلام سیدنا اسمٰعیل شہید ؒ

۱۰ ۔ طیبی شرح مشکوٰۃ المصابیح : یہ علامہ حسین بن عبد اللہ بن محمد الطیبی م ۷۴۳ھ کی نہایت معتبر تصنیف ہے ،

کتابت نہایت اعلیٰ ہے ۔

مدارجِ سلوک

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب

خواجہ عزیزاں علی رامیتنیؒ (۷۱۵ھ وفات) سلسلۂ نقشبندیہ کے اکابر مشائخ سے ہیں اور قطبِ وقت تھے، آپ کا ایک مختصر رسالہ[1] ہم تک پہنچا ہے، اس میں آپ "رونده راہ" یعنی سالک کو دس شرطیں اپنے پیش نظر رکھنے کی تاکید فرماتے ہیں، چونکہ ان کا زیادہ تر تعلق تزکیۂ نفس و تصفیۂ قلب سے ہے اسلئے ہم یہاں اجمالاً ان شرائط کو پیش کرتے ہیں اور ان ہی پر سلسلۂ نقشبندیہ کے اذکار و اعمال کا باب ختم کرتے ہیں،

(۱) شرط اول طہارت ہے؛ طہارت کی چار قسمیں ہیں: طہارت ظاہر، طہارت باطن، طہارت دل، طہارت سر، طہارت ظاہر[1] سب ہی جانتے ہیں لیکن پانی کی پاکی میں تا امکان احتیاط کرنی ضروری ہے، اسی طرح لباس کی پاکی میں کہ ان کا اثر باطن پر بہت ہوتا ہے۔ طہارت[2] باطن یعنی لقمۂ حرام و مشروبات حرام سے پرہیز، طہارت[3] دل یعنی دل کا صفات ناپسندیدہ، غل و غش، کینہ و حسد، مکر و خیانت، بغض و عداوت و حبت دنیا سے تصفیہ ہے، طہارت[4] سر توجہ بغیر حق سے پاک ہونا ہے۔

وصول الی اللہ کے لیے سالک اپنے ظاہر و باطن، قلب و سر کی تطہیر کرتا ہے، اسکے کچھ طریقے یہ ہیں:

(۲) شرط دوم: خاموشی یعنی زبان کو ناشائستہ کلام سے محفوظ رکھنا اور اس کو قرآن مجید کی تلاوت، امر معروف و نہی منکر کے ارشاد، علم سکھلانے اور اصلاح بین الناس میں مشغول رکھنا چاہیے،

---

[1] یہ رسالہ "رسائل ستہ ضروریہ" میں دوسرا رسالہ ہے، محبوب المطابع، میرٹھ ۱۳۰۸ھ میں چھپا،

ول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ھل یکب الناس علی مناخرھم فی النار الا حصائد السنتھم (رواہ الترمذی) یعنی زبان کی بکواس ہی سے لوگ آگ میں اوندھے منہ جھونکے جاتے ہیں۔

کسی حکیم نے کیا خوب کہا ہے:

ایزد چو بنا کرد بحکمت تن وجاں — در ہر عضوے مصلحتے کرد نہاں

گر مفسدے ندیدہ بودے ز زباں — محبوس نمی کردے بزنداں دہاں

(۳) شرط سوم: خلوت و عزلت ہے، اس کی وجہ سے نظر حرام سے محافظت ہوتی ہے اور نظر حرام ابلیس کے زہر آلود تیروں میں سے ایک تیر ہوتا ہے: النظر سھم مسمومۃ من سھام ابلیس

ز تیر مکر شیاطیں بد بہوش دو چشم — ہلاک گردی اگر تیر کارگر یابی

خلوت کا فائدہ یہ ہے کہ ہاتھ ناشائستہ چیزوں کے پکڑنے اور پاؤں حرام چیزوں کی تلاش میں چلنے اور کان ممنوع چیزوں کے سننے سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ ان سلبی شرائط کی تکمیل ہی سے قلب پر غیب کے دروازے کھلنے لگتے ہیں۔ جب دنیا کے نقوش آئینۂ قلب سے مٹنے لگتے ہیں تو آخرت کے نقوش کا اس پر پرتو پڑتا ہے، اور جب قلب میں کامل صفائی پیدا ہو جاتی ہے تو وحدانیت کے نور کی تجلی ہوتی ہے، اب سالک اہل تجلی ہو جاتا ہے اور فریاد کرنے لگتا ہے کہ:

زاں می خوردم کہ روح پیمانۂ اوست — مستے شدہ ام کہ عقل بیمانۂ اوست

دودے بمن آمد آتشے در من زد — زاں شمع کہ آفتاب پروانۂ اوست

(۴) شرط چہارم: روزہ ہے۔ اس کا فائدہ قہر نفس اور تشبہ بروحانیاں ہے، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف حق تعالیٰ ہی کے لیے اور حق تعالیٰ ہی اس کا اجر دیتے ہیں: الصوم لی وانا اجزی بہ (متفق علیہ) اور یہ دوزخ کی آگ سے سپر ہے، والصیام جنۃ من النار۔۔

ہم کہتے ہیں کہ روزہ کی دو خصوصیتیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے حق تعالیٰ نے اس کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے، اگرچہ ساری عبادتیں اللہ ہی کے لیے ہوتی ہیں، ایک یہ کہ روزہ کی حقیقت نہ کرنا ہے اور یہ باطن ہے، بصر سے مخفی، ریا کو اس کی طرف راہ نہیں، دوسری یہ کہ نیکی کا دشمن ابلیس ہے اور ابلیس کا لشکر شہوات، روزہ اس لشکر کو شکست دیتا ہے کیونکہ روزہ کی حقیقت ترک شہوات ہے۔

اسی لیے روزہ تصفیۂ قلب کے لیے نہایت مفید ہے،

(۵) شرط پنجم: ذکر ہے، تمام اذکار سے افضل ذکر لا الٰہ الا اللہ:

بر تخت وجود ہر کہ شاہنشاہ است ۔۔۔ او را سوے عالم حقیقت راہ است
ہر نوریقیں کہ در دلِ آگاہ است ۔۔۔ دستش زبد و نیک جہاں کوتاہ است
زیں بیش ولے بود و ہزار اندیشہ ۔۔۔ اکنوں ہمہ لا الہ الا اللہ است
اے خواجہ تراغم جمال و جاہ است ۔۔۔ اندیشہ باغ و راغ خرمن گاہ است
ما سوختگان عالم تجرید یم ۔۔۔ ما راغم لا الہ الا اللہ است

مرغ ذکر کے دو بال و پر ہوتے ہیں، جن سے وہ پرواز کر سکتا ہے۔ ایک پر حضور کا، دوسرا پر اخلاص کا۔ حضور سے مراد آگاہی ہے، یعنی یہ جاننا ہے کہ حق تعالیٰ دانا و بینا و شنوا ہیں۔ سالک چاہے بلند آواز سے ذکر کرے (جہراً) یا پست آواز سے (سراً) اور اخلاص سے مراد یہ ہے کہ ذاکر اپنے گفتار و کردار سے نہ دنیا کا خواہاں ہو نہ مال و جاہ کا، نہ کسی چیز کا جو دنیا سے تعلق رکھتی ہے اور نہ ہی وہ عقبیٰ کا طالب ہو یعنی نہ بہشت نہ حور و قصور، نہ بہشت کے انہار و اشجار و اثمار کا، بل ھم الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ یہ ان لوگوں میں ہو جو اللہ کا ذکر حبّاً لجمالہ و جلالہ کرتے ہیں، نہ کہ جنت کے منکوح و مطعوم کی خاطر!

اخلاص کے متعلق جب حضور انورؐ سے کسی نے دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا:

ان تقول ربی اللّٰہ ثم تستقیم کما امرت — اخلاص یہ ہے کہ تو کہے اللّٰہ میرا رب ہے پھر تجھے جس چیز کا حکم دیا گیا ہے، اس پر جما رہے۔

امام غزالیؒ اس کی تصریح فرماتے ہیں:

ای لا تعبد ھواک ونفسک ولا تعبد الا ربک وتستقیم فی عبادتہ کما امرت وھذا اشارۃ الی قطع ماسوی اللّٰہ عن مجری النظر وھو الاخلاص حقاً — یعنی تو اپنے خواہشات کی اور اپنے نفس کی عبادت نہ کرے اور سوائے اپنے رب کے کسی کی عبادت نہ کرے اور اسکی عبادت میں استقامت سے کام لے جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہو اور یہ اشارہ ہے نظر سے ماسوی اللّٰہ کو دور کر دینے سے اور یہی حقیقی اخلاص ہے

ذکر میں حضور و اخلاص پر زور دینے کے بعد خواجہ عزیزاںؒ تاکید فرماتے ہیں کہ درمیان ذکر میں یہ کلمۂ بازگشت کہتا جائے،

"الٰہی مقصود من توی واز تو رضای تو می خواہم"

(۶) شرط ششم "نگاہداشت خاطر" ہے۔ اس سلسلہ میں خواجہؒ کے افادات کے پیش کرنے سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ "خاطر" کیا ہے۔ صوفیہ کے ہاں جو چیز بے قصد دل میں گزرتی ہو اسکو "خاطر" کہا جاتا ہے، خواص صوفیہ خاطر صرف اسی خیال کو کہتے ہیں جو حق تعالیٰ کی طرف سے آئے یا ملک کی طرف سے، جو خطرے نفس و شیطان کی طرف سے پیدا ہوتے ہیں گو ان کو بھی خواطر کہا جاتا ہے لیکن درحقیقت جو چیز شیطان کی طرف سے آتی ہے، وہ وسواس ہے، اور جو نفس کی طرف سے آتی ہے، اس کو ہاجس (جمع ہواجس) کہا جاتا ہے، یہ بھی مانا جاتا ہے کہ حرام خوار کے قلب میں

ہمیشہ وساوس ہی آتے ہیں اور جس کا لقمہ مشتبہ ہوتا ہے، اس کے خواطر وسواس و ہواجس سے ملے جلے ہوتے ہیں۔

خواجہ عزیزانؒ خواطر کی تقسیم چار قسموں میں فرماتے ہیں، خاطر رحمانی، خاطر ملکانی، خاطر شیطانی، خاطر نفسانی، آپ کے ہاں خاطر رحمانی تنبیہ غفلت کا نام ہے، اور خاطر ملکانی ترغیب طاعت کا، خاطر شیطانی تزیین معصیت کا اور خاطر نفسانی مطالبۂ شہوات کا، سالک کو جب ذکر کے وقت خواطر آنے لگیں تو اس کو ان کی نفی کرنا چاہیے اور اپنے ذکر میں مصروف رہنا چاہیے، اس پر خود روشن ہو جائے گا کہ کن خواطر کو قبول کرنا چاہیئے اور کن کو رد، اور اگر ان میں وہ تمیز کرنے سے عاجز ہو تو پھر حق تعالیٰ سے کہنا چاہیے کہ

خداوندا میدانی کہ نمی دانم ومی دانم کہ می دانی انچہ خیریت ست آں کرامت فرما

یعنی حق تعالیٰ آپ جانتے ہیں کہ میں نہیں جانتا اور میں جانتا ہوں کہ آپ جانتے ہیں، جو خیر ہے وہی عطا فرمائے؛ اور یہ دعا پڑھنی چاہیے:

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا	اے اللہ ہمیں حق کو حق کر دکھلا اور اسکی
اتباعہ وارنا الباطل باطلا و	پیروی نصیب کر اور باطل کو باطل کر دکھلا
ارزقنا اجتنابہ ولا تکلنا الی	اور اس سے دوری عطا فرما اور ہمیں اپنے
انفسنا طرفۃ عین ولا اقل من	نفس کے حوالہ نہ کر ایک لحظہ کے لیے اور
ذلک وکن لنا ولیا وحافظا	نہ اس سے کم عرصہ کے لیے اور ہمارا
وناصرا وعونا ومعینا وعلی	والی و حافظ و ناصر اور مددگار و معین
کل خیر دلیلا وملقنا وموئلا	ہوجا اور ہر خیر کی طرف ہماری دلالت
ربنا آتنا من حضرنا ومن غاب عنا	فرما اور اس کی تلقین فرما اور اس میں

وکل مومن و مومنة فی الدارین | ہماری مدد کر، اے رب ہمارے ہم میں جو حاضر ہیں
حسنا یا واسع المغفرة و یا ارحم | اور جو غائب، مومن و مومنہ تمام کو دارین میں بھلائی
الراحمین | عطا فرما اور تو وسیع المغفرة ہے اور سب سے زیادہ رحم

(۷) شرط ہفتم۔ رضا بقضاء اللہ ہے، اور توکل و تفویض کا بھی اسی سے تعلق ہے۔

جب حق تعالیٰ کے کریم و رحیم و غفور و ستار ہونے کا خیال پیدا ہوتا ہے تو قلب میں رجا کا قوی ہونا ضروری ہے، اور جب ان کے قہار اور شدید العقاب اور شدید البطش ہونے پر نظر جاتی ہے تو خوف قوت پکڑتا ہے، جب توفیق پر نظر پڑتی ہے تو امید پیدا ہوتی ہے۔

لیکن اختیار حق تعالیٰ کو حاصل ہے جس کو چاہا توفیق دی، نہ چاہا نہ دی کہ

توفیق عزیز است بہر کس ندہند   وایں گوہر ناسفتہ بہر خس ندہند

اور جب اپنی تقصیر پر نظر پڑتی ہے تو خوف پیدا ہوتا ہے۔

بندہ ہمہ بہ کہ بہ تقصیر خویش   عذر بدرگاہِ خدا آورد
ورنہ سزا وار خداوندیش   کس نتواند کہ بجا آورد

انسان کے لیے خیر اسی میں ہے کہ جب تک دنیا میں رہے خوف و رجا کے درمیان رہے، نہ حق تعالیٰ کے مکر سے مامون ہو جائے نہ ان کی رحمت سے مایوس، "لا تامن ولا تیئأس" اسی لیے حکم شرعی ہے۔

ایمن مباش خواجہ و نومید ہم مشو   اسلام درمیانۂ حق و رجا بود

(۸) شرط ہشتم۔ صحبت صالح کا اختیار کرنا ہے، اور مفسد کی صحبت ترک کرنا، اس بارے میں خواجہ عزیزانؒ کی ایک رباعی بہت مشہور ہے:

با ہر کہ نشستی و نشد جمع دلت   وز تو نرہید زحمتِ آب و گلت

از صحبتِ او اگر تبرا نہ کنی   ہرگز نکند روحِ عزیزاں بحلت

یعنی اگر تو کسی شخص کے پاس بیٹھے اور تجھے جمعیت خاطر نصیب نہ ہو اور دنیا کی کوفت و زحمت تیرے قلب سے دور نہ ہو تو ہر ایسے شخص کی صحبت سے اگر تو کنارہ نہ کرے تو خواجہ عزیزاں کی روح تجھے کبھی مدات نہ کرے گی۔

(۹) شرط نہم۔ بیداری ہے۔ اس میں بہت سے فائدے ہیں: ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اس سے تخلق باخلاق اللہ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے لا تأخذہ سنۃ و لا نوم اور تخلق باخلاق اللہ سے قرب حق حاصل ہوتا ہے، جیساکہ کہا گیا ہے

گفتم بچہ خدمت بوصالت برسم   گفتا کہ تخلقوا باخلاق اللہ

اور رات عاشقوں کا خلوت خانہ ہوتی ہے جس میں وہ حضرت بے نیاز سے راز و نیاز کرتے ہیں، بے تشویش اغیار:

از صبح وجود بے خبر بود عدم   انجا کہ من و عشق تو بودیم بہم
در روز اگر کسے نیابم محرم   شب ہست و غمت ہست مرا پیش چہ غم

سالکانِ راہ کو جو بھی دولت و سعادت ملی ہے وہ رات ہی میں ملی ہے

دولتِ شبگیر خواہی خیز و شب را زندہ دار
خفتہ نابینا بود، دولت بہ بیدار ان رسد

(۱۰) شرط دہم۔ نگہداشت لقمہ ہے۔ لقمہ حلال و پاک چاہیے، یہ جملہ فرائض میں سے ایک فرض ہے۔ قال اللہ تعالیٰ:

فکلوا مما رزقکم اللہ حلالا   سو کھاؤ جو روزی دی اللہ نے تم کو
طیبا (پ، ع ۲۱)   حلال اور پاک۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عبادت کے دس جزو ہیں، ان میں سے نو جزو تو حلال روزی کا طلب کرنا ہے اور باقی عبادت جو رہی وہ ایک جزو ہے۔ "حلال" کے معنی یہ ہیں کہ روزی کے کسب کے وقت کوئی گناہ کا ارتکاب نہ ہو اور "طیب" کے معنی یہ ہیں کہ اس کے کھاتے وقت نیت یہ ہو کہ اس سے حق تعالیٰ کی اطاعت وعبادت کی قوت جسم میں پیدا ہو، اب رزق حلال و پاک کے حاصل کرنے کے بعد اسراف نہ کرنا چاہیے:

گرچہ خدا گفت کلوا واشربوا　　　از پے آں گفت ولا تسرفوا

اور کھاتے وقت ذکر سے غافل نہ ہونا چاہیے، غفلت سے کھانا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس ذبیحہ کا کھانا جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے، ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ

ولا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ　　　جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اسکو کھاؤ

ظاہر آیت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی لقمہ بغیر ذکر اللہ کے نہ کھایا جائے اور غافلوں کے ساتھ بھی نہ کھانا چاہیے۔

منشیں با بداں کہ صحبت بد　　　گرچہ پاکی ترا پلید کند

آفتابے بداں بزرگی را　　　ذرہ ابر ناپدید کند

گوہر از ناقصان راہ مطلب　　　زانکہ ایں مایہ کاملے دارد

اور یہ بھی ضروری ہے کہ کھانے پکانے والا باطہارت ہو اور باذکر ہو تاکہ یہ غذا غفلت وتیرگی کا سبب نہ ہو جائے۔

غالبؔ سے منسوب دوسرا سکہ اور اس کی حقیقت

از جناب مالک رام صاحب

معارف کے فروری ۱۹۵۹ء کے شمارے میں میرا مضمون "غالب پر سکہ کا الزام اور اسکی حقیقت" شائع ہوا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد غالب پر انگریزوں نے جو الزام لگایا تھا کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے لیے یہ سکہ کہا تھا۔

بزر زد سکۂ کشور ستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

تو یہ غلط تھا، یہ سکہ دراصل حافظ غلام رسول ویران تلمیذ استاد ذوق مرحوم نے لکھا تھا، اور ویران کا کارنامہ خواہ مخواہ غالب کے نامۂ اعمال میں درج کر دیا گیا۔ اسی دوران میں ایک اور سکہ منظر عام پر آیا ہے، جو منشی جیون لال نے غالب سے منسوب کیا ہے۔ اور جس کا ذکر ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب کے مضمون (معارف، نومبر ۱۹۵۸ء ص ۳۹۳) میں ہے، منشی جیون لال کے لفظ یہ ہیں:

"دیگر سکہ شعر - مرزا نوشہ ؎

بزر آفتاب و نقرۂ ماہ سکہ زد در جہاں بہادر شاہ

یہ منشی جیون لال ماتھر کایستھ، کمشنر دہلی کے دفتر میں ملازم تھے اور غالباً وہاں فارسی خط و کتابت ان سے متعلق تھی، غالب کے ایک خط موسومہ میر مہدی مجروح میں بھی ان کا نام آیا ہے[1]، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے اور دلی پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہو جانے کے بعد بھی وہ انگریزی حکومت کے

---

[1] اردوے معلی ص ۱۲۹ (لاہور مطبع کریمی ۱۹۲۲ء)

ملازم رہے، جب مئی ۱۸۵۷ء میں دیسی سپاہ میرٹھ سے آکے دلی پر قابض ہو گئی، تو یہ بے کار ہو گئے، ان ایام میں وہ یہ روزنامچہ لکھتے رہے، جس کا حوالہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے مضمون میں ہے۔ (اور جس کے انگریزی ترجمے کا اردو ترجمہ خواجہ حسن نظامی مرحوم نے "غدر کی صبح و شام" کے نام سے شائع کیا تھا) بہرحال دلی والے جانتے تھے کہ وہ انگریز کمشنر کے دفتر کے ملازم ہیں، اس لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ اس دوران میں قلعہ میں بار پا سکے ہوں، بلکہ اگر وہ اس کی کوشش کرتے، تو قدرتی طور پر لوگ انھیں شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتے اور ان کی جان معرضِ خطر میں آ جاتی، انھوں نے یہ روزنامچہ انگریزوں ہی کے لیے لکھا تھا، ان کے اسے مٹکاف کی خدمت میں پیش کرنے ہی سے ان کا مقصد ظاہر ہے، میری نظر میں گوری شنکر اور جیون لال میں صرف اتنا فرق ہے کہ اول الذکر انگریزوں کا تنخواہ دار ملازم تھا، اور یہ غالباً تنخواہ نہیں لیتے تھے، ورنہ انگریزوں کو یہاں کے حالات سے باخبر رکھنے میں دونوں کی خدمات یکساں ہیں، مولانا ابو الکلام آزاد نے بھی یہی بات زرا زیادہ صراحت سے لکھی ہے[1]۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ منشی جیون لال نے جو سکہ غالب کے نام سے لکھا ہے، یہ ان کی اپنی دید تو ہو نہیں سکتی، غالباً کسی نے ان سے اسی طرح بیان کیا اور انھوں نے یونہی لکھ دیا، اور اس معاملے میں ہم گوری شنکر کی کارگذاری دیکھ ہی چکے ہیں، جو اپنی آنکھوں دیکھی بیان کرنے کا مدعی ہے، پس اس صورت میں جیون لال پر گوری شنکر سے زیادہ بھروسہ کس طرح کر سکتے ہیں؟ اسی لیے میرے خیال میں یہ دوسرا سکہ بھی غالب کا نہیں، وہ خود بھی اس سے انکاری ہیں، یوسف مرزا کو لکھتے ہیں[2]:

"میں نے سکہ کہا نہیں۔ اگر کہا تو اپنی جان اور حرمت بچانے کو کہا۔ یہ گناہ نہیں۔"

یہاں ان کا اصل بیان یہ ہے کہ "میں نے سکہ کہا نہیں" منطقی لحاظ سے مابعد کی شرط محض بفرضِ محال ہے،

---

[1] نقش آزاد، ص ۳۰۴ (حاشیہ) نیز دیکھیے "غالب" از مہر ص ۱۰۸ (طبع چہارم) [2] اردوے معلی، ص ۲۴۹

جو بدرجۂ مجبوری بیان ہوئی ہے، اس لیے اس سے استدلال درست نہیں ہوگا۔ اگر انھوں نے یہ دوسرا سکہ کہا ہوتا تو یہ مطالبہ نہ کرتے کہ:[۱]

"باغیوں سے میرا اخلاص مظنۂ محض ہے، امیدوار ہوں کہ اس کی تحقیقات ہو تاکہ میری صفائی اور بے گناہی ثابت ہو۔"

اگر ان کے دل میں اس دوسرے سکے کا چور ہوتا تو وہ کبھی اس بے باکی اور تحدی سے تحقیقات کا مطالبہ نہ کرتے، کیونکہ جہاں یہ ممکن تھا کہ وہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے کہ گوری شنکر والا سکہ ان کا کہا ہوا نہیں، وہیں یہ بھی عین ممکن تھا کہ تحقیقات کے دوران میں یہ دوسرا جیون لال والا سکہ برآمد ہو جاتا۔ لوگوں نے بہادر شاہ کے مقدمے میں کس طرح ان کے خلاف گواہیاں دی تھیں۔ جیون لال کے بیان کے مطابق غالب نے یہ سکہ سر دربار پیش کیا تھا۔ اگر پوچھ گچھ ہوتی تو کیا کوئی ان کے خلاف شہادت نہ دیتا؟ اس پر "صفائی اور بے گناہی" تو کیا ثابت ہوتی، لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اگر انھوں نے واقعی یہ سکہ کہا ہوتا تو ان کا یہ مطالبہ آگ سے کھیلنے کے مرادف تھا۔ غالب کی دنیوی سوجھ بوجھ اور دوراندیشی سے انکار نہیں ہو سکتا، اس لیے یہ بات خیال میں بھی نہیں آ سکتی کہ انھوں نے دیدہ و دانستہ یہ خطرہ مول لیا ہو۔ اسی لیے میرا یقین ہے کہ یہ دوسرا سکہ بھی ان کا کہا ہوا نہیں۔

ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سکہ

"خود پکار پکار (کر) کہہ رہا ہے کہ اس کا مصنف غالب کے سوا دوسرا نہیں ہو سکتا۔"[۲]

اور "میرے دریافت کیے ہوئے شعر (بہ زرِ آفتاب الخ) کا خوبصورت انداز غالب کے طرز اسلوب سے ہم آہنگ ہے، اب تک ستاسکے سامنے آئے ہیں، لیکن اس "قدر دلکش" کے ساتھ کوئی بھی نہیں آیا۔"[۳]

خدا معلوم ان کا مدعا کیا ہے! کیا "طرز اسلوب" (؟) سے ان کی مراد یہ ہے کہ پہلے مصرعے میں زر و سیم

---

[۱] اردوئے معلی، ص ۲۱۱ (بنام بیخبر) [۲] معارف نومبر ۱۹۵۵ء ص ۳۴۹ [۳] ایضاً مئی ۱۹۵۹ء ص ۳۹۲

کی جو تشبیہیں سورج اور چاند سے دی گئی ہیں، یہ غالب کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں سوجھ سکتی تھیں، کیونکہ اور کوئی بات اس سکے میں قابل ذکر نہیں، تو وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ فارسی شاعری میں ازل سے ہوتا آیا ہے، غالب پہلے شاعر نہیں جنھوں نے یہ تشبیہیں لکھی ہوں۔ اور سکوں کے لیے تو یہ اتنی سامنے کی چیز ہے کہ تقریباً ہر موقع پر سونے چاندی کے سکوں کے لیے مہر و ماہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ خاندان تیموریہ ہی کے بعض بادشاہوں کے سکے ملاحظہ کیجئے:۔

اورنگ زیب عالمگیر:

چاندی کا سکہ ؎ سکہ زد در جہاں چو بدر منیر شاہ اورنگ زیب عالم گیر

سونے کی اشرفی ؎ سکہ زد در جہاں چو مہر منیر شاہ اورنگ زیب عالم گیر

جہاندار شاہ :۔ بزد سکہ در ملک چوں مہر و ماہ شہنشاہ غازی جہاندار شاہ

محمد شاہ رنگیلا :۔ ز فضل حق شہنشاہ محمد شاہ دیں پرور دریں عالم زدہ سکہ ز مہر و ماہ روشن تر

اسی سلسلے میں صادق الاخبار کا ایک اور اقتباس بھی درج کرتا ہوں، جو دلچسپی سے پڑھا جائیگا، اس کی ۵ ذی الحجہ ۱۲۷۳ھ، ۲۷ جولائی ۱۸۵۷ء کی اشاعت میں (ص ۴ پر) لکھا ہے:

"سکہ ہاے شاہی از طبع عالی عرفی زماں، خاقانی دوراں فیضی وقت مولوی محمد ظہور علی صاحب تھانیدار، رئیس دادری [دادری]

۱۔ سکہ زد در جہاں بعون الاہ حامی دین حق بہادر شاہ

(ان دونوں مصرعوں سے تاریخ ہجری ۱۲۷۳ برآمد ہوتی ہے، مگر ملفوظی)

۲۔ بشرق و غرب زدہ سکہ ہیچو مہر و ماہ ابوظفر شہ عالی نسب بہادر شاہ

۳۔ بہ ہر سکۂ شاہی زدہ بہادر شاہ بحق اشہد ان لا الہ الا اللہ

۴۔ بہ ہر سکۂ شاہی زدہ بفضل الہ ابوظفر شہ گیتی ستان بہادر شاہ"

مدیر اخبار نے ان سکوں پر یہ حاشیہ لکھا ہے :۔

"یوں تو سب سکے خوب ہیں، مگر جناب مولانا صاحب نے سکۂ تاریخی میں کمال کیا ہے اور جس سکہ میں ذکر کلمہ ہے، وہ بھی خالی از برکت نہیں"

یہاں بھی دوسرے شعر میں زر و سیم کی مناسبت سے مہر و ماہ کی تشبیہ موجود ہے۔

بہرحال میرا خیال یہی ہے کہ منشی جیون لال نے بھی سنی سنائی بات پر یقین کرکے یہ سکہ غالب کے نام لکھ دیا، یہ غالب کا کہا ہوا نہیں، ورنہ وہ کبھی انگریزوں سے تحقیقات کا مطالبہ نہ کرتے،

آخر میں ڈاکٹر صاحب موصوف سے ایک شکایت کرنے کو جی چاہتا ہے۔ انھوں نے جہاں دستنبو کا حوالہ دیا ہے،[1] وہاں صراحت سے لکھا ہے "مملوکہ راقم" حالانکہ یہ مطبوعہ کتاب ہے، جو ممکن ہے عام طور پر نہ ملتی ہو، لیکن تاہم اس کے نسخے بعض اور لوگوں کے پاس یا کتاب خانوں میں بھی ضرور ہوں گے، لیکن انھوں نے اپنے دونوں مضمونوں میں "روزنامچۂ جیون لال" کے قلمی نسخے کے حوالے متواتر دیے ہیں اور کسی جگہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ آخر یہ نسخہ ہے کہاں۔ کیا ان کی ذاتی ملک ہے یا کسی کتاب خانے میں، تاکہ اگر کوئی شخص بھی اس سے استفادہ کرنا چاہے یا ان کے دیے ہوئے حوالے ہی کی تصدیق کرنا چاہے تو کر سکے۔ مخطوطات کے حوالے دینے میں جو اصول برتے جاتے ہیں، یقیناً یہ ان سے مخفی نہیں ہوں گے۔

---

[1] معارف، مئی ۱۹۵۹ء، ص ۳۱۵ نیز ۳۹۶ (حاشیہ)

باب التقریظ والانتقاد

رسائل و اخبارات کے خاص نمبر

چراغ راہ اسلامی قانون نمبر جلد اول و دوم — مرتبہ جناب پروفیسر خورشید احمد صاحب، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت اچھی، رنگین ٹائٹل بغیر مرمت

بالترتیب ۴۵۴ و ۵۰۴ صفحات، قیمت بالترتیب للعہ و سے، پتہ دفتر چراغ راہ کراچی نمبر ا

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس ضخیم نمبر میں اسلامی فقہ و قانون سے متعلق بلند پایہ علمی اور تحقیقی مقالات کو جمع کیا گیا ہے، پورا نمبر مختلف ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں قانون اور اصول قانون، دوسرے میں اسلام کے تصور قانون، تیسرے میں اسلامی قوانین کا بعض دیگر غیر اسلامی قوانین سے تقابل، چوتھے میں اسلامی فقہ و قانون کے ماخذ، پانچویں میں قانون اسلامی کی تاریخ و تدوین اور ساتویں باب میں موجودہ دور میں اسلامی قانون کی تشکیل و نفاذ سے متعلق بلند پایہ مضامین ہیں، چھٹے باب میں دستور شعر کے عنوان سے اسلامی عدل و قانون سے متعلق قدیم و جدید شاعروں کے کلام کا انتخاب ہے، آٹھویں باب میں ایک تحریری سمپوزیم ہے جس میں اسلامی فقہ و قانون کے متعلق اکابر علماء کے قلم سے چند سوالات کا جواب ہے، اور نویں باب میں اسلامی قانون و فقہ کی بعض اہم کتابوں پر ایک مختصر مقالہ اور ان کی فہرست ہے، مقالہ نگاروں میں متقدمین علماء میں علامہ ابن خلدون اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے لیکر مستشرقین سر الفریڈ ونینگ، جارج وائٹ کراس، ڈاکٹر ایس ایس اونار، عربی ممالک کے ڈاکٹر عبدالقادر عودہ شہید، ڈاکٹر مصطفی زرقاء، پروفیسر محمد ابو زہرہ، ڈاکٹر معروف دوالیبی، ڈاکٹر صبحی محمصانی اور ہندو پاک کے ڈاکٹر اقبال، ڈاکٹر حمید اللہ، مولانا ابو الاعلیٰ مودودی،

مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ڈاکٹر رفیع الدین جیسے اکابر علماء، اور دوسرے اہل قلم میں ہمارے رفیق مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی وغیرہ شامل ہیں، شروع میں لائق مرتب نے اس نمبر میں حصہ لینے والے مشہور حضرات کا اجمالی تعارف کرایا ہے اور سب سے زیادہ مفید کام یہ کیا ہے کہ آخر میں عربی، انگریزی، اردو کی متعدد قانونی اور فقہی کتابوں اور بعض اہم مقالات کی ایک طویل فہرست دیدی ہے، غرض اسلامی قانون پر اس نمبر میں بہت سامواد اکٹھا کردیا گیا ہے، پاکستان میں اسلامی قانون کی تشکیل میں اس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے، لائق مرتب کو ہم اس تحقیقی، علمی اور دینی خدمت پر مبارکباد دیتے ہیں، یہ نمبر فقہاء، اور اسلامی فقہ سے دلچسپی رکھنے والوں اور قانون کے طلبا، اور ماہرین کے مطالعہ کے لائق ہے،

نقوش مکاتیب نمبر جلد اول و دوم — مرتبہ جناب محمد طفیل صاحب، کاغذ معمولی، کتابت وطباعت بہتر، مجموعی ضخامت ۱۴۰۰ صفحات، قیمت عـلـہ، پتہ: ادارۂ فروغ اردو (ایبک روڈ انارکلی) لاہور،

مدیر نقوش اس سے پہلے مختلف مفید عنوانوں پر کئی ضخیم نمبر نکال چکے ہیں، یہ مکاتیب نمبر ہے جس میں ہندوستان کے مختلف طبقوں کے اکابر و مشاہیر کے خطوط جمع کیے گئے ہیں، ان میں سے اکثر اب مرحوم ہو چکے ہیں، انھوں نے ان مکاتیب کے جمع کرنے میں جو مشقت اٹھائی ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جن کو اس قسم کے کام کرنے کا اتفاق ہو چکا ہے، اردو میں اتنے مشاہیر کے خطوط کا یہ نہایت دلچسپ اور رنگارنگ مجموعہ ہے، شروع میں غلام رسول صاحب مہر نے علم و ادب میں خطوط کا درجہ، ڈاکٹر سید عبد اللہ نے خط نگاری کی اہمیت، اردو خطوط نگاری کا جائزہ اور سرسری تبصرہ، مالک رام نے اردو کے منفرد اور صاحب طرز خطوط نگاروں کا تعارف و تذکرہ، اور دوسری جلد کے آخر میں محمد عبد اللہ قریشی نے مشاہیر کے

مختصر سوانح لکھے ہیں، آخری اور دوسرا مقالہ نہایت اہم ہے، ان سے اس نمبر کی افادیت میں بڑا اضافہ ہو گیا ہے، شروع میں مشہور ادیبوں کے خطوط کا عکس اور فوٹو ہے، یہ نمبر مرزا غالب اور سرسید سے لیکر مہدی بیگم تک اور پھر اس دور کے ممتاز لوگوں کے مکاتیب پر مشتمل ہے، خطوط کے ابتک اردو میں کئی مجموعے کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں لیکن مدیر نقوش کا یہ کارنامہ بڑا غیر معمولی اور اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ انھوں نے غیر مطبوعہ اور نادر خطوط کا اس قدر وسیع اور گرانقدر ذخیرہ مہیا کر دیا ہے، جس سے ادب و انشاء اور گذشتہ سو سالہ دور کی علمی، سیاسی ادبی اور سماجی تاریخ پر روشنی پڑتی ہے، لائق مرتب کی یہ علمی و ادبی خدمت لائق تحسین ہے۔

ہمایوں سالنامہ

مرتبہ جناب بشیر احمد صاحب، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۷۲، قیمت ہے۔ پتہ المنظر ۳۲ لارنس روڈ لاہور

مشہور علمی رسالہ ہمایوں مالی دشواریوں کی وجہ سے عرصہ سے بند ہو گیا ہے، مگر اسکی تلافی کے لیے حسب معمول اس کا یہ سالنامہ نکالا گیا ہے، اس میں ادبی و فنی، تہذیبی و ثقافتی اور شخصیات سے متعلق مضامین، افسانے، ڈرامے اور بلند پایہ نظمیں اور غزلیں پیش کی گئی ہیں، جو مرتب کے اعلیٰ ادبی مذاق کا نمونہ ہیں، ادب و فن میں "دس سال کا اردو ادب" اور "بھاگ متی کا افسانہ" تحقیقی مضامین ہیں، تہذیب و معاشرت کے زیر عنوان بھی مفید، موثر اور اہم مقالات ہیں، ڈاکٹر شائستہ اکرام اللہ سہروردی نے اپنے حالات بڑے دلچسپ انداز شستہ اور شگفتہ زبان میں لکھے ہیں، نظم و غزل کے حصے میں جوش، حفیظ، جگر، فراق، اسد ملتانی، اثر لکھنوی، احسان دانش، سید عابد علی عابد، قتیل شفائی، فیض احمد فیض اور عبد المجید حیرت جیسے مشاق اور قادر الکلام شعرا نظر آتے ہیں، آج کل جبکہ سطحی اور تیسرے درجہ کے رسالوں کی بھرمار ہے یہ نمبر دیکھکر بڑی مسرت ہوئی، ادبی و علمی حیثیت سے یہ نمبر اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

اورنٹیل کالج میگزین مرتبہ ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب، خوبصورت ٹائپ، سالانہ چندہ للعہ، اس نمبر کی قیمت صہ، پتہ: اورنٹیل کالج، لاہور،

لاہور کا مشہور بلند پایہ علمی رسالہ اورنٹیل کالج میگزین اپنی علمی روایات کو ابتک برقرار رکھے ہوئے ہے، فروری اور مئی ۱۹۵۸ء کا نمبر ملا کر یہ خاص نمبر شائع ہوا ہے، جو حسب ذیل مقالات پر مشتمل ہے: داستان امیر حمزہ کی تصویریں، مثنوی ابر گہر بار، حول مخطوط من دیوان شعر الباخرزی، اہمیتہ الروایتہ الاسلامیہ، خواجہ میر درد کا خاندان، افسوس ہے کہ ہمیں جو نمبر موصول ہوا ہے اس میں تیسرا اور چوتھا مقالہ جڑنے سے رہ گیا ہے، شروع میں ڈاکٹر صاحب کا خطبۂ استقبالیہ اور ڈاکٹر مس خدیجہ کا خطبۂ صدارت ہے، جو ۲۳ر نومبر ۵۶ء کو یونیورسٹی اورنٹیل کالج کے ۸۰ ویں یوم تاسیس پر پڑھے گئے تھے، قاسم لاہوری کا ایک تذکرۂ شعراء بنام "مردم دیدہ" جو بالاقساط شائع ہو رہا ہے، اس شمارہ میں بھی ہے، اس اہم اور نادر تذکرہ کی ترتیب و تصحیح ڈاکٹر سید عبد اللہ صاحب نے کی ہے، ایک بڑا مفید کام یہ کیا گیا ہے کہ فروری ۴۲ء سے نومبر ۵۶ء کے پرانے رسالوں کے مضمون نگاروں اور مضامین دونوں کی فہرست مرتب کی گئی ہے، ۴۲ء سے پیشتر کی فہرست بھی پہلے نکل چکی ہے،

مہر نیمروز وحشت نمبر - مرتبہ جناب حسن مثنیٰ ندوی، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۲ر پتہ ہاؤسنگ یونین ایریا، کراچی۔

جناب رضا علی وحشت کلکتوی اس دور کے اساتذۂ شعر و سخن میں تھے اور بنگالی ہونے کے باوجود زبان پر اہل زبان کی سی قدرت رکھتے تھے، اور جدید شاعری کے مقابلہ میں قدیم شاعری اور قدیم روایات کے دلدادہ تھے۔ پاکستان کے مشہور ادبی رسالہ مہر نیمروز نے ان کی یادگار میں یہ نمبر نکالا ہے، جس میں جناب وحشت کے عام حالات، شاعرانہ کمالات اور خصوصیات پر بلند پایہ مضامین فراہم کیے گئے ہیں،

اور ان کی شاعری سے متعلق علامہ شبلی، مولانا حالی، ڈاکٹر اقبال، مولانا شرر، نظم طباطبائی، صفی لکھنوی، سید امداد امام اثر، شوق قدوائی، حسرت موہانی، ظفر علی خاں، اور مرزا کاظم حسین جیسے اکابر فن کی منثور اور اکبر الہ آبادی، شاد عظیم آبادی، صفی لکھنوی، عزیز لکھنوی، حسرت موہانی اور ناطق لکھنوی وغیرہ مشاہیر شعراء کی منظوم رائیں شامل ہیں جن کے بعد ان کی مہارت فن میں کیا شبہہ ہو سکتا ہے، اور آخر میں جناب وحشت کے دو ادبی مقالے، چار اہم خطوط اور ان کے دیوان اور ترانۂ وحشت کا انتخاب شامل کر دیا گیا ہے، دیوان کا انتخاب مولانا حسرت موہانی نے کیا ہے، اس انتخاب اور وحشت کے خطوط و مقالات نے اس نمبر کی اہمیت و افادیت اور بڑھا دی ہے، امید ہے کہ اصحاب ذوق میں یہ نمبر پسند کیا جائے گا۔

البصیر شبلی نمبر۔ مرتبہ جناب غلام دستگیر و سردار محمد صاحب، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ صفحات ۲۱۳، قیمت درج نہیں، پتہ: اسلامیہ کالج، چنیوٹ، پاکستان۔

۱۸۵۷ء ہندوستان کی تاریخ جد وجہد آزادی میں خاص اہمیت رکھتا ہے، مولانا شبلی اسی سال پیدا ہوئے تھے، گذشتہ سال یعنی ۱۹۵۷ء ان کی پہلی صد سالہ جوبلی کا سال تھا دار المصنفین کو ان کے خیالات، مقاصد اور پیش نظر علمی کاموں کی تکمیل کے لیے ٹھیک ان کی وصیت کے مطابق ان کے لائق ترین شاگردوں نے قائم کیا تھا، اس لیے ان کی یادگار منانے کا اصلی حقدار وہی تھا، لیکن مولانا کی شخصیت اتنی جامع اور ان کے کمالات اس قدر گوناگوں اور وسیع ہیں کہ ان کی شایان شان یادگار منانے کے لیے جیسے سرمایہ کی ضرورت تھی اس سر دست اس کا سامان نہیں تھا، دوسرے دار المصنفین خود ان کی مجسم یادگار ہے، جس سے انشاء اللہ ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا، اس لیے اس کو اس قسم کی رسمیات کی چنداں ضرورت بھی نہ تھی، مگر ہم کو مسرت ہے کہ بعض دوسرے اداروں نے اس تقریب کو انجام دیا، چنانچہ اسلامیہ کالج چنیوٹ نے مولانا کی

صد سالہ جوبلی کے موقعہ پر دسمبر ۱۹۵۶ء میں البصیر کا شبلی نمبر نکالا تھا، اس نمبر کی تیاری میں مرتبین نے دار المصنفین کے اکابر کی طرف بھی رجوع کیا، اس سلسلہ میں بعض نادر چیزیں بھیج دی گئی تھیں، اور ہمارے محترم رفیق کار سید صباح الدین صاحب نے دو مقالے لکھے تھے، جو اس نمبر میں چھپے ہیں، دوسرے مضامین میں بھی مولانا کے حالات، شخصیت، علمی مرتبت، ادبی حیثیت، تصنیفات، شاعری اور دوسرے علمی و عملی کمالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، لیکن بعض مضمون نگاروں کا لب و لہجہ حیات شبلی کے مولف کی نسبت اس لیے سخت ہوگیا ہے کہ سید صاحبؒ نے سرسید اور شبلی کے اختلاف فکر و نظر کا تذکرہ کر دیا ہے، مگر جب یہ ایک حقیقت ہے، تو پھر ایک مورخ اور سوانح نگار کا قلم اس کو کیسے نظر انداز کرسکتا تھا، پھر یہ بھی حیرت انگیز ہے کہ مولانا شبلی کے تمام کمالات کو صرف علی گڑھ اور سرسید ہی کا فیض قرار دیا جائے، ان ناخوشگوار بحثوں کو اس نمبر میں چھیڑنے کی ضرورت ہی کیا تھی، ان باتوں سے قطع نظر یہ نمبر اس لحاظ سے مفید ہے کہ مولانا کے متعلق مختلف قسم کے مضامین اسمیں جمع کر دیے گئے ہیں، شروع میں مولانا کے ایک خط کا عکس اور فوٹو دیا گیا ہے، اور آخر میں اڈیٹوریل کے علاوہ ایک مقالہ انگریزی میں بھی ہے، کتابت و طباعت کی جانب بہ توجہ اور اہتمام کی ضرورت تھی،

ماہنامہ صبا شبلی نمبر۔ مرتبہ جناب سلیمان اریب صاحب، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۱۱۰، قیمت عہ، پتہ: انجمن ترقی اردو، حیدرآباد۔

ماہنامہ "صبا" نے بھی شبلی نمبر نکالا ہے جس میں مولانا کے حالات، ان کے افکار و خیالات، ادب اور شاعری سے متعلق چند مقالات اور ان کے اردو، فارسی کلام کا انتخاب بھی دیا گیا ہے، یہ امر باعث مسرت ہے کہ لوگوں میں شبلی پر کام کرنے کا ذوق و شوق پیدا ہو رہا ہے لیکن

یہ دیکھکر افسوس ہوتا ہو کہ لوگ ان کے علمی و مذہبی کمالات، قومی و ملی خدمات اور ادبی و علمی کارناموں وغیرہ سے تعرض کرنے کے بجائے غیر ضروری بحثوں میں پڑ جاتے ہیں، اس نمبر کے بعض مضامین ترقی پسند ادیبوں کی بے راہ روی کا نمونہ ہیں، اور بعض چیزیں تو مولانا کے متعلق ایسی لکھی گئی ہیں جو غلط اور مہمل ہیں، تاہم بعض مضامین مفید اور قابل قدر ہیں جس سے مولانا کے حالات و کمالات پر بھی روشنی پڑتی ہے،

آجکل ابوالکلام نمبر ۔ مرتبہ جناب بال کمند عرش ملسیانی۔ کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ صفحات ۱۲۸، قیمت عہ ر پتہ: پبلیکیشنز ڈویژن اولڈ سکریٹریٹ، پوسٹ بکس نمبر ۲۰۱۱ دہلی نمبر

ماہنامہ آج کل اردو نے مولانا ابوالکلام آزاد کی یادگار میں یہ خاص نمبر نکالا ہے، جس میں ان کی مختلف حیثیتوں پر مقالات، نظموں اور قطعات تاریخ کے علاوہ ان کے متعدد فوٹو خطوط کے عکس اور ان کی بلیغ اور ولولہ انگیز تحریروں کے اقتباسات شائع کئے ہیں شروع میں پنڈت جواہر لال نہرو، ڈاکٹر سید محمود، بخشی غلام محمد، حافظ ابراہیم اور مسز ارونا آصف علی وغیرہ کے پیام عقیدت بھی درج ہیں، اس نمبر کے لکھنے والے زیادہ تر مولانا کے عقیدت مند یا قریبی تعلق رکھنے والے ہی ہیں، اس لیے ان کی شخصیت بہت زیادہ اجاگر ہوگئی ہے، لائق مرتب نے اس نمبر کے ذریعہ کوشش کی ہے کہ مولانا کی زندگی کے مختلف اور نمایاں پہلو واضح ہوجائیں، لیکن ان کی شخصیت اس قدر ہمہ گیر اور جامع تھی کہ ایک نمبر کے ذریعہ ان کا حق ادا نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس سے مولانا کے مختلف کمالات کی جھلک نظر آجاتی ہے اور اس حیثیت سے یہ نمبر کامیاب ہے،

الجمعیۃ شیخ الاسلام نمبر ۔ مرتبہ مولانا محمد عثمان فارقلیط، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۹۰، قیمت عہ پتہ: (۱) الجمعیۃ بک ڈپو، قاسم جان اسٹریٹ دہلی نمبر

حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کی ذات ستودہ صفات علم و فضل، زہد و تقویٰ، سلوک و ارشاد، طریقت و شریعت، جہد و عمل اور پاکیزہ سیرت و کردار کی جامع اور سلف صالحین کا نمونہ تھی، الجمعیۃ یقیناً مبارک باد کے قابل ہے کہ اس نے حضرت مولانا کے شایانِ شان نمبر نکالا جس میں مولانا کے خلفا، مسترشدین، احباب، تلامذہ اور خصوصی تعلق رکھنے والوں نے ان کی زندگی کے متعدد پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اور کوشش کی گئی ہے کہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ اور حصہ تشنہ نہ رہنے پائے، لکھنے والوں میں مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی، مولانا محمد طیب، مولانا محمد میاں، مولانا ابو الحسن علی ندوی، مولانا احتشام الحسن کاندھلوی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا اخلاق حسین قاسمی اور ڈاکٹر محمد اشرف وغیرہ قابل ذکر ہیں، کسی تحریر کے تمام پہلوؤں سے ہر شخص کا لفظ بلفظ اتفاق کرنا ضروری نہیں خصوصاً جب لکھنے والے تمامتر عقیدتمند ہوں تو بیان میں مبالغہ ہو جانا بعید نہیں ہے، مولانا کے کمال علم و عمل کے اثبات کے لیے انکے مذہبی و سیاسی خیالات سے اختلاف رکھنے والوں کو مطعون کرنا ضروری نہیں، تلک امۃ قد خلت لہا ما کسبت و لکم ما کسبتم۔ خصوصاً جب کہ مولانا ابو الحسن علی کے بقول مولانا حسین احمد صاحبؒ کا عمل اس شعر پر تھا کہ

شنیدم کہ مردان راہ خدا

دلِ دشمناں ہم نہ کردند تنگ

اس قسم کی باتیں صرف دو تین مقالوں میں ہیں، ورنہ اکثر مقالے بہت مفید ہیں اور ان کا مطالعہ عام مسلمانوں کے لیے اس لحاظ سے بڑا مفید ہوگا کہ اس سے مولانا کے نقش قدم پر چلنے کی انھیں توفیق ہوگی، "ض"

مطبوعات جدیدہ

صہبائے مینائی - از جناب ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۲۸۸، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت للعہ، پتہ مکتبۂ عارفین ۱۴۵/۱۱ گورنمنٹ نیو مارکٹ، عظیم پور، ڈھاکہ۔ ہندوستان میں: حاجی محمد سعید اینڈ سنس، ناشران و تاجران کتب نمبر ۲ ویلسلی اسٹریٹ، کلکتہ ۱۳

قدیم اردو شاعری اپنی خامیوں کے باوجود نہ صرف ہمارے شعر و ادب کا بہترین سرمایہ بلکہ بہت سی اعلیٰ قدیم تہذیبی اقدار کی ترجمان بھی ہے، جدید شاعری کتنی ہی ترقی کر جائے مگر قدیم ادبی سرمایہ سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتی، اس کی عمارت اسی پرانی بنیاد پر قائم ہے۔ اس دور کے صاحب نظر ادیب بھی اس حقیقت کے معترف ہیں، پرانے اساتذہ میں داغ و امیر قدیم طرز کے آخری نمایندے اور اپنے اپنے رنگ کے استاد کامل تھے، اسی لیے اس زمانہ کے ایک خوش مذاق ادیب ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی نے انکی شاعری کی روشنی میں قدیم شاعری کی اہمیت اور قدر و قیمت دکھانے کی کوشش کی ہے۔ گلہائے داغ کی بہار وہ پہلے دکھا چکے ہیں، اب صہبائے مینائی پیش کی ہے، اس کتاب میں چار ابواب ہیں اور ان میں بالترتیب نفس شاعری، تغزل، امیر کی شاعری کے پس منظر، شخصیت، خاندانی حالات، علمی کمالات، تحقیقی کارنامون، صوفیانہ زندگی، شگفتہ مزاجی، داغ و امیر کے تعلقات اور ان کی غزل گوئی پر تبصرہ اور انکے شاعرانہ مقام کی وضاحت کی گئی ہے اور آخر میں ان کے کلام کا ایک عمدہ انتخاب پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ڈاکٹر عندلیب شادانی کے قلم

سے ایک تقریظ ہے۔ لائق مؤلف نے بڑی محنت اور خوش مذاقی سے یہ کتاب لکھی ہے، اس کی نمایاں خصوصیت، اس کی جامعیت، ادبی وشاعرانہ نکتہ سنجی اور جدت و قدامت کا معتدل امتزاج ہے، اس سے آمیر کے حالات اور ان کے شاعرانہ کمالات کے ساتھ شعر و ادب کے بہت سے دلکش پہلو اور اس دور کے ادبی و تہذیبی ماحول کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے، انداز بیان نہایت شگفتہ و دلکش ہے، اور وہ اپنے ادبی محاسن کے لحاظ سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے، اس کی اشاعت سے اردو ادب میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا ہے۔

تعمیر پاکستان اور علمائے ربانی۔ از منشی عبد الرحمن خاں صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۲۷، مجلد معہ رنگین گرد پوش، قیمت ؎، پتہ: ادارۂ نشر المعارف چہلیک ملتان شہر۔

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ شروع میں تخیل پاکستان اور تحریک پاکستان کی ضرورت و اسباب اور اس کے بعد یہاں اسلامی آئین و قوانین کے نفاذ میں علماء کی مساعی اور جد و جہد پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ پاکستان کا تخیل ڈاکٹر اقبال کے بجائے سب سے پہلے حکیم الامت مولانا تھانویؒ نے پیش کیا تھا۔ اس سے تعجب ضرور ہوتا ہے، مگر مصنف نے اسے ثقہ لوگوں کی روایات اور دلائل سے ثابت کیا ہے، ایک باب میں قائد اعظم محمد علی جناح کے تدین کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی دینی و عملی تربیت میں مولانا تھانویؒ کا خاص حصہ تھا، کتاب کے اکثر حصوں میں جماعت اسلامی پاکستان اور اس کے امیر مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کے طرز عمل سے بحث کی گئی ہے کہ وہ شروع میں قیام پاکستان کے مخالف تھے اور اس کے بننے کے بعد متعدد مسائل میں ان کی پالیسی سے پاکستان کو نقصان پہنچا اور اس کے دینی رجحان اور اسلامی نظام کے لیے فضا سازگار بنانے میں جماعت اسلامی کا نہیں بلکہ علمائے اشرفیہ کا بڑا دخل تھا،

یہ ان کی ذاتی رائے ہے، جو ممکن ہے صحیح ہو لیکن اس بحث میں مصنف کا لہجہ درشت، مناظرانہ اور انداز تحریر عامیانہ ہوگیا ہے، انھوں نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمایندہ اور دینی جماعت بتایا ہے، حالانکہ علما، کی اکثریت اس کے خلاف تھی اور اس کے دینی جماعت ہونے کا سارا راز پاکستان بننے کے بعد فاش ہوگیا، کتاب دلچسپ اور تاریخی معلومات پر مشتمل ہے، اس سے گذشتہ نصف صدی کی تاریخ کے بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں،

تذکرۂ نادر :۔ مرتبہ جناب مسعود حسن رضوی ادیب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۱۹۰ قیمت عہ پتہ : کتاب نگر دین دیال روڈ، لاہور،

اعتصام الدولہ مرزا کلب حسین خاں بہادر جنگ نادر رئیس بنارس، شاعری میں شیخ ناسخ کے شاگرد تھے، دیوان غریب ان کے مخمسوں کا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے ۱۲۵ شاعروں کی غزلوں کا مخمس کیا ہے اور ان کے ضروری حالات تحریر کیے ہیں، اس دیوان کا ایک بوسیدہ اور کہنہ نسخہ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے کتبخانہ میں موجود تھا، جس کے خستگی و بوسیدگی کے باعث ضائع ہو جانے کا اندیشہ تھا، اس لیے رضوی صاحب نے جنھیں قدیم ادبی یادگاروں سے عشق ہے تذکرۂ نادر کے نام سے اس کو شائع کر دیا ہے، اور شروع میں نادر کے مختصر حالات و واقعات تحریر کیے ہیں اور اس کی تصنیفات نظم و نثر کا بھی ذکر کیا ہے، اس تذکرہ میں بہت سے ایسے غیر معروف شاعروں کا نمونۂ کلام اور تذکرہ درج ہے جن کا ذکر دوسرے تذکروں میں نہیں ملتا، اس لحاظ سے یہ تذکرہ اہم ہے، اور اس کو مرتب اور شائع کرکے فاضل مرتب نے ایک مفید علمی و ادبی خدمت انجام دی ہے،

المنتخبات العربیۃ قسم النظم :۔ مرتبہ مولانا محبوب الرحمٰن و ابو محفوظ کریم معصومی لکچرار مدرسہ عالیہ کلکتہ، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۹۶ قیمت عہ پتہ عثمانیہ بکڈپو ۱۰۴ لور چیت پور روڈ، کلکتہ نمبر۱

اس مختصر مجموعہ میں پہلی صدی ہجری سے لیکر موجودہ دور تک کے چند عربی شعرا کے کلام کا انتخاب شائع کیا گیا ہے، جو ہر لحاظ سے جامع اور معیاری تو نہیں لیکن فائدہ سے خالی نہیں، اسے مغربی بنگال کے درجۂ عالم کے طلبہ کے لیے مرتب کیا گیا ہے، مگر عربی زبان وادب کے عام شائقین بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، شروع میں مولانا ابوالحسن علی ندوی کا پیش لفظ ہے۔

متاع کلیم :۔ از جناب کلیم احمد آبادی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۷۶، مجلد ہے، رنگین گردپوش، قیمت للعہ پتہ: کلیم بکڈپو، خاص بازار احمد آباد۔

جناب کلیم گجرات کے ایک گمنام مگر سن رسیدہ شاعر ہیں، یہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جو آخری دور کے کلام پر مشتمل ہے، جب کہ ان کی شاعری مجاز کی منزل سے گذر کر حقیقت وعرفان کے مقام پر پہنچ چکی ہے، اس لیے اس میں عشق و محبت کی واردات کے ساتھ سوز وگداز اور جذب ومستی کی بھی کیفیتیں ہیں، اس مجموعہ میں فن اور زبان کی معمولی خامیاں کہیں کہیں نظر آتی ہیں، مگر مجموعی حیثیت سے متاع کلیم اصحاب ذوق کی قدر دانی کے لائق ہے، مجموعہ کے شروع میں مصنف کی شاعری پر مختصر تبصرہ اور ان کے حالات بھی تحریر کیے ہیں، اور اس کی تقریب دارالمصنفین کے سابق اور دیرینہ رفیق جناب نجیب اشرف صاحب ندوی نے لکھی ہے۔

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات :۔ از جناب اسرار احمد صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اعلیٰ، صفحات ۷۰۴، مجلد مع گردپوش، قیمت صہ، ناشر مکتبہ برہان، جامع مسجد، دہلی۔

اس سے پہلے اس کتاب کی دو جلدیں شائع ہو چکی ہیں، یہ جلد ثانی کا دوسرا حصہ ہے، اس میں تجاویز، واقعات، محاربات، اجتماعات، مختصرات اور متفرقات کے عنوانات کے تحت، سیاسی اصطلاحوں کی تشریح کی گئی ہے، سیاسی مسائل میں آئے دن کی تبدیلیوں کیوجہ سے پہلی اور دوسری جلد حصہ اول کے تتمے بھی اسمیں شامل کر دیے ہیں، مصنف نیشلسٹ اور نیم اشتراکی ہیں، انکے یہ رجحانات کتاب میں بھی کہیں کہیں نمایاں ہیں، موجودہ سیاسی اصطلاحات والفاظ کے سمجھنے کے لیے یہ کتاب انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ ض

سلسلۂ تابعین و تبع تابعینؓ

اہل کتاب صحابہ و تابعینؓ

شروع میں عرب کے یہود و نصاریٰ کی قدیم تاریخ اور ان کے تمدنی وسیاسی اثرات اور اُن کی دینی و اخلاقی حالات کی تفصیل اور اس کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے (۹۳) اہل کتاب صحابہ اور تابعین اور ان کے بعد صحابیات اور تابعات کا تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے، مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

ضخامت ۲۷۵ صفحے قیمت : للعہ

تابعینؓ

اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حسن بصریؒ، اویس قرنیؒ، امام زین العابدینؒ، سعید بن مسیبؒ، محمد بن سیرینؒ، ابن شہاب زہری، اور قاضی شریح وغیرہ ۹۶ اکابر تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور علمی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

طبع دوم ضخامت ۵۵۶ صفحے قیمت ؎

تبع تابعینؒ

(حصۂ اول)

علم وعمل اور مذہب واخلاق میں جس طرح صحابۂ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے اور صحابۂ کرام کے بعد انہی کی زندگی ملتِ اسلامیہ کے لئے نمونۂ عمل بنی، بالکل اسی طرح تابعین کرامؒ کے جانشین، اور اُن کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، سیر الصحابہ کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین تابعین کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کر چکا ہے، اب اُس نے اُن کے بعد کے مقدس تر بزرگوں اور ائمۂ دین کا مرقع تیار کرایا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور آپکے فقہی مسلک کے داعی و علمبردار امام ابو یوسفؒ، امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں اور فقہی اجتہادات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی حصہ اول ضخامت صفحے قیمت :

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دو کتابیں

خطباتِ مدراس

یہ وہی خطبات ہیں جو سید صاحب مرحوم نے سنہ ۱۹۲۵ء میں مدراس میں سیرۃ نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر دیئے تھے، یہ اپنے معلومات کی وسعت، مباحث کی ندرت اور افادیت کے لحاظ سے سیرۃ کی ضخیم کتابوں پر بھاری اور سیرۃ کے مقررین کے لئے بہت کارآمد ہیں، دارالمصنفین نے اس کا نیا اڈیشن بڑے اہتمام و نفاست سے تیار کرایا ہے ضخامت: ۱۸۲ صفحے، قیمت ے ر

رحمتِ عالم

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے رحمتِ عالم کے نام سے سیرۃ پر نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں ایک اور چھوٹا سا رسالہ لکھا تھا جو بہت مشہور و مقبول ہوا، بعض مدارس کے نصاب تعلیم میں بھی شامل کرلیا گیا اس رسالہ کو مطبع معارف نے نہایت اہتمام سے دوبارہ چھاپا ہے، یہ رسالہ پاکستان میں مکتبۃ الشرق آرام باغ کراچی سے بھی مل سکتا ہے ضخامت: ۱۰۴ صفحے قیمت ۱۲ر

(دارالمصنفین کی نئی کتاب)

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

یہ تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی، اور معاشرتی تاریخ ہے، اس میں اس عہد کے ہندو مسلمان مورخین کی کتابوں اور مضامین کے وہ تمام اقتباسات جمع کردیئے گئے ہیں جن سے اس عہد کے سیاسی، اقتصادی، تجارتی، تمدنی اور معاشرتی حالات معلوم ہوتے ہیں اور پھر مسلمانوں کی تاریخ کے روشن پہلو ہندو مورخوں کی زبان سے اور ہندوؤں کے علمی کارنامے مسلمان مورخوں کے قلم سے نقل کئے گئے ہیں جس کو مربوط طور پر پہلی مرتبہ اردو میں پیش کیا گیا ہے۔

ضخامت :- ۵۰۶ صفحے قیمت: ؍

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے علیگ

رجسٹرڈ نمبر اے ۵۲۰ ستمبر ۱۹۵۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

تاریخ دعوت وعزیمت حصّہ دوم

یعنی

علامہ ابنِ تیمیہؒ کے سوانح حیات

اس میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ تقی الدین ابن تیمیہ حرانی کے سوانحِ حیات، اُن کے صفات و کمالات، اُن کی علمی و تصنیفی خصوصیات ان کا تجدیدی و اصلاحی کام اور مقام اور اُن کی اہم تصنیفات الجواب الصحیح منہاج السنۃ فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ کا مفصّل تعارف اور اُن کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ، ابن الہادی، ابنِ کثیر اور حافظ ابنِ رجب وغیرہ کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ ضخامت ۳۹۲ قیمت : ۸/-

مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی

قیمت .... ۔/-

جلد ۸۴ ماہ ربیع الاول ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۹ء نمبر ۳

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ گذشتہ مہینہ ۲۴ راگست کو فرنگی محل کے نامور عالم مفتی عبد القادر صاحب نے وفات پائی، مرحوم علم و عمل میں اپنے اسلاف کرام کا نمونہ اور طبعاً نہایت خاموش اور عزلت پسند تھے، پوری زندگی خاموشی اور قناعت کے ساتھ درس و تدریس اور علم و افتا کی خدمت میں گذار دی، ان کی موت سے فرنگی محل کی ایک اہم یادگار مٹ گئی، نئی نسل جدید تعلیم یافتہ ہے، اس کو اپنے اسلاف کے علوم اور روایات سے بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اس لیے جو ایک دو پرانے بزرگ باقی رہ گئے ہیں ان کے بعد فرنگی محل میں سناٹا نظر آتا ہے،

اس خاندان میں جتنی طویل مدت تک علم رہا اور اس سے پورے ہندوستان کو جو فیض پہنچا اسکی مثال دوسرے علمی خاندانوں میں کم ملے گی، عموماً دو چار پشتوں سے زیادہ کسی خاندان میں علم نہیں چلتا، مگر فرنگی محل تقریباً تین صدیوں تک دینی علوم اور اسکی تعلیم کا مرکز رہا اور اس مدت میں ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ ملا حیدر، ملا مبین، ملا حسن، مولانا بحر العلوم، مولانا عبد الحئی اور مولانا عبد الباری رحمہم اللہ جیسے بڑے بڑے علماء پیدا ہوئے، مگر اب بظاہر اس سلسلۃ الذہب کا خاتمہ نظر آتا ہے۔

مفتی صاحب مرحوم علم و عمل کے ساتھ اخلاق فاضلہ اور اوصاف حمیدہ سے بھی آراستہ، نہایت خاموش، متواضع، نرم خو، خندہ جبیں، شگفتہ مزاج اور خوش خلق تھے، ملنے والوں پر ان کے علم سے زیادہ ان کے اخلاق کا اثر پڑتا تھا، ان اوصاف کی بنا پر وہ ہر طبقہ میں بڑے مقبول تھے، راقم نے ان سے

مختصر المعانی پڑھی تھی، اس زمانہ میں ان کے اخلاق اور مہر و محبت کا جو نقش دل پر قائم ہوا تھا وہ ابتک باقی ہے، اللہ تعالیٰ اس خادم علم و دین کو اپنی رحمت کاملہ سے سرفراز فرمائے۔

ہندوستان کی حکومت سیکولر ہے اس لیے اس کے نظام تعلیم میں مذہبی تعلیم کی کوئی جگہ نہیں تھی، مگر اب حکومت کو بھی اس ضرورت کا احساس ہو رہا ہے، چنانچہ اس نے اس مسئلہ پر غور کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی ہے اور یقین ہے کہ اس کی رپورٹ کے بعد مذہبی تعلیم بھی نظام تعلیم میں شامل کر لیجائے گی، اس تجویز سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن ہندوستان میں مختلف مذاہب اور مختلف فرقے ہیں، اصولاً ان سب کی مذہبی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے، مگر ایسا نہ ہو سکے گا، ایسی صورت میں سوال یہ ہے کہ پھر کس مذہب کی تعلیم دیجائیگی، ابھی حال میں حکومت نے مسلمانوں کے ایک وفد کو اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ کسی خاص مذہب کی نہیں بلکہ جملہ مذاہب کی مشترک تعلیمات کی تعلیم دیجائیگی، اس کے معنی یہ ہیں کہ صرف اخلاقیات کی تعلیم ہوگی، یہاں تک غنیمت ہے، مگر اندیشہ یہ ہے کہ مذہب کے نام سے ہندو مذہب کی تعلیم دیجائیگی، اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب سیکولر نظام تعلیم میں ابتدائی تعلیم تمامتر ہندو تاریخ اور ہندو تہذیب و روایات کی دیجارہی ہے تو جب مذہبی تعلیم باقاعدہ نظام تعلیم میں شامل کر لیجائے گی اس وقت جس مذہب کی تعلیم ہوگی اسکا قیاس ابتدائی تعلیم پر کیا جا سکتا ہے۔

اس کی صحیح شکل جو سب فرقوں کے لیے قابل اطمینان ہوتی یہ تھی کہ جو کمیٹی مقرر کیگئی ہے اس میں ماہرین تعلیم کے ساتھ ہر فرقہ کے مذہبی تعلیم کے اصلی نمایندوں یا کم سے کم ایسے لوگوں کو بھی شامل کیا جاتا جو اپنے مذہب کی تعلیم کے بارہ میں صحیح نقطۂ نظر پیش کر سکتے، یا آیندہ مذہبی نصاب کی جو کمیٹی بنائی جائے یا اسکی ترتیب کا جو نظام بھی ہو اس میں بھی اس کا لحاظ رکھا جائے اور ان سب کے مشورے سے نصاب تعلیم بنایا جائے اور انکے

اتفاق کے بعد اس کو جاری کیا جائے، جدید تعلیم کے ماہرین میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے، مگر حکومت ایسے موقعوں پر عموماً ان ہی لوگوں کا انتخاب کرتی ہے جن کو سرے سے اپنے مذہب ہی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور وہ اس کی ترجمانی کرنے کے بجائے حکومت کے نشا کی تکمیل کرتے ہیں۔

تعلیم کا مسئلہ ہندوستان کے تمام فرقوں کے لیے نہایت اہم ہے، اسی کے ذریعہ بچوں اور نوجوانوں کے عقائد و افکار بنتے اور انکی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے، جو نقش اس زمانہ میں قائم ہوتا ہے وہ کبھی نہیں مٹتا، ابتدائی تعلیم کے ذریعہ مسلمان بچوں کی ملی و تہذیبی خصوصیات کو مٹانے اور ان کو ہندو تہذیب و روایات کے رنگ میں رنگنے کی جس طرح کوشش کیجا رہی ہے اس کا تجربہ ان سب لوگوں کو ہوگا جن کے بچے ابتدائی اسکولوں میں پڑھتے ہیں، اسلیے سرکاری تعلیم میں مذہبی تعلیم کو شامل کرنے کی جو تجویز ہے اگر ابھی سے اس میں اپنے مذہبی تحفظ کی کوشش نہ کی گئی تو ابتدائی تعلیم کے ذریعہ ہندو بنانے کی جو مہم شروع ہوئی ہے اسکی پوری تکمیل ہو جائیگی، اس لیے تمام فرقوں خصوصاً مسلمانوں کو اس کے تدارک کی پوری کوشش کرنی چاہیے اور جمعیۃ العلماء کو خاص طور سے اس کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تمدنی اور کلچرل تاریخ کا جو کام عرصہ سے دارالمصنفین کے پیش نظر تھا، اب وہ شروع ہو گیا ہے اور اس کے لیے حکومت ہند نے فی الحال ایک سال کے لیے دس ہزار کی امداد منظور کی ہے، اس وقت اس سلسلہ کی دو کتابیں زیر تالیف ہیں، "ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام" اور "ہندوستان عربوں کی نظر میں"۔ اس میں ہندوستان کے متعلق عرب مورخین، جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کے اصل بیانات مع ترجمہ کے ہوں گے یقین ہے کہ یہ دونوں کتابیں اپریل تک تیار ہو جائیں گی، ایک نئی کتاب تبع تابعین چھپکر تیار ہو گئی ہے، اس پر سیرت کا سلسلہ یعنی سیر الصحابہ، تابعین اور تبع تابعین مکمل ہو جائے گا، فالحمد للہ علی ذالک۔

مقالات

امام حسن بن محمد الصغانی لاہوری

از جناب مولانا عبد الحلیم چشتی فاضل دیوبند

(۸)

مدرسہ تتشیہ میں صغانی کا تقرر

جب صغانیؒ ۶۲۲ھ میں رباط المرزبانیہ کی صدارت سے سبکدوش ہوئے تو خلیفۂ بغداد مستعصم باللہ نے ان کو خمارتکینؒ[1] کے مدرسۂ تتشیہ[2] میں مدرس مقرر کر دیا اور

---

[1] افسوس ہے اس مخلص اور خیرخواہ کے تذکرے سے تاریخ اور تذکرہ کی متداول کتابیں یکسر خاموش ہیں، جو سرمایہ جستجو اور تلاش کے بعد ہاتھ آیا ہو وہ ہدیۂ ناظرین ہے، خمارتکین بن طاشتکین المتوفی ۵۰۰ھ سلطان الپ ارسلان کے فرزند تاج الدولہ ابوسعید تتش السلجوقی المتوفی ۴۸۸ھ کا غلام تھا، تاج الدولہ ابوسعید نے اس کو پہلی مرتبہ ایک بار شتر نمک کی قیمت میں خریدا تھا، یہ جوہر قابل تھا، اس نے اپنی وفاداری، فرض شناسی، غیرمعمولی شجاعت اور قابلیت کی وجہ سے جلد ہی اپنے آقا کی نگاہ میں ایک خاص مقام پیدا کر لیا تھا، اس کے انتقال کے بعد محمد بن ملک شاہ المتوفی ۵۱۱ھ کے دربار میں اس کو بڑی جاہ و منزلت حاصل ہو گئی تھی، اس کے دور حکومت میں اس کا طوطی بولتا تھا، اس کے پاس مال و دولت کی بڑی فراوانی تھی، اور اس نے رفاہ عام کے کارہائے نمایاں انجام دیے، حاجیوں اور مسافروں کے لیے رے اور سمنان میں نہایت عالیشان سرائیں تعمیر کرائیں، بغداد میں مسجدیں اور سڑکیں بنوائیں، شفاخانے اور مدرسے کھولے، مگر اس وفادار اور حق شناس خادم نے ان سب کو اپنے نام سے انتساب کے بجائے اپنے آقا کے نام سے نسبت ہی کو باعث فخر سمجھا، اس کے اخلاص کی یہ برکت تھی کہ دو سو برس تک ان سے خلقِ خدا کو فیض پہنچتا رہا، یاقوت رومی المتوفی ۶۲۶ھ

(باقی حواشی صفحہ ۱۶۶ پر)

خلعت خاص سے سرفراز فرمایا، پہلی مرتبہ اس کا اصل محرک اور بانی اگرچہ ابوسعد صوفی تھا، مگر اس کا

(بقیہ حواشی ص ۱۶۵) معجم البلدان میں رقم طراز ہے:-

تتش التاآن مضمومتان والشين معجمة وهو اسم رجل ينسب اليه مواضع ببغداد وهي سوق قرب المدرسة النظامية يقال له العقار التتشي ومدرسة بالقرب لاصحاب ابي حنيفة يقال التتشية وبيمارستان بباب الازج يقال له التتشي والجميع منسوب الى خادم يقال له خمارتكين كان لملك تاج الدولة تتش بن الب ارسلان بن داؤد بن سلجوق قالوا وكان ثمن خمارتكين هذا في اول شرائه حملا ملحا وعظم قدره عند السلطان محمد بن ملك شاه ونفذ امره وكثرت امواله وبنى ما بناه مما ذكرناه في بغداد وبنى بين الري وسمنان رباطا عظيما ينتفع الحاج والسابلة وغيرهم وامضى السلطان محمد ذلك كله وجميع ما ذكرناه في بغداد موجود معمور الآن جار على احسن نظام عليه الوكلاء يجبون امواله

تتش یہ ہر دو تا مضموم اور شین معجمہ کیساتھ ہے یہ ایک شخص کا نام ہے، اس کی طرف متعدد مقامات منسوب ہیں، مدرسہ نظامیہ کے قریب ایک بازار بھی اسی کے نام سے موسوم ہے جس کو عقار تتشی کہا جاتا ہے، احناف کا ایک مدرسہ بھی اس کے پاس ہے جس کو مدرسۂ تتشیہ کہا جاتا ہے، باب الازج کے پاس ایک شفاخانہ بھی ہے جو شفاخانہ تتشی کے نام سے پکارا جاتا ہے، اور یہ سب اسی ایک خادم کی طرف منسوب ہیں جس کا نام خمارتکین ہے، یہ سلطان تاج الدولہ تتش بن الب ارسلان ابن داؤد بن سلجوق کا خادم اور غلام تھا، اور جس وقت پہلی مرتبہ اس کو خریدا تھا اسکی قیمت ایک بار شتر نمک تھی، محمد بن ملک شاہ کے یہاں اس کا بڑا مرتبہ تھا، اس کا حکم چلتا تھا اور ان کو بڑی ثروت حاصل ہوگئی تھی، اس نے بغداد میں ان چیزوں کو بنایا جس کا اوپر ہم نے ذکر کیا ہے، رے اور سمنان میں بھی اس نے بڑی بڑی سرائیں بنوائیں تاکہ حاجیوں اور مسافروں کو فائدہ پہنچے، اسکی بنا کردہ چیزوں کو سلطان محمد نے برقرار رکھا اور

(باقی حواشی ص ۱۶۷)

روح و روان نہایت متعصب شافعی نظام الملک طوسی تھا جس کے نام سے یہ مدرسہ مشہور ہے۔

(بقیہ حواشی ص ۱۶۶) وبھما فو تھا فی وجود	بغداد میں آج بھی موجود اور آباد ہیں اور حسن انتظام
ومات خمار تکین ھذا فی رابع	کیساتھ چل رہی ہیں اور اسکی نگرانی اور دیکھ بھال
صفر ۵۰۸	کیلئے وکیل مقرر ہیں جو اپنی نگرانی اور مرمت وغیرہ پر
(معجم البلدان باب التا، والثار وما یلیھا)	روپیہ خرچ کرتے رہتے ہیں، خمار تکین کا انتقال ۵۰۸ھ

عربی زبان کا پرگو اور صاحب دیوان شاعر عیسٰی الحاجری المتوفی ۶۳۳ھ اسی کی نسل سے تھا، مورخ ابن خلکان المتوفی ۶۸۱ھ وفیات الاعیان (طبع ایران ۱۲۸۴ھ ج ۱ ص ۴۳۵) میں رقمطراز ہیں:

ھو عیسٰی بن سنجر بن بھرام بن جبریل بن خمار تکین بن طاشتکین الاربلی

اس میں اس کے باپ کا نام بھی بصراحت مذکور ہے،

۲ے ہمارا خیال ہے کہ حنفیوں کا یہ مدرسہ مدرسہ نظامیہ کے مقابلہ پر قائم کیا گیا تھا جو کم و بیش دو سو برس تک خاموشی کے ساتھ اسلام کی خدمت کر رہا ہے، یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مدرسہ نظامیہ شوافع کا قائم کردہ اور شافعی مکتب خیال کے علماء کا مرکز اشاعت تھا، اس میں درس و تدریس کا منصب شافعی عالم ہی کو ملتا تھا اور اس کے دروازے حنفی علماء پر بند تھے، صرف و نحو تک پڑھانے کے لیے غیر شافعی کو جگہ نہ ملتی تھی، حالانکہ صرف و نحو کو حنفیت اور شافعیت سے کوئی علاقہ نہیں، کیونکہ بانیانِ مدرسہ نے وقف کے وقت یہ شرط لگا دی تھی کہ تدریس کا منصب بجز شافعی علماء کے اور کسی کو نہیں دیا جا سکتا، اس لیے بعض زمانہ ساز علماء نے یہاں پر درس و تدریس کی خاطر شافعی مسلک اختیار کر لیا تھا، مورخ ابن خلکان الشافعی المتوفی ۶۸۱ھ شیخ ابن الدہان ابوبکر المبارک الواسطی المتوفی ۶۱۲ھ کے تذکرہ میں رقمطراز ہیں:

تفقہ علی مذھب ابی حنیفۃ بعد	وہ حنبلی تھے مگر فقہ حنفی کی تحصیل کی اور
ان کان حنبلیا ثم صار (اشتغل) منصب	حنفی مسلک اختیار کیا۔ پھر جب مدرسہ
تدریس النحو بالمدرسۃ النظامیۃ و	نظامیہ میں نحو کی تدریس پر مامور ہوئے تو واقف
شرط الواقف ان لا یفوض الا الی	کی اس شرط کے مطابق کہ کوئی منصب شافعی
شافعی فانتقل الوجیہ الی	عالم کے سوا اور کسی کو نہیں دیا جائیگا، وجیہ
مذھب الشافعی	(ابن الدہان کا لقب ہے) نے شافعی مذہب اختیار کر لیا،

یہی وجہ تھی کہ اس مدرسہ کے قائم ہونے کے بعد بغداد میں اختلافی مسائل کی بڑی گرم بازاری رہی، مناظرے و مباحثے ہوئے، اور احناف کی تردید میں بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں، مسعود بن ابی شیبہ السندی کتاب التعلیم (مخطوطہ مجلس علمی کراچی ص ۱۳۰) میں تحریر فرماتے ہیں:

ظهر مذهب الشافعي حين ظهر
فيهم نظام الملك وكانت فتنة
على اصحاب ابي حنيفة ومالك
اشد من الديلم وقد قتلوا منهم
خلقاً كثيراً ووضعت في ايامه كتب
مثالب ابي حنيفة ومعائبه
وقد لقي جزاء ذلك حيا وميتا
حتى تناثرت اعضاءه بالجذام
وعذب بالضرب والحبس و
احرقت رمته في سنة اثنتين
وثلاثين وستمائة بعد مائة
وثمان واربعين سنة احرقتها
الكفار التتر لما استولوا
على اصفهان بسبب يطول ذكره

شافعی مذہب کا غلبہ بغداد میں نظام الملک طوسی کے اقتدار کے زمانہ میں ہوا اور یہ حنفیوں اور مالکیوں کے لیے دیلمیوں کے فتنہ سے بھی بڑھ کر تھا، انھوں نے ان کی کثیر تعداد قتل کی، اسی کے زمانہ میں امام ابوحنیفہؒ کی مذمت اور معائب میں کتابیں لکھی گئیں، مگر اس کو زندگی میں بھی اور مرنے کے بعد بھی اس کا پورا بدلہ ملا ہے، اس کے اعضا کوڑھ سے گل کر گرنے لگے، مار بھی پڑی، قید و بند کی سزائیں اس نے بھگتیں، اور اس کی موت کے ۱۴۸ برس کے بعد کافر تاتاریوں نے ۶۳۲ھ میں جب اصفہان پر قبضہ کیا، اس وقت اس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر جلا دیں، اس وقت اس کی تفصیل

یہاں عربی عبارت ختم ہے

خلفائے بغداد کو ایک زمانہ کے بعد نظامیہ کے قیام سے پیدا شدہ منافرت کا صحیح احساس ہوا اور آخر مستنصر باللہ نے ایک جداگانہ مدرسہ کی داغ بیل ڈالی، جو مدرسہ مستنصریہ کے نام

سے مشہور ہے، اس میں مذاہب اربعہ کی تعلیم کا صحیح انتظام کیا گیا تھا اور ہر مسلک کے علماء کو اس میں مدرس رکھا گیا تھا جس سے اتحاد و اتفاق کی ایک نئی روح علماء میں جلوہ گر ہوئی تھی،

ابن الفوطی نے (الحوادث الجامعہ ص ۲۹۰) شمس الدین محمد بن عبید اللہ الہاشمی الکوفی المتوفی ۶۷۵ھ کے تذکرہ میں لکھا ہے،

ولی التدریس بالمدرسۃ التتشیہ	آپ مدرسہ تتشیہ میں تدریس کے منصب پر فائز رہے ہیں۔

جس سے ثابت ہوتا ہے مدرسہ تتشیہ میں ۶۷۵ھ تک تعلیم کا سلسلہ جاری تھا،

صغانی جب پہلی مرتبہ اس مدرسہ میں آئے تو ایک فصیح و بلیغ خطبہ دیا اور تدریس سے فارغ ہو کر برجستہ چند اشعار پڑھے، مورخ ابن الفوطی البغدادی لکھتے ہیں:

رتب الصغانی مدرسا بمدرسۃ	خلیفہ مستعصم باللہ نے صغانی کو خمارتکین
خمارتکین التتشی وخلع علیہ	کے مدرسہ تتشیہ میں مدرس مقرر کیا اور
وحضر المدرسۃ وخطب خطبۃ	خلعت سے سرفراز فرمایا، آپ مدرسہ میں آئے
فصیحۃ وذکر عشرۃ درس	تو نہایت فصیح و بلیغ خطبہ دیا اور جو دس
وانشد عند فراغھا	سبق آپ کے سپرد ہوئے تھے ان کی بابت کچھ فرمایا
	اور اس سے فارغ ہو کر حسب ذیل چند شعر پڑھے

فھاکم یا سادتی	منی درسا عشرۃ
میرے بزرگو! مجھ سے	دس سبق پڑھ لو
فانتم معادن الفضل	الکرام البررۃ
آپ فضیلت کی کانیں ہیں	نیک اور شریف ہیں
ولست حبرا عالما	لکنما محبرۃ
اور میں کوئی زبردست عالم نہیں	صرف ایک دوات ہوں

فلتعذروا اخاکم	فمثلکم من عذر له
تمھارا بھائی تم سے عذر قبول کرنے کے لیے کہتا ہے	تمھاری طرح بعض وہ لوگ ہیں جو عذر پیش کرنے میں مبالغہ کرتے ہیں

صغانی کے اس مدرسہ سے ترک تعلق کی کوئی شہادت نہیں مل سکی جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدرسۂ مذکورہ سے موصوف کا تعلق تا حیات برابر قائم رہا ہے،

خلیفۂ بغداد مستعصم باللہ کا وزیر مویدالدین محمد ابن العلقمی غالی شیعہ ہونے کے باوجود آپ کو نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھتا، بڑے احترام سے پیش آتا اور ہر طرح سے آپ کی دلجوئی اور خدمت کو اپنی سعادت سمجھتا تھا۔ اس کے اسی اخلاص و محبت کا نتیجہ تھا کہ صغانی بھی اس کا خیال رکھتے تھے، اس نے جہاں اور نادرۂ روزگار فضلاء کو اپنے فرزند عزالدین ابوالفضل محمد العلقمی کی تعلیم و تربیت پر مامور کیا تھا وہاں ادب اور لغت کی تعلیم کے واسطے آپ کی خدمات حاصل کی تھیں، اس کو پڑھانے کے لیے ابن العلقمی کے محل میں جاتے تھے۔ الحوادث الجامعہ کے مؤلف کا بیان ہے:

کان یتردد الی دار الوزیر	آپ وزیر کے فرزند عزالدین کو ادب کی تعلیم دینے کے
بشغل ولده عزالدین فی الادب[۲]	واسطے اس کے دولتکدہ پر آیا جایا کرتے تھے،

صلاح الدین خلیل بن ایبک الصفدی المتوفی ۷۶۴ھ تحریر فرماتے ہیں:

قرأ القرآن علی التقی حسن ابن	عزالدین نے قرآن مجید حسن بن الباقلانی
الباقلانی الحلی النحوی واللغة	الحلی النحوی سے اور لغت رضی الدین الصغانی
علی رضی الدین الصغانی[۳]	سے پڑھی،

اس زمانہ میں امراء بھی جید عالم ہوتے تھے، اور ہر امیر کے پاس ایک کتب خانہ بھی ہوتا تھا، ابن العلقمی اعلیٰ درجہ کا انشاء پرداز اور بڑا صاحب ذوق وزیر تھا، وہ صرف وزیر ہی نہیں بلکہ حکومت کے

---

[۱] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ مطبعۃ الفرات بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۲۰۸ [۲] ایضاً ص ۲۳۴ [۳] ملاحظہ ہو الوافی بالوفیات مطبعۃ الدولہ استنبول ۱۹۳۱ء ج ۱ ص ۱۸۲

سیاہ و سفید کا مالک تھا، اس کا ذاتی کتب خانہ نوادر اور بیش قیمت کتابوں کا خزانہ اور دس ہزار مجلدات پر مشتمل تھا، ابن الطقطقی اس کے فرزند ابوالقاسم علی سے ناقل ہے:

اشتملت خزانته علی عشرة الآف مجلد من نفائس الکتب[1]	اس کا کتب خانہ دس ہزار نہایت عمدہ کتابوں پر مشتمل تھا،

یہی کتب خانہ تھا جسے اس نے ۶۴۴ھ میں اپنے محل سے دارالوزارت میں منتقل کر دیا تھا جس سے اس کا فائدہ عام ہو گیا تھا۔ وقتاً فوقتاً اس میں اور بھی علوم و فنون کی کتابوں کا اضافہ ہوتا رہا، ابن الفوطی لکھتے ہیں:

فتحت دار الکتب التی انشأھا الوزیر مؤید الدین ابن العلقمی فی دارہ، ونقل الیھا کتب من انواع العلوم[2]	وہ کتب خانہ جو ابن العلقمی نے اپنے گھر میں قائم کیا تھا، اس کو کھول دیا گیا اور اس میں مختلف علوم و فنون کی کتابیں داخل کی گئیں۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

فتحت دار الکتب التی انشأھا الوزیر مؤید الدین محمد بن احمد العلقمی بدار الوزارة وکانت فی نہایة الحسن ووضع فیھا من الکتب النفیسة والنافعة شیٔ کثیر[3]	وہ کتب خانہ جو وزیر مؤید الدین محمد بن احمد العلقمی نے قائم کیا تھا، اس کو دارالوزارت میں کھولا گیا جس کی عمارت نہایت خوبصورت ہے اور اس میں نہایت عمدہ، نفیس اور مفید کتابیں جمع کی گئی تھیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو الفخری فی الآداب السلطانیہ والدول الاسلامیہ مطبعۃ الموسوعات مصر ۱۳۱۷ھ ص ۳۰۱ [2] الحوادث الجامعۃ المطبعۃ العربیہ بغداد ۱۳۵۱ھ ص ۲۰۹ [3] البدایہ والنہایہ مطبع السعادۃ مصر ج ۱۳ ص ۲۰۷

صحاح جوہری کی تصحیح اور تحشیہ | صغانیؒ نے اپنے قلم سے صحاح جوہری کے ایک نسخہ کی تصحیح اور تحشیہ کرکے اسی کتب خانہ میں داخل کیا تھا، موصوف العباب الزاخر کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

قد صححت نسخة وحشيتها بخطى	میں نے مدینۃ السلام (بغداد) میں اللہ تعالےٰ
بمدينة السلام حماها الله تعالےٰ	اس کو اپنی حفاظت میں رکھے، صحاح جوہری
للخزانة الميمونة المعمورة الوزيرية	کے ایک نسخہ کی تصحیح کی اور اس پر اپنے قلم سے
المؤيدية زاد الله صاحبها	حواشی لکھکر وزیر موید الدین کے مبارک
من الارتقاء فى درج الجلال	ومعمور کتب خانہ میں داخل کیا ہے، اللہ تعالےٰ
ورقاه وذريته عين الكمال	صاحب کتب خانہ کے مراتب میں ترقی عطا فرمائے
فمن رام مصداق ماذكرت	اور اس کو اور اس کی آل اولاد کو کمال
فليقف عينه بادارتها فيها	کی چوٹی پر چڑھائے، پس جو کچھ میں نے کہا
وليرتع فى رياض فرائدها	اگر کوئی اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہے (کہ
وفوائد حواشيها[1]	صحاح جوہری میں ایک ہزار غلطیاں ہیں)
	تو اس کو کتاب میں اپنی نگاہ دوڑانا چاہیے
	اور اس کے یکتا موتیوں کے باغ سے فائدہ
	اٹھانا چاہیے اور حاشیوں کے فائدوں سے بہرہ ور ہونا چاہیے،

کتاب الذئب کا سبب تالیف | خلیفۂ وقت مستعصم باللہ کی قدردانی اور وزیر ابن العلقمی کی عزت افزائی نے صغانی کو ہمعصروں کی نظروں میں محسود بنا دیا، چنانچہ بعض حاسدوں نے آپ کو طرح طرح سے تنگ کیا، مگر آپ خاموشی کے ساتھ برداشت کرتے رہے، مگر جب ان کی آتش حسد کسی طرح

[1] ملاحظہ ہو مقدمۃ العباب قلمی اس کا نسخہ مولانا عبدالعزیز میمن زید مجدہم اور راقم السطور کے پاس موجود ہے،

ٹھنڈی نہ ہوئی، تو صغانی نے ان کے وہ خصائل جو ان میں اور بھیڑیوں میں مشترک تھے، ایک رسالہ میں جمع کر دیے، اور اس رسالہ کا نام کتاب الذئب رکھا، آغاز رسالہ میں لکھتے ہیں:

هذا كتاب غريب مبناه، في اسامي	یہ کتاب جس کی اساس غیر مانوس الفاظ پر ہے
الذئب وكناه، حداني على جمعه	بھیڑیے کے ناموں اور کنیتوں کے بیان میں ہے،
تذاؤب بعض اهل زماني، ومن	میرے بعض ہمعصروں کا بھیڑیوں کی طرح
عصبيات رواشقه رماني	مکاری اور خباثت میں میرے پیچھے لگ جانے
وانا اسئل الله تعالى رد كيده	اور میری ہڈیوں میں گھس جانے والے تیز تیر
في نحره، وان يعيذني من شراره	پھینکنے والی کمانوں سے مجھ پر تیر برسانے
وشره وهو مجيب دعوة الداعي	نے اس کتاب کی ترتیب پر مجھے آمادہ کیا ہے،
اذا دعاه، ومنيل اهل الراجي	اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وہ ان کے
اذا رجاه[1]	مکر کو ان کے سینہ میں اتار دے اور اللہ تعالیٰ
	مجھے انکی شرارتوں اور برائیوں سے اپنی پناہ
	میں رکھے، وہی پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہے
	جب کوئی اسکو پکارتا ہے، اور وہی آس لگانے والوں کی آس پوری کرتا ہے۔

اس واقعہ سے جہاں صغانی کی وسعت قلب کا اندازہ ہوتا ہے، وہاں ان کے اخلاق و کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے،

صغانی کا مطالعہ درس و تدریس کے بعد صغانی کو جو وقت ملتا تھا وہ مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں گذرتا تھا، مطالعہ سے شغف اخیر عمر تک باقی رہا اور لغت میں آپ کا قول حرف آخر ہونے کے باوجود

[1] ملاحظہ ہو کتاب الذئب، یہ رسالہ مقامات الحنفی اور ابن ناقیا کے ساتھ مطبع احمد کامل استنبول سے ۱۳۳۰ھ میں شائع ہوا تھا۔

آپ کا مطالعہ ہمیشہ علم میں اضافہ کرتا رہا، چنانچہ لفظ مجراشہ کا علم ابن خالویہ کی طرح موصوف کو بھی ستر سال سے متجاوز عمر ہونے کے بعد ہوا تھا، جس وقت اس کا علم ہوا تو زبان قلم پر بے اختیار خدا کی حمد و ثنا جاری ہوگئی، یہ واقعہ بھی پڑھنے کے لایق ہے، فرماتے ہیں:

قال ابو عبد الله الحسين بن خالويه النحوي في كتاب ليس اجرأشت الابل اي سمنت وامتلأت بطونها فهي مُجرَأشةٌ بفتح الهمزة على خلاف القياس كما قالوا الفح فهو مُلفَح واحصن فهو محصن واسهب فهو مسهب، قال ابن خالويه وجدت هذه اللفظة يعني فهي مجرأشة بعد سبعين سنة قال الصغاني مولف هذا الكتاب انا وجدت هذه اللفظة بعد سبعين سنة والحمد لله على طول الاعمار وتردد الآثار ومصاحبة الاخيار ومجانبة الاشرار والاكثار من الازديار والحج والاعتمار جعلني الله تعالى من اوليائه والابرار المستغفرين

ابوعبداللہ حسین بن خالویہ نحوی کتاب لیس میں کہتا ہے اجرأشت الابل جب اونٹ موٹا ہو جاتا ہے اور اس کی کوکیں بھر جاتی ہیں تو اس کے لیے لفظ مجرأشۃ خلاف قاعدہ فتح ہمزہ کے ساتھ بولتے ہیں، جس طرح اہل عرب الفح فہو ملفح اور احصن فہو محصن اور اسہب فہو مسہب کہتے ہیں، ابن خالویہ کہتا ہے مجھے یہ لفظ یعنی فہی مجرأشۃ ستر برس کے بعد معلوم ہوا تھا، اس کتاب کا مولف صغانی کہتا ہے مجھے بھی اس لفظ کا علم ستر برس کے بعد ہوا اور تمام تعریفیں اللہ ہی کی ذات کے لیے ہیں جس نے لمبی لمبی عمریں عطا کیں اور آثار اور نقول کو دست بدست پہنچایا، نیک لوگوں کی صحبت نصیب فرمائی اور بدکاروں سے بچایا، دیار حبیب کی کثرت سے زیارت کا شرف بخشا، حج اور عمرہ کی توفیق دی، مجھے اللہ تعالے

بالاسحار الذاکرین اللہ	اپنے نیک بندوں میں بنا سے جو اخیر شب میں اللہ
بالعشی والابکار[۱]	مغفرت کی دعا مانگتے ہیں اور صبح وشام یاد الٰہی میں

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ صغانیؒ کا مطالعہ برابر جاری رہا، اس واقعہ سے ان کی باطنی کیفیت بھی ظاہر ہوتی ہے۔

تصنیف و تالیف کا شغلہ اسی طرح تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی مرتے دم تک نہ چھوٹا، چنانچہ العباب الزاخر کی تالیف کے وقت لفظ بکم لکھا تھا کہ انتقال ہوگیا، سید مرتضیٰ الزبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں:

لما بلغ الشیخ الاجل الفاضل	شیخ اجل، فاضل، زاہد، امین اور حرم اللہ (مکہ)
الزاھد الامین الملتجئ الی حرم	کی پناہ کے طالب رضی الدین حسن بن محمد بن
اللہ تعالیٰ رضی الدین الحسن	حسن صاغانی اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت کے
بن محمد بن الحسن الصاغانی	سایہ میں رکھے، جب اپنی تالیف کردہ کتاب
تغمدہ اللہ تعالیٰ برحمتہ فی	العباب الزاخر میں اس جگہ (بکم) تک پہنچے تو
تصنیف کتابہ العباب الزاخر	تو موت نے ان کو چھین لیا اور کتاب نا تمام
الی ھذا المکان اخترمتہ المنیۃ	رہ گئی، حکم اور فیصلہ بس اسی خدائے بزرگ
وبقی الکتاب مقطوعا والحکم للہ[۲]	و برتر ہی کا جاری و ساری ہے۔

کسی شاعر نے اسی واقعہ سے متاثر ہو کر حسب ذیل قطعہ کہا تھا۔

ان الصغانی الذی	حاز العلوم والحکم
صغانی جس کی ذات	علوم اور حکمتوں کی جامع تھی

[۱] ملاحظہ ہو العباب الزاخر روٹوگراف کاپی اسلامک انسٹیٹوٹ آف ریسرچ کراچی مادہ جرش [۲] ملاحظہ ہو تاج العروس مادہ بکم

کان قصار نحی أمره ان انتهی الی بکم[1]

ان کا بھی سارا زور لفظ بکم تک پہنچکر ختم ہوگیا تھا اور کتاب ناقص رہ گئی تھی

یہ قطعہ صنعت ایہام میں ہے کیونکہ یہاں لفظ بکم سے قریب اور بعید دونوں معنی مراد لیے ہیں، بعید معنی ہی یہاں مراد ہیں کہ صغانی جو علوم و فنون اور حکمت کے ماہر تھے، وہ بھی لفظ اس کی تشریح سے قاصر رہے اور کتاب ناتمام رہ گئی، دانشوران ناصری میں مذکور ہے:

"شاعر در ایں شعر در صناعت ایہامی کہ بکار بردہ وبمقتضی ایہام این صنعت دو معنی ارادہ کردہ یکے بعید، دیگر قریب از معنی بعید ایں را ارادہ کردہ است کہ حسن کتاب مذکور را تا مادہ بکم نوشتہ وآں را باتمام نرسانیدہ ..... یعنی ہمانا حسن صغانی کہ فنون و علوم و اصناف حکمتہا را فراہم نمود عاقبت امرش ایں شد کہ برگ گنگ گردید و زبانش بستہ شد[2]"

درس و تدریس | یہی حال درس و تدریس کا تھا، یہ شغل بھی تاحیات منقطع نہیں ہوا، شرف الدین کا بیان ہے:

قرأت علیه یوم الاربعاء وتو فی ليلة الجمعة[3]

میں نے بدھ کو ان سے پڑھا اور جمعہ کی شب کو ان کا انتقال ہوگیا،

پاکستان کے مایۂ ناز فرزند حسن صغانی جن کا سکہ لغت و ادب فقہ و حدیث تمام اقلیموں میں رواں تھا اور جو صرف و نحو، شعر و ادب، اخبار و انساب، رجال و سیرت کے امام تھے، جن کے وجود پر علم و فضل اور ورع و تقوی کو ناز تھا، اس پیکر علم و تقوی جس نے کم و بیش نصف صدی

---

[1] ملاحظہ ہو بغیۃ الوعاۃ طبع مصر تذکرہ حسن صغانی [2] ملاحظہ ہو دانشوران ناصری طبع ایران ج ا

[3] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام ذہبی مخطوطہ رضا لائبریری رام پور (ترجمہ حسن صغانی)

اپنی تعلیم و تربیت اور درس و تدریس سے ایک عالم کو مستفید کیا تھا۔ اس قدسی صفات انسان نے تہتر (۷۳[1]) سال کی عمر میں ۲۹ شعبان ۶۵۰ھ جمعہ کی شب کو بغداد میں اچانک انتقال کیا (رحمۃ اللہ علیہ) اس اجمال کی تفصیل درج ذیل ہے:

صغانی کی وفات سے پیشتر ایک وصیت صغانی کی وفات کا واقعہ بھی عجیب ہے، مشہور ہے کہ آپ کے پاس ایک زائچہ تھا جس سے آپ کی وفات کا دن اور وقت سب لکھا ہوا تھا، جب وہ دن قریب آیا تو آپ نے اپنے فرزندوں کو بلا کر پچاس دینار دیے اور وصیت کی کہ جب میرا انتقال ہو جائے تو میری لاش مکہ لیجا کر فضیل بن عیاض المتوفی ۱۸۷ھ کے پاس دفن کرانا، ابن الفوطی کا بیان ہے،

کان قد اوصی بذلک وان یحمل	انھوں نے وصیت کی تھی کہ انکی لاش مکہ معظمہ
الی مکۃ ویدفن مجاور الفضیل	لیجاکر فضیل بن عیاض کے پاس دفن کیجائے، انکی
بن عیاض. ففعل اولادہ	اولاد نے اس وصیت کے مطابق عمل اور ان کی
ذلک وتولی تجھیزہ[2]	تجہیز و تکفین کا سامان کیا.

علامہ ذہبی لکھتے ہیں:

کان اوصی بذلک واعد خمسین	اس امر کی انھوں نے وصیت کی تھی اور جو شخص
دینار المن یحملہ الی مکۃ[3]	انکی لاش کو مکہ لیجا کر دفن کرے اس کے لیے پچاس دینار

[1] ہم گذشتہ اوراق میں صغانی کی ولادت پر نہایت تفصیل سے بحث کر چکے ہیں جس سے یہ بات واضح ہو چکی ہو کہ وفات کے وقت آپ کی عمر تہتر سال کی تھی، امام ذہبی نے بھی دول الاسلام میں تہتر (۷۳) سال کی عمر کو وثوق سے بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں

فیھا توفی العلامۃ رضی الدین الحسن	اسی سال ۶۵۰ھ میں رضی الدین حسن
بن محمد الھندی الصاغانی صاحب	ابن محمد الہندی الصاغانی جو صاحب
التصانیف ببغداد ولہ ثلاث وسبعون سنۃ	التصانیف تھے، تہتر (۷۳) سال کی عمر میں بغداد
(دول الاسلام طبع حیدرآباد دکن ۱۳۶۵ھ ج ۲ ص ۱۱۸)	میں انتقال فرمایا

[2] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ص ۲۶۳ [3] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام مخطوطہ رضا لائبریری رامپور تذکرہ حسن بن محمد الصغانی۔

وفات سے پہلے احباب کی دعوت | صغانی کو اس مقررہ دن کا بڑی بےچینی سے انتظار تھا، جب وہ دن آ

تو اس وقت آپ نہایت تندرست تھے، اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے شکرانہ میں اس دن اپنے احباب

اور شاگردوں کی پرتکلف دعوت کا انتظام کیا اور ان کو اپنے مکان پر رات کے کھانے پر مدعو کیا جب لوگ

کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہوگئے تو تھوڑی دیر کے بعد ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آپ کے شاگرد حافظ الحدیث شرف الدین الدمیاطی فرماتے ہیں:

کان معہ مولودٌ[1] وقد حکم	صغانی کے پاس ایک زائچہ تھا جس میں انکی موت
فیہ بموتہ فی وقتہ فکان یترقب	کا دن اور وقت بھی مذکور تھا، آپ اس دن
ذالک الیوم فحضر ذالک الیوم	کا انتظار کیا کرتے تھے، جب وہ دن آیا تو آپ
وھو معافا فعمل وا صحابہ طعاما	اچھے بھلے تھے، خدا کی اس نعمت کے شکر کے طور پر
شکرا للہ ذالک وفارقناہ وعدیت	اپنے احباب کی دعوت کی، اور جب ہم کھانا کھا
الی الشط فلقینی شخص اخبرنی	ان سے رخصت ہوئے اور میں دجلہ کے کنارے ہی
بموتہ فقلت لہ الساعۃ فارقتہ	تک ہی پہنچا تھا کہ مجھے ایک شخص ملا اور اس نے
فقال والساعۃ وقع الحمام یخبر	انکی موت کی خبر دی، میں نے اس سے کہا ابھی تو میں
بموتہ فجأۃ وذالک سنۃ	ان سے ملکر آیا ہوں اس نے کہا ابھی ابھی ان کا انتقال
خمسین وستمأئۃ[2]	ہوا ہے، وہ شخص انکی اچانک موت کی خبر دے رہا تھا

[illegible]

---

[1] واضح رہے کہ مولود کا ترجمہ ولد اور لڑکا صحیح نہیں، یہاں مولود کے معنی زائچہ ہیں، ڈوزی نے عربی کی جو لغت لکھی ہے اس میں بصراحت لکھا ہے کہ مولود کا لفظ زائچہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نیز ما بعد کا جملہ خود اس معنی کا ثبوت ہے، یہی معنی دانشوران ناصری میں مذکور ہیں، محمد علی تبریزی نے ریحانۃ الادب فی تراجم المعروفین بالکنیۃ واللقب (چاپخانہ شرکت سہامی ۱۳۶۸ھ قمری ج ۲ ص ۴۵۳) میں بھی زائچہ ہی ترجمہ کیا ہے۔ دہخدا نے بھی لغت نامہ (طبع طہران ۱۳۲۵ھ) میں ترجمہ میں زائچہ کا لفظ اختیار کیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو بغیۃ الوعاۃ

جب صغانی کا انتقال ہو گیا تو انھیں اسی مکان میں جس میں ان کا قیام تھا، عارضی طور پر دفنا یا گیا، یہ مکان حریم طاہری میں واقع تھا،[1] دمیاطی کہتے ہیں:

---

[1] یاقوت رومی المتوفی ۶۲۶ھ المشترک وضعاً والمفترق صقعاً (طبع گوٹن جرمنی ۱۸۴۶ء ص ۱۳۰) میں لکھتے ہیں:

الحریم الطاہری فی اعلا مدینة	حریم طاہری مدینۃ السلام بغداد کے مغرب کے بالائی حصہ میں
السلام بغداد بالجانب الغربی کان	واقع ہے یہاں آل طاہر بن الحسین کے مکانات تھے جو یہاں آکر
منازل آل طاہر بن الحسین وکان	پناہ لیتا تھا وہ مامون ہو جاتا تھا اسی لیے اسکو حریم کہتے ہیں
من لجاء الیہ امن فسمی الحریم	

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے ۶۲۳ھ میں صغانی کی ہندوستان سے روانگی کے بعد بغداد میں یہ موصوف کا دوسرا مکان تھا پہلا مکان باب الازج کے پاس تھا، یہ ایک محلہ کا نام ہے، جو بغداد کے مشرقی حصہ میں واقع تھا، اسی مکان میں صغانی نے مغرب (اندلس وغیرہ) کے بعض علماء کو مشارق الانوار کی سند دی تھی جس کے آخر میں اس کا تذکرہ موجود ہے، وہ یہ ہے:

سمع جمیع ھذا الکتاب وھو مشارق	یہ پوری کتاب جس کا نام مشارق الانوار النبویہ
الانوار النبویة من صحاح الاخبار	من صحاح الاخبار المصطفیہ ہے، اس کو شیخ
المصطفیة علی مصنفه الشیخ الامام	امام علامہ اجل، رئیس اصحاب، صدر محترم
العالم الاجل رئیس الاصحاب الصدر	مکرم، امت کے سردار، ائمہ کے معتمد، حرم بیت اللہ
الکبیر المحترم قدوۃ الامم وعمدۃ	میں پناہ کے طلبگار رضی الدین ابو الفضائل
الائمة الملتجئ الی حرم اللہ تعالیٰ	حسن بن محمد بن حسن الصغانی رضی اللہ عنہ
رضی الدین ابی الفضائل الحسن بن	کے سامنے فقیہ، امام، حافظ متقن جمال الدین
محمد بن الحسن الصغانی رضی اللہ عنہ	ابو بکر محمد بن احمد ابن محمد بکری الشریشی
بقراۃ الفقیہ الامام الحافظ المتقن	اور فقہا کے سردار برہان الدین ابراہیم
جمال الدین ابی بکر محمد بن احمد بن	ابن یحییٰ بن ابی جفان مکناسی، سعد الدین
محمد البکری الشریشی والسادۃ الفقہا	سعد بن احمد بن احمد بن عبد اللہ جذامی
برھان الدین ابراھیم بن یحیی بن ابی	البیانی، محی الدین ابو الحسن علی بن یحییٰ بن
جفان المکناسی وسعد الدین	علی النمیری الغرناطی، رضی الدین سلیمان بن

(باقی ص ۱۸۰ پر)

وفات سے پہلے احباب کی دعوت صغانی کو اس مقررہ دن کا بڑی بےچینی سے انتظار تھا، جب وہ دن آیا تو اس وقت آپ نہایت تندرست تھے، اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کے شکرانہ میں اس دن اپنے احباب اور شاگردوں کی پر تکلف دعوت کا انتظام کیا اور ان کو اپنے مکان پر رات کے کھانے پر مدعو کیا، جب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے تو تھوڑی دیر کے بعد ہی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔

آپ کے شاگرد حافظ الحدیث شرف الدین الدمیاطی فرماتے ہیں:

كان معه مولود[1] وقد حكم	صغانی کے پاس ایک زائچہ تھا جس میں انکی موت
فيه بموته في وقته فكان يترقب	کا دن اور وقت بھی مذکور تھا، آپ اس دن
ذلك اليوم فحضر ذلك اليوم	کا انتظار کیا کرتے تھے، جب وہ دن آیا تو آپ
وهو معافا فعمل واصحابه طعاماً	اچھے بھلے تھے، خدا کی اس نعمت کے شکر کے طور پر
شكراً لذلك وفارقناه وعدت	اپنے احباب کی دعوت کی، اور جب ہم کھانا کھا
الى الشط فلقيني شخص اخبرني	ان سے رخصت ہوئے اور میں دجلہ کے کنارے ہی
بموته فقلت له الساعة فارقته	تک ہی پہنچا تھا کہ مجھے ایک شخص ملا اور اس نے
فقال والساعة وقع الحمام يخبر	انکی موت کی خبر دی، میں نے اس سے کہا ابھی تو میں
بموته فجأة وذلك سنة	ان سے ملکر آیا ہوں اس نے کہا ابھی ابھی ان کا انتقال
خمسين وستمائة[2]	ہوا ہے، وہ شخص انکی اچانک موت کی خبر دے رہا تھا[2]

---

[1] واضح رہے کہ مولود کا ترجمہ ولد اور لڑکا صحیح نہیں، یہاں مولود کے معنی زائچہ ہیں، ڈوزی نے عربی کی جو لغت لکھی ہوئی ہے اس میں بصراحت لکھا ہے کہ مولود کا لفظ زائچہ کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، نیز مابعد کا جملہ خود اس معنی کا ثبوت ہے، یہی معنی دانشوران ناصری میں مذکور ہیں، محمد علی تبریزی نے ریحانۃ الادب فی تراجم المعروفین بالکنیۃ واللقب (چاپخانہ شرکت سہامی ۱۳۶۸ھ قمری ج ۲ ص ۴۵۳) میں بھی زائچہ ہی ترجمہ کیا ہے۔ دہخدا نے بھی لغت نامہ (طبع طہران ۱۳۲۵ھ) میں ترجمہ میں زائچہ کا لفظ اختیار کیا ہے۔

[2] ملاحظہ ہو بغیۃ الوعاۃ

جب صغانی کا انتقال ہوگیا تو انھیں اسی مکان میں جس میں ان کا قیام تھا، عارضی طور پر دفنا یا گیا، یہ مکان حریم طاہری میں واقع تھا،[۱] دمیاطی کہتے ہیں :

---

[۱] یاقوت رومی المتوفی ۶۲۶ھ المشترک وضعاً والمفترق صقعاً (طبع گوٹن جرمنی ۱۸۴۶ء ص ۱۳۰) میں لکھتے ہیں:

الحريم الطاهري في اعلا مدينة	حریم طاہری مدینۃ السلام بغداد کے مغرب کیطرف بالائی حصہ میں
السلام بغداد بالجانب الغربي كان	واقع ہے، یہاں آل طاہر بن الحسین کے مکانات تھے جو یہاں آکر
منازل آل طاهر بن الحسين وكان	پناہ لیتا تھا وہ مامون ہو جاتا تھا اسی لیے اسکو حریم کہتے ہیں
من لجاء اليه امن فسمى الحريم	

جہاں تک معلوم ہو سکا ہے ۶۳۱ھ میں صغانی کی ہندوستان سے روانگی کے بعد بغداد میں یہ موصوف کا دوسرا مکان تھا، پہلا مکان باب الازج کے پاس تھا، یہ ایک محلہ کا نام ہے، جو بغداد کے مشرقی حصہ میں واقع تھا، اسی مکان میں صغانی نے مغرب (اندلس وغیرہ) کے بعض علماء کو مشارق الانوار کی سند دی تھی جس کے آخر میں اس کا تذکرہ موجود ہے، وھوھذا

سمع جميع هذا الكتاب وهو مشارق	یہ پوری کتاب جس کا نام مشارق الانوار النبویہ
الانوار النبوية من صحاح الاخبار	من صحاح الاخبار المصطفیہ ہے، اس کو شیخ
المصطفية على مصنفه الشيخ الامام	امام علامہ اجل، رئیس اصحاب، صدر محترم
العالم الاجل رئيس الاصحاب الصدر	ومکرم، امت کے سردار، ائمہ کے معتمد، حرم بیت اللہ
الكبير المحترم قدوة الامم وعمدة	میں پناہ کے طلبگار رضی الدین ابو الفضائل
الائمة الملتجئ الى حرم الله تعالى	حسن بن محمد بن حسن الصغانی رضی اللہ عنہ
رضى الدين ابي الفضائل الحسن بن	کے سامنے فقیہ، امام، حافظ متقن جمال الدین
محمد بن الحسن الصغاني رضي الله عنه	ابو بکر محمد بن احمد ابن محمد بکری الشریشی
بقراءة الفقيه الامام الحافظ المتقن	اور فقہا کے سردار برہان الدین ابراہیم
جمال الدين ابي بكر محمد بن احمد بن	ابن یحییٰ بن ابی جفان مکناسی، سعد الدین
محمد البكري الشريشي والسادة الفقها	سعد بن احمد بن احمد بن عبد اللہ جذامی
برهان الدين ابراهيم بن يحيى بن ابي	البیانی، محی الدین ابو الحسن علی بن یحییٰ بن
جفان المكناسي وسعد الدين	علی النمیری الغرناطی، رضی الدین سلیمان بن

(باقی ص ۱۸۰ پر)

حضرت دفنه بداره بالحريم
الطاهری

(بقیہ حاشیہ ص ۱۷۹) سعد بن احمد بن احمد
بن عبد الله الجذامی البیّانی
ومحی الدین ابو الحسن علی بن یحیی
بن علی التمیری الغرناطی ورضی الدین
سلیمان بن یوسف بن محمد بن ابی
عیان الملیانی وشهاب الدین
ابو عبد الله محمد بن محمد بن
بد والسبتی المالکی وشمس الدین
ابو عبد الله محمد بن میمون بن
علی الکوی وعبد الله بن محمد
بن ابی بکر الغسانی الاندلسی
المالکی عفا الله عنه فی مجالس
اخرها یوم الثلاثاء السابع
والعشرون من جمادی الآخرة
سنة سبع وثلاثین وستمائة
نصح ذلك وثبت فی منزل الشیخ
المصنف من باب الازج وکتب
عبد الله بن محمد بن ابی بکر
الغسانی والحمد لله وحده و
وصلواته علی محمد وآله وسلامه

صغانی کے دفن کے وقت جب انھیں انکے گھر کے اندر
دفن کیا گیا، میں وہاں موجود تھا،

یوسف بن محمد بن ابی عیان الملیانی،
شہاب الدین ابو عبد اللہ محمد بن محمد
ابن بد والسبتی مالکی، شمس الدین
ابو عبد اللہ محمد بن میمون بن علی
الکوی اور عبد اللہ بن محمد بن ابی
بکر الغسانی الاندلسی المالکی
عفا اللہ عنہ کی قرأت سے مختلف
نشستوں میں جن میں سے آخری
نشست دوشنبہ ۲۷ جمادی الآخرہ
۶۳۷ھ کو تھی، اس کتاب کا سماع
ہوا، اور مصنف کے مکان پر جو
باب الازج میں واقع ہے پایۂ
تکمیل کو پہنچا، یہ عبارت عبد اللہ
ابن محمد بن ابی بکر الغسانی نے
قلمبند کی ہیں، تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ
کے لیے خاص ہیں، اور درود وسلام
محمدؐ اور ان کی آل واصحابؓ

. . . .

. . . .

. . . .

(باقی ص ۱۸۱ پر)

ابن الفوطی کا بیان ہے:

دفنہ اصحاب الوزیر | انکی تدفین کے وقت وزیر کا عملہ بھی موجود تھا

وصیت کے مطابق صغانی کی مکہ میں تدفین | چند دنوں کے بعد آپ کی وصیت کے مطابق جسد خاکی کو یہاں سے مکہ لیجایا گیا، اور حرم مکہ میں جنۃ المعلاۃ کے اندر فضیل بن عیاضؒ کی قبر کے پاس سپرد خاک کیا گیا۔ امومؒ صوفی کے مایۂ ناز شاگرد حافظ الحدیث دمیاطی جو استاد کی وفات کے بعد بغداد چھوڑ کر مکہ معظمہ آگئے تھے لکھتے ہیں:

ثم نقل بعد خروجی من بغداد | میرے بغداد سے مکہ نکلنے کے بعد آپ کا

الی مکۃ فدفن بہا[1] | جسد خاکی مکہ لایا گیا اور وہاں دفن کر دیا گیا۔

ایک دیرینہ آرزو کی تکمیل | اس طرح آپ کی وہ دعا قبول ہوئی جو آپ نے مشارق الانوار کے مقدمہ میں ان الفاظ میں مانگی تھی:

قال الملتجی الی حرم اللہ الحسن | حرم بیت اللہ کی پناہ کا طالب حسن بن محمد

بن محمد الصغانی بنہہ للخطر العظیم | الصغانی کہتا ہے کہ اللہ پاک سکو بڑے خطرہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۸۰) صحیح ذلک وکتب الملتجی | یہ جو کچھ لکھا ہے صحیح ہے، نوشتۂ ملتجی الی حرم اللہ الحسن

الی حرم اللہ تعالٰی الحسن بن محمد بن الحسن | ابن محمد بن الحسن الصغانی اللہ تعالٰی اسکو فضیلتوں

الصغانی احلہ اللہ اعلی مجال اولی الفضل | سے آراستہ اور دانشوروں کے اعلیٰ مقام

والحجی وجعلہ علما فی الفضائل | میں جگہ دے اور فضیلتوں میں اسکو ایسا اونچا علم بنادے

کالنجم فی الدجی حامداً ومصلیاً | جیسے ثریا تاریکی میں ہوتا ہے، حامداً ومصلیاً

(ملاحظہ ہو فہرست مخطوطات عربیہ کتب خانہ چسٹر بیٹی ج ۲ بلیٹ نمبر ۱۵ مرتبہ جے آر بری طبع ڈبلن ۱۹۵۶ء)

اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ صغانی جمادی الآخرہ ۶۱۳ھ سے پہلے بغداد گئے تھے، اور ہندوستان سے زیادہ بغداد میں مقبول رہے۔

(حاشیہ صفحہ ہذا) [1] ملاحظہ ہو تاریخ الاسلام مخطوط رضا لائبریری رام پور

قبل ان يضعضع الموت اركانه
وحداه على ان يعمر ربع الورع
ويشيد بنيانه واباحه باحة
سبوحة واتاح فيها غبوقه
وصبوحه واماته بها حميداً
فاقبره ثم اذا شاء انشره[1]

سے متنبہ فرما دیں تاکہ وہ نیک اعمال کا ذخیرہ کرلے اس سے پیشتر کہ موت اس کے اعضا کو ہلا دے، اور باری تعالیٰ اس کو پرہیزگاری کی منزل آباد رکھنے اور اسکو مستحکم کرنے پر آمادہ رکھیں اور اسکو مکہ معظمہ کے میدان میں اتاریں اور اسی میں اسکی صبح وشام کی شراب مقدر فرما دیں اور ایسی حالت میں وہیں اسکو موت دیں کہ لوگوں کی زبانوں پر اسکے حق میں خیر کلمے جاری ہوں اور وہیں اسکا مزار بنائیں، پھر قیامت کے دن وہیں سے اس کا حشر فرمائیں،

یہی دعا صغانیؒ نے کتاب الذئب کے شروع میں ان الفاظ مانگی تھی:

قال الملتجئ الى حرم الله تعالیٰ
الحسن بن محمد بن الحسن الصغانی
اعاذه الله من افتراس اعراض
عباده واعاده برحمته الى اشرف
بلاده[2]

حرم بیت اللہ کا طلبگار حسن بن محمد بن حسن صغانی کہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اپنے بندوں کی اغراض کا شکار بننے سے پناہ میں رکھے اور اپنی رحمت سے اس کو سب سے بزرگ وبرتر شہر مکہ کیطرف لوٹائے اور وہیں مرنا نصیب کرے۔

---

[1] مشارق الانوار طبع آستانہ ۱۳۰۹ھ ص ۲ واضح رہے عبد اللطیف المتوفی ۸۸۵ھ نے مبارق الازہار (طبع آستانہ ص ۱) میں لکھا ہے کہ فاقبرہ کے بعد اذا شاء منہا انشرہ کہنے سے شدت اہتمام کا اظہار ہے، پھر لکھا ہے کہ میرے والد اور شیخ عبد العزیز نے مجھ سے اپنے مشائخ کا یہ قول بیان کیا تھا کہ جو مکہ میں دفن ہوتا ہے اور وہ وہاں دفن ہونے کے لائق نہیں ہوتا تو فرشتے اس کو وہاں سے دوسری جگہ منتقل کر دیتے ہیں، لہذا حقیقت میں یہ اس امر کی دعا ہے کہ باری تعالیٰ وہاں دفن ہونے اور وہیں سے حشر ہونے کے لائق اور مستحق کر دے [2] ملاحظہ ہو کتاب الذئب طبع استنبول ص ۲

صغانی کی وفات پر شاگردوں کے مرثیے | صغانی کے انتقال پر ان کے بعض شاگردوں نے مرثیے لکھے تھے، بعض مرثیے نہایت خوب ہیں، زمخشری نے اپنے استاد ابو مضر کی وفات پر جو اشعار کہے تھے، صغانی کے ایک شاگرد نے اسی انداز پر ان کا مرثیہ لکھا ہے، ابن ابی مخرمہ نے اس واقعہ کو لکھکر اس کے چند شعر بھی نقل کیے ہیں، فرماتے ہیں:

قال الجندی واجتمعت برجل	جندی کہتے ہیں کہ میری ایک عجمی سے ملاقات
من العجم اسمہ علی بن الحسن بن	ہوئی جس کا نام علی بن حسن بن محمد بن عمر بن
محمد بن عمر بن اسماعیل	اسمٰعیل شہرزوری تھا، وہ فقہاء کے
الشہرزوری کان یتزیا بزی	لباس میں رہتا تھا، مگر اس کے دماغ میں
الفقہاء وعلی ذہنہ اشعار	عمدہ اشعار کا غلبہ تھا (وہ صاحب ذوق تھا)
مستحسنۃ فتذاکرنا محاسن	عمدہ شعروں پر ہماری گفتگو ہوئی، میں نے
الشعر فذکرت لہ قول جار اللہ	اس کو جار اللہ محمود بن عمر زمخشری کے
محمود بن عمر الزمخشری فی	وہ شعر سنائے جو اس نے اپنے استاد ابو مضر
بیتین یرثی بہا شیخہ ابا مضر	کی وفات پر کہے تھے، وہ کہتا ہے۔

وقائلۃ ما ہذہ الدرر التی ۔۔۔ تساقطہا عیناک سمطین سمطین

مجھ سے لوگوں نے پوچھا یہ موتیوں کی دو لڑیاں تیری آنکھیں کیوں گرا رہی ہیں۔

فقلت ہی الدر اللواتی حشی بہا ۔۔۔ ابو مضر اذنی تساقطن من عینی

تو میں نے کہا یہ وہ موتی ہیں جن کو ابو مضر نے میرے کانوں میں بھرا تھا اب وہ میری آنکھوں سے گر رہے ہیں۔

فقال لی قد اخذ ہذا المعنی عم لی	تو اس نے کہا میرے چچا نے جن کا نام احمد بن
اسمہ احمد بن محمد فی شعر رثی بہ	محمد ہے، اسی مفہوم کو ان اشعار میں نظم کیا ہے

شیخہ ابا الفضائل الحسن بن محمد الصغانی فقال — جو انھوں نے شیخ ابوالفضائل حسن بن محمد الصغانی کے مرثیہ میں کہے ہیں، وہ کہتا ہے،

اقول والشمل فی ذیل النوی عثرا — یوم الوداع ودمع العین قد کثرا

میں کہتا ہوں جب جدائی کے دن آنسوؤں کی لڑی رواں تھی اور اجتماع وداع کے دامن پر پھسل رہا تھا

ابا الفضائل قد زودتنی اسفا — اضعاف ما زدت قدری فی الوری اثرا

(اسوقت) ابوالفضائل تم نے مجھے اتنے دوناچوگنا رنج واندوہ کا توشہ دیا، جتنا کمالات علیہ دیگر دنیا میں میری قدر و منزلت بڑھائی تھی،

قد کنت تودع سمعی الدر منتظما[1] — فخذہ من جفن عینی الآن منتشرا

تم نے میرے کانوں میں ایک سلک مروارید کو امانت رکھا تھا اب ان ہی موتیوں کو اس وقت میری نرگاں سے ٹپکتے ہوئے لے لیجئے۔

وزیر محمد ابن العلقمی کے فرزند عزالدین العلقمی نے آپ کا جو مرثیہ لکھا تھا، اس کو ابن الفوطی نے نقل کیا ہے وہ بھی ہدیۂ ناظرین ہے، کہتا ہے:

تخاطبنا الدنیا خطاب مناصح — واسماعنا عما تقول صوارف

دنیا ہم سے ناصح مشفق کی طرح خطاب کرتی ہے — اور جو کچھ وہ کہتی ہمارے کان اسکو سننے سے بھی گریز کرتے ہیں،

تخوفنا والامن حشو قلوبنا — کان سوانا من عنتہ المخاوف

وہ ہم کو ڈراتی ہے اور ہمارے دل امن سے معمور ہوتے ہیں۔ گویا کہ ڈرانیوالی چیزوں نے ہمارے سوا اوروں کو مراد لیا ہو حالانکہ اسکی مراد ہم ہی ہوتے ہیں

وترشدنا احداثہا فنری الہدی — عیانا ولکنا غرورا تخالف

حوادث زمانہ ہمیں راہ دکھاتے ہیں اور ہم ہدایت کو صاف صاف دیکھتے ہیں، لیکن دھوکہ سے مخالفت کرتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ عدن طبع لیڈن ج ۲ تذکرۂ حسن بن محمد الصغانی

ونرجو من الایام عدلاً لجھلنا ویقضی بجور صرفها المترادف

ہم نادانی کی وجہ سے زمانہ سے انصاف کی توقع رکھتے ہیں۔ اور اسکی پے در پے آنیوالی گردشیں ظلم کا فیصلہ کرتی ہیں۔

ھوت بالصغانی الذی لج قدرہ علواً من الاقدار دھماء قاذف

وہ صغانی جس کے مقدر نے سربلندی میں اقدار (تقدیر الٰہی) سے مقابلہ کیا تھا اسکو ایک پھینکنے والی مصیبت نے گرادیا

لیبلک علیہ العلم ان عاش بعدہ وتندیب ان تبق النھی والمعارف

علم کو اس پر رونا چاہیے اگر وہ اسکے بعد زندہ رہے۔ اور اگر فہم و دانش بھی زندہ رہیں تو ان کو بھی اس پر نوحہ کرنا چاہیے

بکاک کتاب لم تتم فصولہ ودون امانی الرجال صوادف

تجھ پر وہ کتاب رو رہی ہے جس کی فصلیں ناتمام رہ گئیں (العباب) اور لوگوں کی امیدوں کے سامنے بہت سے موانع ہیں کہ ان کی آرزوئیں پوری نہیں ہوتیں۔

کذا مجمع البحرین فرق شملہ[1] وغاص اکتئاباً موجہ المتقاذف

اسی طرح مجمع البحرین جس کا مرتب مواد منتشر ہوگیا، اور اس کی وہ تیز رفتار موج بھی غم کی وجہ سے تہ نشین ہوگئی

لئن اصبح التصحیف بعدک ناشیا لقد الفت بسط الوجوہ الصحائف

اور اگر تیرے بعد غلطیاں اور تصحیفات پھیل گئیں، تو کتابیں بھی منہ کھولنے سے ناک بھوں چڑھائیں گی۔

فحال بنی الآداب بعدک حائل وبال بنی الآداب بعدک کاسف

تمھارے بعد بنی الآداب (ادب عربی کے شیدائیوں) کے درمیان ایک پردہ حائل ہوگیا ہے اور تمھارے بعد عربی ادب کے شیدائیوں کے دل بھی بجھ گئے ہیں۔

---

[1] مجمع البحرین صغانی کی دو کتابیں ہیں، ایک لغت میں ہے اور دوسری حدیث میں، لغت کی کتاب ہمارے مطالعہ سے گذر چکی ہے وہ مکمل ہے، جو حدیث میں ہے وہ سید مرتضیٰ الزبیدی کے پیش نظر رہی ہے، انھوں نے جس انداز سے اس کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مکمل ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صغانی نے مجمع البحرین کے نقل کرکے ان کے کتب خانہ میں داخل کرنے کا وعدہ کیا ہوگا، جو موت کی وجہ سے پورا نہ ہوسکا، اس شعر میں غالباً اسی طرف اشارہ ہے،

قضی نقضت ام الفضائل نحبھا وما حکمھا فیما قضت متجانف

ابوالفضائل کا انتقال ہوگیا تو ام الفضائل بھی رانڈ ہوگئی، اور اس نے جو کچھ فیصلہ کیا وہ بیجا نہیں کیا،

ومات حمیداً حین لم یبق مشرق ولا مغرب الا لہ فیہ واصف[1]

اس کا اس حالت میں انتقال ہوا ہے کہ مشرق و مغرب ہر چہار سو اسکی تعریف کے لوگ گن گاتے ہیں،

ہم نے صغانیؒ کے صرف سوانح حیات پر روشنی ڈالی ہے، ان کے علمی کمالات، عادات و اخلاق، تصنیفات، فضل و کمال اور شاگردوں پر کچھ نہیں لکھا ہے، کیونکہ یہ عنوانات بڑی تفصیل چاہتے تھے، ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ نہایت عجلت میں لکھا ہے، جس کی حقیقت کو راقم السطور اور شاید مدیر محترم ہی جانتے ہیں، اگر مدیر محترم کا ماہانہ تقاضہ نہ ہوتا تو کچھ عجب نہ تھا کہ یہ حصہ بھی ناتمام ہی رہ جاتا اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق شامل حال رہی تو ہم ان عنوانات پر لکھکر پاکستان کے اس نامور فرزند پر ایک مستقل کتاب پیش کرنے کی سعادت حاصل کرینگے۔ والحمد للہ اولاً و آخراً

---

[1] ملاحظہ ہو الحوادث الجامعہ ترجمہ حسن بن محمد الصغانی۔

فقہ اسلامی کے ماخذ

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر دار العلوم معینیہ اجمیر

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف جون ۱۹۵۹ء)

استحسان

فقہ اسلامی کا پانچواں ماخذ "استحسان" ہے،

استحسان کی تعریف "استحسان" کے لغوی معنی کسی شی کو اچھا اور مستحسن سمجھنا ہیں، عدالشئ حسنا[۱] اور فقہاء کی اصطلاح میں مسئلہ کے دو پہلوؤں میں ایک کو کسی معقول دلیل کی بنا پر ترجیح دینے کا نام استحسان ہے، ذیل میں افادہ کے لحاظ سے چند تعریفیں نقل کی جاتی ہیں،

قطع المسألة عن نظائرها بما هو اقوی[۱]	کسی مسئلہ کے حکم کو قوی وجہ کی بنا پر اس کے نظائر سے الگ کر لینا۔
العدول عن قیاس الی قیاس اقوی[۲]	ایک قیاس چھوڑ کر اس سے زیادہ قوی قیاس اختیار کرنا
العدول فی مسئلة عن مثل ما حکم به فی نظائرها الی خلافه بوجه هو اقوی[۳]	مسئلہ کے نظائر میں جو حکم موجود ہے کسی قوی وجہ کی بناء پر اس کو چھوڑ کر اس کے خلاف حکم لگانا۔

استحسان کی اہمیت وضرورت اصل بات یہ ہے کہ انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں کا دامن اس قدر وسیع

---

[۱] کتاب التحقیق [۲] ایضاً [۳] منہاج الاصول

ہے کہ قاعدہ و قانون میں ان کا سمیٹنا نہایت مشکل ہے، ضرورتوں اور مصلحتوں کی بنیاد پہلے پڑتی ہے پھر انھیں منظم شکل دینے کے لیے قاعدہ و قانون مقرر کیے جاتے ہیں، زمان و مکان کے لحاظ سے ان میں تبدیلی موقع اور محل کے لحاظ سے تنوع اور نت نئی ضرورتیں ایسی ناگزیر صورتیں ہیں کہ کبھی قیاس کی وسیع حدیں بھی ان کے لیے تنگ اور ضرر رساں ثابت ہوتی ہیں، ایسی حالت میں فقہاء ضرورت کو معیار بنا کر حکم ثابت کرتے ہیں یا قیاس میں اور گہرائی سے وجہ ترجیح تلاش کرتے ہیں، اور اس کی بنا پر ضرر رساں پہلو چھوڑ کر دوسرا مفید پہلو اختیار کرتے ہیں، فقہاء ایسے کرنے پر اس لیے مجبور رہیں کہ الٰہی پالیسی کے ساتھ ہم آہنگی ہو، اور اس کے ذریعہ احکام معلوم کرکے فلاح و بہبود میں اضافہ اور مضرت کا دفعیہ ہو سکے، استحسان اسی ضرورت اور مصلحت کا پیدا کردہ ایک اصول یا "ماخذ" ہے، درج ذیل تصریحات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے،

الاستحسان ترک القیاس والاخذ بما ہو اوفق للناس[1]	استحسان، ظاہری قیاس چھوڑ کر اس چیز کو اختیار کرنے کا نام ہے جو لوگوں کی ضرورتوں کے زیادہ موافق ہو،
الاستحسان طلب السهولة فی الاحکام فیما یبتلی فیه الخاص والعام[2]	استحسان، ان صورتوں میں سہولت طلب کرنا ہے جن میں خاص و عام سب مبتلا ہیں،
الاخذ بالسماحة وابتغاء ما فیه الراحة[3]	استحسان فراخی پر عمل کرنے اور اس میں راحت کی صورت تلاش کرنے کا نام ہے
الاخذ بالسعة وابتغاء الدعة[4]	استحسان وسعت کو اختیار کرنے اور فراخی کو تلاش کرنے کا نام ہے

[1] المبسوط ج ۱۰ ص ۱۴۵ [2] ایضاً [3] ایضاً [4] ایضاً

ان سب کا حاصل مشکل کو چھوڑ کر آسان صورت اختیار کرنا ہے، ترک العسر للیسر[۱] کہ الٰہی پالیسی یہی ہے،

يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا	اللہ تمھارے لیے آسانی اور سہولت چاہتا ہے
يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ	تم کو دشواری اور مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

خير دينكم اليسر	تمھارا اچھا دین یسر ہے۔

حضرت علیؓ اور معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت ارشاد فرمایا

يسرا ولا تعسرا قربا ولا تنفرا	لوگوں کے لیے آسانی کرنا مشکل میں نہ ڈالنا ان کو قریب لانا متنفر نہ بنانا۔

اس یسر اور عسر کا مطلب پہلے گذر چکا ہے، اور مزید تفصیل اصول و کلیات کے ذیل میں آئے گی۔

قدیم قانون میں استحسان سے ملتا جلتا ایک اصول

جن ضروریات و حالات کے پیش نظر فقہا، نے استحسان کا اصول وضع کیا ہے، تقریباً انہی ضروریات کے پیش نظر اس سے ملتے جلتے ایک اصول کا پتہ قدیم قوانین میں بھی ملتا ہے، یونانیوں میں اسے پائی کیا" (Epieikeia) کے نام سے یہ اصول مشہور ہے اور رومیوں میں اک وٹی (Aequita) کے نام سے اس کا پتہ چلتا ہے۔

ارسطو نے کہا ہے کہ ملکی قانون میں جہاں کہیں عمومیت کی وجہ سے نقص ہو، اس اصول کے ذریعہ اس کی اصلاح کی جاتی ہے،

سسرو کی تصنیفات میں جا بجا نصفت اور قانون کا فرق بتلایا گیا ہے، ور نصفت کو قانون

---

[۱] المبسوط ج ۱۰ ص ۱۴۵ ؎ معارف فروری ۱۹۵۹ء

کی سختی میں اعتدال پیدا کرنے والا قرار دیا گیا ہے،

یہ واضح رہے کہ قانون کی کتابوں میں نصفت کے کئی معنی مذکور ہیں، ان میں سے ایک معنی استحسان کے مفہوم سے ملتا جلتا ہے[1]۔

قانون کی کتابوں میں اس اصول کے وضع کرنے کے وجوہ بھی مذکور ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

اس کی ابتداء روما میں پردیسیوں کے حقوق و فرائض کی حفاظت اور بین الاقوامی معاملات کے تصفیہ نیز ترقی تجارت کے خیال سے ہوئی تھی، اس زمانہ میں یہ بات نہایت دشوار تھی کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم کے رسم و رواج اور قانون کو قبول کر لیتی، اس مقصد کے لیے روما کے مقننین نے چند ایسے اصول مقرر کیے جن کے تحت باہمی معاملات کا تصفیہ حالات و مقامات کے لحاظ سے وہ کرتے تھے،[2]

چونکہ ملکی قانون میں عام اصول بیان کیے جاتے ہیں اور منفرد مقدمات کے مخصوص حالات کا لحاظ نہیں کیا جاتا ہے، اس لیے قانون کی عمومیت کے سبب اکثر انفصال مقدمات کے وقت لوگوں کے حق میں ناانصافی ہوتی ہے، اور کبھی قانون مقرر کرتے وقت بعض گوشے مقننین کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں جس کی بنا پر دوسرا فریق موزوں چارۂ کار نہیں اختیار کر پاتا ہے اور نقصان اٹھاتا ہے، ایسی کل ضرورتوں میں کہ قانون نے دادخواہوں کی ضرورتوں کے موافق چارۂ کار اور دادرسی کے بتلانے سے اغماض کیا ہے، عدالتوں کو قانون کے حدود سے تجاوز کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور قدرتی انصاف کے مطابق فیصلہ کرنا پڑتا ہے،

قدرتی انصاف یہ ہے کہ

فیصلہ ان ہدایات کے مطابق کیا جائے جو عقل اور ایمانداری کے تقاضے سے پیدا ہوتی ہیں

---

[1] ملاحظہ ہو قدیم قانون ص ۵۳ و اصول قانون ج ۱ ص ۴۲ [2] قدیم قانون از ص ۵۳ تا ۴۰

اس سلسلہ میں ذیل کی تصریح زیادہ دلچسپ ہے:

> قدیم مذہبی چانسروں نے اکثر بنیادی اصول مذہبی قانون سے اخذ کیے ہیں، بعد کے چانسری ججوں نے اکثر قانون روما سے کام لیا ہے جس کے قواعد بہ نسبت مذہبی قوانین کے دنیوی نزاعات کے تصفیہ میں زیادہ ترکارآمد تھے۔[۱]

اس کا حاصل یہ ہے کہ تمدنی ضروریات اور ملکی مصالح کے پیش نظر قدیم قانون" نصفت" کی تجویز پر عمل کیا گیا تھا، "استحسان" کی تجویز بھی بڑی حد تک ان ہی مصالح اور ضروریات کے پیش نظر عمل میں لائی گئی ہے۔

قرآن حکیم میں لفظ استحسان کے مفہوم کی طرف اشارہ

قرآن حکیم میں "استحسان" کی بنیاد حسب ذیل آیتیں بیان کیجاتی ہیں۔

فبشر عبادی	میرے ان بندوں کو خوشخبری دیدیجئے
الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ	کہ وہ جو بات سنتے ہیں ان میں احسن کی اتباع کرتے ہیں۔
وأمُر قومك یاخذوا باحسنها	اپنی قوم کو حکم دیدیجئے کہ وہ احسن احکام کو اختیار کریں۔

استحسان کی ضرورت کے بارے میں یہ آیتیں خاص اہمیت رکھتی ہیں،

ماجعل علیکم فی الدین من حرج	اللہ نے دین میں تمھارے اوپر کوئی تنگی نہیں کی ہے،
یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر	اللہ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا
لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها	اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت اور برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا،

---

[۱] قدیم قانون ص ۵۳

سنت میں استحسان کے استعمال کی طرف اشارہ | احادیث میں یہ حدیث پیش کیجاتی ہے،

ما راٰہ المسلمون جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے

حسنا فھو عند اللہ حسن نزدیک بھی اچھا ہے،

مگر صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کا قول ہے جو موقوف ہے،[۵]

خیر دینکم الیسر تمھارا اچھا دین یسر (آسانی) ہے

اس بارہ میں حضرت علیؓ اور معاذؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی ہدایت اوپر گذر چکی ہے۔ اسی طرح یسر اور آسانی سے متعلق رسول اللہ صلعم کے جتنے ارشادات ہیں وہ سب اس کے ثبوت میں بن سکتے ہیں۔

صحابہ کے طرز عمل سے استحسان کا ثبوت | صحابہ کے طرز عمل سے استحسان کا ثبوت میراث کا مسئلہ ہے، اس کا واقعہ یہ ہے کہ ایک عورت کا انتقال ہوتا ہے، اس کے ورثا میں شوہر، والدہ، دو سگے بھائی، اور دو ماں شریک بھائی ہیں۔ علم میراث کے قاعدہ کے مطابق سگے بھائی عصبات میں شمار ہوتے ہیں اور ماں شریک بھائی اصحاب فروض میں شامل ہیں،

اصحاب فروض وہ ہیں جن کے حصے وحی الٰہی نے مقرر کر دیے ہیں اور عصبات وہ ہیں جن کے حصے متعین نہیں ہیں، بلکہ اصحاب فروض سے جو بچتا ہے وہ اس کے مستحق قرار پاتے ہیں،

اس صورت میں شوہر کو نصف، والدہ کو چھٹا حصہ اور ماں شریک بھائیوں کو تہائی حصہ ملے گا۔ قیاسی قاعدہ کے مطابق اس تقسیم کے بعد کچھ نہیں بچتا ہے کہ سگے بھائیوں کو دیا جائے، اس بنا پر وہ محروم ہو جائیں گے اور ماں شریک بھائی اپنا حصہ لے لیں گے،

ظاہر ہے کہ اس تقسیم میں سگے بھائیوں کا نقصان ہے، جبکہ میت سے ان کا دہرا رشتہ (ماں اور باپ دونوں جانب سے) قائم ہے، حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ واقعہ پیش ہوا تو

---

۵ الاشباہ والنظائر ص ۹۳ بحوالہ مسند احمد بن حنبل

انھوں نے سگے بھائیوں کے نقصان کے دفعیہ کی غرض سے قیاسی قاعدہ چھوڑ دیا اور ان کو ماں شریک بھائیوں میں شامل کرکے تہائی میں سب کو حقدار بنایا،

اسی طرح میراث میں پوتے کا مسئلہ ہے، جب دادا کی حیات میں باپ کا انتقال ہوجائے، اور باپ کے پاس کوئی مال نہ ہو تو ایسی صورت میں پوتے کو میراث نہ ملے گی، کیونکہ بیٹے کی موجودگی میں پوتا محروم ہوجاتا ہے، یہ مسئلہ بھی استحسان کے ذریعہ حل کرنے کے قابل ہے،

استحسان کی بنیاد چار چیزیں مبنی ہیں — فقہانے استحسان کی عمومیت کو قیاس خفی میں سمیٹ کر بیان کیا ہے، چنانچہ قیاس خفی ہی کا دوسرا نام وہ استحسان قرار دیتے ہیں، اس طرح قیاس کی دو قسمیں مبنی ہیں

(۱) قیاس جلی اور (۲) قیاس خفی۔

قیاس جلی وہ ہے جس کی طرف ذہن جلد منتقل ہو، زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہ پڑے، قیاس خفی وہ ہے کہ غور و فکر اور دقت نظر کے بعد اس کی طرف ذہن منتقل ہو۔[۱]

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قیاس جلی کے مقابل قیاس خفی نہیں ہوتا ہے، بلکہ کتاب و سنت کی نص ہوتی ہے، اجماع ہوتا ہے، یا "ضرورۃ" ہوتی ہے، ان صورتوں میں بھی استحسان کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، اور اس وقت اس کی یہ تعریف کی جاتی ہے،

كل دليل فى مقابلة القياس الظاهر نص او اجماع او ضرورة[۲]

ہر ایسی دلیل کا نام استحسان ہے جو قیاس ظاہر کے مقابل ہو خواہ نص ہو، اجماع ہو یا ضرورۃ ہو۔

اس طرح قیاس ظاہر سے جو حکم ثابت ہوتا ہے اس کو چھوڑنے پر آمادہ کرنے والی اور اس کے خلاف حکم کو ترجیح دینے والی چار چیزیں ہیں (۱) نص (۲) اجماع (۳) ضرورۃ اور (۴) قیاس خفی، اور ان سب پر استحسان کا لفظ استعمال ہوتا ہے، لیکن چونکہ یہ بحث اصولی نہیں ہے، صرف استعمالی ہے، اس بنا

---

[۱] شرح مسلم الثبوت ص ۵۰۸ [۲] ایضاً

فقہاء اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے، اور قیاس خفی ہی کا دوسرا نام وہ استحسان قرار دیتے ہیں، البتہ تشریح و توضیح کے مرحلہ میں ہر ایک کی وضاحت کر دیتے ہیں، ان چاروں کی مثالیں یہ ہیں:

نص، اجماع، ضرورۃ اور قیاس خفی ہر ایک کی مثال

(۱) قیاس ظاہر کے مقابلہ میں "نص" کی مثال:

بیع سلم (جس مال پر معاملہ کیا گیا ہو وہ موجود نہ ہو بلکہ بعد میں حوالہ کیا جائے) کا معاملہ ہے۔ قیاس ظاہر کے مطابق یہ بیع درست نہ ہونی چاہیے، کیونکہ جو چیز بیچی جاتی ہے وہ موجود نہیں ہوتی ہے، حالانکہ شی کی موجودگی بیع کی صحت کے لیے ضروری ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کی بنا پر قیاس چھوڑ کر استحسان پر عمل کیا جاتا ہے۔

من اسلم منکم فلیسلم فی کیل معلوم ووزن معلوم الی اجل معلوم	جو شخص تم میں سے بیع سلم کرنا چاہے اسکو چاہیے کہ پیمانہ وزن اور مدت متعین کر کے کرلے۔

(۲) قیاس ظاہر کے مقابلہ میں اجماع کی مثال:

قیمت طے کر کے جوتا بنانے کا آرڈر دیا اور اس کی ناپ بھی دیدی، قیاس ظاہر کے مطابق یہ معاملہ درست نہ ہونا چاہیے، کیونکہ جوتا بعد میں تیار ہوگا، معاملہ کے وقت وہ موجود نہیں ہے، لیکن لوگوں کے عمل درآمد کی بنا پر گویا اجماع ہو گیا ہے کہ یہ معاملہ جائز ہے، اس لیے قیاس چھوڑ کر استحسان پر عمل ہوگا۔

(۳) قیاس ظاہر کے مقابلہ میں "ضرورۃ" کی مثال:

برتن جب ناپاک ہو جائے تو اس کے پاک کرنے کی کوئی صورت نہ ہونی چاہیے، کیونکہ وہ نچوڑے نہیں جا سکتے، حالانکہ قیاسی قاعدہ کے مطابق نجاست نکالنے کے لیے نچوڑنا ضروری ہے، لیکن ضرورۃ اور حرج کے دفعیہ کی بنا پر قیاس چھوڑ دیا جائے گا اور استحسان پر عمل کر کے دھونے کے بعد ان کی پاکی کا حکم لگایا جائے گا، اسی طرح اگر کنواں اور حوض جب ناپاک ہو جائیں تو ان کے پاکی کی کوئی صورت نہ ہونی چاہیے، کیونکہ ان میں نجاست کا اثر بہرحال باقی رہتا ہے، لیکن ضرورت کی بنا پر قیاس چھوڑ کر استحسان پر عمل کر کے

ان کی پاکی کا حکم دیا گیا۔

(۴) قیاس ظاہر کے مقابلہ میں قیاس خفی کی مثال:

جن جانوروں کا گوشت حرام ہے، ان کا جھوٹا بھی حرام ہے، کیونکہ جھوٹے میں ان کے لعاب کا اثر ہوتا ہے، اس اصول کی بنا پر پنجہ سے شکار کرنے والے پرندوں کا جھوٹا حرام ہونا چاہیے، کیونکہ ان کا گوشت حرام ہے، لیکن قیاس خفی یہ ہے کہ پرندے جو چونچ سے کھاتے پیتے ہیں، چونچ ہڈی ہوتی ہے، جو زندہ مردہ سب کی پاک ہے، کھاتے پیتے وقت یہ پاک (چونچ) دوسری پاک چیز سے مل جاتی ہے جس میں ناپاکی کی کوئی آمیزش نہیں ہے، بخلاف درندوں کے جھوٹے کے کہ وہ زبان سے کھاتے پیتے ہیں، اور زبان پر نجس لعاب ہوتا ہے جو حرام گوشت سے بنا ہے، یہ نجس لعاب پاک چیز سے ملے گا تو لازمی طور سے اس کو بھی ناپاک بنا دیگا، اس بنا پر پرندہ کو درندہ پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا، اور قیاس ظاہر چھوڑ کر استحسان (قیاس خفی) پر عمل کیا جائے گا،

استحسان کی چار قسمیں فقہاء کے نزدیک استحسان کی چار قسمیں ہیں (۱) استحسان سنت (۲) استحسان اجماع (۳) استحسان ضرورت اور (۴) استحسان قیاسی۔ استحسان کی پہلی اور دوسری قسم میں جب قیاس ظاہر کے مقابلہ میں نص یا اجماع ہو کسی قسم کا اشتباہ نہیں ہے اور قاعدہ کے مطابق لازمی طور سے قیاس چھوڑ دیا جائے گا اور ان دونوں پر عمل کرنا ضروری ہوگا، دوسرے اور تیسرے کی تفصیل یہ ہے

(۳) استحسان ضرورت۔

قیاسی مسائل اگرچہ ایک ہی جنس کے اور ایک ہی مشترک بنیاد (علت) پر قائم ہوتے ہیں، لیکن بسا اوقات مخصوص حالات و مواقع کی بنا پر نتائج اور ردعمل کے لحاظ سے وہ یکساں مفید اور مصلحت و ضرورت کے حامل نہیں ہوتے، اور ان پر عمل کرنے سے کہیں دشواری پیدا ہوتی ہے اور کہیں وہ ضرر رساں اور غیر منصفانہ نظر آتے ہیں، ایسی حالت میں الٰہی پالیسی کے مطابق فطری طور پر

انھیں چھوڑنے کی ضرورت ہوتی ہے، اور حصول مصلحت اور دفع مضرت کی خاطر دوسری راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ فقہار نے استحسان ضرورت کا حکیمانہ طریقہ ایسے ہی مواقع کے لیے وضع کیا ہے، مگر یہ ظاہر ہے کہ ان مواقع میں ان ہی ضرورتوں، مصلحتوں اور دفع مضرت کا لحاظ ہوگا، جو الٰہی پالیسی کے موافق ہونگی اور شارع نے قانون سازی میں انھیں امر ونہی کا پیمانہ بنایا ہوگا، ہماری خود ساختہ ضروریات و مصالح اس میں شامل نہیں، فقہار کی بیان کردہ مصالح کی تعریف اور تقسیم حسب ذیل ہیں:

مایرجع الی قیام حیاۃ الانسان	مصالح وہ ہیں جن کا تعلق حیات انسانی
وتمام عیشہ ونیلہ ما تقتضیہ	کے قیام اور اس کی تکمیل سے ہو اور
اوصافہ الشہوانیۃ والعقلیۃ	جن کے ذریعہ انسان اپنی شہوانی و عقلی
علی الاطلاق [1]	اوصاف کے فطری تقاضوں کو پورا کرے،

بنیادی حیثیت سے ان مصالح کی تین قسمیں ہیں:

مصالح کی تین قسمیں (۱) مصالح ضروریہ (۲) مصالح حاجیۃ اور (۳) مصالح تحسینیہ، ان کے علاوہ کچھ ضرورتیں اور مصلحتیں ایسی ہی ہیں، جو ان میں سے ہر ایک کی تکمیل کرنے والی ہیں، اس طرح ان کی چھ قسمیں بن جاتی ہیں، (۴) مکملات ضروریہ (۵) مکملات حاجیۃ اور (۶) مکملات تحسینیہ، ان میں سے ہر ایک کی ترتیب اور تفصیل درج ذیل ہے،

(۱) مصالح ضروریہ وہ ہیں جو کلیات خمسہ (دین[1] نفس[2] عقل[3] نسل[4] اور مال[5]) کی حفاظت کے لیے مقرر ہیں، یہ کلیات ایسے ہیں جن پر انسان کا اپنی اصلی پوزیشن میں قیام و بقار موقوف ہے اور پھر اس کے واسطہ سے صالح معاشرہ کے وجود کے لیے بھی وہ ناگزیر ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر زمانہ

---

[1] موافقات ج ۲ ص ۲۵

کی شریعتوں نے ان کی حفاظت کی ہے اور ہر دور کے قانون نے ان کا احترام اپنا فرض منصبی سمجھا ہے۔

الٰہی پالیسی کے مطابق ان کی حفاظت کا جس طرح انتظام کیا گیا ہے اور اس کے لیے جس طرح قانون بنائے گئے ہیں ان کی چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) حفاظت دین کی خاطر عبادات مقرر ہوئیں کہ ان کے بغیر دین کی تشکیل نہیں ہوتی۔ تبلیغ و جہاد فرض کیا گیا کہ ان پر دین کا قیام موقوف ہے،[1] (۲) حفاظت نفس کے لیے قصاص مقرر ہوا (۳) حفاظت عقل کے لیے نشہ آور چیزوں کے استعمال کی ممانعت کی گئی اور استعمال کرنے والے کے لیے سزا مقرر ہوئی (۴) حفاظت نسل کی خاطر غیر محل میں شہوت رانی سے منع کیا گیا اور اس کے مرتکب کے لیے سزا مقرر کی گئی ہے (۵) حفاظت مال کی خاطر چوری وغیرہ کی سزائیں مقرر ہوئیں، ان کے علاوہ بہت سے احکام مذکورۂ بالا ضروریات کو مکمل کرنے کے واسطے مقرر کیے گئے، مثلاً کھانے پینے، رہنے سہنے سے متعلق احکام اور ان چیزوں سے متعلق احکام و سزائیں جو حرام و منہیات کے ارتکاب کا سبب بنتی ہیں، ان سب کا تعلق نفس اور عقل کی حفاظت سے ہے، اسی طرح معاملات و سیاسیات وغیرہ سے متعلق احکام حفاظت نسل و مال اور دین سے تعلق رکھتے ہیں،

(۲) مصالح حاجیہ وہ ہیں جن پر کلیات خمسہ کا قیام و بقا تو موقوف نہیں ہے، مگر ان کے ذریعہ زندگی خوشگوار بنتی ہے، مضرت کا دفعیہ ہوتا ہے مشقتوں، کلفتوں سے نجات ملتی ہے، اور زندگی کی تمام ان پرخطر راہوں پر قابو حاصل ہوتا ہے جن پر قابو پائے بغیر نہ حقیقی تمدنی زندگی حاصل ہوتی ہے اور نہ مدنیت صالحہ پیدا ہوتی ہے، ان مصالح کے حصول اور مضرت کے دفعیہ کے لیے بہت سے معاملات، مثلاً خرید و فروخت شرکت، بٹائی اور کرایہ وغیرہ کے احکام مقرر ہوئے ہیں، اور پھر ان مصالح کو مکمل بنانے کے لیے مہر، طلاق، کفارہ وغیرہ سے متعلق احکام ہیں۔

---

[1] جہاد کے مفہوم اور قیام و بقا کے لیے اس کی اہمیت پر مفصل بحث راقم الحروف کی کتاب "عروج و زوال کا الٰہی نظام" میں ملے گی۔

(۳) مصالح تحسینیہ وہ ہیں جن پر نفس زندگی کا قیام و بقا تو موقوف نہیں ہے، لیکن انسان کے انسانیت کے دائرہ میں شامل ہونے کے لیے ان کی ضرورت ہے، مثلاً عمدہ اخلاق، اچھی عادتیں، عالی ظرفی اور بلند حوصلگی وغیرہ۔

اس سلسلہ میں اخلاقی اصول و ضوابط مقرر کیے گئے ہیں، تلقین و ترغیب کے ذریعہ ان پر کاربند ہونے کی تاکید کی گئی ہے، تعلیم و گفتگو، کھانے پینے کے آداب، معاشی اور معاشرتی زندگی میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کے احکام کا تعلق ان ہی مصالح سے ہے، اسی طرح ان کے حصول کی راہ میں جو چیزیں رکاوٹ بن سکتی یا کسی طرح بھی اثر انداز ہو سکتی تھیں، ان سب پر پابندی لگائی گئی، مثلاً گندی اور ناپاک چیزوں کے استعمال سے روکا گیا اور پاکیزہ چیزوں کے استعمال کا حکم دیا گیا ہے، کیونکہ اخلاقی زندگی بڑی حد تک ان سے متاثر ہوتی ہے، اسی طریقہ سے صدقہ و خیرات کے استعمال سے متعلق احکام عفو و درگذر کی ترغیب، لین دین میں نرمی و سہولت وغیرہ کا تعلق اسی قسم کے مصالح کے حصول اور دفع مضرت سے ہے[1]۔

اصول "استحسان" کا استعمال زیادہ تر تیسرے درجہ کے مصالح میں کیا گیا ہے اور اکثر و بیشتر استحسانی مسائل کا تعلق ان ہی سے ملتا ہے۔

فقہاء کے مقرر کردہ تقدیم و تاخیر کے اصول

مصالح کے تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے بھی درجے اور مرتبے قائم کیے ہیں اور بنیادی حیثیت سے تقدیم و تاخیر میں وہ مصلحت اور ضرورت کی قوت کا اعتبار کرتے ہیں، چنانچہ ان کے نزدیک مصالح ضروریہ حاجیۃ پر مقدم ہوں گے اور حاجیۃ تحسینیہ پر مقدم ہوں گے، پھر ہر ایک کے کملات کو دوسرے کے کملات پر فوقیت حاصل ہوگی[2]۔

بعض فقہاء کی رائے ہے کہ کملات ضروریہ کو نفس حاجیہ پر ہی تقدم ہوگا، اسی طرح کملات حاجیہ

---

[1] شرح مسلم الثبوت ص ۲۶۵ [2] ایضاً ص ۲۶۵

کو نفس تحسینیہ پر فوقیت ہوگی[۵] لیکن یہ اختلاف زیادہ اہم نہیں ہے، موقع و محل کے لحاظ سے آسانی کے ساتھ اس کا فیصلہ ہو سکتا ہے،

پھر ضروریہ میں مقدم حفظ دین، پھر حفظ نفس، پھر حفظ نسب، پھر حفظ عقل، پھر حفظ مال ہے، ایک رائے یہ بھی ہے کہ بعد کے چاروں حفظ کلیات دین پر مقدم ہوں گے کیونکہ ان کا تعلق زیادہ تر انسان کے حق سے ہے اور دین کا زیادہ تر تعلق اللہ تعالیٰ کے حق سے ہے، اور احکام میں انسان کا حق اللہ کے حق پر مقدم ہوتا ہے، مثلاً قصاص ارتداد کی سزا پر مقدم ہے، حفاظت مال کی غرض سے کبھی جمعہ اور جماعت کے ترک کی اجازت مل جاتی ہے، چار آنے کے برابر نقصان کی صورت میں نماز قطع کرنا جائز ہوتا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر

قد کان الاحسن تقدیم ھذہ[۶] الاربعة علی الدین[۵]	بعد کے چاروں کی تقدیم دین پر احسن بن سکتی ہے۔

مگر محققین فقہا نے ان سب کے جوابات دیے ہیں اور دین کی تقدیم کو برقرار رکھا ہے۔ اور صحیح یہ ہے کہ یہ اختلافی معاملہ بھی بڑی حد تک موقع اور محل کے تابع ہے اور اسی لحاظ سے آسانی کے ساتھ کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

شارع نے مصلحت و مضرت کے غلبہ کا اعتبار کیا ہے | یہاں یہ بات واضح کر دینا ضروری ہے کہ مصلحت و مضرت اضافی چیزیں ہیں، ایک ہی چیز ایک لحاظ سے مفید ہو سکتی ہے اور دوسرے لحاظ سے مضر بن سکتی ہے کبھی یہ دونوں حیثیتیں برابر ہوتی ہیں، اور کبھی ان میں فرق ہوتا ہے، شارع نے احکام کے تقرر میں غلبہ کا لحاظ کیا ہے یعنی کسی امر کو اس بنا پر جائز قرار دیا کہ اس میں نفع کا پہلو غالب تھا، اور منع اس بنا پر کیا کہ ضرر و نقصان کا پہلو غالب تھا، چنانچہ فقہا کی تصریح ہے،

[۱] التقریر والتحبیر ص ۲۳۱ [۲] ایضاً

لیس فی الدنیا مصلحة محضة	دنیا میں کوئی مصلحت و مضرت خالص نہیں
ولا مفسدة محضة والمقصود	ہوتی، اسی بنا پر شارع نے ان کے غلبہ کو
للشارع ما غلب منها [۱]	مقصود بنایا ہے

البتہ احکام کی تعمیل میں اس کا لحاظ ضروری نہیں ہے، کہ ہم ان کی حقیقت سے واقف بھی ہوں یا وہ ہماری خواہشات اور فکر و نظر سے موافقت کرتے ہوں، شارع نے ہماری دینی و دنیوی فلاح اور ہمارے نفع و نقصان کو سمجھکر جو احکام (مامورات و منہیات) مقرر کیے ہیں، بس ان کی تعمیل ہمارے لیے ضروری ہے،

استحسان ضرورت کی مثالیں | استحسان ضرورت کی چند مثالیں یہ ہیں:

(۱) الٰہی شریعت کا قانون ہے کہ اگر امانتدار (امین) سے مال امانت تلف ہو جائے اور اس میں اس کی کوتاہی کو دخل نہ ہو تو امین کو تاوان نہ دینا پڑے گا، یہی حکم ہر اس صورت میں ہوگا جہاں امانت کی شکل پائی جائے گی، مثلاً شرکت میں کاروبار کرنے والوں میں کسی کے ہاتھ سے مال ضائع ہو جائے یا اپنے خاص ملازم سے مال تلف ہو جائے یا کوئی چیز مستعار لی گئی ہو اور مستعیر سے ضائع ہو جائے تو ان سب صورتوں میں تاوان نہ دینا پڑے گا، بشرطیکہ حفاظت میں کوئی کوتاہی ان کی جانب سے نہ ہوئی ہو اور ضائع ہونے میں ان کے کسی فعل کو دخل نہ ہو،

لیکن اس حکم سے وہ پیشہ ور مستثنیٰ ہوں گے جو کسی ایک شخص کے لیے مخصوص نہیں ہوتے ہیں بلکہ بہت سے لوگوں کا کام کرتے ہیں، مثلاً دھوبی، رنگریز، درزی اور نان بائی وغیرہ، ایسے لوگوں کے ہاتھ سے مال تلف ہو جانے کی صورت میں انھیں تاوان دینا پڑے گا، اس میں ضرورت و مصلحت یہ ہے کہ اگر ان سے تاوان نہ لیا جائے گا تو حرص و طمع میں لوگوں کا مال جمع کرتے رہیں گے اور مدتوں واپس کرنے کا نام نہ لیں گے، جس سے مالک کو زحمت ہوگی اور کبھی مال ناکارہ، خراب یا ضائع بھی ہو جائے گا،

---

[۱] الموافقات ج ۲ ص ۲۵

البتہ اگر کسی ایسی وجہ سے مال تلف ہو جائے جو ان کے بس سے باہر ہے، مثلاً آگ لگ جائے یا اور کوئی عمومی تباہی کی صورت پیش آجائے تو ان سے تاوان نہ لیا جائے گا۔

(۲) جو چیزیں ناپ تول کر بیچی اور خریدی جاتی ہیں وہ سود والی اشیاء میں شمار ہوتی ہیں جب ایسی چیزیں کسی کو قرض دیجائیں یا جنس کے عوض میں بیچی جائیں تو برابر سرابر ہونا ضروری ہے کمی بیشی میں سود لازم آجائے گا لیکن اس حکم سے روٹی کے لین دین کی یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کوئی شخص دو روٹی قرض لے اور وہ ایک ایک چھٹانک کی ہوں، مگر وہ خود ڈیڑھ ڈیڑھ چھٹانک کی روٹی واپس کرے تو اس کمی بیشی میں سود نہ ہوگا، اس میں ضرورت و مصلحت یہ ہے کہ پڑوسیوں کے درمیان عموماً اس قسم کا لین دین چلتا رہتا ہے، اور ایسی معمولی معمولی باتوں میں احتیاط سے دشواری پیدا ہوتی ہے، اگر اس قسم کی چیزوں پر بھی بندش لگا دیجائے تو لوگوں کو چند در چند دشواریاں پیش آئیں گی اور ان کی ضرورتیں نہ پوری ہوسکیں گی، اس حکم میں وہ تمام چیزیں داخل ہیں جو عام طور پر لوگوں میں رائج ہیں، اور ان میں احتیاط کرنے سے مختلف قسم کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑے۔

غرض اس طرح فقہائے احناف نے "استحسان" سے کام لے کر فقہ اسلامی کی بڑی قیمتی خدمت انجام دی ہے اور اپنے زمانہ کی تمدنی ضروریات اور ملکی و ملی مصالح کے ساتھ فقہ اسلامی کو ہم آہنگ بنایا ہے، نہ یہ کہ کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال کیا ہے۔

ضرورت و مصلحت کی بناء پر ممنوعات کے مباح ہونے کی حد

البتہ بعض ضرورتیں اور مصلحتیں ایسی بھی ہیں جن میں ممنوعات تک مباح ہو جاتی ہیں، ان کے لیے فقہاء نے یہ قواعد مقرر کیے ہیں:

الضرورات تبیح المحظورات	ضرورتیں ممنوعات کو مباح بنا دیتی ہیں
لاضرر ولاضرار	نہ خود نقصان میں پڑنا چاہیے اور نہ دوسرے کو نقصان میں ڈالنا
الضرر یزال	ضرر دور کیا جائے

الضرر لا یزال بالضرر — ایک ضرر کو دوسرے ضرر کے ذریعہ دور کیا جائے

المشقة تجلب التیسیر — مشقت سہولت کی طالب ہے۔

لیکن یہ وسعت اسی حد تک ہے جس حد تک ضرورت ہوگی، اس سے زیادہ کی اجازت نہیں، مثلاً دائی اور طبیب وغیرہ اسی حد تک "ستر" کے معاملہ میں مستثنیٰ ہیں، جس حد تک علاج وغیرہ کے لیے ضرورت ہو، ایسی صورتوں کے لیے فقہا نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے،

الثابت بالضرورة یتقدر بقدر الضرورة[1] — جس کی ضرورت ثابت ہو تو ضرورت ہی کی مقدار سے اس کا اندازہ ہوگا،

جو احکام ضرورت و مصلحت کی بنا پر ہوں گے، حالات و زمانہ کی تبدیلی سے جب ضرورت و مصلحت بدل جائے گی تو وہ احکام بھی بدل جائیں گے، جیسا کہ علامہ ابن عابدین کہتے ہیں:

بہت سے مسائل ایسے ہیں جن کے بارے میں زمانہ کے حالات و مصالح کے پیش نظر حکم بیان کیا گیا تھا لیکن بعد میں نہ وہ اہل زمانہ رہتے ہیں اور نہ وہ حالات و مصالح ہی باقی رہتے ہیں، ایسی صورت میں حالات و مصالح کی تبدیلی سے احکام میں تبدیلی لازمی بنجاتی ہے، کیونکہ اگر تبدیلی نہ کیجائے تو لوگ مشقتوں اور مضرتوں میں مبتلا ہو جائیں اور اس طرح الٰہی پالیسی کی خلاف ورزی لازم آئیگی، جو حصول منفعت اور دفع مضرت پر مبنی ہے۔

فقہ کی کتابوں میں بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں فقہاء کے اختلاف کی بڑی وجہ ان ہی مصالح و ضروریات کی تبدیلی ہے،

ضرورت و مصلحت کی تعیین میں علامہ شوکانی کا یہ اصول سامنے رہے تو زیادہ اچھا ہے،

وان المصالح انما اعتبرت من حیث وضع الشارع لها من حیث — مصالح کا اعتبار شارع کی وضع کی حیثیت سے ہوگا، مکلف کی سمجھ بوجھ

[1] شرح سیر کبیر ص ۱۷۱

ادراك المكلف — کے مطابق نہ ہو گا۔

علامہ شاطبی کا بیان بھی اس سلسلہ میں نہایت اہم ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں :

المراد بالمصالح والمفاسد ما كانت	مصالح اور مفاسد سے مراد یہ ہو کہ وہ شارع کی
كذلك في نظر الشرع لاما كان	نظر میں مصالح و مفاسد ہوں، اشخاص کی طبیعت کے
ملائما او منافرا للطبع[1]	مناسب اور غیر مناسب ہونے کا اعتبار نہیں ہے،

استحسان قیاسی کی تفصیل (۳) استحسان قیاسی کبھی ظاہری اور متبادر قیاس کی رو سے مسئلہ کا ایک حکم ہوتا ہے لیکن اس پر عمل کرنے سے تنگی و دشواری پیش آتی ہے، یا ضرر رساں ثابت ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اور زیادہ گہرائی سے دقیق اور باریک پہلو نکالا جاتا ہے، اور اس پہلو کو مدار بنا کر ظاہری قیاس کے خلاف حکم دیا جاتا ہے، فقہا کی اصطلاح میں قیاس خفی اسی کا نام ہے، چونکہ اس میں دو قیاس کا تعارض ہوتا ہے اور معقول دلیل کی بنا پر ان میں سے ایک کو ترجیح دیجاتی ہے، اس بنا پر اس کو استحسان کہتے ہیں۔

فقہا کے نزدیک اصل اعتبار دلیل (علت) کے اثر کی قوت اور صحت کا ہے ظہور اور خفا کا نہیں ہے، اس وجہ سے استحسانی (ترجیحی) صورت وہیں بن سکے گی، جہاں خفی دلیل اپنے اثر کے لحاظ سے ظاہری دلیل (قیاس جلی) کے مقابلہ میں زیادہ صحیح اور قوی ہوگی، اور اگر ایسا نہ ہوا بلکہ ظاہری دلیل ہی خفی کے مقابلہ میں اثر کے لحاظ سے زیادہ صحیح اور قوی ثابت ہوگی تو پھر قیاس ہی کو ترجیح حاصل ہوگی، ایسے موقع پر لفظ استحسان کا استعمال محض خفا کی وجہ سے ہوتا ہے

جب قیاس اور استحسان کا مقابلہ دلیل کی قوت کے اعتبار سے ہو تو اس کی چار قسمیں ہیں :

(۱) قیاس اور استحسان دونوں قوی ہوں (۲) دونوں ضعیف ہوں (۳) قیاس قوی اور استحسان ضعیف ہو (۴) استحسان قوی ہو اور قیاس ضعیف ہو، ان صورتوں میں ترجیح اسی کو حاصل ہوگی جس میں قوت پائی جائے گی، چنانچہ صرف چوتھی صورت میں قاعدہ کے مطابق استحسان کو ترجیح ہوگی،

---

[1] الموافقات ج ۲ ص ۳۷

اس کی مثال پرندہ کے جھوٹے کی اوپر گذر چکی ہے، فقہ کی کتابوں میں عموماً یہ عبارت آتی ہے،

انا ناخذ بالاستحسان و ترکنا القیاس — ہم نے قیاس چھوڑ دیا اور استحسان اختیار کیا۔

اس سے زیادہ تر یہی چوتھی صورت مراد ہوتی ہے کہ استحسان کا اثر قوی اور قیاس کا ضعیف ہونے کی وجہ سے قیاس چھوڑ کر استحسان پر عمل کیا جاتا ہے، باقی مذکورہ تین صورتوں میں پہلی اور تیسری صورت میں وجہ ترجیح نکال کر قیاس کو ترجیح ہوگی، اور دوسری میں ممکن ہے ضعیف کی وجہ سے دونوں کا اعتبار نہ کیا جائے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قرائن کی وجہ سے کسی ایک کے لیے ترجیحی صورت پیدا کر لی جائے،

جب قیاس اور استحسان کا مقابلہ دلیل کی صحت کے اعتبار سے ہو تو اسکی بھی چار قسمیں ہیں،

(۱) استحسان اور قیاس دونوں کے ظاہر و باطن صحیح ہوں (۲) دونوں کے ظاہر و باطن فاسد ہوں،

(۳) قیاس کا ظاہر فاسد ہو اور استحسان کا باطن صحیح ہو (۴) استحسان کا باطن فاسد ہو اور قیاس کا ظاہر صحیح ہو،

قیاس کی چار قسموں کو استحسان کی چار قسموں میں ضرب دینے سے سولہ قسمیں بنتی ہیں لیکن جس قیاس کا ظاہر و باطن دونوں صحیح ہو اس کو استحسان کی تمام صورتوں (صحت کے لحاظ سے) پر ترجیح حاصل ہوگی اور جس قیاس کا ظاہر و باطن فاسد ہو وہ مقبول نہ ہوگا، اسی طرح جس استحسان کا ظاہر و باطن صحیح ہو اور جیسے اس قیاس پر ترجیح ہوگی جس کا ظاہر صحیح اور باطن فاسد ہو یا ظاہر فاسد اور باطن صحیح ہو اس کو استحسان کا ظاہر و باطن دونوں فاسد ہوں وہ مردود ہوگا، اس کے بعد تعارض کی صرف چار صورتیں باقی رہتی ہیں،

(۱) استحسان کا ظاہر صحیح اور باطن فاسد اور قیاس کا ظاہر فاسد اور باطن صحیح (۲) استحسان کا ظاہر فاسد اور باطن صحیح اور قیاس کا باطن فاسد اور ظاہر صحیح (۳) استحسان کا ظاہر صحیح اور باطن فاسد اور قیاس کا ظاہر صحیح اور باطن فاسد (۴) استحسان کا باطن صحیح و ظاہر فاسد اور قیاس کا باطن صحیح و ظاہر

صرف دوسری صورت میں استحسان کو ترجیح حاصل ہوگی اور بقیہ تین صورتوں میں قیاس ہی کو ترجیح دیجائیگی،

استحسان قیاسی کی مثالیں | استحسان قیاسی کی مثالیں یہ ہیں،

(۱) ایک شخص کسی کے پاس امانت رکھکر کہیں چلا گیا، دوسرا شخص آکر کہتا ہے کہ میں اس کا وکیل ہوں مجھے امانت واپس دیدو، امین (جس کے پاس امانت ہے) بھی یقین کرلیتا ہو کہ واقعی یہ شخص اس کا وکیل ہے، ایسی صورت میں قیاس کا تقاضا ہے کہ وہ امانت وکیل کے حوالہ کردے، جس طرح قرض کی صورت میں جب کوئی شخص اپنے کو وصولی کا وکیل بتائے اور مقروض اس کی تصدیق کرے تو قرض وکیل کے حوالہ کر دیا جاتا ہے، لیکن استحسان کا تقاضا ہے کہ امانت وکیل کے حوالہ نہ کی جائے، ان دونوں صورتوں میں باریک فرق ہے وہ یہ کہ جس کی امانت ہے، اس کا حق امانت کی ذات سے وابستہ ہے، اس بنا پر بعینہ امانت کا واپس کرنا ضروری ہے، اس کے بدلہ میں کسی دوسری شی کے دینے سے ایک ایسی چیز کی واپسی لازم آئے گی جس سے اس کا حق وابستہ نہ تھا،

بخلاف قرض کے کہ قرض دینے والے کا حق بعینہ اس رقم سے وابستہ نہیں ہوتا جو قرض میں دیگئی ہے، بلکہ اس حق کا محل مقروض کی ذمہ داری ہے، اس لیے جس رقم سے بھی مقروض قرض ادا کرے گا، قرض دینے والے کا حق اس سے وابستہ ہو جائے گا اور ادا کرنا صحیح ہوگا،

فرض کیجئے مذکورہ صورت میں اگر اصل شخص یعنی قرض خواہ آکر یہ کہدے کہ میں نے اس کو وکیل بنایا ہی نہ تھا، اس لیے میرا مال بدستور تمھارے ذمہ ہے، تو ایسی صورت میں مقروض کو تاوان دینا پڑے گا، کیونکہ اس نے خود ہی وکیل کی تصدیق کی ہے، اور تصدیق کے بعد مال واپس کیا ہے، اس لیے لازمی طور سے تاوان اس کے ذمہ ہوگا، قرض کی صورت میں تو تاوان کی بات بن جائیگی، لیکن امانت میں اس کا حق تاوان (جو امانت والی شی کے بدلہ میں دیا جارہا ہے) سے وابستہ ہونا لازم آئے گا، حالانکہ حق نفس امانت سے وابستہ تھا نہ اس کے بدلہ سے اس طرح ایک ایسی دشواری د

پیچیدگی پیدا ہوتی ہے کہ اس پر قابو پانا مشکل ہے، اس بنا پر قیاس چھوڑ کر استحسان کا طریقہ اختیار کیا جائیگا، اور امانت وکیل کے حوالہ نہ کی جائے گی۔

(۲) قرضخواہ کے پاس قرض کی ضمانت کا مال رہن رکھا ہوا ہے، قرض خواہ نے قرض معاف کر دیا لیکن رہن کا مال ابھی نہیں واپس کیا تھا کہ اس کے پاس سے تلف ہوگیا، ایسی صورت میں قیاس کا تقاضا یہ ہے کہ قرضخواہ اس کا تاوان دے، جس طرح قرضدار نے قرض ادا کر دیا اور رہن کا مال ابھی نہیں لے گیا تھا کہ وہ مال قرضخواہ کے پاس تلف ہوگیا، تو اس کے تاوان میں قرض کی ادا کی ہوئی رقم قرضدار واپس لے لیگا اور رہن کا تلف شدہ مال اصل قرضہ کے بدلے میں ہو جائے گا (جبکہ برابر ہوں) لیکن معافی کی صورت میں تاوان نہ دینا پڑے گا، کیونکہ ایسا کرنے میں قرضخواہ کا دوہرا نقصان ہے کہ اس نے قرض بھی معاف کیا اور تاوان بھی اس کے ذمہ واجب ہوا، اور قرضدار کا دوہرا فائدہ ہے کہ قرض بھی معاف ہوگیا اور مال کا تاوان بھی مل گیا، بخلاف ادائیگی کی صورت کے کہ اگر تاوان نہ دلایا جائے تو قرضدار کا سراسر نقصان ہوگا، کہ اس نے قرض بھی ادا کیا اور رہن رکھا ہوا مال بھی تلف ہوا، ایسی صورت میں قرض خواہ فائدہ میں رہے گا کہ اپنا حق تو وصول کر لیا اور جو مال تلف ہوا وہ دوسرے کا تھا۔

اس نقصان سے بچانے کے لیے فقہا نے استحسان کا طریقہ اختیار کیا ہے، اور معافی کی صورت میں تلف شدہ مال کو "امانت" قرار دیا ہے، مال ضمانت نہیں سمجھا ہے، اور امانت کے لیے قانون ہے کہ اگر حفاظت میں کوتاہی کے بغیر تلف ہو جائے تو اس کا تاوان نہیں دینا پڑے گا۔

فقہاء قیاس جلی کی طرح قیاس خفی (استحسان) سے بھی مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور اس کو قیاس ہی کی ایک قسم کہتے ہیں، جس طرح جلی میں اشتراک علت کی بنا پر ایک حکم دوسرے پر لگاتے ہیں، اسی طرح استحسان میں دقیق اور باریک بات جو علت بنتی ہے، اشتراک کی صورت میں ایک حکم دوسرے پر ثابت کرتے ہیں۔

استحسان کی مخالفت اصول وضوابط کی عادت نہ کرنے کی وجہ سے ہو

فقہاے احناف نے اصول استحسان سے بہت کام لیا ہے اور اس کے ذریعہ فقہ کی بڑی مفید خدمت انجام دی ہے جس سے ان کی دقیقہ رسی اور نکتہ سنجی کا پورا ثبوت ملتا ہے، حنابلہ نے بھی اس اصول کے ذریعہ مسائل کا استنباط کیا ہے، امام مالک نے اصول استحسان کو تھوڑے سے فرق کے ساتھ استعمال کیا ہے، مثلاً قیاس کے مقابل جب عرف غالب آجائے یا کوئی ترجیح دینے والی مصلحت پائی جائے، یا قیاس پر عمل کرنے سے نقصان ہوتا ہو، مشقت اور دشواری آتی ہو تو ان سب صورتوں میں امام مالک کے نزدیک قیاس چھوڑ دیا جائے گا اور استحسان پر عمل ہوگا، البتہ امام شافعی کی جانب یہ بات منسوب ہے کہ انھوں نے اس اصول پر سخت نکیر کی ہے اور یہاں تک فرمایا ہے کہ[1]

من استحسن فقد شرع ای وضع شرعا جدیدا	جس نے استحسان سے کام لیا اس نے نئی شریعت بنائی

ایک طرف امام شافعی کے یہ الفاظ ہیں، مگر دوسری طرف اوپر ذکر کیے ہوئے استحسان کے مفہوم سے مسائل کا استنباط بھی ان کے یہاں پایا جاتا ہے، در اصل پیچیدگی اور دشواری کو دور کرنا ضرورت و مصلحت کے تقاضہ سے کام لینا وغیرہ ایسی ناگزیر صورتیں ہیں جن سے کوئی شخص انکار کر ہی نہیں سکتا ہے اور نہ اس کے بغیر عملی زندگی نباہ سکتا ہے، پھر اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں فرمایا؟ ممکن ہے لفظ استحسان چونکہ انسانی میلان اور خواہش کے دخل پر دلالت کرتا ہے، اس بنا پر بعض برگزیدہ ہستیوں کو اس لفظ کو مستقل اصول کی حیثیت دینا پسند نہ ہو، اس کے علاوہ اور کوئی معقول وجہ ان کی کتابوں میں بھی نہیں ملتی ہے، محققین شوافع نے کہا ہے،

ان الحق ما قاله ابن الحاجب	حق بات وہ ہے جس کو ابن حاجب نے کہا ہے
واشار الیه الآمدی انه	اور "آمدی" نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے
لا یتحقق استحسان مختلف فیه[2]	کہ مختلف فیہ استحسان کا وجود نہیں ہے،

---

[1] منہاج الاصول بر حاشیہ التقریر والتحبیر ص ۱۷۲ [2] ایضاً ص ۱۷۲،۱۷۱

تعجب ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے بھی استحسان کو تحریف فی الدین میں شمار کیا ہے، اور اسی باب میں اس کا بیان بھی کیا ہے؟ غالباً استحسان کے آزادانہ استعمال اور اس کے مقررہ اصول و ضوابط کی رعایت نہ کرنے کی صورت میں اس کو تحریف فی الدین کے زمرہ میں شمار کیا ہے، جیسا کہ شاہ صاحبؒ کی مندرجہ ذیل عبارت اور اس کی تائید میں یہودیوں کی مثال اس پر دلالت کرتی ہے،

فیختلس بعض ما ذکرنا من اسرار	ہم نے تشریع کے جو اسرار بیان کیے ہیں
التشریع فیشرع للناس حسب	ان میں سے بعض کو لے لیا جائے، پھر عقل کی
ما عقل من المصلحة[1]	سمجھی ہوئی مصلحت کے موافق لوگوں کے لیے احکام

ورنہ ملی و ملکی مصالح کے پیش نظر "استحسان" کے بغیر چارہ نہیں ہے، جس سے کسی بھی صاحب بصیرت کو انکار نہیں ہو سکتا، (باقی)

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۱۲۰

اسلام کا سیاسی نظام

اگرچہ بعض وجوہ سے اشاعت کے اعتبار سے یہ سلسلۂ تالیفات دار المصنفین کی ۴۸ ویں کتاب ہے، لیکن اس کی تصنیف آج سے تقریباً ۱۵ سال پہلے ہوئی تھی، جبکہ اس موضوع پر اردو میں کوئی کتاب موجود نہیں تھی، اس میں کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی سیاسی نظام کا ایک خاکہ پیش کیا گیا ہے، اٹھارہ ابواب ہیں جن میں نظریۂ خلافت، مجلس تشریعی، طریقۂ قانون سازی، حقوق رعایا، بیت المال احتساب، حرب و دفاع، خارجی معاملات وغیرہ قریب قریب اسلامی دستور کے سب اصولی اور سیاسی پہلو آگئے ہیں، آخری باب سیاست کے غیر اسلامی نظریات سے متعلق ہے، جس میں موجودہ سیاسی نظریات، شخصیت، آمریت، جمہوریت پر مختصر مگر جامع بحث کی گئی ہے۔ قیمت : صہ

مینجر

الجبر و المقابلہ

از

جناب مولوی محمد عثمان عمادی صاحب بی۔ ایس۔ سی (علیگ) ڈپ ان ایڈ، جامعۂ عثمانیہ، حیدرآباد

مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں دوسرے علوم و فنون کی طرح ریاضی کو بھی بڑی ترقی دی تھی، خصوصاً الجبرا میں ان کے بڑے کارنامے اور اس کے بعض اصول اور فارمولے ان ہی کی ایجاد ہیں، مگر افسوس ہے کہ بعد کے علما نے اس کی طرف بہت کم توجہ کی، بلکہ ان کو اس سے ایک قسم کا بعد ہوتا گیا، جدید تعلیم یافتہ طبقہ عربی سے ناواقفیت کی بنا پر ان سے بے خبر رہا، اس لیے عام طور سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو بھی اپنے اسلاف کے کارناموں کا علم نہیں ہے،

عرصہ ہوا مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی فاضلانہ تصنیف خیام میں عباسی دور کے مشہور ماہر ریاضی محمد بن موسیٰ خوارزمی کے ایک نادر رسالہ کتاب المختصر فی حساب الجبر و المقابلہ کا تذکرہ نظر سے گزرا تھا، اتفاق سے اس کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود تھا، مجھکو بھی ریاضی سے کچھ دلچسپی ہے، اس لیے میں نے اس رسالہ کی نقل حاصل کی، یہ رسالہ اپنے موضوع پر نہایت اہم ہے، اس مضمون میں اس کے اور خوارزمی کی بعض ایجادات کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے،

۱۔ ترجمۃ المصنف | محمد بن موسیٰ الخوارزمی کے متعلق ہماری معلومات بالکل محدود ہیں، کتاب کے دیباچہ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ الخوارزمی خلیفہ مامون الرشید کے دربار میں تھا، اور رصدگاہ کا اہتمام و انتظام اس کے سپرد تھا، خلیفہ کے حکم سے اس نے یہ کتاب تصنیف کی،

حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں لکھا ہے کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے جبر ومقابلہ پر کوئی کتاب لکھی، اصل کتاب کے حاشیہ سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں یہ پہلی کتاب ہے جو اس فن میں لکھی گئی ہے، مصنف کی تاریخ وفات میں بھی اختلاف ہے، انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں مضمون نگار نے دو تاریخیں دی ہیں:

(۱) سنہ ۲۲۰ (۸۳۵ء) اور (۲) سنہ ۲۳۲ (۸۴۷ء)

قیاس کہتا ہے کہ نویں صدی کے آغاز میں یہ کتاب تصنیف ہوئی، جیسا کہ آگے چل ہم دیکھیں گے محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے جب یہ کتاب خلیفہ مامون کے حکم سے لکھنی شروع کی تو اس کے سامنے اس موضوع کی کوئی دوسری کتاب نہیں تھی، مترجم نے دیباچہ میں یہ شبہہ ظاہر کیا ہے کہ اگر محمد بن موسیٰ الخوارزمی کے سامنے جبر و مقابلہ کی کوئی دوسری کتاب نہیں تھی تو اس سے یہ کیونکر ثابت ہوتا ہے کہ اس فن کا جاننے والا خوارزمی کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں تھا،

بے شک یہ اعتراض صحیح ہے، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اس زمانہ کے حالات سے یہی پتہ چلتا ہے کہ جس شخص نے کوئی نئی چیز ایجاد کی، اس نے اپنی ایجاد کے اصول و قوانین ایک رسالہ یا کتاب کی صورت میں منضبط کرکے دنیا کے سامنے پیش کر دیے، اس سے عربوں کی تاریخ کا طالب علم بخوبی آگاہ ہے، اس اصول کے تحت کہا جا سکتا ہے کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے جب اپنی معرکۃ الآرا کتاب تصنیف کی تو اس کے سامنے کوئی دوسری کتاب نہیں تھی، اور اس فن کا جاننے والا بھی کوئی نہیں تھا، اگر خوارزمی نے کسی دوسرے سے اس فن میں استفادہ کیا ہوتا تو عربوں کی صداقت سے بعید تھا کہ وہ اس کو چھپاتا، اس لیے یہ ماننا پڑتا ہے کہ محمد بن موسیٰ ہی اس فن کا موجد ہے، اس موضوع پر ہم آگے چل کر پھر گفتگو کریں گے،

یورپ والوں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ اگر کوئی چیز مسلمانوں کی ایجاد یا انکشاف ہے تو یہ فخر اس سے چھین کر دوسروں کے سر اس کا سہرا باندھ دیتے ہیں، یا کم از کم اس کی اہمیت گھٹانے کی

کوشش کرتے ہیں، پلیونا کے میدان میں جب غازی عثمان پاشانے روسیوں کو شکست پر شکست دی تو سارا یورپ حیرت زدہ رہ گیا اور سب کہنے لگے کہ غازی عثمان پاشا ترک نہیں ہیں، بلکہ ان کا خاندان یورپی قوم سے تعلق رکھتا ہے، یہی طریقہ علمی میدان میں بھی اختیار کیا گیا ہے، خوارزمی کی ایجاد پر طرح طرح کے شکوک و شبہات کرنا اس کی اہمیت کو گھٹانے کی سعی بیجا نہیں تو اور کیا ہے۔

اس کتاب کا ایک ہی نسخہ یورپ والوں کو ملا، یہ نسخہ آکسفورڈ کے بوڈلین کتاب خانہ میں محفوظ ہے، سب سے پہلے مسٹر کولبروک نے اس کو علمی دنیا سے روشناس کرایا، اور فریڈرک اوزن نے اس کا انگریزی ترجمہ مع اصل عربی کتاب کے ۱۸۳۱ء میں شائع کیا، ترجمہ نہایت شگفتہ اور سلیس ہے، جس سے ہم مترجم کی محنت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے، مترجم نے ہر مسئلہ کو حاشیہ میں جدید طریقوں سے حل کرکے کتاب کی قدر و قیمت کو اور بھی بڑھا دیا ہے۔

۲- الجبر و المقابلہ | عربی لغت میں جبر کے لفظی معنی ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑنے کے ہیں، محاورۂ عرب میں ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے، متنبی کا شعر ہے:

لا یجبر الناس عظما انت کاسرہ　　　ولا یھیضون عظما انت جابرہ

جس ہڈی کو تو نے توڑا ہے لوگ اسکو جوڑ نہیں سکیں گے　　　اور جسکو تو نے جوڑا ہے اسکو وہ توڑ نہیں سکیں گے

ہسپانیہ میں جہاں عربوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی ایسے شخص کو جو ہڈی جوڑتا ہے۔ آج بھی "الجبرستا" (Algebrista) کہتے ہیں، قافلہ تو چلا گیا، لیکن راستہ میں جو نشانات اس نے چھوڑے وہ اب بھی باقی ہیں،

ریاضی کی اصطلاح میں الجبر کے معنی ہیں کسی مقدار کو جو پوری نہ ہو مکمل بنانا۔ مثلاً لا۲ - ۶ = ۲۳ میں ہم دیکھتے ہیں کہ مساوات کے دائیں جانب لا۲ کو بقدر ۶ کے کمی لاحق ہے، اس نقص کو پورا کرنے کے لیے ہم مساوات کے دونوں جانب ۶ جمع کر دیتے ہیں: لا۲ - ۶ + ۶ = ۲۳ + ۶

اب دائیں جانب مقدار مجہول میں جو نقص تھا وہ دور ہو گیا، اس کو جبر کہتے ہیں،

"مقابلہ" کے لفظی معنی ہیں آمنے سامنے ہونا، ریاضی کی اصطلاح میں کسی مرکب مقدار میں مثبت اور منفی ارکان کے پائے جانے اور پھر اُن کی تحویل کو مقابلہ کہتے ہیں، اوپر کی مثال میں دونوں جانب + ۶ ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہیں، لہذا اختصار کے بعد لا^{۲} = ۲۹ حاصل ہوتا ہے، اس کو مقابلہ کہیں گے،

جبر و مقابلہ کے فن کے ساتھ یہ نام بھی یورپ میں رائج ہوا ـــــ سولھویں صدی سے "المقابلہ" کا لفظ ترک ہو گیا اور صرف "الجبر" باقی رہ گیا ـــــ جو بعد کو الجبرا بن گیا ـــــ وہ عرب تو اب نہیں رہے لیکن علمی دنیا میں ان کے آثار ابتک باقی ہیں،

۳- مساوات درجۂ دوم | عربوں سے پہلے مساوات درجۂ دوم سے دنیا ناواقف تھی، محمد بن موسیٰ الخوارزمی پہلا شخص ہے جس نے مساوات درجۂ دوم اور اس کے حل سے علمی دنیا کو روشناس کرایا ـــــ مساوات درجۂ دوم اس مساوات کو کہتے ہیں جس میں مجہول مقدار (یعنی لا) دوسرے درجہ میں ہو ـــــ اس کی صورت عامہ یہ ہے:

$$\text{ا لا}^{۲} + \text{ب لا} + \text{ج} = \text{صفر}$$

الخوارزمی نے مساوات درجہ دوم کی حسب ذیل تین صورتوں کے جبری حل پیش کیے اور ہندسی طریق پر اپنے ثبوت کی توثیق کی،

۱- $\text{لا}^{۲} + \text{ب لا} = \text{ج}$

۲- $\text{لا}^{۲} + \text{ج} = \text{ب لا}$

۳- $\text{لا}^{۲} = \text{ب لا} + \text{ج}$

پہلی صورت، لا^{۲} + ۱۰ لا = ۳۹ ان کو الفاظ میں وہ یوں بیان کرتا ہے کہ وہ شے

دریافت کرو جس کے مربع میں شے کو دس گنے کے اضافہ سے ۳۹ حاصل ہو، پھر حل کرنے کا طریقہ یہ بیان کرتا ہے،

ل کے نصف عددی سر کا مربع یعنی $(\frac{۱۰}{۲})^{۲}$ لو اور اس کو ۳۹ میں جمع کرو تو ۶۴ حاصل ہوگا، اب اس کا جذر لو جو ۸ ہے، ل کے نصف عددی سر یعنی ۵ کو اس میں سے تفریق کرو تو ۳ حاصل ہوگا، جو شے کی قیمت ہے۔ ریاضی کی زبان میں ہم اس کو یوں بیان کر سکتے ہیں:

$$ل^{۲} + ۱۰ ل = ۳۹ \therefore ل = \sqrt{(\frac{۱۰}{۲})^{۲} + ۳۹} - \frac{۱۰}{۲} = \sqrt{۶۴} - ۵ = ۸ - ۵ = ۳$$

پھر اسی نمونہ کی دو مثالیں اور حل کی ہیں۔

دوسری صورت، $ل^{۲} + ۲۱ = ۱۰ ل$۔ یعنی وہ شے کیا ہوگی جس کے مربع میں ۲۱ جمع کرنے سے شے کا دس گنا حاصل ہو۔ اس کا حل وہ یوں بیان کرتا ہے:

ل کے نصف عددی سر کا مربع یعنی $(\frac{۱۰}{۲})^{۲}$ لو اور اس میں سے ۲۱ تفریق کرو، حاصل تفریق کا جذر لو۔ اس جذر کو ل کے نصف عددی سر میں سے تفریق کردیا اس میں جمع کرو، دونوں صورتوں میں ل کی قیمتیں حاصل ہوں گی:

$$ل^{۲} + ۲۱ = ۱۰ ل \therefore ل = \frac{۱۰}{۲} \pm \sqrt{(\frac{۱۰}{۲})^{۲} - ۲۱} = \pm \sqrt{۲۵ - ۲۱} = \pm \sqrt{۴} = ۵ \pm ۲ = ۷ \text{ یا } ۳$$

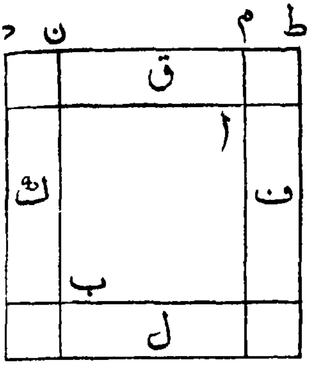
تیسری صورت، $ل^{۲} = ۳ ل + ۴$ ل کے نصف عددی سر کا مربع لو، اس کو ۴ میں جمع کرو، $\frac{۲۵}{۴}$ حاصل ہوگا۔ اس کا جذر لو اور ل کے نصف عددی سر میں جمع کرو تو ۴ حاصل ہوگا،

$$ل^{۲} = ۳ ل + ۴ \therefore ل = \sqrt{(\frac{۳}{۲})^{۲} + ۴} + \frac{۳}{۲} = \sqrt{\frac{۹}{۴} + ۴} + \frac{۳}{۲}$$

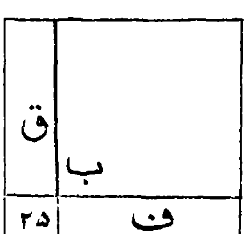
$$= \sqrt{\frac{۲۵}{۴}} + \frac{۳}{۲} = ۲\frac{۱}{۲} + ۱\frac{۱}{۲} = ۴$$

اس کے بعد محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے ان تینوں صورتوں کے ہندسی حل پیش کئے ہیں۔

۴، ۱- $لا^۲ + ۱۰ لا = ۳۹$ کا ہندسی حل | فرض کرو کہ ا ب ایک مربع ہے جس کے ضلع کا طول لا ہے،



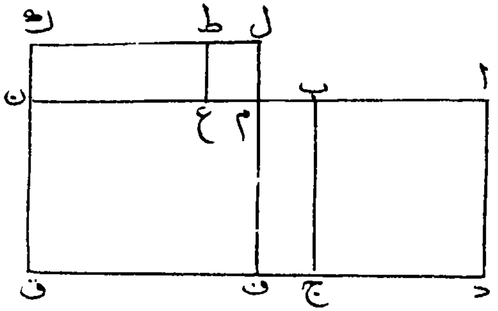
مربع کا رقبہ $لا^۲$ ہوگا، اب اس مربع کے چاروں ضلعوں کے ساتھ چار ایسے مستطیل جوڑنا ہے کہ ان کا مجموعی رقبہ ۱۰ لا ہو، مستطیل کے ضلع کا طول لا ہے لہذا عرض $\frac{۱۰}{۴} = \frac{۵}{۲}$ ہونا چاہیے، اس طرح مربع ا ب اور مستطیل ف، ق، ل، ل مساوات کے دائیں جانب کے ارکان $لا^۲ + ۱۰ لا$ کو تعبیر کرتے ہیں لیکن بموجب مفروض $لا^۲ + ۱۰ لا = ۳۹$، لہذا مربع ا ب اور مستطیل ف، ق، ل، ل کا مجموعی رقبہ ۳۹ کے برابر ہوا، شکل سے صاف ظاہر ہے کہ چاروں کونوں پر چار چھوٹے مربعوں کی کمی ہے جن کے ہر ضلع کا طول $\frac{۵}{۲}$ ہے، اگر یہ کمی پوری کر دی جائے یعنی چار چھوٹے مربعے جن کا مجموعی رقبہ $۴ (\frac{۵}{۲})^۲$ یعنی ۲۵ ہے، کونوں پر جمع کر دیے جائیں تو ج د حاصل ہوتا ہے جس کا رقبہ = ۳۹ + ۲۵ یعنی ۶۴ اب اس بڑے مربع کے ضلع کا طول = ۶۴ کا جذر یعنی ۸، اس لیے ط د = ۸ اب ط د - (ط م + د ن) = م ن جو مربع ا ب کے ضلع لا کو تعبیر کرتا ہے، اس لیے $لا = ۸ - (\frac{۵}{۲} + \frac{۵}{۲}) = ۸ - ۵ = ۳$



مصنف علام نے ایک اور حل اسی مساوات کا پیش کیا ہے، فرض کرو کہ ا ب ایک مربع ہے جس کے ضلع کا طول لا ہم کو دریافت کرنا ہے، اس مربع کے دو ضلعوں کے ساتھ ہم دو مستطیل ف اور ق جوڑ دیتے ہیں جن کا مجموعی رقبہ ۱۰ لا ہوتا ہے۔ اس طرح مستطیل ف = مستطیل ق = ۵ لا، ظاہر ہے کہ مستطیل کا طول لا ہے تو اس کا عرض ۵ ہوگا۔ ان مستطیلوں کے اضافے سے ایک مربع کی جگہ بچ رہتی ہے جس کا رقبہ = ۵ × ۵ یعنی ۲۵، اب مربع ا ب + مستطیل ف + مستطیل ق = ۳۹ اس لیے بڑا مربع = مربع ا ب + مستطیل ف + مستطیل ق + ۲۵ = ۳۹ + ۲۵ = ۶۴

لہذا بڑے مربع کا ضلع = $\sqrt{64}$ = ۸ ∴ مربع اب کا ضلع = لا = ۸ - ۵ یعنی ۳

(۲) لا^۲ + ۲۱ = ۱۰ لا کا ہندسی حل



فرض کرو کہ اب ایک مربع ہے جس کے ضلع اب کا طول = لا؛ لا کی قیمت دریافت طلب ہے؛ اس کے ساتھ ہم ایک مستطیل ب ق جمع کرتے ہیں اس طرح کہ بڑے مستطیل ا ق کا رقبہ ۱۰ لا ہو جاتا ہے۔ چونکہ اد = لا

اس لیے ا ن = ۱۰

چونکہ ا ق کا رقبہ = ۱۰ لا، اور بموجب مفروض ۱۰ لا = لا^۲ + ۲۱

لہذا ا ق کا رقبہ لا^۲ + ۲۱

اور چونکہ ا ج کا رقبہ لا ہے، اس لیے مستطیل ب ق کا رقبہ = ۲۱

ا ن کا وسطی نقطہ م معلوم کرو اور ل م = م ب بناؤ؛ مربع ف ق ک ل مکمل کرو۔

چونکہ ف ل = ف م + م ل = ا ب + ب م = ۵، لہذا مربع ف ق ک ل کا رقبہ = ۲۵

م ن میں سے م ع = م ب قطع کرو اور اس پر مربع م ع ط ل بناؤ۔

مستطیل ع ک کا ضلع ع ن = م ن - م ع = ا م - م ب = ا ب = ب ج اور ع ط = م ب، لہذا مستطیل ع ک کا رقبہ = مستطیل ج م کا رقبہ۔

چونکہ مربع ف ک - مستطیل ج ن

= (مستطیل ف ن + مستطیل ع ک + مربع م ط) - (مستطیل ف ن + مستطیل ج م)

= مربع م ط

اور ہم پہلے ثابت کر چکے ہیں کہ مربع ف ک کا رقبہ ۲۵ ہے اور مستطیل ج ن کا رقبہ ۲۱ ہے،

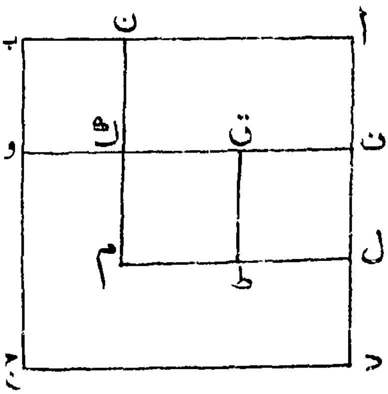
لہذا مربع م ط کا رقبہ = ۲۵ - ۲۱ = ۴، یعنی م ع = م ب = $\sqrt{۴}$ = ۲

چونکہ اب = لا = ام - م ب

لہذا لا = ۵ - ۲ یعنی ۳

(۳) لا^{۲} = ۳ لا + ۴ کا ہندسی حل | فرض کرو کہ ا ب ج د ایک مربع ہے جس کے ضلع کا طول لا ہے، چونکہ لا^{۲} = ۳ لا + ۴، لہذا اس مربع کا رقبہ ۳ لا + ۴ ہے

اس مربع کے ضلع ا د میں سے د ف = طول کی تین اکائیاں قطع کرو اور مستطیل $\overline{د و}$ کی تکمیل کرو، مستطیل $\overline{د و}$ کا رقبہ ۳ لا ہے، چونکہ پورے مربع اج کا رقبہ ۳ لا + ۴ ہے



اس لیے مستطیل ا و کا رقبہ ۴ ہوگا، ف د کا وسطی نقطہ ل معلوم کرو اور ف ل پر ایک مربع ف ل ط ق بناؤ، اس مربع کا رقبہ = $(\frac{۳}{۲})^{۲}$ = $\frac{۹}{۴}$ اس لیے کہ ف ل نصف ہے ف د کا، $\overline{ل ط}$ کو م تک خارج اس طرح کہ ط م = اف اور ل م پر مربع ل م ن ا بناؤ؛

چونکہ ل ا = ان اور اد = اب

لہذا د ل = ن ب، لیکن د ل = ل ف = ط ق

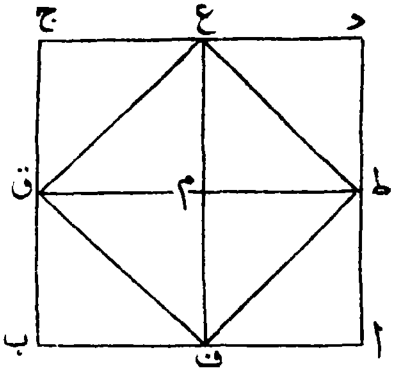
اس لیے ن ب = ط ق اور ن ک = ط م،

لہذا مستطیل ک ن ب و = مستطیل ط ق ک م، یعنی مستطیل ا ک + مستطیل ک ط = $\overline{ا ک}$ + $\overline{ک ب}$ = ۴ مربع ل ن = مربع ل ق + مستطیل ف ن + مستطیل ط ک = $(\frac{۳}{۲})^{۲}$ + ۴ = $\frac{۹}{۴}$ + ۴ = $\frac{۵}{۷}$

لہذا ضلع ال = $\sqrt{\frac{۲۵}{۴}}$ = $\frac{۵}{۲}$

لیکن لا = اد = ال + دل ∴ لا = $\frac{۵}{۲}$ + $\frac{۳}{۲}$ = $\frac{۸}{۲}$ = ۴

مسئلہ فیثا غورث کا ثبوت محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے مسئلہ فیثا غورث کا ثبوت بھی دیا ہے جو پُر از معلومات ہونے کی وجہ سے ہدیۂ ناظرین ہے:



اب ج د ایک مربع ہے جس کے مقابل کے اضلاع کے نقاط وسطی ط، ق اور ف، ع کو ملایا گیا، پھر ط ع، ع ق، ق ف اور ف ط کو ملایا گیا؛ اس طرح سے بڑا مربع آٹھ چھوٹے مثلث قائم الزاویہ میں تقسیم ہو جاتا ہے جو آپس میں ہر طرح سے مساوی ہیں۔

مربع ط ع کا رقبہ دو مثلث قائم الزاویہ ط م ع اور ط د ع کے رقبہ کے مساوی ہے۔

لہذا ط د^2 + د ع^2 = چار مثلث قائم الزاویہ کے رقبہ کے

چونکہ شکل ط ف ق ع مربع ہے اور چار مثلث قائم الزاویہ پر مشتمل ہے،

لہذا ط ع^2 = چار مثلث قائم الزاویہ کے رقبہ کے

یعنی ط د^2 + د ع^2 = ط ع^2

۵۔ اس فن کو کس نے وضع کیا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس فن کے موجد عرب تھے، محمد بن موسیٰ الخوارزمی پہلا شخص ہے، جس نے مساوات درجۂ دوم حل کرنے کے طریقے دنیا کو بتائے، اس سے پہلے یہ طریقے کسی کو بھی نہیں معلوم تھے، فرنگیوں کو مسلمانوں اور ان کے آثار سے ہمیشہ بغض رہا ہے، ان کو کسی طرح یہ گوارا نہیں ہے کہ ریاضی کی اس شاخ کا موجد ایک عرب قرار پائے، چنانچہ فریدرک روزن مترجم جبر و مقابلہ فرماتے ہیں کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے یہ فن دایو فانٹس یا ہنود سے لیا ہے، پھر خود ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ عرب چوتھی صدی ہجری کے وسط تک دایو فانتوس کی تصنیف سے بالکل ناواقف تھے، اس لیے گمان غالب یہ ہے کہ انھوں نے ہندوؤں سے جبر و مقابلہ کے ابتدائی معلومات حاصل کیے جو خلیفہ مامون الرشید کے دربار میں معزز عہدوں پر فائز تھے۔

فاضل مترجم نے ہر جگہ بھاسکر چاری کی کتاب لیلا وتی اور وج گیتا کے حوالہ سے اپنے دلائل کو مستحکم کرنے کی کوشش کی، لیکن مثل مشہور ہے " دروغ گورا حافظ نباشد" اس لیے یہ حقیقت بالکل بھول گیا ہے کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نویں صدی ہجری کے آغاز میں تھے، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے مضمون نگار نے ان کی تاریخ وفات سنہ ۲۲۰ھ بیان کی ہے جو عیسوی حساب کے مطابق ۸۳۵ء ہوتا ہے، اور بھاسکر چاری مصنف لیلا وتی بارہویں صدی کا شخص ہے، لہذا یہ ناممکن ہے کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی مصنف" لیلا وتی "سے خوشہ چینی کر سکے، بخلاف اس کے گمان غالب یہ ہے کہ بھاسکر چاری نے محمد بن موسیٰ الخوارزمی سے اپنے معلومات اخذ کیے ہوں،

ہمارے اس بیان کی تصدیق میں خود فاضل مترجم نے ثبوت فراہم کیے ہیں، چنانچہ صفحہ ۵ سطر ۹ کے تحت حاشیہ میں مساوات ا لا^۲ + ب لا = ج کے حل کی بھاسکر کی اصل عبارت مترجم صاحب نے نقل کی ہے، کو لبرک نے لیلا وتی کا جو ترجمہ کیا ہے، ہمارے مترجم نے اس کو بھی درج کر دیا ہے، وہ یہ ہے:

"ایک مقدار دی گئی ہے جو بقدر اپنے جذر المربع کے بڑھائی یا گھٹائی گئی ہے؛ ضرب دینے والے عدد کا نصف مربع دیے ہوئے عدد میں جمع کرو، مجموعہ کا جذر دریافت کرو؛ اگر فرق دیا گیا ہو تو ضرب دینے والے عدد کا نصف جمع کر دیا اگر مجموعہ دیا گیا ہو تو اس کو تفریق کرو، نتیجہ کا مربع مطلوبہ مقدار ہوگا"

غور سے دیکھیے محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے پہلی اور تیسری صورت کا جو حل پیش کیا ہے، صاحب لیلاوتی نے بالکل وہی طریقہ بیان کیا ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ خوارزمی نے دونوں صورتوں کا حل علیحدہ علیحدہ بیان کیا ہے، اور لیلا وتی کے مصنف نے ان دونوں کو ملا کر ایک کر دیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ بھاسکرا چاری نے محمد بن موسیٰ الخوارزمی کے جبر و مقابلہ سے یہ حل لیا ہے،

سچائی کو کتنا ہی چھپانے کی کوشش کی جائے لیکن کبھی نہ کبھی وہ ظاہر ہو جاتی ہے، خوارزمی نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۶ میں مثلث منفرجۃ الزاویہ جس کے اضلاع ۵، ۶ اور ۹ ہوں اس کا رقبہ دریافت کرنے کا طریقہ بتایا ہے، فاضل مترجم نے لیلا وتی کے ترجمہ کولبروک ص ۷۱ کے حوالے سے نوٹس میں لکھا ہے کہ بھاسکر اچاری نے بھی انھیں طول والے اضلاع سے اس مثال کی توضیح کی ہے، کولبروک کے ترجمۂ لیلاوتی سے ممکن ہے کچھ اور شہادتیں بھی مل جائیں لیکن ان دو داخلی شہادتوں سے بھی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ لیلاوتی کی تصنیف کے وقت بھاسکر اچاری کے پیش نظر خوارزمی کا جو جبر و مقابلہ تھا، اس لیے جبر و مقابلہ کے تمام مسائل جو اس نے لیلاوتی میں بیان کیے ہیں محمد بن موسیٰ الخوارزمی ہی سے لیے ہیں۔

آج سے اسی سال پہلے برٹش میوزیم کے شعبۂ مصریات میں بیروس کی چھال پر خط مسند میں لکھی ہوئی ایک قدیم تحریر ملی تھی جس کو آئسنلوہر (Eisenlohr) نے بڑی محنت اور کاوش سے پڑھا تھا، یہ حساب اور ہندسہ پر مشتمل ریاضی کی ایک کتاب تھی، جس کو احمیس (Ahmes) نے ۱۷۰۰ ق م سے بھی پہلے لکھا تھا، برچ (Birch) کے خیال کے مطابق یہ کتاب ایک دوسری تصنیف کا خلاصہ تھی۔ جو ۳۴۰۰ سال ق م تحریر ہوئی تھی۔

اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے پانچ ہزار سال پہلے مصریوں نے ریاضی میں کافی ترقی کی تھی، کتاب کا عنوان ہے :-

"نامعلوم چیزیں دریافت کرنے کے متعلق ہدایات"

"Directions for obtaining The knowledge of all dark Things"

اس زمانہ کے دانایان مصر کو ریاضی کے اصولوں سے کوئی بحث نہ تھی بلکہ صرف نتائج اور جوابات سے غرض ہوتی تھی، مگر اس زمانے میں بھی ایک مجہول مقدار کی مساوات کے حل سے اہل مصر واقف تھے،

احمیس مجہول مقدار کو ' haw ' یعنی heap (شے) تعبیر کرتا ہے، اور ایک عبارتی سوال اس طرح دیتا ہے: شے کا ساتواں حصہ اور وہ شے مل کر ۱۹ ہوتے ہیں؛

ریاضی کی زبان میں: $\frac{\text{لا}}{7} + \text{لا} = 19$؛ اس کو یوں حل کرتا ہے:

$$\frac{8\text{لا}}{7} = 19;\quad \frac{\text{لا}}{7} = 2\frac{1}{4}\ \frac{1}{8};\quad \text{لا} = 16\frac{1}{2}\ \frac{1}{8};$$

اسی زمانے کی دوسری تحریریں بھی دریافت ہوئی ہیں جن میں مساوات درجۂ دوم کی مثالیں موجود ہیں، ان میں سے ایک حسب ذیل ہے:۔ رقبہ کی ۱۰۰ اکائیاں دو مربعوں کے مجموعہ کے برابر ہے، اور ان کے اضلاع ایک اور $\frac{3}{4}$ کی نسبت میں ہیں، جدید ریاضی کی زبان میں:۔

$$\text{لا}^2 + \text{ما}^2 = 100;\quad \text{لا} : \text{ما} = 1 : \frac{3}{4}$$

اس کو خطائین کے اصول سے حل کیا گیا ہے۔ جو خاص عربوں کی چیز ہے، ان مثالوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آج سے پانچ ہزار پہلے اہل مصر آسان عبارتی سوالات جبری طریقہ سے حل کرنا جانتے تھے،

اس کے بعد زمانہ کروٹ بدلتا ہے، تین ہزار سال کی مدت گزر جاتی ہے۔ فراعنۂ مصر کی میراث یونان کے حصہ میں آتی ہے۔ اس کا یہ دور بہت ہی درخشاں ہے۔ بڑے بڑے ہندسی اور مفکر پیدا ہوتے ہیں، جو علمی دنیا میں اپنا سکہ رائج کرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں دایو فانطوس (Diophantus) نامی ایک شخص اسکندریہ کی خاک سے اٹھتا ہے، اور ریاضی خصوصاً جبر و مقابلہ میں اپنے بہت کچھ آثار چھوڑ جاتا ہے۔ یونانیوں کا محبوب ترین مضمون علم ہندسہ تھا اور اس میں انھوں نے بہت کچھ ترقی کی، احمیس کے بعد دایو فانطوس پہلا شخص ہے جس نے علم حساب اور جبر و مقابلہ کی طرف توجہ کی،

دایو فانطوس مساوات درجۂ دوم اور اس کے حل سے واقف تھا۔ مساوات $84\,\text{لا}^2 + 7\,\text{لا} = 7$ کو وہ بیان کرتا ہے اور اس سے $\text{لا} = \frac{1}{4}$ حاصل کرتا ہے، مساوات درجۂ دوم کی جو صورتیں وہ حل کرتا ہے ان کو ہم تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں؛ $\text{ا}\,\text{لا}^2 + \text{ب}\,\text{لا} = \text{ج}$، $\text{ا}\,\text{لا}^2 = \text{ب}\,\text{لا} + \text{ج}$، $\text{ا}\,\text{لا}^2 + \text{ج} = \text{ب}\,\text{لا}$ ہر ایک صورت کے حل کے وہ علحدہ طریقے بیان کرتا ہے۔

لیکن دایو فانطوس کے یہاں دو بڑی خامیاں ہیں، اول یہ کہ وہ مجہول مقدار کی صرف ایک قیمت دیتا ہے جو مثبت ہوتی ہے، دوسری قیمت کا اس کے یہاں کہیں نام ونشان نہیں منفی قیمتوں میں سے بالکل ناواقف ہے، یہ حیرت انگیز بات ہے کہ منفی مقدار کا اس کے پاس کوئی تصور ہی نہیں، بخلاف اس کے محمد بن موسیٰ الخوارزمی مساوات درجۂ دوم کی دونوں قیمتوں سے واقف تھا، اور جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، وہ دونوں قیمتیں دیتا ہے، اسی بنا پر صاحب تاریخ ریاضی (کجوری Cajori) کو اس میں شبہہ ہے کہ محمد بن موسیٰ الخوارزمی نے دایو فانطوس یا ہنود سے جبر ومقابلہ کے معلومات حاصل کیے (Cajori : History of Mathematics, P. 103)

دوسری بڑی خامی یہ ہے کہ وہ سوال بیان کرتا ہے اور فوراً جواب دیدیتا ہے، یہ جواب کس طرح حاصل ہوتا ہے، کسی کو نہیں معلوم، ہندو ریاضی دانوں کے یہاں بھی یہی طریقہ رائج ہے، جواب کس طرح حاصل ہوا، اس کا عمل کیا ہے، یہ چیزیں دایو فانطوس اور ہندوؤں کے یہاں بالکل مفقود ہے، بخلاف اس کے محمد بن موسی الخوارزمی اور دیگر عرب ریاضی دانوں کے یہاں پورا عمل واضح طور پر موجود ہے، منطقی دلائل نہایت صاف ہوتے ہیں، اور ہر سطر، سطر بالا سے بطور نتیجہ کے حاصل ہوتی ہے۔

اس لیے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ دایو فانطوس اور ہنود کا جبر ومقابلہ فن ریاضی کے تحت نہیں آتا، کیونکہ ریاضی کا اہم ترین جزو "استدلال" یہاں سرے سے مفقود ہے۔

اس بحث کو ختم کرنے سے پہلے فاضل مترجم کے وہ الفاظ پیش کیے جاتے ہیں، جن میں اس نے اپنے دیباچے میں عربوں اور ہندوؤں کے طریقوں کا موازنہ کیا ہے:۔

But under whatever obligation our author may be to the Hindus, as to the subject matter of his performance, he seems to have been independent of them in the manner of digesting and treating it:

at least the method which he follows in expounding his rules, as well as in showing their application, differs considerably from that of the Hindu mathematical writers. Bhaskara and Brahmagupta give dogmatical precept, unsupported by argument, wich, even by the metrical form in which they are expressed, seem to address themselves rather to the memory than to the reasoning faculty of the learner: Mohammad gives his rules in simple prose, and establishes their accuracy by geometrical illustration. The Hindus give comparatively few examples, and are fond of investing the statement of their problems in rhetorical pomp: the Arab, on the contrary, is remarkably rich in examples, but he introduces them with the same perspicuous simplicity of style which distinguishes his rules. In solving al the problems, the Hindus are satis-fied with pointing at the result, and at the principal intermediate steps which lead to it:

The Arab shows the working of each example at full length keeping his view constantly fixed upon the two sides of the equation as upon the two scales of a balance, and showing how any alteration in one side is counterpoised by a corresponding change in the other.

اصل موضوع کی تکمیل کی حد تک ہمارا مصنف (محمد بن موسیٰ الخوارزمی) ہنود کا خواہ کتنا ہی رہین منت کیوں نہ ہو لیکن (فن ریاضی کے) ادراک اور طریقۂ عملیات میں ان کا تابع نہیں معلوم ہوتا، کم ازکم وہ اسلوب بیان جو وہ اپنے ضابطوں کو پیش کرنے اور ان کے اطلاق کیلئے عمل پیرا ہوتا ہے، ہندو ریاضی داں مصنفین سے بڑی حد تک مختلف ہے،

بھاسکرا اور برہما گپتا دلائل سے معرا صرف تیقنات پیش کرتے ہیں جو اپنی عروضی نوعیت میں جس طرح کہ انکا اظہار کیا جاتا ہے، متعلم کے استدلالی قویٰ کو بڑھانے کی بجائے صرف اسکی قوتِ حافظہ کو تازہ کرتے ہیں اور محمد (محمد بن موسیٰ الخوارزمی) اپنے ضابطوں کو سادہ نثر میں بیان کرتے ہیں اور انکی صحت کا ثبوت علم ہندسہ کے اشکال سے دیتے ہیں،

ہنود نسبتہً امثال کم پیش کرتے ہیں اور پرشوکت الفاظ میں اپنے مسائل کو ظاہر کرنا بہتر جانتے ہیں، اور عرب (تصانیف) خصوصیت کے ساتھ مثالوں سے معمور ہیں اور وہ ان کو انھیں سادہ طریقوں سے پیش کرتے ہیں جو ان کے ضابطوں میں نمایاں ہیں،

اپنے مسائل کے حل میں ہنود صرف نتیجہ کے حصول اور ان خاص خاص درمیانی مدارج پر اکتفا کرتے ہیں، جن سے نتیجہ برآمد کرنا ہوتا ہے اور عرب پوری تفصیل کے ساتھ ہر مثال کے عملیات کو پیش کرتے ہیں اور انکی نظر میں اسی طرح مساوات کے دونوں جانب برابر جمی رہتی ہیں، جس طرح ترازو کے پلڑوں پر تاکہ یہ دیکھا جاسکے کہ کسی ایک جانب اگر کوئی تبدیلی کی جائے تو دوسری جانب بھی اس تغیر کا اثر اسی تناسب سے برآمد ہوگا،

"جدید عربی ادب کے چند پہلو"

ڈاکٹر عبد الکریم جرمانوس

مترجمہ: محمود الحسن صاحب ندوی جامعہ نگر

جدید عربی ادب کے نشأۃ ثانیہ کے سلسلہ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ابتداء مصر پر نپولین کے حملہ سے ہوتی ہے۔ غیر معمولی ذہانت کا مالک نپولین بہت سے فرانسیسی علماء اپنے ساتھ لایا تھا، جنھوں نے خوابیدہ مشرق کو جگایا اور مسلمانوں میں تعلیمی دلچسپی کی روح پھونکی، اسلامی تہذیب و مغربی تہذیب میں کبھی بھی بنیادی اختلاف نہیں رہا، کیونکہ دونوں نے یونانی تہذیب سے استفادہ کیا تھا۔ ازمنہ وسطی میں مسلم علماء نے اس تہذیب کے ماخذ اور اپنی آزادانہ جستجو کی روح دونوں چیزیں غیر مہذب مغرب کو عطا کی تھیں، اب جدید ترقی یافتہ مغرب نے اپنے فکری تحقیق اور اس کے نتائج اسلامی مشرق کو دیکر اپنا فرض ادا کر دیا جس کا سلسلہ انیسویں صدی سے جاری ہے۔

جبرتی نے اپنی تاریخی کتابوں میں فرانس کی کیمسٹری اور فزکس کی تجربہ گاہوں کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے، اس نے ان کو دیکھ کر تعجب کا اظہار کیا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب فرانسیسی سپاہی مصر میں سیاسی قوت کی بنیاد ڈالنے کے لیے جد و جہد کر رہے تھے۔ سرزمین مصر سے فرانسیسی فوجوں کے اخراج کے بعد محمد علی نے اس کے دروازے علماء کے لیے کھول دیے، مصری طلباء نے فرانس سے واپس آکر مصر کو نئی زندگی بخشی۔ یہ عقلی نشأۃ ثانیہ کا دور تھا، جس نے عربی ادب میں شاہکار تخلیقات کی طرف رہنمائی کی، اس سے ایک نئے قسم کا عربی ادب وجود میں آیا جس کا اسٹائل بالکل نیا تھا، اور جس میں مضامین کی جدت کے ساتھ ساتھ زندگی

کے بارے میں نئی مغربی طرز فکر بھی تھی۔ شاعری جو اب بھی قصیدہ و غزل سے چمٹی ہوئی تھی، آہستہ آہستہ جدت کے رنگ میں رنگنے لگی۔ اس نے مرصع اور مشکل طرز کو چھوڑ کر آسان طرز نگارش اختیار کیا اور جذبات و تمناؤں کا اظہار ہونے لگا۔ شاعروں کے دلوں میں قومی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ اور شاندار ماضی کا احساس بھی انکے حافظ میں محفوظ تھا۔ ان دونوں اسباب نے ان کو انفرادی و قومی آزادی میں شریک ہونے کی طرف مائل کیا۔ صنعتی نظام کی وجہ سے سماجی تبدیلیاں ظہور میں آئیں جس سے ادب کا نثری پہلو بھی متاثر ہوا اور ایک نئے طرز کی نثر منظر عام پر آئی۔ مختصر افسانے، مختصر ناولیں اور ڈرامے لکھنے کا رواج ہوا۔ مختصر افسانہ نگاری یورپین ایجاد میں ہے، بلکہ ازمنۂ وسطی کے فرانسیسی اور اٹالین مصنفین الف لیلہ ولیلہ کے طرز اور ابن شداد کے بہادرانہ کارناموں سے متعلق کہانیوں سے متاثر ہوئے تھے لیکن جدید یورپین ناولوں نے سماجی ماحول کا نقشہ کھینچا اور پرانی کہانیوں سے زیادہ ترقی یافتہ اور مکمل صورت میں انیسویں صدی کے وسط میں ترکی ناولوں کے وجود میں آنے کے بعد عربی زبان میں ایسی بلند پایہ ناولیں لکھی گئیں، جو یورپین زبانوں میں ترجمہ کے قابل ہیں، محمود تیمور، توفیق الحکیم، طہٰ حسین، طاہر لاشین، امین حسونا، حسین ہیکل، ابراہیم مازنی، عبدالقدیر مازنی، نجیب محفوظ، عبدالحمید، عبدالحلیم، عبداللہ، علی احمد باکثیر، امین یوسف، محمود البدوی، اور نجیب العقیقی کی تصانیف اونچے مقام کی مستحق ہیں،

اس مضمون کا دائرہ ان لکھنے والوں تک محدود ہے جو نئے ادبی ارتقاء کے پیش رو اور مشرق قریب کے صنعتی نظام سے متاثر سماج کی پیداوار ہیں۔ مجھے ایسے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا جو نئے ترقی یافتہ عربی ادب کے لیے ہراول دستہ کی حیثیت رکھتے ہیں، یہ ملاقاتیں "رابطۃ الادب الحدیث" کی نشستوں میں ہوئی تھیں، اس انجمن کے مستقل ممبروں میں محمد ناجی، صحرتی، سیرنی، وادی فلسطین، ابراہیم، عبداللہ، عبدالجبار، ذکریا الانصاری، عبدالمنعم الخفاجی اور حلیم مثری وغیرہ شامل ہیں، اس دائرے کے روحانی پیشوا ڈاکٹر ابوشادی ہیں جو ممتاز تنقید نگار ہیں،

عبدالمنعم خفاجی انجمن "رابطہ" کے رکن اور مشہور خاندان خفاجی سے تعلق رکھتے ہیں، انھوں نے ایک کتاب "بنو خفاجہ و تاریخہم السیاسی والادبی" نو جلدوں میں لکھی ہے، وہ بہت زیادہ لکھنے والے مصنف ہیں، انھوں نے اپنی ۴۰ سالہ مختصر زندگی میں تاریخ ادب و شعر میں بہت سی کتابیں لکھیں، عرب مصنفین کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ بہت لکھتے ہیں مگر ان کی کتابوں میں تالیفی رنگ زیادہ اور تحقیق کم ہوتا ہے لیکن خفاجی پوری آزادی سے پرانے اور نئے ادبی سرمایوں پر تنقید کرتا ہے، حلیم قرنی نے اپنی ایک جدید کتاب "من رواد الادب المعاصر" میں خفاجی پر کئی صفحے لکھے ہیں، اور اسکے غیر معمولی کارناموں کو بہت سراہا ہے، خفاجی کے نزدیک ادب سوسائٹی کے سماجی ڈھانچہ کا آئینہ دار ہوتا ہے، چنانچہ عباسی دور کے قصیدے اس دور کی جاگیردارانہ سوسائٹی کی عکاسی کرتے ہیں، مامون اور رشید کے زمانہ کا نام نہاد ادب الخلاعۃ درحقیقت اس طبقہ کی عیش پرستانہ زندگی کا ثمر تھا، جسے غلامی کے نظام نے غیر ذمہ دار حد تک عیاش بنا دیا تھا،

مبالغہ آمیز درباری ادب کے پہلو بہ پہلو عوامی گیت "قوالبہ" کو ان پڑھ عوام نے نشو و نما دی، اسپین کی سماجی حالت اس سے مختلف تھی، وہاں زندگی میں جمودی روح کا زیادہ اثر تھا، کیونکہ عوام اور بالادار طبقہ میں زیادہ بعد نہ تھا، اس کے برعکس بغداد میں طبقاتی بعد بہت زیادہ تھا، اندلس کے کلاسیکل ادب نے عوامی گیت سے بہت کچھ لیا تھا،

خفاجی ازہری ہے، مگر جس طرح ازہر دینی المشرب خصوصیات کے باوجود اپنی روح کے اعتبار سے مصری رہی، خفاجی بھی اپنے ادبی کارناموں سے مصری نقش نہ محو کرسکا، وہ قاہرہ کے غالب اثرات کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، وہ قاہرہ جس سے گوناگوں تاریخی روایات، خاندان ملوک کا زوال، عثمانیوں کی حکومت اور جدید یورپین زندگی وابستہ ہے، مذاہب الادب، رائد الشعر الحدیث، قصص من التاریخ، مختارات من الشعر الحدیث وغیرہ ان کی خطیبانہ تنقیدی کتابیں ہیں۔

"مذاہب الادب" میں خفاجی نے دلائل سے بتایا ہے کہ جدید شاعری کو سماج کی دلچسپی اور اسکے مفاد کی خدمت کرنی چاہیے، اسے حقیقت پسندانہ بننا چاہیے، سماجی بہبود کی خاطر اس کو احساسات و جذبات کا مظہر ہونا چاہیے، یہی چیزیں شاعری کی نشو ونما کرتی اور اسے خوبصورتی وسچائی کی راہ پر لگاتی ہیں، محض چند لوگوں کے خاطر شاعر کی زندگی محض خوشنما الفاظ تراشنے میں صرف نہ ہونی چاہیے بلکہ اس کو مصیبت زدہ عوام کی امیدوں، حوصلوں اور انکی روح کا مظہر ہونا چاہیے، خفاجی کے اس تصور کے دائرہ میں جو مصری شاعر آتے ہیں ان میں فکری، مازنی اور عقاد زیادہ نمایاں ہیں، انھوں نے انگریزی ادب سے متاثر ہوکر ایک نئے طرز کی عربی شاعری کی بنیاد ڈالی، شوقی اس قابل نہیں تھا کہ اس حد تک عوامی روح کی طرف بڑھتا، تاہم اس کی متعدد نظموں میں خوبی واثر موجود ہے،

اپنی کتاب "مذاہب النقد" میں خفاجی کھل کر لکھتا ہے کہ پرانی عربی تنقید فقہی قسم کی تھی جس کا سارا زور عبارت کی پرکھ تک محدود تھا، خطیبانہ اور پرجوش عناصر کو تنقیدی اہمیت حاصل تھی، ایسی تنقید متن کو جملوں میں تقسیم کرکے ہر ایک کے ساتھ آزاد اکائی جیسے معاملہ کرتی تھی، یہ طرز تنقید ابن سلام، جاحظ، ابن قتیبہ، مبرد، ابن المعتز، عمیدی اور جرجانی کا تھا، قدامہ ابن جعفر تنقید کو الفاظ کے تجزیہ اور انکے صحیح اور غلط استعمال کے پرکھنے کا اصول سمجھتا تھا، یہ اصول اب بھی ہمارے بہت سے نقادوں کے یہاں مقبول ہے لیکن یہ تنقیدی اصول شاعر کے ذہنی خیالات، فنکارانہ احساسات اور جذباتی عناصر کو نظر انداز کر دیتا ہے، اور تنقید ادب کے حقیقی مفہوم کی طرف رہنمائی نہیں کرتا، حقیقت نگاری کا اسکول ادبی اہتمام کا منکر ہے، اس کے برخلاف "توفیق الحکیم" ایک دوسرے رجحان کی نمائندگی کرتا ہے، اس کے نزدیک ادب کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ سماجی اور فلسفیانہ رجحانات کے لیے کارآمد اور مفید ہو، اس کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ فنکارانہ ہو، فنکار کو اس پر مجبور نہیں کرنا چاہیے کہ وہ عوامی ذوق کو تقویت پہنچائے، اس کے قلم یا برش کی رہنمائی اعلیٰ آرٹ کے لیے ہونی چاہیے، احمد امین کی رائے اس کے بالکل خلاف ہے، وہ کہتے ہیں "آرٹ صرف زندگی کے لیے ہے"

ادھر چند برسوں سے مغربی اثرات کے تحت نظم منثور عربی ادب میں رائج ہوئی ہے، مگر خفاجی بھی آزاد شاعری کا مخالف ہے، کیونکہ وہ عربی مذاق کے خلاف ہے، اور مصری نقادوں میں اس مسئلہ پر بڑی دلچسپ بحث چھڑ گئی ہے، محمد عواد نے اپنے ایک مضمون "الرسالہ" میں غیر مقفی شاعری کو عربی میں رائج کرنے کی سختی سے مخالفت کی ہے، ذکی ابوشادی نے اس کے جواب میں اس مسئلہ کو مستقبل پر چھوڑ دینے کا مشورہ دیا ہے، یہ تمام تنقیدیں اور بحثیں واضح طور پر بتاتی ہیں کہ مصر کا ادبی حلقہ مغربی روح سے کس درجہ متاثر ہے، مصر و لبنان اپنے جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر مشرق و مغرب کا سنگم، مغربی اور انکی معاشی زندگی پر اسکا بڑا اثر پڑا ہے، اسلیے ادب میں بھی آزاد اسلوب رائج ہوا۔

مصر اپنے ان ادبی حلقوں پر فخر کر سکتا ہے، جو شاعری کو پروان چڑھانے میں مشغول ہیں، ان میں سے ایک حلقہ خالد الجرنوسی کا ہے جو خود بھی قادر الکلام شاعر ہیں، اس حلقہ میں ہمیں متعدد شاعرات بھی نظر آتی ہیں، ان میں جلیلہ رائدہ "صاحبۃ اللحن الباکی" اور زینب خاص طور پر قابل ذکر ہیں، شاعروں میں عبداللہ شمس الدین، غلیل جرجیس خلیل، ابراہیم عیسیٰ، رشدی ماہر، میجر محمد علی جیسے لائق افراد شامل ہیں، دوسرا حلقہ اخوۃ الادب کا ہے، اس کی صدر "جمیل العلیلی" ہیں یہ مشہور شاعرہ اور "الاہداف" کی اڈیٹر بھی ہیں، انھوں نے اپنے دو پر زور قصیدوں "الابنتی" اور "من وحی الفجر" کی وجہ سے بڑی مقبولیت حاصل کی ہے، انجمن شبان المسلمین نے بھی بہت سے شاعروں اور ادیبوں کو اپنے حلقہ میں جمع کیا ہے۔ اس حلقہ کی رہنمائی صوفی شاعر محمود جابر کے ہاتھوں میں ہے۔

ہم عصر مصری شاعری میں آزادی کا رجحان غیر معمولی قوت سے کام کر رہا ہے، سیاسی زندگی حرکت و عمل کا پس منظر بن چکی ہے، چنانچہ مصر کے نامور شاعر ابوشادی کو جو مختلف ادبی میدانوں میں باکمال اور ہمہ گیر صلاحیت کے مالک ہیں اور شاعری میں جنکے بڑے کارنامے ہیں، شاعر حریت کا خطاب دیا گیا ہے، خالد جرنوسی اپنی کتاب "حدث فی عصر الرشید" میں روایت پرستی کی بیڑیوں، پرانے بندھنوں

...ر جہالت کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہے۔ اس کے خیال میں یہ چیزیں انسان کی آزادی اور نشوونما
...ں روڑے اٹکاتی ہیں، اسی طرح خلیل جبر جیس اپنی کتاب "تار العد ائین" اور محمد نوعنی "امنیۃ الحرتہ"
...ں اسی منزل کی نمایندگی کرتے ہیں۔

جدید مصری شاعری کا ایک اور پہلو فطری شاعری ہے۔ قدیم عربی شاعری میں فطری
...ناظر کا اظہار کچھ اجنبی نہیں۔ مگر فطری شاعری کا نیا تصور عربی میں بالکل نئی چیز ہے۔ شاعر
اپنی ہستی کو خوشبوؤں، جھاڑیوں کے رنگوں، جنگلوں، دریاؤں، پہاڑوں، صبح کی تجلیوں اور شفق
کی سرخیوں میں گم کر دیتا ہے۔ اس کی مثال محمود حسن اسماعیل کا دیوان "این المفر" ہے۔ اس میں
وہ نیل کے نغمے گنگناتا ہے۔ سحارتی اپنی کتاب "ازہارالذکریٰ" میں فطرت کی زمزمہ سنجی میں مشغول
ہے۔ اس نے تتلی، ندی نالے اور سایہ دار درختوں پر جن کے نیچے چشمہ ابل رہا ہو، قلم اٹھایا ہے۔
اس کے اشعار میں فطرت کائنات کا ملجا بن کر سامنے آتی ہے۔ علی تہامہ "نجم والرجم" میں گاؤں کی
زندگی کی منظر کشی کرتا ہے اور اس کو اتنے زور و صداقت سے بیان کرتا ہے کہ محمد حسن اسماعیل
اس سے متاثر ہو کر "ہکذا اغنی" میں اسی کی تقلید کرتا ہے۔

جدید شاعری کی یہ قسم بلاشبہ اس مغربی تصادم کے نتیجہ میں پیدا ہوئی جو مصر کی زندگی
میں عام طور پر رونما ہوا، اور عربوں کی شاعری نے مغرب کی جانب تیز قدم اٹھایا۔ اس سلسلہ میں
اسماعیل احمد ادہم اس کے متعلق یہ انتہا پسندانہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ امریکی عربوں کی شاعری
نام کی عربی رہ گئی ہے۔ اس کی روح میں یورپین روح کار فرما ہے۔ ابو شباکر نے اپنی کتاب
"روابط الفکری والروحی" میں لکھا ہے کہ "فرانس کی ادبی دنیا میں جو بھی تبدیلی آئی، اس نے عربی
ادب کو ضرور متاثر کیا" لیکن غور کرنے سے فرانسیسی اثر کے علاوہ دوسرے اثرات بھی نظر آتے ہیں

خصوصاً انگریزی اثر کو عنصر سمجھا جا سکتا ہے اور Antun Gattar Karam تسلیم کرنے میں حق بجانب ہے کہ انفرادی رجحانات جو عربی شاعری میں پائے جاتے ہیں، ان کو ہم غیر ملکی ادب کے شعری ترجموں کا نتیجہ سمجھتے ہیں،

عرب عوام کی شعر نوازی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج شعرا اور تنقید نگاروں کی بڑی تعداد آزادی سے پروان چڑھ رہی ہے، مجھے تنقیدی کتابیں پڑھنے کا اکثر اتفاق رہا ہے، ان میں سعد میکائیل کی تمیر الادبا، میں شوقی، احمد ذکی، ابو شادی، اسماعیل صبری، برکات محمد حافظ، حسن کامل صیرفی، خلیل تراب، اور صاحب جودت وغیرہ کے بارے میں تنقیدی تبصرے ملتے ہیں، اسی طرح یوسف مکنی کی کتاب "عبقریات نساء القرن التاسع عشر" عائشہ تیموریہ، وادات الیازجی، زینب فواض الامیلیا کے بارے میں تنقیدیں ملتی ہیں،

مصری شاعروں میں ڈاکٹر ابراہیم ناجی کو نظر انداز کرنا ناممکن ہے، ان سے میری پہلی ملاقات ایک اسپتال میں ہوئی تھی، جب کہ موٹر کے تصادم میں ان کا پیر ٹوٹ گیا تھا، بعد میں قاہرہ کے Cafes میں بارہا ملنے کا اتفاق ہوا، دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ان کی قبل از وقت وفات ایک حادثۂ جانکاہ تھی، وہ ایک نازک و ناتواں جسم مگر گرم جوش شخصیت کے مالک تھے۔

ناجی اپنے گیتوں میں طلوع کی کامیاب مصوری کرتا ہے، اسے روزمرہ کے تجربات کو مترنم اور متناسب قافیوں میں پیش کرنے کا زبردست ملکہ حاصل ہے اور سننے اور پڑھنے والوں کے دلوں میں جذبات کی بجلی دوڑا دیتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ شاعری محبت کی الم انگیزیوں، کائنات کی مسرتوں اور جذبات انسانی کے اظہار کا ذریعہ ہے ؎

انما الشعر مزهر   قد حكى قصة الامم
وبادنا ۔ ۔ المنى   تتلاقى وتزدحم

هوانائی موجع لشجی وما کتم
هوا نشودة الحیاة وفیض النغم
هوا آهات شاعر عرف الحب والالم

ترجمہ: "شاعری ایسا ستار ہے جو قوموں کی داستاں سرائی کرتا ہے، امیدیں اسکے تاروں پر جمع ہوتی اور تھرتھراتی ہیں، یہ ایسی صدا آفریں بانسری ہے جو غم اور مخفی چیزوں کو گنگناتی ہے، شاعری زندگی کا ترانہ اور نغمہ کی فراوانی یہ شاعر کی آہ ہے جو محبت والم کا شناسا ہے"۔

ناجی کے غنائی نغموں کی موسیقیت نے ہم عصر شاعروں کو تیزی سے متاثر کیا، چنانچہ حجازی شاعر احمد عبدالغفور نے اپنے دیوان "الهواء الشباب" میں اسی طرز کی شاعری کی ہے جس کا نمونہ یہ ہے:

یامن غفت والفجر فی دارها شعشع فی الآفاق ابهی سناه
قد طرق الباب فتی تعب طال به السیر وکلت خطاه
عندك قد حط رحال المنی وفی حمی حبك القی عصاه

ترجمہ: "اے وہ جو خواب راحت کے مزے لیتی رہی حالانکہ اس کے گھر میں سورج چمک رہا تھا اور تابناک کرنیں افق سے اتر رہی تھیں، ایک تھکے ماندے نوجوان نے دروازے پر دستک دی، وہ دور دراز کی مسافت طے کرکے آیا، اس کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ ہے، وہ اپنی امید کا کجاوہ تمھارے مسکن پر اتارتا ہے اور تمھاری محبت کی جائے پناہ میں اپنے عصا کو رکھتا ہے"۔

ناجی شاعرانہ مناظر کی اس طرح تصویر کشی کرتا ہے کہ وہ ہمارے دماغ کی نگاہوں کے سامنے متحرک تصویر بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کے الفاظ صرف معنی ہی نہیں ظاہر کرتے بلکہ وہ ایسی دلکش تصویر کھینچتے ہیں کہ ان کی صداقت بول اٹھتی ہے، اپنی نظم "رسائل تحترق" میں وہ کہتا ہے:

ذوت الصبابة والطوت — وفرغت من آلامها
لكنني القى المنايا — من بقايا جامها
عادت الى الذكريات — بحشدها وزحامها
فى ليلة ليلاء ار — قنى عصيب ظلامها
هدأت رسائل حبها — كالطفل فى احلامها
اشعلت فيها النار تر — مى فى عزيز حطامها
تعتال قصة حبنا — من بدأها لختامها
احرقتها ورميت قل — بى فى صميم ضرامها

ترجمہ: عشق کی کھیتی سوکھ گئی اور اس کے آلام سے نجات ملی لیکن اس کے جام کے باقی حصے سے آرزوؤں کا سامنا ہو گیا، پرانی یادیں تازہ ہو گئیں اور رات کی تاریکی میں ہجوم کر آئیں، انھوں نے اپنے پرغم سایوں سے بیدار رکھا، اس کے عشق بھرے خطوط اس طرح آرام کر رہے ہیں، جیسے بچہ خواب راحت میں مشغول رہتا، ان خطوط نے اس کے محبوب دھوکوں کو سینے سے لگا کر شعلہ بھڑکا دیا اور ہماری محبت کی داستان ابتدا سے انتہا تک تہ وبالا کر دی، میں نے ان خطوط کو جلا دیا اور اپنے دل کو اسکے دہکتے ہوئے شعلوں میں جھونک دیا۔

ناجی اپنے دل سے اس طرح محو گفتگو ہوتا ہے:

لا تقل لى فى غد موعدنا — فالغد الموعود ناء كالنجوم
ان تلت فعلمنى اصطبارا — ليتنى اختصر العمر اختصارا
عبرت بى نشوة من فرح — فرقصنا انا والقلب سكارى
انفردنا انا والقلب عشيا — ننسج الآمال والنجوى سويا
فركبنا الوهم نبغى دارها — وطوينا الدهر والعالم طيا

قال لی القلب احقنا مابلغنا ... کیف نام القدر الساهر عنا

قلت: لا تجزع فکم من منزل ... عز حتی صار فوق المتمنی

ایها النور سلاماً وخشوعا ... ایها المعبد صمتاً ورکوعا

رب قول کنت قد اعددته ... لک اذا القاک یابی ان یطیعا

وجیش من عتاب فی فمی ... قد عصانی فتفجرت دموعا

ترجمہ: یہ مجھ سے مت کہہ کہ صبح ہم کو ملنا ہے کیونکہ موعودہ صبح اتنی ہی دور ہے جتنے کہ یہ تارے، کل تم نے کیا کہا تھا، تو مجھے صبر کی تعلیم دے۔ کاش میری عمر دراز نہ ہوتی، شادمانی کی لہریں میرے رگ وپے میں سرایت کر گئیں اور میں میرا دل دونوں ناچنے لگے اور دونوں مدہوش تھے، پھر ہم دونوں امیدوں اور سرگوشیوں میں غلطاں شام کے وقت جدا ہوئے، ہم تخیل کے بازوں پر سوار اسکے گھر کیجانب چلے اور زمانہ وکائنات دونوں کو ہم نے طے کیا، دل اس طرح مجھ سے مخاطب ہوا جو ہم کو معلوم ہوا ہے، کیا وہ حقیقت ہے، آخر بیدار زمانے کی نگاہوں نے کیسے ہم سے چشم پوشی کی۔ میں نے جواب دیا گھبرانے کی بات نہیں کتنی منزلیں اتنی دشوار ہیں کہ امیدوں کی پرواز وہاں تک پہنچنے سے عاجز ہے، اے نور عجز وانکسار سے تجھکو سلام ہے، اے وہ معبد جو خاموشی واحترام سے معمور ہے، تیری ملاقات کے لیے میں نے بہت سے الفاظ سوچے تھے، مگر وہ ملاقات کے وقت کام نہ آئے اور زبان میں بند شکایت تو نے سرکشی کی اور آنسوؤں کی راہ پہ نکلیں۔"

وہ اپنے ان اشعار میں عجیب وغریب طرز اظہار اختیار کرتا ہے:

قد ینام التراث جیلاً فجیلاً ... غافیاً فی مجاهل خرساء

وتنام الروح العریقة فی المجد ... لتبدو فی ظلمة سمراء

فتراها مصریة السمت القو ... ة والعزم والحجا والمضاء

ثم ما قد غسلنا الجلال لیصحو ... من جدید فی وجهة الوضاء

ترجمہ :- کبھی کبھی میراث صدیوں تک گونگی بے راہ ریگستانوں میں سوتی ہے اور قدیم روح جو دیرینہ عظمت واقبال میں اس لیے سوتی ہے کہ گندمی چہروں پر ظاہر ہو، دیکھو قوت عزم اور ذکاوت مصر کیجانب تیزی سے بڑھ رہی ہے، میں قسم کھا کر کہتا ہوں عظمت نے نیند کی جھپکیاں لی ہیں تاکہ تیرے روشن چہرہ میں تازہ دم ہو کر جلوہ گر ہو "

ابراہیم ناجی نقش ونگار اور تخیل کا شاعر تھا. اس کے تخیل نے زندگی کے تجربوں کو استعاروں، مسکراہٹوں اور تلمیحوں میں زندۂ جاوید بنا کر پیش کیا ہے،

محمد الاسمار آسان نظم نگار ہے، ازہری ہونے کے باوجود مکتبی علم کی بیڑیاں اس نے کاٹ دی ہیں، اسکی بے شمار کتابوں میں وسیع خزانہ پوشیدہ ہے، کثیر التعداد مصنفین نے اسکی شاعری کا بڑی گرمجوشی سے استقبال کیا ہے، عادل الغدبان نے اسکی نظم ونثر کو پرزور طریقہ سے سراہا ہے، اس کا یقین تھا کہ شاعری کے سوتے انسان کے روحانی جذبات سے پھوٹتے ہیں، اور الفاظ کے حسین لباس میں جلوہ گر ہوتے ہیں، اور ٹیکنیک آرٹ نہیں ہے بلکہ مواد اور روح آرٹ کو آرٹ بناتے ہیں، اس کے اشعار اس کا نمونہ ہیں :

شاعر من یومہ صفر الید	غارق فی دینہ لا بد
وھو فی ذالک ماحط علی	وھدۃ بل حام فوق الوقد
ضاحک منتفخ منتعش	واضح العزۃ جم العید
من رآہ قال کم ثروتہ	وھی صفر من یسار لعدد
منفق فی یومہ ما عندہ	تارک ذلک لتدبیر الغد

ترجمہ : "خالی ہاتھ شاعر نے دن کاٹ دیا، وہ ہمیشہ بار قرض سے دبا رہا لیکن اس حالت میں بھی کبھی گھر غار میں نہیں گرا بلکہ مسکراتا ہوا اپنی شاندار قوت صید افگنی پر نازاں قطبی ستاروں پر منڈلاتا رہا، جس نے دیکھا سوال کیا، کتنی دولت ہے ؟ حالانکہ اس کے پاس کچھ بھی نہیں، جو کچھ وہ رکھتا ہے دن بھر میں خرچ کرکے آیندہ کل کو خدا پر چھوڑ دیتا ہے "

(باقی)

ادبیات

غزل

از جناب اقبر موہانی دارثی

عبث جلوہ گر ہو کے کیا کیجئے گا — شکارِ نظر ہو کے کیا کیجئے گا
جوابِ سحر ہو کے کیا کیجئے گا — قیامت اثر ہو کے کیا کیجئے گا
نہیں جب کہ تابِ نظر ہر جلوہ — تو پھر دیدہ ور ہو کے کیا کیجئے گا
فریبِ نظر ہے بہارِ گلستاں — بہارِ نظر ہو کے کیا کیجئے گا
قیامت کو پردہ میں رہنے بھی دیجئے — ابھی پردہ در ہو کے کیا کیجئے گا
مزہ دل کی بیتابیاں دے رہی ہیں — قرارِ جگر ہو کے کیا کیجئے گا
نگاہوں میں ہو جائینگے غرق جلوے — مآلِ نظر ہو کے کیا کیجئے گا
یہ دنیا ہی کیا کیا فسانے بنیں گے — مرے نوحہ گر ہو کے کیا کیجئے گا
رہے حسن پردہ بہ پردہ تو بہتر — نظر در نظر ہو کے کیا کیجئے گا
مجھے یوں بھی ہے اعتبارِ محبت — غم معتبر ہو کے کیا کیجئے گا
بشر آپ کو یوں بھی کرتے ہیں سجدہ — خدائے بشر ہو کے کیا کیجئے گا
یہ رہتا ہے پیشِ نظر آئینہ کیوں — ادھر سے ادھر ہو کے کیا کیجئے گا
نہیں شاعری حاصلِ زیست اقبر — فراقؔ و جگرؔ ہو کے کیا کیجئے گا

غزل

از جناب چندر پرکاش جوہر بجنوری

نہ آئے دور مجھ تک غم نہیں ہے
نظر ساقی سے ملنا کم نہیں ہے

زمانے کو شعور غم نہیں ہے
یہاں کوئی مرا محرم نہیں ہے

بیان غم پہ کیا رونے سے حاصل
علاج تشنگی شبنم نہیں ہے

جہاں میں ہوں وہاں راحت ہے مفقود
جہاں تم ہو وہاں کچھ غم نہیں ہے

نوائے ساز بھی دلکش ہے لیکن
سکوت ساز بھی کچھ کم نہیں ہے

وہ بزم گل بھی ہے بے رنگ جس میں
کوئی شعلہ کوئی شبنم نہیں ہے

جہاد زندگی ہے یہ کشاکش
مجھے ناکامیوں کا غم نہیں ہے

محبت سے ہے تخلیق دو عالم
محبت کا کوئی عالم نہیں ہے

غم دوراں کو کیا اپناؤں جوہر
غم جاناں کی لذت کم نہیں ہے

غزل

از جناب اختر علی صاحب تلہری

ہنگامہ قیامت کا بپا کرنے میں زمیں ہے
ان کی نگہ قہر تو جنبش میں نہیں ہے

جب سے کہ ترے حسن کی وسعت ہے نظر میں
دنیا کی ہر اک شے مری آنکھوں میں حسیں ہے

تیری نگہ لطف و غضب نے یہ بتایا
جنت بھی یہیں اور جہنم بھی یہیں ہے

میں اور ترے غمزۂ خوں ریز کے شکوے
دنیائے محبت کا یہ آئین نہیں ہے

کیا جانیے کیا کہہ گئی میری نگہ شوق
بیٹھا ہے وہ خاموش گرہ برجبیں ہے

واعظ نہ بڑھاپا ہے بھی کیوں نہیں کہتا
سامان تسلی ہوس خلد بریں ہے

دنیا کے حوادث نے بدل دی مری فطرت
پہلو میں اب اختر دل پر جوش نہیں ہے

مطبوعات جدیدہ

اردو میں قومی شاعری کے سو سال - مرتبہ جناب علی جواد زیدی لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۴۳۲ مجلد، قیمت صہ پتہ: پرکاشن شاکھا محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

اردو نے ہندوستان کی سیاسی بیداری اور جنگ آزادی کی رجز خوانی اس زمانہ میں شروع کی تھی، جب دوسری زبانوں میں اس کا احساس وشعور بھی نہ تھا، اور اس میں جنگ آزادی کے ترانوں اور اس کے نعروں کا اتنا ذخیرہ ہے، جن سے کئی ضخیم جلدیں تیار ہو سکتی ہیں، اس قسم کی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، مگر یہ نیا مجموعہ ان سب میں جامع اور مفصل ہے، لایق مرتب خود ایک خوش مذاق شاعر صاحب نظر ادیب ہیں اور جنگ آزادی کے سپاہی بھی رہ چکے ہیں، اس لیے انھوں نے بڑی خوش مذاقی اور سلیقہ سے یہ انتخاب کیا ہے، اس مجموعہ میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے لیکر ہندوستان کی آزادی اور اس کے بعد یعنی ۱۹۵۷ء تک ہر رنگ کی بلند پایہ قومی ووطنی نظموں کا انتخاب ہے جس سے آزادی کے مختلف پہلوؤں کی نظمیں، جنگ آزادی کے مختلف مراحل اور اس کی سرگذشت سامنے آجاتی ہے، مجموعے کے شروع میں اتر پردیش کے ڈائرکٹر اطلاعات جناب بھگوتی شرن سنگھ کے قلم سے تعارف اور مرتب کے قلم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے جس میں تحریک آزادی کی صد سالہ اجمالی سرگذشت اور اس کے متعلق ضروری معلومات اور اس زمانہ میں شعر وادب کی کیفیت تحریر کی گئی ہے، نثر میں جنگ آزادی کی بہت سی تاریخیں لکھی جائیں گی، لایق مرتب نے یہ منظوم تاریخ مرتب کرکے ایک بڑی مفید سیاسی وادبی خدمت انجام دی ہے،

تابشِ سہیلؔ ۔ مرتبہ جناب افتخار اعظمی، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت اعلیٰ،
صفحات ۲۰۳ مجلد، قیمت: صہ، ناشر مرکز ادب، جہانگیرآباد پیلس، لکھنؤ،

مولوی اقبال احمد خاں صاحب سہیلؔ کے شاعرانہ کمالات اور محاسن سے اہل نظر پوری طرح واقف ہیں، چند سال پہلے جناب نیاز احمد صدیقی پرنسپل محمد حسن انٹر کالج جونپور نے ان کے کلام کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا، اب افتخار اعظمی صاحب نے مستقل کلام سہیلؔ کی نشر واشاعت کا کام شروع کیا ہے، اس سلسلہ کی نمایاں پیشکش "تابش سہیل" ہے، جو اقبال سہیلؔ کی مشہور نعت "موج کوثر" اور ان کی غزلیات پر مشتمل ہے، شروع میں ۴۴ صفحات تک مقالات ہیں، پہلے مرتب نے سہیلؔ کی داستان حیات تحریر کی ہے، پھر رشید احمد صاحب صدیقی، اثر لکھنوی، آل احمد سرورؔ اور حبیب احمد صدیقی نے اپنے اپنے رنگ میں سہیلؔ کی شخصیت، انکی شاعرانہ قادر الکلامی، نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی وغیرہ مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کیا ہے، اور مرتب نے دیباچہ میں صنف غزل اور سہیلؔ کے تغزل پر بڑی خوبی سے روشنی ڈالی ہے، یہ سب مضامین اپنے اپنے رنگ میں بہت خوب ہیں، اثر صاحب کا مضمون بھی ان کی ناقدانہ بصیرت اور ژرف نگاہی کا نمونہ ہے، مگر سہیلؔ کے معاصرین سے ان کے موازنہ میں بے اعتدالی ہوگئی ہے، سہیلؔ کی شاعرانہ عظمت اور قادر الکلامی کے ثبوت کے لیے قطعاً ان کے معاصرین کی تنقیص کی ضرورت نہیں تھی، جو واقعہ کے لحاظ سے بھی صحیح نہیں ہے، سہیلؔ کی علمی قابلیت، ذہانت و ذکاوت اور قادر الکلامی کے باوجود خالص تغزل میں ان کے بعض معاصرین کا پایہ سہیلؔ سے بلند تھا، درحقیقت سہیلؔ کا اصل میدان غزل نہیں بلکہ قصیدہ ہے اور اس میں بلاشبہ ان کا کوئی معاصر ان کا حریف نہیں لیکن وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے، اس لیے تغزل میں بھی ان کا ذوق بڑا ستھرا اور بلند تھا اور اس میں بھی وہ عام شعرا میں امتیازی درجہ رکھتے تھے، لیکن اس میں وہ یگانہ نہ تھے، تعجب ہے کہ جناب مرتب نے اپنے مقدمہ میں محمد حسن انٹر کالج میگزین کا کوئی ذکر نہیں کیا

ہ آل احمد سرور کا وہی مقالہ جو میگزین میں شائع ہوا تھا، شروع و آخر کے حصوں کو حذف کرکے اس
مہ میں شامل کیا گیا ہے، رشید صاحب کے مضمون کے بعض حصے بھی لفظ بلفظ ملتے ہوئے ہیں،
ش سہیل" کی تمام غزلیں چند کے علاوہ کالج کے میگزین نمبر میں موجود ہیں، البتہ ردیف" ر"
یک غزل اور بہت سی غزلوں کے کچھ اشعار جو مرتب کی نظر انتخاب میں نہ آسکے حذف کر دیے
، اس مجموعہ کی ترتیب ردیف وار کے بجائے زمانی رکھی گئی ہے، اور میگزین کی بعض غلطیوں
یحیح بھی کی گئی ہے، ان باتوں کی تصریح مقدمہ میں ضروری تھی سہیل کا کلام اسی کا مستحق تھا
س کو بہتر شکل میں شائع کیا جاتا، مرتب نے یہ مجموعہ شائع کرکے ایک مفید
ا و شعری خدمت انجام دی ہے، ہم کو توقع ہے کہ اصحاب ذوق خصوصاً سہیل مرحوم کے
دان عملی قدر دانی کا ثبوت دیں گے،

پاکستان میں ذہنی رجحانات ۔ مؤلفہ جناب عبید اللہ قدسی صاحب متوسط تقطیع، کاغذ کتابت
و طباعت بہتر، صفحات ۴۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ پتہ: یک لینڈ، ۱۲ محمد بلڈنگ، بندر روڈ، کراچی

اس کتاب میں پاکستان کی ذہنی تعمیر و ترقی میں حصہ لینے والے عناصر اور تصورات کا جائزہ لیا گیا ہے،
، اس سلسلہ میں ترقی پسند تحریک، اردو ادب، ترجمہ اور تنقید، نیز تعلیم، آرٹ اور مذہب وغیرہ اہم امور
ر ان کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، آخر میں پاکستان کے مختلف اداروں، قابل قدر کتابوں
لتب خانوں کے متعلق معلومات فراہم کیے گئے ہیں کہ ان سب کا پاکستان کی ذہنی نشو ونما میں کسی نہ کسی
ثیت سے حصہ ہے، تبصروں اور جائزوں میں مؤلف کی رائے عموماً متوازن ہے، مگر تمامتر اس سے
غاق نہیں کیا جاسکتا، کتاب گو بہت مختصر ہے پھر بھی بڑی حد تک جامع اور اپنے موضوع پر منفرد ہے،
ں لیے تحسین و ستائش کی مستحق ہے، ہندوستان میں بھی ایسی کتابیں لکھنے کی ضرورت ہے،

میرا عقیدہ ۔ از مولانا ابوالکلام آزاد، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہترین، صفحات ۳۸

قیمت: عہ پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مولانا ابوالکلام آزاد اپنی غیر معمولی ذہانت و ذکاوت اور وسیع علم کی بنا پر تقلید جامد کو ناپسند اور بعض مسائل میں آزادانہ رائے رکھتے تھے، اس لیے عام مسلمانوں کو ان کی تحریروں میں کہیں کہیں بے اعتدالی نظر آتی ہے جس سے ان کے بارہ میں طرح طرح کی غلط فہمیاں اور یہانتک خیال ہو گیا تھا کہ وہ نجات و سعادت کے لیے ایمان بالرسالت کو ضروری نہیں سمجھتے اور بظاہر ترجمان القرآن جلد اول وغیرہ کے بعض مباحث سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے، اس لیے مولانا کے احباب اور عقیدت مندوں نے اس بارہ میں ان سے استفسار کیا، اور مولانا نے اس کا مفصل جواب تحریر فرمایا، زیر تبصرہ پمفلٹ میں قاضی احمد حسین صاحب نے مولانا کے ان ہی مکتوبات کو شائع کیا ہے، جس سے ان کے عقیدہ و مسلک کے متعلق غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے، مولانا غلام رسول مہر اور حکیم سعد اللہ کے نام خطوط کا عکس بھی شائع کیا گیا ہے۔ اس پمفلٹ کی اشاعت بہت ضروری تھی۔

امثال آصف الحکیم ۔ از مولانا حمید الدین فراہیؒ، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۶۹ قیمت عہ پتہ: دائرۂ حمیدیہ، مدرسۃ الاصلاح، سرائمیر اعظم گڈھ۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ نے علوم عربیہ کی تحصیل کے زمانہ میں حکیم آصف کی تمثیلی حکایات کا انگریزی سے عربی ترجمہ کیا تھا، جو عرصہ ہوا کتابی شکل میں شائع ہوا تھا، مگر اب خوبصورت ٹائپ میں خاص اہتمام سے شائع کیا گیا ہے، یہ حکایات حکیمانہ بھی ہیں اور دلچسپ بھی، اسلیے یہ رسالہ اپنی سبق آموزی کے لحاظ سے عربی مدارس کے ابتدائی درجوں کے نصاب میں شامل کرنے کے لائق ہے۔

" ض "

سلسلۂ تابعین و تبع تابعینؓ

تابعینؓ	اہل کتاب صحابہ و تابعینؓ
اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حسن بصریؒ، اویسؒ قرنی، امام زین العابدینؒ، سعید بن مسیبؒ، محمد بن سیرینؒ ابن شہاب زہری، اور قاضی شریح وغیرہ ۹۶، اکابر تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور علمی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی،	شروع میں عرب کے یہود و نصاریٰ کی قدیم تاریخ اور ان کے تمدنی و سیاسی اثرات اور اُن کی دینی و اخلاقی حالت کی تفصیل اور اس کے بعد حروف تہجی کے اعتبار سے (۹۳) اہل کتاب صحابہ اور تابعین اور اُن کے بعد صحابیات اور تابعات کا تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے، مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی
طبع دوم ضخامت ۵۵۶ صفحے قیمت ؏	ضخامت ۲۶۵ صفحے قیمت: للعہ

تبع تابعینؒ

(حصّہ اوّل)

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں جس طرح صحابۂ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے اور صحابۂ کرام کے بعد اُنہی کی زندگی ملتِ اسلامیہ کے لئے نمونۂ عمل بنی، بالکل اسی طرح تابعین کرامؒ کے جانشین اور اُن کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، سیر الصحابہ کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین تابعینؒ کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کرچکا ہے، اب اُس نے اُن کے بعد کے مقدس آب بزرگوں اور ائمۂ دین کا مرقع تیار کرایا ہے، اس کے دو حصّے ہیں، پہلے حصّہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور اُنکے فقہی مسلک کے داعی و علمبردار امام ابو یوسفؒ، امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں اور فقہی اجتہادات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی، حصّہ اوّل ضخامت صفحے قیمت:

رجسٹرڈ نمبر ۵۲۰۱ اے
اکتوبر ۱۹۵۹ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

جلد ۸۴ - ماہ ربیع الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۹ء نمبر ۴

مضامین

شذرات

افسوس ہے کہ ہماری قدیم تہذیب کی یادگاریں ایک ایک کرکے اٹھتی جاتی ہیں اور پرانی محفل اجڑتی جاتی ہے، ان ہی یادگاروں میں ایک چودھری محمد علی صاحب مرحوم ردولوی بھی تھے، وہ امراء و شرفائے اودھ کی تہذیب کا نمونہ تھے، ان کی شخصیت بڑی دلکش و دلپذیر تھی، بڑے خوش مذاق، زندہ دل، بذلہ سنج، حاضر جواب اور علم مجلسی کے بڑے ماہر تھے، انکی ہر چیز میں خوبی و لطافت اور زبان و قلم دونوں میں بڑی دلکشی تھی۔ تحریر میں صاحب طرز ادیب اور خوش گفتاری میں ہزار داستان تھے جس محفل میں بیٹھتے تھے اپنی خوش بیانی سے ان چھا جاتے تھے، ان کی تحریر میں سادگی کے ساتھ بڑی تازگی اور بے ساختگی تھی۔ اس طرز میں وہ منفرد تھے، اہل زبان حضرات میں بھی اس طرز میں لکھنے والا کوئی نہ تھا، مگر ان کی تحریر اور گفتگو دونوں میں اودھ کا پرانا بے فکری کا تفریحی مذاق غالب تھا اس لیئے تحریر کا دائرہ ادب و افسانے تک محدود تھا۔ اور اسی میں ان کا طرز تحریر کھلتا بھی تھا، سنجیدہ علمی و ادبی مباحث سے ان کو زیادہ دلچسپی نہ تھی، اگر کبھی بھولے سے اس کوچہ میں نکل آتے تھے تو اس میں بھی تفریحی رنگ پیدا ہو جاتا تھا یہی حال انکی گفتگو کا تھا، انکی سنجیدہ گفتگو بھی لطائف و ظرائف سے خالی نہ ہوتی تھی،

انکی عمر اسّی کے قریب تھی مگر انکی طبیعت صدا بہار تھی، اسلیے اس زمانہ میں بھی نہ وہ کسی سوسائٹی کے لیے اجنبی ہوئے تھے اور نہ کوئی سوسائٹی ان کے لیے اجنبی تھی۔ ہر عمر اور ہر مذاق اور ہر طبقہ کے لوگوں سے ان کے یکساں تعلقات تھے، اور جس مجمع میں بیٹھتے تھے اس میں گھل مل کر اس طرح اس کے مذاق کی باتیں کرتے تھے کہ اسی کا ایک فرد معلوم ہوتے تھے، انکی صحبت زعفران زار ہوتی تھی جس سے ہر مذاق کا آدمی لطف اندوز ہوتا تھا، وہ آج سے نصف صدی

بیشتر کے لکھنے والے تھے لیکن ان کی تحریر کی تازگی میں اب بھی فرق نہیں آیا تھا، ان کا مطالعہ وسیع تھا، اسلامیات پر بھی انکی نظر تھی، اور آجکل کے بہت سے پڑھے لکھے لوگوں سے زیادہ معلومات رکھتے تھے اورکسی موضوع پر بھی بند نہ تھے، انگریزی اور اردو کا ایک مختصر کتب خانہ بھی ان کے پاس تھا جس میں انگریزی کی بعض اچھی کتابیں تھیں، ان کے ورثہ میں ان کے بعد ان کا کوئی قدر دان نہیں ہے، خدا معلوم اس کا انجام کیا ہو،

وہ مذہباً شیعہ تھے، مگر بڑے معتدل اور شیعہ سنی اتحاد کے بڑے علمبردار تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے "میرا مذہب" کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی تھی، عرصہ سے محرم کی بدعتوں کو ترک کر دیا تھا، ایک زمانہ میں بڑے آزاد خیال، وسیع المشرب اور رنگین مزاج تھے لیکن عمر کے ساتھ ساتھ مذہبی رجحان بڑھتا گیا تھا اور ادھر چند برسوں سے بڑے مذہبی ہو گئے تھے، اور ان کے دل میں بڑا سوز و گداز پیدا ہو گیا تھا، حضرت امام زین العابدینؓ کی دعاؤں کا ایک مجموعہ انکے ورد میں رہتا تھا اور اپنی گذشتہ زندگی کو یاد کرکے اکثر رویا کرتے تھے اور آنے جانے والوں سے اپنی دعائے مغفرت کی درخواست کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کی شان رحمت سے پوری توقع ہے کہ وہ انکی مغفرت فرمائیگا، جس طرح انکی زندگی میں شیعہ سنیوں سے ان کے یکساں تعلقات تھے، اسی طرح انکی وفات کے بعد بھی انکی وصیت کے مطابق دونوں نے الگ الگ ان کی نماز جنازہ پڑھائی، چودھری صاحب جس تہذیب کی یادگار تھے، اب وہ تہذیب مٹ چکی ہے، اس لیے ان کی موت سے ایک پورے دور کا خاتمہ ہو گیا اور اب ایسے نمونے پیدا نہ ہوں گے،

یادگارِ زمانہ تھے یہ لوگ   سن رکھو تم فسانہ تھے یہ لوگ

انگریزوں پر یہ الزام بالکل بجا تھا کہ انھوں نے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈلوانے کے لیے ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ عمداً غلط رنگ میں پیش کی، اگر انھوں نے ایسا کیا تو وہ ایک حد تک قابل معافی تھے کہ حکومت کے قیام و بقا کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے لیکن ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ میں اسی پرانی روش پر قائم رہنا اور تاریخ

میں ایسی باتیں لکھنا جس سے مسلمانوں یا کسی فرقہ کی دل آزاری ہوتی ہو، کہاں تک مناسب اور ہندوستان کے مفاد کے موافق ہے، افسوس ہے کہ بڑے بڑے ہندو مورخین کا دامن بھی اس سے پاک نہیں ہے اور مسلمانوں کے متعلق ان کے قلم پر جو بھی آتا ہے لکھ جاتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ اس کا اثر ہندوستان پر کیا پڑے گا۔

بھارتیہ ودیا بھون بمبئی کی جانب سے بڑے اہتمام سے ہندوستان کی ایک مبسوط تاریخ "دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل" کے نام سے کئی جلدوں میں شائع ہو رہی ہے، اسکی پانچ جلدیں اب تک شائع ہو چکی ہیں، ہندوستان کے مشہور مورخ آر، سی موجمدار اس کے جنرل اڈیٹر اور کے، ایم منشی سابق گورنر یوپی اسکے دیباچہ نگار ہیں، ان دونوں نے پانچویں جلد میں مسلمانوں کے متعلق نہایت دل آزار باتیں لکھی ہیں، منشی جی سے تو اسکی شکایت نہیں کہ مسلم آزاری ان کا مستقل شیوہ ہے جس سے وہ کبھی نہیں چوکتے، مگر موجمدار جیسے ذمہ دار اور نامور مورخ سے اس کی توقع نہ تھی، جب ان کا یہ حال ہے تو معمولی درجہ کے مورخین کا کیا ذکر۔

انگریزوں نے جو کچھ کیا وہ تو ان کے مفاد کا تقاضا تھا، مگر آزاد ہندوستان کا مقصد تو ہندو مسلمانوں کو ملانا اور متحدہ قومیت کی تعمیر ہے، لیکن کیا اس کا طریقہ یہی ہے اور اسی سے دونوں فرقوں میں وحدت پیدا ہوگی، حقیقت یہ ہے کہ ہم آزاد تو ہو گئے ہیں مگر ابھی تک ہم میں آزاد قوموں کی بلند نظری اور وسعت قلب نہیں پیدا ہوئی ہے اور ہمارا قدم تنگ نظری کے پرانے دائرے سے باہر نہیں نکلا ہے، اور آج بھی ہندوستان میں ایک بڑی جماعت ایسی موجود ہے جو مسلمانوں کو غیر قوم سمجھتی ہے، اور اس کو ہندوستان میں ان کا وجود گوارا نہیں اور وہ انکے دور حکومت کو ہندوستان کی تاریخ سے مٹا دینا چاہتی ہے جس کا ثبوت زندگی کے ہر شعبہ میں برابر مل رہا ہے، یہ کتاب بھی اس سے خالی نہیں ہے، اس پر کسی آیندہ پرچہ میں مفصل تبصرہ آئے گا۔

گذشتہ ۱۰ ستمبر کو دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کا جلسہ ہوا تھا، بیرونی ارکان اور عہدہ داروں میں ڈاکٹر سید محمود صاحب، مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی، مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی، اور مولانا عمران خان صاحب نے شرکت فرمائی، اور دارالمصنفین کے مسائل پر غور کیا اور مفید مشورے دیے، دو دن دارالمصنفین میں بڑی چہل پہل رہی،

مقالات

فقہ اسلامی کے مآخذ

(۲)

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر مدرس دار العلوم معینیہ اجمیر

ماقبل کی شریعت

ماقبل کی شریعت بحیثیت ماخذ | فقہ اسلامی کا آٹھواں ماخذ ماقبل کی شریعت ہے، اس سے مراد منزل من اللہ ہدایت کے تمام وہ راستے اور طریقے ہیں جو دوسری امتوں کے پاس موجود و محفوظ تھے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر عمل فرمایا تھا، ظاہر ہے کہ اس میں وہی باتیں داخل ہوں گی جو الٰہی پالیسی اور اس کے بنیادی اصول کے موافق تھیں اور جن میں انسانی اغراض نے تصرفات کر دیے تھے یا وہ حالات و زمانہ کے تقاضے کے مناسب نہ رہ گئی تھیں، ان کے قبول کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے اور نہ وہ ماخذ بن سکتی ہیں، اصل یہ ہے کہ بنیادی تعلیمات میں تمام شریعتوں کے باوجود قومی مزاج اور حالات و تقاضا کی مناسبت سے ان کے راستے اور طریقوں میں اختلاف ہوتا تھا، اس لیے ہر بعد میں آنے والی شریعت اپنے ماسبق کی ان ہی باتوں کے اپنانے پر مامور ہوتی تھی، جو بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دیکر الٰہی پالیسی (منافع کا حصول اور مضرت کا دفعیہ) کی بقا میں مددگار ثابت ہوتی تھیں اس کے متعلق حسب ذیل آیات ہیں :

قرآن حکیم سے اس کا ثبوت انبیاء اور ان کی شریعتوں کے تذکرہ کے بعد رسول اللہ کو حکم دیا گیا ہے،

اولٰئک الذین ھدی اللہ	یہی وہ لوگ ہیں کہ جنھیں اللہ نے ہدایت کی ہے
فبھدٰھم اقتدہ (الانعام)	ان کے ہدیٰ کی آپ اتباع کیجئے۔

ہدیٰ کی تشریح فقہاء نے یہ کی ہے۔

والھدیٰ اسم للایمان والشرائع	ہدیٰ ایمان (بنیادی اصول اور شرائع راستہ
جمیعا لان الاھتداء یقع بالکل	اور طریقہ) سب کو شامل ہے کیونکہ ہدایت پانے کا
فیجب علیہ اتباع شرعھم[1]	تعلق سب سے ہے اسلیے ان (انبیاء) کی شریعت کا

اتباع واجب ہے

دوسری آیت میں ہے :-

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ	اللہ نے تمھارے لیے وہی الدین مقرر کیا ہے جسکی
نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا	وصیت نوحؑ کو کی گئی تھی اور جس پر چلنے کا حکم ابراہیم
وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ	اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دیا تھا (ان سب کی تعلیم یہی تھی)
أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ (شوریٰ)	کہ "الدین" کو قائم رکھو اور اس میں الگ الگ نہ ہو

ملت ابراہیمی کی اتباع کا حکم اس آیت میں ہے :

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ	ہم نے آپ کو وحی بھیجی کہ آپ ملت ابراہیمی کی
إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا (النحل)	اتباع اور پیروی کیجئے

رسول اللہ کے طرز عمل سے شہادت اسی طرح قصاص حدود وغیرہ سے متعلق ماقبل کی شریعتوں کے بہت سے جزوی احکام قرآن حکیم میں موجود ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے بھی ثبوت ملتا ہے، مثلاً ایک روایت میں ہے کہ "اگر کسی بات کے متعلق براہ راست وحی نہ آئی تو آپ اہل کتاب (یہود ونصاریٰ) کے طور طریقوں پر عمل کرنا پسند فرماتے تھے۔"

[1] کتاب التحقیق ص ۲۰۱

مسند امام احمد بن حنبل میں ایک روایت ہے جس میں اہل کتاب کی خصوصیت نہیں ہو بلکہ زمانہ جاہلیت کی اچھی باتوں پر بھی عمل کا ثبوت ملتا ہے،

یعمل فی الاسلام بفضائل الجاهلیة [۱]	اسلام میں زمانۂ جاہلیت کی اچھی باتوں پر عمل کیا جاتا تھا،

اسی بنا پر محدثین نے فرمایا ہے:

وان شرع من قبلنا یلزمنا مالم ینقض الله بالانکار [۲]	پہلی شریعتوں پر عمل کرنا ضروری ہے، جبتک وحی الٰہی کی طرف سے اس پر نکیر نہ کیجائے۔

اخذ واستفادہ حالات وزمانہ کے تقاضے پر محدود تھا

یہ اخذ واستفادہ کن باتوں اور طریقوں میں تھا، اس کی تصریح درج ذیل عبارت سے ہوتی ہے

فان مصالح العباد قد یتفق وقد تختلف فیجوز ان یکون الشئ مصلحة فی زمان النبی الاول دون الثانی و یجوز عکسه و یجوز ان یکون مصلحة فی زمان الاول والثانی و یجوز ان تختلف الشرائع و یتفق [۳]	بندوں کی مصلحتوں میں اگلے اور پچھلے زمانہ میں کبھی اتفاق ہوتا ہے اور کبھی اختلاف ہوتا ہے، ممکن ہے کہ پہلے نبیؐ کے زمانہ میں کوئی مصلحت ہو جو دوسرے کے زمانہ میں بدل گئی ہو، اسی طرح ہو سکتا ہے کہ مصلحت نہ بدلی ہو لیکن اس کے حاصل کرنے کے راستے اور طریقے بدل گئے ہوں۔

اس بنا پر یہ استفادہ حالات وزمانہ کے تقاضے کی مناسبت پر موقوف ہوگا،

چونکہ ماقبل کی شریعتوں سے استفادہ رسول اللہؐ کے زمانہ میں ہوا تھا اور آپ نے اس کی

---

[۱] مسند امام احمد بن حنبل ج ۳ [۲] از امام ابوحنیفہ کی تدوین ص ۲۶ [۳] عینی [۴] کتاب التحقیق ص ۲۰۱

قانونی حیثیت تسلیم فرمائی تھی، اس لیے اس کی حیثیت "سنت" کی قرار پائے گی اور یہ ماخذ سنت ہی میں داخل سمجھا جائے گا، رہا یہ امر کہ تدوین فقہ کے زمانہ میں فقہا نے یہود و نصاریٰ وغیرہ کے فقہ سے باقاعدہ استفادہ کیا ہو تو اس کا ثبوت ابتک فراہم نہیں ہو سکا ہے۔

کیا اسلامی فقہ دوسرے قوانین سے ماخوذ ہے

البتہ بعض مماثلتیں اس قسم کی ضرور ہیں جن سے شبہہ ہوتا ہے کہ ممکن ہے فقہا نے الٰہی پالیسی اور بنیادی اصول کے ماتحت کہیں کہیں جزوی استفادہ کیا ہو لیکن اس قسم کی خفیف مماثلت یقین کے لیے کافی نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں عموماً تین مذاہب کے فقہ سے اثر پذیری کا ذکر زیر بحث لایا جا سکتا ہے:

(۱) پارسی مذہب

(۲) عیسائی مذہب

(۳) یہودی مذہب

۱۔ پارسی فقہ اور اسلامی فقہ میں مماثلت و مشابہت ابتک نہیں ثابت ہو سکی ہے، دو چار باتوں کا دونوں میں اشتراک (مثلاً نماز، مسواک وغیرہ) اثر و تاثیر کی دلیل نہیں بن سکتا ہے، بلکہ محققین کی رائے ہے کہ فقہ اسلامی کی تدوین کے زمانہ میں پارسیوں کے مذہبی قوانین کا نظم و ترتیب کے ساتھ وجود ہی نہ تھا۔

(۲) عیسائی مذہب میں دین و دنیا کی تفریق سے اس کی اور اسلام کی مغایرت ظاہر ہے، مذہبی احکام و قوانین نہایت تھوڑے اور محدود ہیں جو زندگی کے تمام گوشوں کیا معمولی حصوں پر بھی حاوی نہیں ہیں، اور وہ بھی بڑی حد تک پوپ کے وقتاً فوقتاً صادر کردہ احکام پر مبنی ہیں، بلکہ کلیسائی قانون کو خود اسلامی فقہ نے ملک شام وغیرہ میں متاثر کیا ہے، قانون جبر و اکراہ وغیرہ (جن کے بارے میں بعض کا خیال ہے) میں کسی درجہ کی مماثلت فقہ کی اثر پذیری کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے۔

(۴) البتہ یہودی مذہب کے احکام سے فقہ کی مماثلت ضرور بیان کی جاتی ہے، چنانچہ تالمود (یہودی فقہ) میں عیسائی مذہب کی طرح عبادات اور قانون میں تفریق نہیں ہے بلکہ مذہبی قوانین دونوں کو شامل ہیں اور وحی الٰہی ان کا ماخذ ہے، اسلامی فقہ کی طرح موشگافی کا رجحان بھی اسمیں پایا جاتا ہے، مسائل کے استنباط میں اجتہاد کو دخیل مانا جاتا ہے، ان کے علاوہ بعض اور تشریحات میں بھی مشابہت بیان کی جاتی ہے، مثلاً تالمود[1] کے چند احکام جو فقہ سے مناسبت رکھتے ہیں، یہ ہیں:

(۱) اگر کوئی شخص راستہ چلتے روٹی وغیرہ غذا کے ٹکڑوں پر سے گذرے تو انھیں ایک طرف ہٹادے اور روندنے سے بچائے (ج ۲ ص ۱۶۰)

(۲) یوم کفارہ کا روزہ رکھنے پر بچوں کو مجبور نہ کیا جائے، بلکہ مقررہ عمر سے دو ایک سال قبل سے اس کا عادی بنایا جائے (ج ۵ ص ۲۵۰)

(۳) تالمود کے مختلف مقامات میں نیم آزاد اور نیم غلام کا ذکر ملتا ہے۔

(۴) تالمود (ج ۹ ص ۴۵) میں طلاق بالمعاوضہ کا ذکر ہے

(۵) لقطہ (پڑی ہوئی چیز) کے متعلق احکام ج ۱۰ ص ۵۸ میں ہیں

(۶) قاضی اور گواہ بننے کی صلاحیت ان لوگوں سے سلب ہو جاتی ہے جو سود پر قرض دیتے ہیں۔

---

[1] تالمود سے مراد مشنا اور اس کی شرح گمارہ کا مجموعہ ہے، توریت یا حضرت موسیٰ کی تعلیم کا وہ روایاتی مفہوم جو دوسری صدی کے آخر میں یہودیوں میں پایا جاتا تھا، اسکے مجموعہ کو مشنا کہتے ہیں، اسکے چھ باب ہیں (۱) سرائیم۔ نماز و عبادات اور زراعت و مالگذاری (زکوٰۃ) (۲) معید یوم سبت (ہفتہ کا دن) ایام عید روزہ کے احکام (۳) نشیم قانون ازدواج (۴) نیکین قانون دیوانی و فوجداری (۵) قدسیم قربانی اور کھانے پینے کے احکام (۶) طہورات پاکی و ناپاکی کے احکام اس تالیف کے دو اڈیشن ہیں (۱) تالمود یروشلم تقریباً چوتھی صدی عیسوی میں لکھی گئی ہے (۲) تالمود بابل جو اس سے زیادہ ضخیم ہے اور پانچویں و چھٹی صدی عیسوی میں لکھی گئی ہے۔

نرد کھیلتے ہیں اور شرط کر کے کبوتروں کو اڑاتے ہیں (ج ۱ ص ۲۵۵)

(۷) عورت کے حقوق اور نفقہ کی تفصیل ج ۸ ص ۸۰ میں ہے۔

تمام الہامی مذاہب اور شرائع میں جزوی مماثلت ضروری ہے

لیکن اس قسم کی مشابہت اخذ و استفادہ کا ثبوت بلکہ ان کا ان تمام مذاہب میں پایا جانا ضروری ہے، جو ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں اور جن کا سرچشمہ ایک ہے۔ یہودیت بھی ملت ابراہیمی کی شاخ ہے اور اسلام بھی، اس لیے ان دونوں میں اس قسم کی جزوی مماثلت کا ہونا ضروری ہے، اس میں اخذ و استفادہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

رہیں وہ روایتیں جن سے ماقبل کی شریعتوں سے اخذ و استفادہ کی مماثلت ثابت کی جاتی ہے، مثلاً یہ واقعہ کہ حضرت عمرؓ نے یہود کی کچھ باتیں نقل کرنی چاہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

امتھوکون انتم کما تھوکت الیھود	کیا تم متحیر ہو (اپنے دین اور کتاب کے بارہ میں)
والنصاریٰ لقد جئتکم بھا	جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے متحیر ہو کر دوسری طرف رخ کر لیا ہے، میں تمھارے پاس صاف اور واضح
بیضاء نقیۃ ولو کان موسیٰ	شریعت لے کر آیا ہوں (جو ہر قسم کے شکوک و شبہات اور نقص سے خالی ہے) اگر موسیٰ علیہ السلام (صاحب شریعت)
حیا ما وسعہ الا اتباعی[1]	زندہ ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ تھا۔

اس کا جواب حدیث کے الفاظ ہی میں موجود ہے، در اصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس یہودی اثر پذیری اور تاثیر کی مرعوبانہ ذہنیت پر پابندی لگانا چاہتے تھے، جو حدود و قیود کی رعایت کیے بغیر حق و ناحق ہر بات میں اخذ و استفادہ کا سلسلہ شروع کر دیتی ہے، جیسے آجکل یورپ کی اندھی تقلید کیجاتی ہے، حضرت عمرؓ کا یہود کی باتوں کے بارے میں "تعجبنا" (وہ ہمیں اچھی معلوم ہوتی ہیں) کہنا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس کے جواب میں لقد جئتکم بھا بیضاء نقیۃ ارشاد فرمانا

---

[1] شعب الایمان از مشکوٰۃ ص ۲۸

خود اس کا ثبوت ہے۔ اس لیے حضرت عمرؓ جیسے غیور اور جلیل القدر انسان کو جو یہود کو خاطر میں بھی نہ لاتے تھے ان کی بعض باتیں ان کو پسند آگئی تھیں، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے روک دیا ورنہ پھر ان کی تقلید کا دروازہ کھل جاتا، جس کا مشاہدہ آج بھی کیا جاسکتا ہے۔

یا یہ روایت کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس توریت کا نسخہ لائے اور اس کو پڑھنا شروع کر دیا، وہ پڑھتے جاتے تھے اور رسول اللہ کا چہرۂ مبارک متغیر ہوتا جاتا تھا، جب حضرت عمرؓ کی نگاہ رسول اللہؐ کے چہرہ پر پڑی تو فرمایا

اعوذ باللہ من غضب اللہ	میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں، اللہ اور اس کے
وغضب رسولہ رضینا باللہ	رسول کے غضب سے۔ ہم اللہ کے رب ہونے پر
ربا وبالاسلام دینا	اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم
وبمحمد نبیا	کے نبی ہونے پر راضی اور خوش ہیں۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

والذی نفس محمد بیدہ لو بدا	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے
لکم موسیٰ فاتبعتموہ وترکتمونی	اگر موسیٰ علیہ السلام نمودار ہوتے اور تم مجھے چھوڑ کر
لضللتم عن سواء السبیل ولو کان	ان کی اتباع کرتے تو بھی سیدھے راستہ سے
حیا وادرک نبوتی لا تبعنی[1]	گمراہ ہو جاتے اور اگر وہ زندہ ہوتے اور میری
	نبوت کا زمانہ پاتے تو وہ بھی میری اتباع کرتے۔

اس روایت سے بظاہر اخذ و استفادہ کی عمومی ممانعت معلوم ہوتی ہے لیکن جن لوگوں کی نظر دوسری احادیث پر بھی ہے وہ اس کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں کہ اس حدیث کا مقصد حالات و تقاضا کے بدلنے سے احکام سے جو تبدیلی ہوتی ہے اس کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے نہ کہ اخذ و استفادہ سے ممانعت۔

---

[1] دارمی از مشکوٰۃ ص ۲۹

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں حالات و مزاج کا جو فرق
شریعت محمدیہ ہی واجب العمل تھی، اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا،

تعامل

فقہ اسلامی کا نواں ماخذ تعامل ہے

صحابہ کا عمل حجت ہے | اس سے مراد رسول اللہؐ کے "اصحاب" کا عمل درآمد ہے، فقہا نے تد
مرحلہ میں اس سے بہت استفادہ کیا ہے، اور اس کو "سنت" میں شمار کرکے بطور ماخذ اسا
در اصل یہ وہ حضرات ہیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے
تعلیم و تربیت حاصل کی تھی، آپ کی فکری و عملی زندگی کو اپنی زندگی میں رچایا اور بسا
آپ سے سنا یا آپ کو کرتے دیکھا، بعینہ اسی طرح اس پر عمل پیرا ہوئے، اگر کہیں اشتبا
سے پوچھ کر تشفی کرلی ان میں کچھ اصحاب ایسے بھی تھے جو قانونی معاملات میں خصوصیت سے
بارے میں رسول اللہؐ کی زبان مبارک کی شہادت بھی موجود ہے۔

ایسی حالت میں ان سے بڑھکر مزاج شناس نبوت اور کون ہو سکتا ہے
اور عمل کے مقابلہ میں کسی کی رائے اور عمل کو اہمیت نہیں دیجا سکتی اور مجموعی
قول اور فعل کو معیار تسلیم کرنے میں کسی اصول کلی پر زد نہیں پڑتی بلکہ یہ تو عین مقت
ہے، کیونکہ نبوت اس پر بھی مامور ہوتی ہے کہ وہ ایک ایسی جماعت تیار کردے جو
سے اس کی تعلیمات کی محافظ اور اس کے مقاصد کی تکمیل کرسکے، یہ ظاہر ہے کہ نبو
اور آیندہ پیش آنے والے واقعات کی تعلیم نہیں دے سکتا، البتہ اس کے ارشا
اصول کلیہ ہوتے ہیں جن سے نئے مسائل کا استنباط کیا جا سکتا ہے، نبی کی تیار کر
مزاج شناس نبوت ہوتی ہے، اس لیے وہی اس فرض کو انجام دے سکتی ہے،

تعامل صحابہ کو حجت تسلیم کیا ہے،

آیات و احادیث سے اس کا ثبوت | درج ذیل آیت سے صحابہؓ کی اہمیت پر روشنی پڑتی ہے،

والسابقون الاولون من المهاجرین	مہاجرین و انصار میں جو لوگ سبقت کرنے والے
والانصار والذین اتبعوھم	سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے
باحسان رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ	راست بازی کے ساتھ ان کی اتباع کی ان سے اللہ
(۹/۱۰۰)	راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اس آیت میں "رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ" کا جملہ صحابہ کے تعامل کو ماخذ قرار دینے کے بارے میں نہایت اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے، بالخصوص "ورضوا عنہ" جو الٰہی پالیسی کے ساتھ ان کے تعامل کی ہم آہنگی پر دلالت کرتا ہے،

ان احادیث سے بھی "تعامل" کے ماخذ ہونے پر روشنی پڑتی ہے،

ما من نبی بعثہ اللہ فی امۃ قبلی	جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مجھ سے پہلے بھیجا
الا کان لہ فی امتہ حواریون	سب کی امت میں اس کے مددگار اور صحابہ
واصحاب یاخذون بسنتہ و	تھے جو نبی کی سنت کو حاصل کرتے اور اس کے
یقتدون بامرہ[1]	حکم کی اقتدا کرتے تھے۔

دوسری حدیث میں ہے:

فعلیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء	تم لوگ میری سنت اور خلفاء راشدین کی
الراشدین المھدیین تمسکوا	سنت کو لازم پکڑو مضبوطی کے ساتھ اس سے
بھا وعضوا علیھا بالنواجذ[2]	چمٹے رہو اور اس سے رہبری حاصل کرو،

---

[1] مسلم از مشکوٰۃ ص ۳۰ [2] ابوداؤد و ترمذی

ایک اور روایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور سند اور معیار صحابہ کا ! پیش کیا ہے

ما انا علیہ واصحابی [1]

جس راستہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں وہی حق ہے

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ایک موقع پر فرمایا

اولئک اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کانوا افضل ھذہ الامۃ ابرھا قلوبا واعمقھا علما واقلھا تکلفا اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ ولاقامۃ دینہ فاعرفوا لھم فضلھم واتبعوھم علی اثرھم وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقھم وسیرھم فانہم کانوا علی الھدی المستقیم [2]

یہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ہیں جو دل کی نیکی، علم کی گہرائی، بے تکلف کی کمی میں اس امت کے افضل ترین لوگوں میں ہیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کے قائم کرنے کیلئے منتخب فرمایا ہے، تم لوگ ان کے فضل کو پہچانو ان کے نقش قدم کی پیروی کرو اور ان کے اخلاق اور ان کی سیرت کو جہاں تک بس چلے مضبوطی کے ساتھ پکڑو، وہی لوگ ہدایت مستقیم پر ہیں،

صحابہ کی زندگی پر حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کے اس ہمہ گیر اور عمیق تبصرہ کے بعد اور کسی کی ضرورت نہیں باقی رہتی ہے ابرھا قلوبا اعمقھا علما اقلھا تکلفا (زندگی میں سادگی پاکیزگی علم میں گہرائی) یہ وہ اوصاف ہیں کہ جن سے قوموں کی تاریخ بنتی ہے۔

تعامل کے بارے میں فقہا کا مسلک تعامل کے بارے میں فقہا کا یہ مسلک اصول فقہ میں مذکو

یجب اجماعا فیما شاع فسکتوا

جو بات تمام صحابہ میں عام طور شائع ہوا جس کو

---

[1] ترمذی [2] رزین از مشکوٰۃ ص ۲۹

مسلمین ولا یجب اجماعا فیما ثبت — انھوں نے ان لیا ہو اسکی اتباع واجب ہے

الخلاف بینھم — اور جس میں کچھ اختلاف ہو اس میں واجب نہیں ہے

اس لیے کہ صحابہ میں جو بات عمومی حیثیت سے پائی جائے گی اس کی حیثیت اجماع کی ہو گی، [1]

اور جب اجماع ہر دور کا حجت ہوتا ہے تو صحابہ کا اجماع بدرجۂ اولیٰ حجت ہوگا۔

فقہاء نے شیخین (حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ) کے کسی بات میں متفق ہونے کو بھی اصولی حیثیت دی ہے اور اس کا اتباع ضروری قرار دیا ہے،

کل ما ثبت فیہ اتفاق الشیخین — ہر وہ بات جس میں شیخین کا اتفاق ثابت ہو

یجب الاقتداء بہ [2] — اسکی اقتداء واجب ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تدوین قانون میں اشخاص کے انتخاب میں کمیت کے مقابلہ میں کیفیت کا زیادہ لحاظ کیا جاتا ہے یعنی اشخاص کو تولا جاتا ہے، گنا نہیں جاتا ہے،

مسلمہ شخصیتوں کی رائیں

فقہ اسلامی دسواں ماخذ "مسلمہ شخصیتوں کی رائیں" ہیں۔

اس میں اقوال، فتاویٰ، ثالثی، عدالتی فیصلہ، سرکاری وغیر سرکاری ہدایتیں وغیرہ سب داخل ہیں، مگر مرکزی حیثیت صحابہ کی رایوں کو حاصل ہو گی، رسول اللہؐ نے ان کے بارے میں فرمایا ہے:

اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم — میرے صحابی مثل ستاروں کے ہیں ان میں سے

اھتدیتم [3] — جس کی اقتدا کرلو گے ہدایت مل جائے گی۔

فقہاء نے صحابۂ کرام سے اخذ و استنباط کے یہ دلائل بیان کیے ہیں۔

صحابہ کی رایوں کے مستند ہونے کے دلائل	لان اکثر اقوالھم مسموع محضرۃ	ان کے اکثر اقوال زبان رسالت سے سنے ہوئے ہیں اور اگر انھوں نے اجتہا دبھی

---

[1] توضیح و تلویح ج ۲ ص ۱۷ [2] ایضاً [3] رزین

لرسالة وان اجتهد وافرأيهم	کیا ہے تو انکی راے زیادہ صائب ہے کیونکہ
اصوب لانهم شاهدوا موارد	انھوں نے نصوص کے موقع و محل کا براہ راست
النصوص ولتقدمهم في	مشاہدہ کیا ہے۔ دین میں انھیں تقدم
الدين وبركة صحبة النبي	حاصل ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
صلى الله عليه وسلم وكونهم	کی صحبت کی برکت سے فیضیاب ہوئے
في خير القرون[1]	ہیں، ان کا زمانہ خیر القرون کا زمانہ تھا،
لانهم شاهدوا احوال التنزيل	کیونکہ انھوں نے قرآن مجید کے نزول اور
واسرار الشريعة[2]	اسرار شریعت کا مشاہدہ کیا ہے،
ومعرفة اسباب التنزيل[3]	ان کو اسباب نزول کی معرفت حاصل ہے،

ان وجوہ کی بنا پر اگر وہ اپنی رائے سے بھی کوئی بات کہتے ہیں تو وہ دوسروں کے مقابلہ بدرجہا فضیلت اور برتری کی مستحق ہوتی ہے،

فقہانے صحابہ سے اخذ و استنباط کے بارے میں ان کے علم و فضل تقوی و طہارت کے لحاظ ان کے درجے قائم کیے ہیں، اور ان کے بارہ میں رسول اللہ ؐ کی شہادت اور قانونی امور میں خصوصیت کا بھی لحاظ رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ سب انسان یکساں نہیں ہوتے اس لیے سب صحابہ بھی یکساں نہیں تھے، قانونی امور میں ان صحابہ کی رائے زیادہ وزنی ہوگی، جنکی طرف اس عبارت میں اشارہ ہے

الذين افنوا اعمارهم في الصحبة	صحابہ نے رسول اللہ ؐ کی صحبت میں اپنی عمریں
وتخلقوا باخلاق الشريعة	گذاری تھیں اور آپ کے پاکیزہ اخلاق کے رنگ

لہ توضیح وتلویح ج ۲ ۲ے نور الانوار ص ۲۱۷ ۳ے حسامی ص ۸۶

كالخلفاء والازواج المطهرات | میں رنگ گئے تھے، جیسے خلفاء راشدین، ازواج
والعبادلة وانس وحذيفة | مطہرات، عبادلہ (عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، عبد اللہ بن عباسؓ) حضرت انسؓ
ومن في طبقتهم[1] | حضرت حذیفہؓ اور جو ان کے طبقہ میں ہیں

چنانچہ صحابہ کے اقوال کے بارے میں فقہاء کا یہ مسلک ہے،

قول الصحابي فيما يمكن فيه الرأي | صحابی کا وہ قول جس میں قیاس اور رائے کی گنجایش ہے
يلحق بالسنة لغيره[2] | غیر صحابی کے لیے سنت کے حکم میں ہوگا۔

یعنی جن میں قیاس کو دخل نہیں ہے، ان میں ان کی اتباع واجب ہے اور جن میں قیاس چل سکتا ہے، ان میں قیاس کرنے کی گنجایش ہے، چونکہ صحابہ کے اقوال میں اختلاف ہے اس بنا پر امام شافعی ان کی تقلید واجب نہیں کہتے ہیں[3]،

اماموں کا یہ اختلاف اس صورت میں ہے جب کسی معاملہ میں عموم البلوی کی حالت نہ پائی جائے اگر عام ابتلاء کی حالت ہو اور صحابہ کے اقوال اس کے خلاف ہوں تو ان کا قبول کرنا ضروری نہ ہوگا، اس کی دلیل یہ ہے

لا يقبل فيه السنة فلا يقبل | ایسی حالت میں سنت نہ قبول کیجائے اس لیے جو چیز
هو ما يقبل يشبهه به[4] | سنت کی مشابہت کی وجہ قبول کی گئی ہے وہ بدرجہ اولیٰ نہ مقبول ہوگی،

تابعین کے اقوال کے ساتھ فقہاء کا طرز عمل

صحابہؓ کے بعد تابعین کا درجہ ہے، جس پر آیت قرآنی "الذين اتبعوهم باحسان (جنھوں نے نیکی اور خلوص کے ساتھ صحابہ کا اتباع کیا) اور

---

[1] شرح مسلم ص ۱۴۴ [2] ایضاً ص ۱۴۰ [3] نور الانوار وغیرہ [4] توضیح توریح ص ۱۷

حسب ذیل حدیث نبوی شاہد ہے

خیر امتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم [1]	میری امت کا بہترین زمانہ میرا زمانہ ہے پھر وہ جو اسکے بعد ہے پھر وہ جو اس کے بعد ہے۔

اس بناپر فقہاء نے تابعین کے اقوال و آراء سے بھی استفادہ کیا ہے، اور جن تابعین کے فتاوی صحابہ کے زمانہ میں مشہور ہوئے اور تسلیم کیے گئے، جیسے قاضی شریح اور حضرت مسروق وغیرہ، ان کو اخذ و استنباط میں مثل صحابی کے قرار دیا ہے، لیکن صحابہ کے مقابلہ میں تابعین کے اقوال میں وسعت سے کام لیا ہے، اور ان کے قول کے مقابلہ میں قیاس کو ترجیح دی ہے، اور وقت و ضرورت کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے اور ان کے بارہ میں نحن رجال وھم رجال (جیسے ہم ہیں ویسے وہ تھے) کہا گیا ہے،

یہ واضح رہے کہ مذکورۂ بالا عنوان میں رائے کا مفہوم قیاس والی رائے سے وسیع تر ہے، اس میں استحسان استصلاح وغیرہ کی صورتیں اور وقتی وہنگامی رائیں سب داخل ہیں،

عرف و رواج

فقہ اسلامی کا گیارہواں ماخذ عرف و رواج ہے،

عرف و رواج کو فقہ کی نشو ونما میں کافی دخل ہے — یہ نہایت قدیم ماخذ ہے اور تقریباً ہر دور میں پایا جاتا رہا ہے، فقہ اسلامی کے نشو ونما میں اس کو بڑا دخل ہے، عرب اور غیر عرب کے بہت سے عرف و رواج جو الٰہی پالیسی اور اسلام کے بنیادی اصول کے خلاف نہ تھے اور قرآن و سنت کی تصریحات ان کے بارے میں خاموش تھیں، ان کو صحابہ و تابعین نے اور ان کے بعد فقہا نے باقی رہنے دیا اور ترتیب و تدوین کے زمانہ میں وہ فقہ اسلامی کا جزو قرار پائے،

اسلام سے پہلے کی جتنی چیزیں زمانۂ اسلام میں باقی رہیں، ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ سب پہلے کی شریعتوں بالخصوص شریعت ابراہیمی سے ماخوذ اور مستنبط تھیں، نہایت مشکل ہے یہ کیسے

---

[1] بخاری و مسلم از مشکوٰۃ باب مناقب الصحابہ۔

ہو سکتا ہے کہ عرب اور غیر عرب میں کسی دوسری ملت کے معقول رواج کا وجود ہی نہ رہا ہو یا معاشرتی فلاح و بہبود سے متعلق کوئی عملد رآمد اور عرف پایا ہی نہ جاتا رہا ہو، مثلاً دیت (خون کا معاوضہ) سو اونٹ رائج تھی جس کو عبد المطلب نے (رسول اکرمؐ کے دادا) نے ایک کاہنہ عورت کی تجویز پر قبول کیا تھا[1]، وہ صحابہ و تابعین کے زمانہ میں بدستور رائج رہی اور فقہ میں اس باب کے پورے مسائل اسی پر مبنی ہیں،

حضرت شاہ ولی اللہ نے بھی عرب جاہلی کے بعض رسم و رواج کو اسلامی شریعت کا تشریعی مادہ قرار دیا ہے ھی مادۃ تشریعۃ[2]۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا ہے:

ونھی عن الرسوم الفاسدۃ و امر بالصالحۃ[3]	رسول اللہؐ نے فاسد رسموں سے منع کیا اور اچھی رسموں کے قبول کرنے کا حکم دیا۔

اصل یہ ہے کہ وہ تمام عرف و رواج جو الٰہی پالیسی (منافع کا حصول اور نفرت کا دفعیہ) کے موافق تھے، وہ سب قبول کیے گئے، خواہ وہ عرب میں رائج رہے ہوں یا غیر عرب میں یا ان کا تعلق ماقبل کی شریعتوں سے تھا یا نہ تھا،

عرف و رواج کی تعریف فقہاء نے عرف و رواج کی یہ تعریف کی ہے،

عادۃ جمھور قوم فی قول او عمل	قول یا عمل میں جمہور کی عادت کا نام عرف ہے

عرف کا دوسرا نام تعامل اور عادت بھی ہے۔

التعامل وھو عادۃ الناس فی المعاملات من البیع والشراء وغیرھما[4]	خرید و فروخت اور دوسرے معاملات میں لوگوں کی عادت کا نام "تعامل" ہے۔

---

[1] امام ابوحنیفہ کی تدوین قانون اسلامی ص ۲۲ [2] حجۃ اللہ البالغہ ص ۲۲۳ [3] ایضاً ص ۴۲، [4]

عادت کی تعریف میں یہ منقول ہے:

العادة عبارة عما يستقر فی النفوس من الامور المتكررة المقبولة عند الطباع السليمة[1]

عادت اس کو کہتے ہیں کہ جو باتیں طبیعت سلیمہ کے نزدیک پسندیدہ ہیں اور انہیں بار بار کرنے سے انسان کے اندر وہ جگہ پکڑ لیں۔

فقہاء کا قول عادت کے بارے میں یہ ہے:

العادة تجعل حكماً اذا لم يوجد التصريح بخلافه فاما عند وجود التصريح بخلافه يسقط اعتبارها[2]

اگر قرآن اور سنت میں اس کے خلاف تصریح نہ ہو تو "عادت" ہی کو حکم (فیصلہ کرنے والا) بنایا جائیگا اور اگر خلاف تصریح موجود ہو تو عادت کا اعتبار نہیں کیا جائیگا۔

قرآن و سنت سے ثبوت قرآن حکیم میں اس کی بنیاد درج ذیل آیت بن سکتی ہے:

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِينَ (۱۹۹)

عفو و درگذر سے کام لیجئے عرف کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے نہ الجھئے۔

مفسرین کے نزدیک تمام عقلی و رواجی اچھی باتیں داخل ہیں اس لیے اس عموم میں مذکورہ اصطلاحی عرف بھی داخل سمجھا جائے گا، ذیل کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

انتم اعلم بامور دنياكم

تم لوگ اپنے دنیوی امور سے زیادہ واقف ہو،

ایک موقع پر حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا:

ما رآه المسلمون حسنا فهو عند الله حسن وما رآه المسلمون قبيحا

جس کو جمہور مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے، اور جس کو وہ برا سمجھیں وہ اللہ

---

[1] الاشباہ والنظائر ص ۹۳ [2] شرح سیر کبیر ج ۱ ص ۱۹۸

فھو عند اللہ قبیح[1]   کے نزدیک بھی برا ہے۔

مگر یہ ظاہر ہے کہ یہ عام اصول انھیں باتوں میں نافذ ہوگا جو اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف نہ ہوں اور جو اس کے خلاف ہوں گی ان میں اس کو نہ مانا جائے گا۔

فقہا کے نزدیک عرف کا مقام فقہاء نے عرف و رواج کو نہایت اونچا درجہ دیا ہے، مثلاً وہ کہتے ہیں:

الثابت بالعرف کالثابت بالنص[2]	جو چیز عرف سے ثابت ہے وہ نص سے ثابت کے مثل ہے،
الثابت بالعرف ثابت بدلیل شرعی[3]	جو عرف سے ثابت ہے وہ شریعت میں دلیل شرعی سے ثابت سمجھا جائے گا۔

فقہا نے بہت سے مسائل میں عرف و رواج ہی کو مدار بناکر حکم جاری کیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

ان یفتی علی عرف اھل زمانہ	فتویٰ اہل زمانہ کے عرف کے مطابق دیا جائے
وان خالف زمان المتقدمین[4]	خواہ وہ متقدمین کے زمانہ کے خلاف ہو،

عرف کے اعتبار کیلئے ضروری نہیں ہے کہ اس پر ہر ہر فرد کا عمل ہو، بلکہ غالب اکثریت کا عمل کافی ہے۔ ایسی صورت میں بھی مفتی اور قاضی کو عرف کے خلاف فتویٰ دینا اور فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے:

انما تعتبر العادۃ اذا اطردت وغلبت[5]	جب عادت بڑھ جائے اور غالب آجائے تو اس وقت اسکا اعتبار کیا جائے گا۔

عرف کی دو قسمیں فقہاء نے عرف کی دو قسمیں بیان کی ہیں (۱) عرف خاص اور (۲) عرف عام، عرف خاص، جو کسی خاص علاقہ یا پیشہ اور کاروباری طبقہ میں رائج ہو، عرف عام، جو عمومی حیثیت سے رائج ہو کسی خاص طبقہ و علاقہ کے ساتھ مخصوص نہ ہو۔

---

[1] مجموعہ رسائل ابن عابدین ص ۱۲۰ [2] شرح سیر کبیر ج ۱ ص ۱۱۵ [3] مجموعہ رسائل عابدین ص ۱۱۵ [4] رد المختار [5] الاشباہ والنظائر ص ۹۵ [6] مجموعہ ص ۱۱۵

عرف کے اعتبار کرنے کی تفصیل | مگر یہ عرف اسی صورت میں معتبر مانا جائے گا جب

(۱) عرف قرآن وسنت کے حکم کے خلاف نہ ہو کہ عرف پر عمل کی صورت میں قرآن وسنت کا ترک لازم آئے۔ ایسی صورت میں تو عرف پر عمل نہ کیا جائے گا، بلکہ قرآن وسنت ہی پر عمل ہوگا۔

البتہ جو صورت عرف ورواج ہی پر مبنی ہو تو عرف بدلنے سے حکم بھی بدل جائے گا لیکن اس وقت بھی عرف کی یہ حیثیت نہ ہوگی کہ وہ قرآن وحدیث کے فیصلہ کو بدل دے بلکہ اس صورت میں یہ کہا جائیگا کہ سابق حکم عرف پر مبنی ہونے کیوجہ سے اتنی ہی مدت تک کے لیے تھا جبتک وہ عرف باقی ہے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض چیزوں کو وزنی (وزن سے بیچی والی چیزیں) شمار کرکے اسکا حکم بیان فرمایا تھا مگراب وہ کیلی (ناپ سے بیچی جانے والی چیزیں) بن گئی ہیں، یا آپ نے کیلی ہونے کی وجہ سے ان کا حکم بیان فرمایا تھا اور اب وہ وزنی بن گئی ہیں تو ان چیزوں میں عرف کی وجہ سے حکم کی تبدیلی ضروری ہوگی۔

(۲) عرف قرآن وسنت کے عام حکم کے خلاف نہ ہو بلکہ حکم کے کسی خاص جزء میں مخالفت ہوتی ہو تو ایسی صورت میں عام حکم سے اس خاص کو عرف کی بنا پر مستثنیٰ قرار دیں گے، مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر اس چیز کی خرید وفروخت کرنا ناجائز قرار دیا ہے، جو بیچنے والے کے پاس موجود نہ ہو، لیکن موچی سے جو معاہدہ جوتے کا کیا جاتا ہے۔ اس میں جوتا موچی کے پاس موجود نہیں ہوتا ہے، بلکہ بعد میں وہ بنا کر دیتا ہے۔ فقہاء نے عرف کی بنا پر اس صورت کو جائز قرار دیا ہے۔

(۳) عرف اگر قیاسی حکم کے خلاف ہو تو قیاس چھوڑ کر عرف پر عمل کیا جائے گا۔ خواہ عرف خاص ہو یا عام [۱]۔

(۴) جو احکام محض عرف پر مبنی ہوں وہ عرف کے بدلنے سے بدل جائیں گے، کیونکہ ان کی مدت عرف کی بقا تک ہی تھی۔

---

[۱] ملاحظہ ہو مجموعہ رسائل عابدین ص ۱۱۶

اماموں کے اختلافی مسائل میں بڑی حد تک عرف ہی کو دخل ہے۔ ایک زمانہ کا عرف کچھ
بعد میں وہ بدل گیا، یا ایک جگہ کا عرف کچھ تھا اور دوسری جگہ کچھ، ان صورتوں میں احکام
اختلاف ناگزیر ہے، ورنہ فقہ کو اسلام کی بنیادی پالیسی کے ساتھ ہم آہنگ ثابت کرنا مشکل ہو جائیگا،

ن کے اعتبار کے لیے خالص دنیوی قانون کی مقرر کردہ شرطیں

لیکن عمومی حیثیت سے ہر عرف و رواج کو قانونی حیثیت دیدینا قطعاً جائز نہیں ہے، ورنہ قرآن وسنت کے حدود و قیود کی کوئی
حیثیت باقی رہے گی، خالص دنیوی قانون نے بھی مطلقاً رسم و رواج کو ماخذ نہیں قرار دیا ہے،
لکہ اس کے حدود و قیود اور شرائط مقرر کی ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

(۱) معقولیت، رسم و رواج کا معقول ہونا ضروری ہے، اسی بنا پر قانونی مقولہ ہے
کہ رسم بد قابل منسوخی ہے، اور رسم کو اقتدار مطلق حاصل نہیں ہے، بلکہ یہ اقتدار انصاف اور
فاہ عام کے ساتھ مشروط ہے یعنی یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے حق میں انصاف ہوتا
ہے، اور عوام کو فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں۔

(۲) واجبی رائے، رسم و رواج کو اپنے عقیدہ میں لوگ واجب اور ضروری سمجھتے ہوں
گر محض فعل اختیاری جیسی حیثیت ہو گی تو اس کا اعتبار نہ ہوگا۔

(۳) رسم و رواج کا قانون موضوعہ کے مطابق ہونا چاہیے یعنی پارلیمنٹ کے وضع کردہ
قانون اور رسم میں موافقت ہونا ضروری ہے یا کم سے کم اس کے مخالف اور مغائر نہ ہونا چاہیے،

(۴) مدت مدید۔ زمانۂ دراز تک جاری رہنا ضروری ہے، پہلے تو یہ شرط تھی کہ رسم اتنی
پرانی ہو کہ اس کے قائم ہونے کا زمانہ لوگوں کو یاد نہ رہا ہو، لیکن بعد میں اس قدر تخفیف کر دیگئی
کہ معین رواج اور اس پر عوام کا عمل درآمد ثابت ہو جانا کفایت کرتا ہے، لیکن رسم خاص کو مؤثر
بنانے کے لیے اب بھی مدت اجراء کا ثابت کرنا ضروری قرار دیا جاتا ہے (مذکورہ مدت کی قید کلیسائی قانون نے
رومی قانون سے لیا تھا)

(۵) مطابقت قانون عام۔ اگر رسم ورواج پرانا نہ ہو تو اس میں اور قانون عام میں مغایرت نہیں ہونی چاہیے، اس شرط کا تعلق رسوم جدید سے ہے،[1]

لیکن فقہاء نے غالباً عرف ورواج کے رائج ہونے کی مدت کو زیادہ اہمیت نہیں دی ہے، بلکہ جس چیز کو لوگوں میں رواج کی پوزیشن حاصل ہو جائے، اس پر اس لفظ کا اطلاق ہوگا اور اس کے احکام جاری ہوں گے، اس کیلئے نہ یہ ضروری ہے کہ وہ صحابۂ کرام کے زمانہ سے رائج ہو اور نہ اس کا اعتبار ہے کہ چند آدمیوں کی محدود جماعت کا اس پر عمل ہو، فقہ کی کتابوں میں ہے

لاعبرۃ بالعرف الطاری[2] عرف طاری کا اعتبار نہیں ہے

ایک ملک یا ایک مقام کے عرف ورواج پر دوسرے ملک اور مقام والوں کو عمل کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ وہاں کے عرف ورواج کی مناسبت سے وہاں والوں کے لیے دوسرے احکام ہوں گے۔

عرف ورواج کی چند اور صورتیں عرف شرع اور عرف اہل زمانہ میں جب تعارض (ٹکراؤ) ہو تو عرف اہل زمانہ کا اعتبار کیا جائے گا، اور عرف شرع کا نہ کیا جائے گا۔ فقہا نے یمین (قسم) کے باب میں بالخصوص اس تقدم کو زیادہ اہمیت دی ہے، مثلاً کسی شخص نے قسم کھائی کہ فرش یا دری پر نہ بیٹھے گا، لیکن اس کے بعد وہ زمین پر بیٹھا تو اس صورت میں وہ حانث (قسم توڑنے والا) نہ قرار پائے گا، حالانکہ قرآن کریم (عرف شرع) میں زمین کو فرش کہا گیا ہے، الذی جعل لکم الارض فراشاً (بقرہ)۔ اسی طرح کسی نے گوشت کھانے کی قسم کھائی، لیکن مچھلی کھالی تو باوجود اس کے کہ قرآن حکیم (عرف شرع) میں مچھلی کو گوشت کہا گیا ہے، لتاکلوا منہ لحماطریا (النحل) لیکن عرف کی وجہ سے وہ حانث (قسم توڑنے والا) قرار پائے گا، فقہا نے اس قاعدۂ کلیہ سے

[1] اصول قانون ج ۱ ص ۲۳۸ تا ۲۵۲ مصنفہ سرجان سامنڈ [2] ملاحظہ ہو الاشباہ والنظائر ص ۰،

چند مستثنیات بھی بیان کی ہیں، جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے[1]۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ جو رواج اور عادتیں لوگوں میں ہمیشہ سے رائج ہیں، فقہاء نے ان کی دو قسمیں کی ہیں: (۱) اس کے جواز اور عدم جواز کے بارے میں شرعی دلیل موجود ہو، (۲) شرعی دلیل تو موجود نہیں ہے، لیکن وہ عام طور پر مروج ہے، پہلی صورت کا حکم ظاہر ہے کہ دیگر امور شرعیہ کی طرح اسکے جواز و عدم جواز کا فیصلہ شرعی حکم ہی سے ہوگا، محض عادت اور رواج کی وجہ سے بری چیز اچھی نہ قرار پائے گی، اور نہ اچھی چیز بری بنے گی، البتہ دوسری قسم میں یہ گنجایش ہے کہ کبھی تو اس پر عمل درآمد باقی رکھا جاتا ہے، اور کبھی ختم کر دیا جاتا ہے، فقہا نے اسکی کئی شکلیں بیان کی ہیں، جن کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں دیکھنی چاہیے[2]۔

(باقی)

---

[1] الاشباہ والنظائر ص ۔ [2] الموافقات وغیرہ

مسلمانوں کے ہندسی ادب کی ثروت

از

جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم اے، ایل ایل بی ۔ پی ایچ ڈی رجسٹرار امتحانات عربی و فارسی اتر پردیش

اسلام کی بنیادی تعلیم اور حصول علم کی ترغیب

اسلام کی بنیادی تعلیم "توحید ربوبیت" ہے۔ اسی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیشمار پیغمبروں کو مبعوث فرمایا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُوْلٍ	اور نہیں بھیجا ہم نے تجھ سے پہلے کوئی رسول
اِلَّا نُوْحِيْ اِلَيْهِ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا	مگر اس کو یہی حکم بھیجا کہ بات یوں ہے کہ کسی کی
اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (انبیاء)	بندگی نہیں سوائے میرے سو میری بندگی کرو۔

اور یہی پیغام لیکر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ	اے لوگو! بندگی کرو اپنے رب کی جس نے
الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِيْنَ مِنْ	پیدا کیا تم کو اور ان کو جو تم سے پہلے تھے،
قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ (بقرہ)	تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے:

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ	اور معبود تم سب کا ایک ہی معبود ہے، کوئی معبود
اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ (بقرہ)	نہیں اسکے سوا، بڑا مہربان ہے نہایت رحم والا۔

قرآن اس "توحید ربوبیت" کو ایک تکوینی حقیقت ہی بتا کر نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اپنے متبعین کو ایجابی طور

حکم دیتا ہے کہ وہ غیر اللہ کی عبادت سے اپنے کو بچائیں

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْا اِلَّا اِيَّاهُ (بنی اسرائیل) اور حکم کر چکا تیرا رب کہ نہ پوجو اس کے سوا،

وہ کسی طرح اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ غیر اللہ کے سامنے سر جھکائیں، یہ ایسا جرم ہے جو ناقابل عفو ہے،

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ	بیشک اللہ نہیں بخشتا ہے اس کو جو اس کا شریک
وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَاۗءُ	کرے کسی کو اور بخشتا ہے اس کے سوا جس کو چاہے
وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ	اور جس نے شریک ٹھہرایا اللہ کا، وہ
ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا (نساء)	بہک کر دور جا پڑا۔

یہ "توحید ربوبیت" اسلام کی پوری تعلیم کا سنگ بنیاد ہے اور یہی "توحید ربوبیت" اسلامی ثقافت اور اسلامک کلچر کا اصل الاصول ہے: "یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں"۔ بالفاظ دیگر اللہ رب العزۃ کے سوا انسان کا کوئی آقا نہیں بلکہ سب اس کے محکوم ہیں۔ کائنات میں اشرف المخلوقات ہونے کا یہ احساس اس کی اخلاقی بلندی اور خودی و خودداری کا ضامن ہے۔ دنیا کی ہر چیز اس کے واسطے پیدا کی گئی،

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي	وہی ہے جس نے پیدا کیا تمھارے واسطے
الْاَرْضِ جَمِيْعًا (بقرہ)	جو کچھ زمین میں ہے سب،

اور انسان صرف خالق کائنات کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے:۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا	اور میں نے جو بنائے جن اور آدمی سو
لِيَعْبُدُوْنِ (ذاریات)	اپنی بندگی کو۔

اس کا منطقی نتیجہ یہی تھا کہ پیروانِ اسلام کائنات کے سامنے بھکاری کی حیثیت سے نہیں بلکہ شکاری کی حیثیت سے جائیں اور کائنات کی ظاہر و پوشیدہ قوتوں کو قابو میں کر کے اپنے مقصد کے مطابق استعمال کریں۔

اسی کا نام تسخیر کائنات ہے جس کے لیے قرآن بار بار ہمت افزائی کرتا ہے:

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے کام میں لگائے
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ	تمھارے لیے جو کچھ ہے آسمان اور زمین میں اور
نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّبَاطِنَۃً (لقمان)	پوری کر دیں تم پر اپنی نعمتیں کھلی اور چھپی۔

دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

اَللّٰہُ الَّذِیْ سَخَّرَ لَکُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِیَ	اللہ وہ ہے جس نے بس میں کر دیا تمھارے دریا کو
الْفُلْکُ فِیْہِ بِاَمْرِہٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ	کہ چلیں اس میں جہاز اس کے حکم سے اور تاکہ تلاش
فَضْلِہٖ وَلَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ۔ وَسَخَّرَ	کرو اس کے فضل سے اور تاکہ تم حق مانو اور
لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ	کام میں لگا دیا تمھارے جو کچھ ہے آسمانوں
جَمِیْعًا مِّنْہُ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ	میں اور زمین میں سب کو اپنی طرف سے، اس میں
لِّقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ (جاثیہ)	نشانیاں ہیں ان لوگوں کے واسطے جو دھیان کرتے ہیں،

لیکن کائنات کی زندہ اور بیجان قوتوں کی تسخیر ان سے براہ راست کشتی لڑ کر نہیں کی جا سکتی، ہاتھی کو اٹھا کر نہیں پٹکا جا سکتا بلکہ انکس کے ذریعے قابو میں لایا جا سکتا ہے، دریا کا زور ہاتھوں سے پانی کو جھکولے دے کر نہیں توڑا جا سکتا، بلکہ ٹربائن کے ذریعہ اس کی توانائی کو بجلی کی شکل میں ذخیرہ کیا جا سکتا ہے، پہاڑ کو گھونسوں سے نہیں توڑا جا سکتا، بلکہ ڈائنامیٹ کے ذریعے اس میں شگاف بلکہ سرنگیں کھودی جا سکتی ہیں، سمندر کی لہروں کے سامنے نہیں ٹھہرا جا سکتا بلکہ کروز راور سب میرین کے ذریعے طوفانی سمندروں میں بھی بےخطر سفر کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب کیا ہے، صرف تسخیر ارض و سموات اور کائنات کی پوشیدہ قوتوں کی واقفیت۔ اسی کا نام طبیعیاتی علوم اور نیچرل سائنس ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں نے دینی علوم کے ساتھ جو آنے والی زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہیں

طبیعیاتی علوم کے حصول کو بھی ضروری سمجھا، ان کے رسول کا حکم تھا

اطلبوا العلم ولوکان بالصین — علم کو تلاش کرو خواہ وہ چین میں ملے،

ظاہر ہے چین اور جاپان میں حاصل ہونے والا "علم" اللہ اور اس کے رسول کی معرفت کا "علم" تو ہوگا نہیں، اس کے لیے تو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کافی تھی، بلکہ یہ صرف دنیوی علم ہی ہو سکتا ہے اور ممکنہ غلط فہمیوں سے تحفظ کے لیے پیغمبر اسلامؐ نے یہ پہلے ہی بتا دیا تھا کہ علم و حکمت میں کسی طرح کا امتیاز نہیں ہو سکتا، وہ مرد مومن کا ورثہ اور اس کی متاع گم گشتہ ہے، جہاں ملے اس کے لے لینے کا حقدار ہے، ترمذی کی حدیث ہے:

کلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن اینما وجدھا — عقل و دانش کی بات مومن کا گنج ہے جہاں بھی

فھو احق بھا — ملے وہ اس کا سب سے زیادہ مستحق ہے،

اپنے رسول کے اس حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے صرف کشورکشائی ہی کے لیے بحر و بر نہیں ناپے، بلکہ انھوں نے علم و حکمت کے موتیوں کی تلاش میں بستیاں اور ویرانے چھان ڈالے،

عرب میں علم و حکمت کی ابتدا عرب کو جس میں اسلام مبعوث ہوا، اپنے علم پر نہیں بلکہ جہل پر ناز تھا، عمرو بن کلثوم فخریہ کہتا ہے:

الا لا یجھلن احد علینا — فنجھل فوق جھل الجاھلینا

بعثت اسلام کے وقت پورے ملک میں کل سترہ آدمی پڑھنا لکھنا جانتے تھے، عربوں کی لغت شاہد ہے کہ وہ نہ کتاب سے واقف تھے نہ تحریر و کتابت سے، حتیٰ کہ پیغمبر اسلام بھی رسمی کتاب کے مفہوم سے نا آشنا تھے، جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے

ما کنت تدری ما الکتب (شوریٰ) — تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب،

ہاں اہل عرب کتاب کے بجائے "کتیبۃ" کو خوب جانتے تھے جس کے معنی لشکر ہیں، مگر خدا کی قدرت

دیکھئے کہ اسی وحشیانہ لفظ سے ان کے یہاں وہ لفظ بنا جو تہذیب ثقافت کی کلید ہے، یعنی "کتاب" چنانچہ قاضی بیضاوی نے کتاب کے اشتقاق کے بارے میں لکھا ہے: "واصل الکتب الجمع ومنہ الکتیبۃ"

صحرانشین عربوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ اس نے ان کے اندر ان ہی میں سے ایک رسول علم و حکمت کی تعلیم کے لیے مبعوث فرمایا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ وَیُعَلِّمُھُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ (آل عمران)

اللہ نے احسان کیا ایمان والوں پر جو بھیجا ان میں رسول ان ہی میں کا، پڑھتا ہے ان پر آیتیں اس کی، اور پاک کرتا ہے ان کو یعنی شرک وغیرہ سے اور سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور کام کی بات،

اسی برکت عظمیٰ کے طفیل میں وہ کتاب و سنت اور علم و حکمت سے آشنا ہوئے اور پھر وہ زمانہ آیا کہ اپنی سعی پیہم سے متمدن دنیا کے استاد قرار پائے، اسلام نے حصول علم کے ساتھ تحریر و کتابت کے سیکھنے پر بھی زیادہ زور دیا ہے اور اپنے متبعین کو ایجابی طور پر حکم دیا کہ وہ اپنی عملی زندگی میں "لکھنے" سے کام لیں،

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَایَنْتُمْ بِدَیْنٍ اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی فَاکْتُبُوْہُ وَلْیَکْتُبْ بَّیْنَکُمْ کَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ

اے ایمان والو جب تم آپس میں معاملہ کرو ادھار کا کسی وقت مقررہ تک تو اس کو لکھ لیا کرو اور چاہیے کہ لکھ دے تمہارے درمیان کوئی لکھنے والا (البقرۃ)

اس طرح نوشت و خواند مسلمانوں کا ایک دینی فریضہ بن گیا، اس میں مرد و عورت، شریف و وضیع اور امیر و غریب کا کوئی امتیاز نہ تھا، اس کا یہ نتیجہ تھا کہ اسلامی معاشرے میں تعلیم اور نوشت و خواند عام ہوگئی، حالانکہ اقوام قدیمہ نے عموماً تعلیم کو صرف مخصوص طبقات میں محدود کر دیا تھا، اور دوسرے طبقات کو اس سے محروم قرار دیا تھا، لیکن اسلام نے اللہ کی اس نعمت کی تقسیم میں کسی بخل کو روا نہ رکھا،

مسلمانوں میں جو پہلی کتاب مدون ہوئی وہ "اللہ کی کتاب" تھی، قرآن مجید عہد رسالت
میں مرتب ہو گیا تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں کتابی صورت میں مدون ہوا، اور
عہد عثمان میں اس کی باضابطہ نقول بلاد اسلامیہ میں بھیجی گئیں، اس کے بعد شمع رسالت کے پروانوں
نے اپنے ہادی و رہنما کے اقوال و اعمال کو قلمبند کیا، حدیث کے ان قدیم مجموعوں میں حضرت
انس بن مالک، عبداللہ بن عمرو بن عاص، ابوہریرہ، عبداللہ بن عباس اور علی بن ابی طالب
رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مجموعے زیادہ مشہور ہیں۔

دوسرے علوم میں سب سے پہلے علم تاریخ کی کتابیں لکھی گئیں، حضرت امیر معاویہؓ کو تاریخ سے بہت زیادہ
دلچسپی تھی، انھوں نے مشہور مورخ عبید بن شریہ کو یمن سے بلا کر تاریخ کی کتابیں لکھوائیں[1]، دوسرے
مشہور مورخین صحار العبدی، عوانہ بن الحکم اور حماد وغیرہ تھے، زیاد بن ابیہ نے جو امیر معاویہؓ
کے زمانے میں عراق کا گورنر تھا، اپنے بیٹے کے لیے ایک کتاب "مثالب العرب" لکھی[2]، اسی زمانہ
میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اشارے سے ابوالاسود دؤلی نے علم نحو مرتب کرنا شروع کیا[3]،
دوسری صدی ہجری میں علم کلام کی بنیاد پڑی، اس کے قدیم ترین نمایندے واصل بن عطاء
اور عمرو بن عبید ہیں، وہ دونوں کثیر التصانیف تھے[4]۔

طبیعیاتی علوم کا آغاز ابھی پہلی صدی کی تین چوتھائی بھی نہ گزری تھی کہ دوسری زبانوں سے طبیعیاتی
علوم کے ترجمے بھی عربی میں ہونا شروع ہو گئے، اور سب سے پہلے خالد بن یزید نے مصر سے یونانی حکماء کو
بلا کر کیمیا اور طب و نجوم کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرائیں، ابن الندیم کہتا ہے:

کان خالد بن یزید بن معاویہ	خالد بن یزید بن معاویہ "مروانی خاندان کا
یسمّی حکیم آل مروان وکان فاضلاً	فلسفی" کہلاتا تھا، وہ خود فاضل تھا اور

---

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۱۳۲ [2] ایضاً ص ۱۳۱ [3] ایضاً ص ۶۰ [4] ایضاً تکملہ ص ۱

فی نفسه وله همة ومحبة للعلوم	اسے علم و حکمت کی ترقی سے شوق تھا، اسے کیمیا
خطر بباله الصنعة فامر باحضار	کا شوق پیدا ہو گیا، چنانچہ اس نے یونانی فلسفہ
جماعة من فلاسفة اليونانيين	کی ایک جماعت کو جو مصر میں رہتی تھی اور عربی
فمن کان ینزل مدینة مصر وقد	زبان میں مہارت رکھتی تھی حاضر کرنے کا حکم دیا
تفصح بالعربية وامرهم بنقل	اور انھیں یونانی و قبطی زبانوں سے عربی میں کیمیا
الکتب فی الصنعة من اللسان	کی کتابیں ترجمہ کرنے پر مامور کیا، اور یہ
الیونانی والقبطی الی العربی	اسلامی تاریخ میں ایک زبان سے
وهذا اول نقل کان فی الاسلام	دوسری زبان میں پہلا ترجمہ
من لغة الی لغة[1]	تھا،

اس کے کچھ عرصہ بعد دیوان خراج فارسی اور رومی زبانوں سے عربی میں منتقل ہو گیا، اس سے عربی زبان کی اہمیت بڑھ گئی اور آیندہ ترجمہ کے لیے فضا سازگار ہو گئی۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کا طبیب خاص عبد الملک بن الجبر الکنانی تھا، وہ پہلے اسکندریہ کے مدرسہ فلسفہ و طب کا ناظم اعلیٰ تھا، بعد میں مسلمان ہو گیا[2]، حضرت عمر بن عبد العزیزؓ نے ماسرجویہ یہودی سے اہرن القس کی کتاب "الکناش" کا جو فن طب میں تھی، محض نفع رسانی خلق کے لیے عربی میں ترجمہ کرایا[3]۔

ہشام بن عبد الملک کے زمانہ میں پہلوی زبان کی کچھ کتابوں کا عربی میں ترجمہ ہوا[4]۔

"قاضی صاعد اندلسی نے منطق کے تراجم کے باب میں جو کچھ لکھا ہے، اس سے خیال ہوتا ہے کہ ارسطو کی قاطیغوریاس کا پہلا ترجمہ بھی اموی عہد ہی میں ہوا تھا[5]"

نلینو نے لکھا ہے کہ وٹیکن کی لائبریری میں نجوم کی ایک کتاب کا مخطوطہ موجود ہے جس پر سنہ کتابت ۱۲۵ھ مرقوم ہے

[1] الفہرست لابن الندیم ص ۳۰۸ [2] عیون الانباء ج ۱ ص ۱۱۶ [3] الفہرست ص ۳۰۴ [4] مروج الذہب للمسعودی [5] طبقات الامم ص ۷۷

غرض اموی خلافت کے خاتمہ (۱۳۲ھ) تک جبکہ اسلام کو آئے ہوئے ابھی کل سوا سو برس ہوئے تھے مسلمانوں نے کشورکشائی و ملک گیری کی مشغولیتوں کے باوجود اتنا کام کر لیا جس کی مثال دوسری اقوام کی ثقافتی تاریخ میں ڈھونڈے سے بھی نہ ملے گی۔

عباسی خلافت کی ابتداء اور تصنیف و تالیف کا نیا دور

۱۳۲ھ میں امویوں کے زوال پر عباسی خلافت قائم ہوئی، یہ محض حکمراں خاندانوں کی تبدیلی نہ تھی، بلکہ ایک ثقافتی انقلاب تھا، "عرب کے سوز و درد" پر "عجم کے حسن طبیعت" کا آغاز تھا، چنانچہ علم و حکمت کی سرپرستی میں عباسیوں نے بڑی خدمات انجام دیں۔

پہلا عباسی خلیفہ سفاح ۱۳۶ھ میں مر گیا، اس کے بعد ابوجعفر منصور خلیفہ ہوا، منصور کا عہد علوم و فنون کے فروغ و ترقی کا آغاز ہے، سیوطی نے ذہبی سے نقل کیا ہے:

قال الذهبی فی سنة ثلث و اربعین ومائة شرع علماء الاسلام فی هذا العصر فی تدوین الحدیث والفقه والتفسیر...... وکثر تدوین العلم وتبویبه ودونت کتب العربیة واللغة والتاریخ وایام الناس[1]	ذہبی نے لکھا ہے کہ ۱۴۳ھ میں اس زمانہ کے علمائے اسلام نے حدیث، فقہ اور تفسیر کو مدون کرنا شروع کیا ...... علوم کی تدوین و تبویب کثرت کے ساتھ ہونے لگی اور علوم عربیہ، لغت اور تاریخ و ایام الناس کے موضوعوں پر کتابیں تصنیف ہونے لگیں۔

منصور ہی کے زمانہ میں یونانی طب ۱۴۸ھ میں جندی سابور سے بغداد میں داخل ہوئی اس سال منصور سخت بیمار ہو گیا اور جورجس بن جبرئیل طبیب کو جندی سابور سے بلایا گیا، اس کے علاج سے منصور کو صحت ہوئی اس لیے اس نے جورجس کو اپنا طبیب خاص بنا لیا، جورجس نے منصور کے حکم

[1] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۷۷

سے بہت سی یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے:

جورجس بن جبرئیل کانت له	جورجس بن جبرئیل کو فن طب میں بہت اچھی
خبرة بصناعة الطب......	واقفیت تھی ....
...وقد نقل للمنصور كتباً	اس نے منصور کے واسطے بہت سی
كثيرة من كتب اليونانيين	یونانی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا۔
الى العربى[1]	

اسی زمانہ میں ارسطاطالیسی منطق کا عربی میں باقاعدہ ترجمہ ہوا، قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے

فاما المنطق فاول من اشتهر به	رہی منطق تو سب سے پہلے جو شخص اس حکومت میں
فى هذه الدولة عبد الله بن	اس میں مہارت کے لیے مشہور ہوا وہ عبد اللہ
المقفع الخطيب الفارسى كاتب	ابن المقفع مشہور ایرانی خطیب اور منصور کا
ابى جعفر فانه ترجم كتب ارسطا طاليس	کاتب تھا، اس نے ارسطاطالیسی منطق کی
المنطقية الثلاثة[2]	پہلی تین کتابوں کا ترجمہ کیا۔

عبد اللہ بن المقفع نے منطق کے علاوہ کلیلہ ودمنہ اور خدائی نامہ کا بھی عربی میں ترجمہ کیا، اس کے علاوہ حسب تصریح مسعودی، مانی، ابن دیصان اور مرقیون وغیرہ زنادقہ قدیم کی کتابوں میں بھی پہلوی سے عربی میں ترجمہ کیں۔

حسب تصریح حافظ جلال الدین سیوطی منصور پہلا خلیفہ ہے جس نے نجومیوں کو تقرب بخشا اور نجوم کے احکام پر عمل کیا[3] اس کا منجم خاص نوبخت تھا، جب وہ بڑھاپے میں مستعفی ہوگیا، تو اس کی جگہ اس کا بیٹا ابوسہل نوبخت منجم باشی ہوا[4] نجوم وہیئت کے ساتھ منصور کو جو دلچسپی تھی اسکی

[1] عیون الانباء ج ۱ ص ۱۲۳ [2] طبقات الامم ص ۷۷ [3] تاریخ الخلفاء للسیوطی ص ۱۰۳ [4] اخبار العلماء باخبار الحکماء لابن القفطی ص ۲۶۶

وجہ سے اس فن کے جاننے والے اس کے دربار میں سمٹے چلے آرہے تھے، ۱۵۶ھ میں ایک ہندوستانی پنڈت سدھانت کا نسخہ لیکر اس کی خدمت میں باریاب ہوا، ابن القفطی نے لکھا ہے،

وقد ذكر الحسين بن محمد بن حميد المعروف بابن الآدمي في زيجه الكبير المعروف بنظم العقد انه قدم على خليفة المنصور في سنة ست وخمسين ومائة رجل من الهند القيم بالحساب المعروف بالسندهند في حركات النجوم ..... فامر المنصور بترجمة ذالك الكتاب الى العربية وان يولف منه كتاب تتخذه العرب اصلاً في حركات الكواكب فتولى ذالك محمد بن ابراهيم الفزاري وعمل منه كتابا يسميه المنجمون السندهند الكبير[1]

حسین بن محمد بن حمید نے جو ابن الآدمی کے نام سے مشہور ہے اپنی بڑی زیج میں جس کا نام "نظم العقد" ہے ذکر کیا ہے کہ ۱۵۶ھ میں ایک ہندوستانی پنڈت جو سدھانت (جوتش) میں ید طولیٰ رکھتا تھا، خلیفہ منصور کے دربار میں حاضر ہوا ...... منصور نے اس کتاب (برہم سدھانت) کے عربی میں ترجمہ کرنے کا حکم دیا، اور اس کی بنیاد پر ایک کتاب تصنیف کرنے کا حکم دیا جسے عرب حرکات کواکب کے حساب میں اصل واساس بنائیں، یہ خدمت محمد بن ابراہیم الفزاری کے سپرد ہوئی اور اس نے برہم سدھانت کی مدد سے وہ کتاب مرتب کی جسے ہیئت داں اور جوتشی "السندھند الکبیر" کہتے تھے،

منصور ہی کے زمانے سے علوم طبیعیہ وریاضیہ کا آغاز ہوتا ہے، اس نے قیصر روم سے یونانی علوم کی کتابیں منگائیں جنھیں پڑھ کر مسلمانوں کا شوق اور بڑھ گیا، ابن خلدون نے لکھا ہے،

---

[1] اخبار العلماء باخبار الحکماء لابن القفطی ص ۱۷۷

فبعث ابو جعفر المنصور الی	ابو جعفر منصور نے قیصر روم کو لکھا کہ وہ ریاضی
ملک الروم ان یبعث الیہ کتب	(Mathematics) کی کتابیں
التعالیم مترجمۃ فبعث الیہ	ترجمہ کرا کر بھیجدے، چنانچہ قیصر نے اصول اقلیدس
بکتاب اوقلیدس وبعض کتب	اور طبیعیات کی کچھ کتابیں منصور کو بھیجیں، مسلمانوں
الطبیعیات فقرأ المسلمون واطلعوا	نے انھیں پڑھا اور ان کے مضمون پر مطلع ہوئے
علی ما فیہا وازدادوا حرصاً	اور ان علوم میں جو کتابیں باقی رہ گئی تھیں،
علی الظفر بما بقی منہا[1]	انھیں حاصل کرنے کے لیے ان کا شوق بڑھ گیا،

اس طرح منصور کے زمانہ میں سب سے پہلی مرتبہ اقلیدس کا عربی میں ترجمہ ہوا، اور مسلمان یونانی ہندسہ کے اس لافانی شاہکار سے واقف ہوئے،

منصور کے بعد اس کا بیٹا مہدی خلیفہ ہوا، اس کا عہد حکومت زنادقہ و ملاحدہ کی دار و گیر میں گزرا، ان کی ملحدانہ تحریکات کے توڑنے کے لیے اس نے متکلمین کو بلا کر ان کے رد میں کتابیں لکھوائیں، ارسطاطالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں قاطیغوریاس، باری ارمیناس اور انالوطیقا کا پہلوی سے عبد اللہ بن المقفع نے ترجمہ کیا تھا، مہدی کے زمانہ میں ابو نوح کاتب نصرانی نے دوبارہ ان کا سریانی سے عربی میں ترجمہ کیا، ابو نوح نے ان کے علاوہ ارسطو کی طوبیقا (کتاب الجدل) کا بھی ترجمہ کیا،[2] مہدی نے نجوم و ہیئت کی سرپرستی کو بھی جاری رکھا، اس کا خاص منجم حسب تصریح ابن القفطی توفیل بن توما نصرانی تھا جو الرہا کا رہنے والا تھا،[3]

مہدی کے بعد ۱۶۹ھ میں اس کا بیٹا ہادی خلیفہ ہوا مگر سال ہی بھر بعد مرگیا، اور ۱۷۰ھ میں ہارون الرشید سریر آرائے خلافت ہوا، اس کے عہد حکومت کا نصف اول برامکہ کے عروج و زوال کی داستان

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۲۶ [2] معارف جلد ۴۰ نمبر ۱ (جولائی) ص ۳۴ [3] اخبار العلما باخبار الحکما، ص ۷۷

[برم]کی خاندان کشمیری نژاد تھا، اس کے مورث اعلیٰ بلخ کے مشہور بدھ مٹھ "نوبہار" کے متولی تھے۔ بعد میں [یہ] خاندان مشرف باسلام ہوگیا، علم دوستی و علماء نوازی اس خاندان نے اپنے اسلاف سے ورثہ میں [پا]ئی تھی، اس کی علمی سرپرستی نے بغداد کو "دانشکدۂ مشرق" بنا دیا، ان ہی کے زمانہ سے ہندوستانیات (Indology) کا آغاز ہوتا ہے[۱]، برامکہ نے ہندوستانی طب کو مسلمانوں میں متعارف [ک]رانے پر بھی توجہ کی اور ان کی ترغیب سے ویدک کی کتابیں سنسکرت سے عربی میں ترجمہ ہوئیں[۲]۔

برامکہ ہی کی علم دوستی سے یونانی طب کو دربار بغداد میں ازسرنو بار ملا۔ ۱۷۱ھ میں ہارون [ر]شید درد سر کے عارضہ میں مبتلا ہوا، جب اطبائے دربار مایوس ہوگئے تو یحییٰ بن خالد کے مشورہ سے جورجیس کے بیٹے بخت یشوع کو جندی سابور سے طلب کیا گیا، اس کے علاج سے ہارون اچھا ہوگیا، اس کے صلے میں اس نے بخت یشوع کو رئیس الاطباء مقرر کیا[۳]، اس کے بعد یہ عہدہ اس کے بیٹے جبرئیل کو ملا جو طب کے علاوہ منطق کا بھی جید عالم تھا، جبرئیل نے منطق پر جالینوس کی کتاب البرہان کے ایک بڑے حصے کو تلاش کر کے عربی میں ترجمہ کرایا[۴]، وہ خود بھی طب کے ساتھ منطق میں صاحب تصانیف تھا[۵]، دوسرا مشہور طبیب یوحنا بن ماسویہ تھا۔ جو کامیاب طبیب ہونے کے ساتھ جید عالم بھی تھا، جب ہارون کو غزوۂ روم میں انقرہ اور عموریہ میں یونانی کتابیں ملیں تو اس نے یوحنا ہی سے ان کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرایا[۶]، یوحنا ہی کا شاگرد حنین بن اسحاق تھا جو تاریخ اسلام کا سب سے بڑا مترجم ہے[۷]،

ہارون کا عہد اس لیے بھی مشہور ہے کہ اس کے زمانہ میں سب سے پہلے سرکاری لائبریری "خزانۃ الحکمۃ" کے نام سے قائم کی گئی۔ پھر بعد میں اس کا نام بیت الحکمۃ ہوگیا، اس کا پہلا لائبریرین ابوسہل فضل بن نوبخت تھا[۸]۔ بعد میں سلما اس عہدہ پر مقرر ہوا، اور وہ تاریخ میں "سلما صاحب بیت الحکمۃ" کے نام سے مشہور ہے[۹]،

---

۱ الفہرست لابن الندیم ص ۴۸۴ ۲ ایضاً ص ۴۲۴ ۳ عیون الانباء ج ۱ ص ۱۲۶ ۴ ایضاً ص ۱۰۰ ۵ ایضاً ص ۱۴۴ ۶ ایضاً ص ۱۷۵ ۷ ایضاً ص ۲۰۷ ۸ اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۶۹،

بیت الحکمۃ کی سرکاری لائبریری کے علاوہ برامکہ کی ذاتی لائبریری بھی تھی، اس کی ثروت کے بارے میں جاحظ نے یحییٰ بن خالد برمکی کے بیٹے موسیٰ کی روایت سے لکھا ہے کہ اس لائبریری میں کوئی کتاب ایسی نہ تھی جس کے تین تین نسخے نہ ہوں،[1]

ارسطا طالیسی منطق کی پہلی تین کتابوں [قاطیغوریاس، باری ارمینیاس اور انالوطیقا] کے دو ترجموں کا ذکر اوپر آچکا ہے، پہلا ترجمہ عبد اللہ بن المقفع نے کیا تھا، اور دوسرا ترجمہ ابو نوح کاتب نصرانی نے، ہارون کے عہد خلافت میں تیسرا ترجمہ سلما صاحب بیت الحکمۃ نے یحییٰ بن خالد برمکی کے ایما سے کیا،[2]

برامکہ کا نام خاص طور سے ریاضی و ہیئت کے سلسلے میں مشہور ہے۔ ان کے اعتناء سے "المجسطی" عربی میں ترجمہ ہوئی، ابن الندیم لکھتا ہے:

اول من اعتنیٰ بتفسیرہ واخراجہ	سب سے پہلے جس شخص نے مجسطی کی تفسیر اور عربی میں اسکا
الی العربیۃ یحییٰ بن خالد بن برمک	ترجمہ کرانے کے ساتھ اعتنا کیا وہ یحییٰ بن خالد برمکی تھا،
نفسرہ لہ جماعۃ فلم یتقنوہ ولم	ایک جماعت نے اس کے لیے مجسطی کی تفسیر کی مگر وہ اس کام
یرض بذلک . فندب لتفسیرہ ابا	کو اچھی طرح انجام نہ دے سکے اور یحییٰ کو انکے تراجم پسند
حسان وسلما صاحب بیت الحکمۃ	نہ آئے اس لیے اس نے اسکی تفسیر کے لیے ابا حسان اور
فاتقناہ واجتھدا فی تصحیحہ بعد ان	سلما صاحب بیت الحکمۃ کو بلایا، انھوں نے اس کام کو بڑی
احضر النقلۃ المجودین فاختبرا نقلھم	اچھی طرح انجام دیا اور اسکی صحت میں سعی بلیغ کی،
واخذا بافصحہ واصحہ وقد قیل	انھوں نے بڑے قابل مترجموں کو بلاکر انکے ترجموں کا امتحان
ان الحجاج بن مطر نقلہ ایضاً[3]	لیا اور جو سب سے زیادہ صحیح اور فصیح تھا اسے منتخب کیا

[illegible]

غالباً حجاج بن مطر کے ترجمہ مجسطی کو قبول عام حاصل نہیں ہوا، قدرت کو اس کا نام دوسرے کام کے ذریعہ

---

[1] کتاب الحیوان للجاحظ جزء اول ص ۳۰ [2] معارف جلد ۸۰ نمبر ۱ (جولائی ۱۹۵۷ء) ص ۳۵-۵۵ [3] الفہرست لابن الندیم ص ۳۷۴

زندہ رکھنا تھا، یہ اقلیدس کا ترجمہ تھا، سب سے پہلے اقلیدس کا ترجمہ منصور کے زمانہ میں ہوا تھا لیکن یہ مشہور نہیں ہوا، برامکہ کی سرپرستی میں اس کا دوسرا ترجمہ ہوا، اسکا مترجم حجاج بن مطر تھا، ابن الندیم لکھتا ہے:

نقلہ الحجاج بن یوسف بن مطر	حجاج بن یوسف بن مطر نے اقلیدس کے یونانی سے
نقلین احدھما یعرف بالھارونی	عربی میں دو ترجمے کیے، ایک نقل ہارونی کے نام سے مشہور ہے
وھو الاول ونقلاً ثانیاً ویعرف	اور وہ پہلا ترجمہ ہے اور دوسرا ترجمہ نقل مامونی کے
بالمامونی وعلیہ یعول[۱]	نام سے مشہور ہے اور اسی پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

۱۸۷ھ میں برمکی خاندان ہارون کے شکوک وشبہات کا شکار ہو کر تباہ ہو گیا، اور اس کے ساتھ علم و ادب کی سرپرستی کا وہ کارخانہ بھی جو ان کی علم نوازی سے چل رہا تھا، درہم برہم ہو گیا، وہ اہل کمال جو برمکی خاندان کی نوازشوں سے فیض یاب ہو کر علم و حکمت کی ترقی میں ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کر رہے تھے بد دل ہو کر خانہ نشین ہو گئے،[۲]

چھ سال بعد ہارون نے بھی وفات پائی اور وصیت کے مطابق امین تخت خلافت پر بیٹھا مگر درباریوں نے جلد ہی اس کو دوسرے بھائی مامون سے بدظن کرا دیا اور برادرانہ خانہ جنگی شروع ہو گئی یہ لڑائی محض دو بھائیوں کی جنگ نہ تھی، بلکہ عرب و عجم کا آخری مقابلہ تھا جس میں عجم کو فتح ہوئی اور ۱۹۸ھ میں مامون سریر آرائے خلافت ہوا،

عباسی خلفاء میں مامون کا عہد اپنی عقلیت پرستی اور یونان پسندی کے لیے مشہور ہے، اس کی علمی سرپرستی کے بارے میں قاضی صاعد اندلسی نے لکھا ہے:

ثم لما افضت الخلافۃ الی الخلیفۃ	پھر جب خلافت ساتویں خلیفہ
السابع منھم عبد اللہ المامون	عبد اللہ المامون کو ملی .....

---

[۱] الفہرست لابن الندیم ص ۳۷۱، [۲] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۶۱-۱۶۲

تمم ما بدأ به جده المنصور
فاقبل على طلب العلم في مواضعه واستخرجه
من معادنه بفضل همته الشريفة
وقوة نفسه الفاضلة فداخل
ملوك الروم واتحفهم بالهدايا
الخطيرة وسألهم صلته بما لديهم
من كتب الفلسفة فبعثوا اليه بما
حضرهم من كتب افلاطون و
ارسطاطاليس وابقراط وجالينوس
واقليدس وبطليموس وغيرهم
من الفلاسفة فاستخار لها مهرة
التراجمة وكلفهم احكام ترجمتها
فترجمت له على غاية ما امكن ثم
حض الناس على قرأتها ورغبهم
في تعليمها فنفقت سوق العلم
في زمانه وقامت دولة الحكمة في عصره [1]

تو اس نے اس تحریک کو جسے اس کے دادا منصور نے
شروع کیا تھا مکمل کیا، اور جن مقامات سے علم حاصل
ہو سکتا تھا اس نے اسے حاصل کرنے پر توجہ کی اور اپنی
ہمت شریفہ اور فاضل نفس کی مدد سے علم و حکمت
کو ان کے معادن سے نکالا، اس غرض سے اس نے
بادشاہان روم سے خط و کتابت کی، انھیں بیش قیمت
تحفے اور ہدیے بھیجے اور ان کے بدلے میں ان سے
فلسفہ کی کتابیں منگائیں، انھوں نے افلاطون و
ارسطو، بقراط و جالینوس اور اقلیدس و بطلیموس
کی جو کتابیں ان کے یہاں تھیں مامون کی خدمت
میں بھیجیں، مامون نے ان کے ترجمے کے لیے ماہر مترجمین
کو منتخب کیا اور انھیں ان کے ترجمہ پر مامور کیا،
اس طرح کمال خوبی کے ساتھ عربی میں انکا ترجمہ ہوا،
پھر لوگوں کو ان کے پڑھنے پر آمادہ کیا اور انکی تعلیم
کی ترغیب دی، اس طرح اس کے زمانہ میں علم کا بازار
چالو ہو گیا اور اس کے عہد میں علم و حکمت کی سلطنت قائم ہو گئی

خلیفۂ وقت کی تقلید میں امراء و رؤسا نے بھی اس علمی تحریک کی ترقی میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر
حصہ لیا، اس کی تفصیل اسلامی ثقافت کے مورخ کا کام ہے، ان میں بنو موسیٰ بن شاکر کا نام خصوصیت سے

[1] طبقات الامم ص ۵۰،

قابلِ ذکر ہے، وہ خود علم ہندسہ میں یگانہ تھے، اور ان کی کوشش سے یونانی ہندسہ کے بڑے بڑے نوادر عربی میں ترجمہ ہوئے، اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

علوم عقلیہ میں مامون کو ہندسہ کے ساتھ اور ہندسہ میں اصول اقلیدس کے ساتھ خصوصی شغف تھا، کہتے ہیں کہ اس کی عبا کی آستینوں پر اقلیدس (مقالہ اولی) کی پانچویں شکل کا طغرا بنا رہتا تھا، اسی لیے اس شکل کو "شکل مامونی" کہا جاتا ہے[1]، مامون کی نظر میں اصول اقلیدس کی اتنی اہمیت تھی کہ جو شخص اس کے کامل تیرہ مقالے پڑھے ہوئے نہیں ہوتا تھا، اس کو وہ مہندس ہی نہیں سمجھتا تھا، ابن القفطی نے لکھا ہے:

وكان عند المامون ان من لم يقرء	مامون کے نزدیک جو شخص اس کتاب کو ختم کیے
هذا الكتاب لا يعد مهندسا البتة[2]	نہ ہوتا تھا وہ مہندس ہی محسوب نہ ہوتا تھا،

مامون کے زمانہ میں حجاج بن مطر نے جس نے پہلی مرتبہ ہارون کے زمانہ میں اقلیدس کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، دوبارہ اس کتاب کا ترجمہ کیا، ابن الندیم کی تصریح اوپر مذکور ہو چکی، نقل ہارونی نایاب ہے، غالباً محقق طوسی کے زمانہ میں بھی نایاب تھی اس لیے وہ اس کا ذکر نہیں کرتا، نقل مامونی کے بھی چھ مقالے ہی ملتے ہیں،

ہندسہ کی آیندہ ترقی کا تذکرہ اس کی مختلف شاخوں کے سلسلے میں آگے آرہا ہے، اس سے پہلے اس کے آغاز پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

مسلمانوں میں ہندسہ کی ابتدا | جس سرعت کے ساتھ مسلمانوں نے ریاضی و ہندسہ میں ترقی کی، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، سنہ ۱ھ (۶۲۲ء) میں مدینہ منورہ میں اسلامی مملکت کی بنیاد پڑی، ۸ھ میں جزیرہ نمائے عرب اسلام کے حیطۂ اقتدار میں آیا، سنہ ۱۱ھ میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ ہوئے، ان کا دو سالہ عہد خلافت ارتداد کے فتنہ کو فرو کرنے اور ان بیرونی

[1] تحریر اقلیدس ص ۹ طہران اڈیشن [2] اخبار العلماء باخبار الحکماء لابن القفطی ص ۲۸۸

طاقتوں کی گوشمالی میں صرف ہوا جو در پردہ ان فتنہ انگیزوں کی اعانت کر رہی تھیں، مثلاً ایرانی اسلام کے مٹانے کی سعی لاحاصل میں مصروف تھیں جیسے روم، اس لیے خلیفۂ اول کی وفات پر ان کے جانشین حضرت عمر فاروقؓ نے بھی اپنے پیشرو کی فارورڈ پالیسی جاری رکھی اور کچھ ہی عرصے میں قیصر وکسریٰ کی عظیم الشان سلطنتوں کا بڑا حصہ اسلامی قلمرو میں شامل ہوگیا، اور روم وعجم کے خزانے مدینہ منورہ میں منتقل ہونا شروع ہوئے، اس سے بیت المال کی باقاعدہ تنظیم کا مسئلہ پیدا ہوا جس کے لیے حساب دان منتظمین کی ضرورت تھی، دوسری طرف دولت وثروت کی کثرت کے ساتھ ترکہ کی تقسیم اور مناسخہ کے پیچیدہ مسائل پیدا ہونے لگے جن کے اطمینان بخش حل کے لیے حساب الکسور میں مہارت ضروری تھی، ان معاشرتی تقاضوں کی بنا پر مسلمانوں نے علم الحساب کو سیکھا اور اس میں کمال حاصل کیا،

خلافت فاروقی کے آخری زمانے میں سواد عراق کا علاقہ فتح ہوا، جسے خلیفۃ المسلمین نے فاتحین میں تقسیم کرنے کے بجائے قدیم مزارعین ہی کے پاس خراج پر چھوڑ دیا، تشخیص خراج کے لیے زمین کی باقاعدہ پیمایش کرائی گئی اور یہ کام عثمان بن حنیفؓ کے سپرد ہوا جسے انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا[۱]، مساحت اور پیمایش زمین کے لیے علم الہندسہ کے مبادی سے واقفیت ضروری ہے، اس لیے یہ باور کرنا چاہیے کہ مسلمان پہلی صدی ہجری کے ربع اول ہی میں علم ہندسہ کے مبادی سے واقف تھے،

پھر ارتقاء تمدن کے ساتھ عمارتوں کی تعمیر اور نئے شہروں کی آبادی ضروری ہوگئی، یہ ظاہر ہے کہ تعمیر عمارات اور ٹاؤن پلاننگ کے لیے سول انجینیرنگ کی مہارت ناگزیر ہے، جس کے لیے علم ہندسہ میں مہارت ضروری ہے، اس لیے یہ یقینی ہے کہ مسلمان پہلی صدی ہجری میں نظری ہندسہ کے مبادی واولیات سے واقف ہوچکے ہوں گے،

غرض ابتدا ہی سے مسلمانوں کے لیے حساب وہندسہ ناگزیر تھا، اور انھوں نے اس معاشرتی تقاضے کو باحسن وجوہ انجام دیا، چنانچہ دوسری صدی ہجری کے نصف اول ختم ہونے سے پہلے "ہندسہ

---

[۱] الاحکام السلطانیہ للماوردی

جاننے والوں" کا باضابطہ ذکر تاریخ میں ملتا ہے، ابن الاثیر ۱۴۵ھ کے واقعات میں لکھتا ہے کہ عباسی خلیفہ ابوجعفر منصور نے مختلف صوبوں کے حکام کو لکھا کہ ان کے یہاں جو معمار و مزدور اور قابل اعتماد "ہندسہ جاننے والے" ہوں انھیں بغداد کی تعمیر کے لیے بھیج دیا جائے،[1]

یہ بھی واضح رہے کہ ۱۶ھ سے (جس سال مصر فتح ہوا تھا) مسلمانوں کو یونانی حکما اور مسیحی علماء کے ساتھ (جو یونان کے علمی سرمایہ سے اجمالی طور پر واقف تھے) تبادلۂ خیالات کا موقعہ ملنے لگا، اس لیے وہ بہت جلد یونانی علم و حکمت کے شاہکاروں سے واقف ہوگئے اور ان کو ان کے حاصل کرنے کا اشتیاق ہوگیا، ابن خلدون لکھتا ہے،

ثم جاء الله بالاسلام .... وابتداء امرهم بالسذاجة و الغفلة عن الصنائع حتى اذا تبحبح السلطان والدولة واخذوا من الحضارة بالحظ الذى لم يكن لغيرهم من الامم وتفننوا فى الصنائع و العلوم وتشوقوا الى الاطلاع على هذه العلوم الحكمية بما سمعوا من الاساقفة والاقسة المعاهدين بعض ذكر منها وبما تسموا اليه افكار الانسان فبعث ابو جعفر المنصور الى ملك الروم ان يبعث اليه بكتب التعاليم

پھر اللہ تعالیٰ نے اسلام کو مبعوث کیا ... اہل اسلام کی ابتداء بڑی سادگی اور صنعتوں سے ناواقفیت کے ساتھ ہوئی، پھر جب ان کی عظمت اور شوکت و حشمت بڑھ گئی اور تہذیب و تمدن سے انھیں وافر حصہ ملا جو ان سے پہلے کی قوموں کو نہیں ملا تھا تو انھوں نے مختلف صنعتوں میں دستگاہ حاصل کی اور انھیں علم و سائنس پر مطلع ہونے کا شوق دامنگیر ہوا کیونکہ انھوں نے قلمروے اسلامی کے ذمی مسیحی علماء اور پادریوں سے ان علوم کا کچھ ذکر سنا تھا، اور انسانی فکر بھی ان کے حصول کی داعی تھی، لہٰذا ابوجعفر منصور نے قیصر روم کو لکھا کہ وہ ریاضی (Mathematic) کی

[1] ابن اثیر ج ۵

مترجمۃ فبعث الیہ بکتاب اقلیدس وبعض کتب الطبعیات[1]   کتابیں ترجمہ کرواکر بھیجدے، چنانچہ قیصر نے اصول اقلیدس اور طبعیات کی کچھ کتابیں منصور کو بھیجیں،

اس طرح ۱۴۵ھ کے قریب اقلیدس کا سب سے پہلی مرتبہ عربی میں ترجمہ ہوا، ہارون الرشید (۱۷۰-۱۹۳ھ) کے زمانہ میں حجاج بن مطر نے یحییٰ بن خالد برمکی کے ایما سے اقلیدس کا از سرِ نو ترجمہ کیا، جب امین و مامون کی خانہ جنگی کے بعد مامون سریر آرائے خلافت ہوا تو حجاج نے پھر سے اقلیدس کا ترجمہ کیا، اس کے بعد (تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں) ہندسی کتابوں کے بیشمار تراجم ہوئے، اور اس سے زیادہ کثرت کے ساتھ مہندسین نے خود ہندسی تصانیف مرتب کیں، ان کی تفصیل آگے آرہی ہے،

مسلمانوں کے علم ہندسہ کی تقسیم | علم ہندسہ کو دو بڑی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، ہندسۂ خالص اور تطبیقی ہندسہ اول الذکر کی تین ذیلی اقسام ہیں

(۱) اصول ہندسہ (جس سے اقلیدس کے "اصول ہندسہ" (Elements) کے انداز کی ہندسی مصنفات مراد ہیں) (۲) کرویات (اس میں "علم المثلثات الکرویہ" (Spherical Trignometry) بھی شامل ہے)

(۳) مخروطات اور دیگر غیر دوری منحنیات کا ہندسہ (Conics and Higher Curves)

اسی طرح تطبیقی ہندسہ کے سلسلے میں مسلمان فضلاء کی کوششوں کو تین ذیلی قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(۱) علم الحیل یا میکانک (Mechanics) (۲) علم المناظر یا بصریات (Optics) (۳) فلکیات یا ہندسی ہیئت (Mathematical Astronomy)

ان میں سب سے زیادہ اعتنا مسلمان مہندسین نے "اصول ہندسہ" کے ساتھ کیا جسے عموماً "اقلیدس" سے تعبیر کیا جاتا تھا، اس ضمن میں حسب ذیل عنوانات قابل ذکر ہیں:

(۱) اقلیدس کے اصول ہندسہ کا ترجمہ (۲) اقلیدس کے اصول ہندسہ کی تلخیص (۳) اصول ہندسہ پر مستقل تصانیف (۴) مساحت اور علم المثلثات (۵) اصول اقلیدس کی شروح (۶) مصادرات اقلیدس کی شرح اور شکوک اقلیدس کا حل،

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۲۶

(۷) مصادرۂ توازی خطوط (Parallel Postulate) کی اصلاح (۸) نظریہ نسبت و تناسب کی شرح و ایضاح (۹) نظریۂ اعداد بالخصوص "اصم" و "منطقات" کی شرح و توضیح (۱۰) مجسمات خمسہ (Five regular Polyhydra) کے مسائل کی توضیح و تبیین۔

کرویات کے ضمن میں مندرجۂ ذیل عنوانات قابل ذکر ہیں:

(۱) کرویات ساکنہ (۲) کرویات متحرکہ (۳) علم المثلثات کرویہ

ہندسہ خالص کی تیسری قسم کو دو عنوانوں کے تحت میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(۱) مخروطات، (۲) غیر فرجاری منحنیات

علم الحیل کے مندرجۂ ذیل عنوانات قابل ذکر ہیں:

۱۔ حیل (Mechanics)

۲۔ میزان الحکمۃ یا اسکونیات (Hydrostatics)

۳۔ علم البنکام یا گھڑی سازی (Horology)

فلکیات کا عنوان ان چند ذیلی عنوانوں میں منقسم ہو سکتا ہے:-

۱۔ زیج شہریار (Persian Astronomy) کی تشریح۔

۲۔ السندھند (Indian Astronomy) کی توضیح

۳۔ المجسطی (Greek Astronomy) کی شرح و اصلاح۔

۴۔ مستقل ہیئتی فنون

۵۔ اصطرلاب

۶۔ آلات رصدیہ کی تیاری

(باقی)

امام نسائی اور انکی سنن

از
جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

حافظ ابو عبد الرحمن نسائی کے نام سے حدیث و سیر کا ہر طالب علم واقف ہے، حدیث کی جو کتابیں اپنی صحت و وثوق کے اعتبار سے صحاح کا درجہ رکھتی ہیں، ان میں سے ایک امام نسائی کی سنن بھی ہے، لیکن یہ امر نہایت افسوسناک ہے کہ مورخین اور اصحاب تذکرہ نے امام نسائی کے ساتھ وہ اعتنا، نہیں کیا جس کے وہ مستحق ہیں، اس لیے ان کے اکثر حالات بڑی حد تک نامعلوم ہیں، اس مضمون میں جو حالات و واقعات تلاش و جستجو سے فراہم ہو سکے ہیں، وہ سنن پر مفصل تبصرہ کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں،

نام و نسب امام نسائی کا اصل نام احمد اور کنیت ابو عبد الرحمن تھی، سلسلۂ نسب یہ ہے:-
احمد بن شعیب بن علی بن سنان بن بحر بن دینار، جمہور نے سلسلۂ نسب اسی ترتیب سے بیان کیا ہے، البتہ علامہ سیوطی نے سنان کے بعد بحر کی جگہ یحییٰ کا نام لیا ہے، سمعانی نے بحر بن سنان لکھا ہے، اور علامہ ابن خلکان نے آپکے والد کا نام علی اور دادا کا نام شعیب قرار دیا ہے، جو صحیح نہیں معلوم ہوتا، ابن جوزی کی المنتظم کے حاشیہ میں ابن خلکان کے سلسلۂ نسب کو مرجوح بتایا گیا ہے،

پیدائش نسائی کے سنہ پیدائش میں خفیف سا اختلاف ہے، عام طور سے مورخین ۲۱۵ھ یا ۲۱۴ھ قرار دیتے ہیں اور اس میں سے کسی کو ترجیح نہیں دیتے، البتہ سیوطی نے حسن المحاضرہ میں اور خیر الدین زرکلی

۔ اعلام میں ۲۲۵ھ لکھا ہے، ابن عماد نے شذرات میں سیوطی کا قول نقل کردیا ہے، جو صحیح نہیں ہے، یونکہ عام طور سے اصحاب سیر و تذکرہ اس بات پر متفق ہیں کہ امام نسائی نے ۸۸ سال کی عمر پائی جیسا کہ ؤد ابن عماد نے بھی اس کی تصریح کی ہے، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ ان کا سنہ پیدائش ۲۱۵ھ کو مانا جائے، امام نسائی خود بھی فرماتے ہیں:

یشبہ ان یکون مولدی فی سنۃ ۲۱۵[1] قیاس یہ ہے کہ میری پیدائش ۲۱۵ھ میں ہوئی ہے

وطن | آپ نے اگرچہ مصر کو وطن بنا لیا تھا مگر پیدائش "نساء" میں ہوئی تھی، نساء کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مسلمان فاتحین جب خراسان میں داخل ہوئے تو انھوں نے اس شہر کا بھی قصد کیا لیکن اہل شہر مسلمانوں کی آمد کی اطلاع پاکر اپنی عورتوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے، مسلمانوں نے جب وہاں عورتوں کو پایا تو جنگ و قتال کے ارادہ سے باز آگئے، کیونکہ ان کے مذہب میں عورتوں سے جنگ ممنوع ہے، اور یہ کہکر لوٹ گئے کہ جب تک اس شہر کے مرد نہ آلیں ہم اس سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔[2]

ممکن ہے تاریخی حیثیت سے یہ واقعہ صحیح نہ ہو لیکن سمعانی نے کتاب الانساب اور یاقوت نے معجم البلدان میں اسے نقل کیا ہے، امام صاحب اسی شہر کی نسبت سے "نسائی" کہلاتے ہیں، اور زیادہ صحیح نسبت اس شہر کی طرف یہی ہے، لیکن "نسوی" بھی کہا جاتا ہے۔[3]

"نساء" ایک زمانہ میں اہل علم اور ارباب کمال کا مرکز رہ چکا ہے، اور اس کی خاک سے بڑے بڑے نامور علماء و فضلاء پیدا ہوئے، اسی شہر کو امام نسائی کے مولد و منشاء ہونے کا فخر حاصل ہے اور امام صاحب نے اگرچہ مصر میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی، مگر ان کی اور ان کی کتاب سنن کو اسی شہر کی نسبت سے شہرت حاصل ہوئی۔

تعلیم کے لیے سفر | نسائی کی تعلیم خصوصاً ابتدائی تعلیم کے حالات نہیں ملتے، مگر یہ مسلم ہے کہ اس زمانہ

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۸ [2] کتاب الانساب للسمعانی ورق ۵۵۹ [3] کتاب الانساب و معجم البلدان

کے دستور اور دیگر ائمہ سلف کی طرح امام نسائی نے بھی حصول علم کے لیے کوئی کوشش باقی نہیں چھوڑی اور اپنے زمانہ کے تمام مشہور اساتذہ اور شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر احادیث نبوی کا سماع کیا، اور جہاں کہیں علوم نبوت کا سرچشمہ دیکھا وہاں جاکر اس سے سیراب ہوئے، علامہ ابن کثیر لکھتے ہیں:

رحل الی الآفاق واشتغل بسماع	دور دراز شہروں میں جاکر سماع حدیث میں
الحدیث والاجتماع بالأئمة الحذاق	مصروف رہے اور ان ائمہ فن اور مشائخ کبار
ومشائخ الذین روی عنهم مشافهة[1]	سے ملے جن سے بالمشافہ سنکر روایت کی ہے

سیوطی نے "جال فی البلاد" کہکر اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، تذکرہ وطبقات کی دوسری کتابوں میں حصول علم کی خاطر آپ کے حجاز، عراق، مصر، شام، جزائر اور خراسان وغیرہ جانے کی تصریح ملتی ہے، حافظ ابن جوزی کا بیان ہے کہ امام نسائی نے سب سے پہلے نیشاپور کا سفر کیا اور وہاں اسحاق بن ابراہیم، حسین بن منصور اور محمد بن رافع جیسے اصحاب علم وفضل سے کسب فیض کیا، پھر بغداد گئے اور وہاں کے اجلہ علما، بالخصوص قتیبہ سے زیادہ استفادہ کیا، مرو میں بھی قیام کیا اور علی بن حجر وغیرہ سے فیضیاب ہوئے، پھر عراق میں ابوکریب جیسے ائمہ فن سے حدیثیں لکھیں، اسی طرح شام، مصر اور الجزائر وغیرہ کا سفر بھی اختیار کیا[2]، اور ہر جگہ کے ارباب فضل وکمال سے استفادہ کرتے رہے، امام موصوف خود بیان کرتے ہیں کہ میں پندرہ سال کی عمر میں قتیبہ کی خدمت میں حدیث سیکھنے کی غرض سے گیا اور ایک سال دو ماہ وہاں ٹھہرا۔

اساتذہ اور شیوخ امام نسائی قدرت کی طرف سے علم کا ذوق وشوق لیکر آئے تھے، اس لیے وہ اپنے زمانہ کے تمام اہل کمال اور ائمہ فن سے مستفیض ہوئے، اس لیے ان کے اساتذہ کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان سب کا استقصا دشوار ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں:

---

[1] البدایة والنهایة ج ۱۱ ص ۱۲۳ [2] المنتظم فی تاریخ الملوک والامم ج ۶ ص ۱۳۱

سمع من خلائق لا یحصون یاتی اکثرھم فی ھذا الکتاب [۱]

انھوں نے بے شمار لوگوں سے حدیثیں سنیں جن میں سے اکثر کا ذکر اس کتاب میں ہوگا،

حافظ ذہبی وغیرہ نے ان کے بعض شیوخ کی تفصیل بیان کی ہے جن کے نام یہ ہیں:

قتیبہ بن سعید، اسحٰق بن راہویہ، ہشام بن عمار، عیسیٰ بن حماد، حسین بن منصور سلمی، عمرو بن زرارۃ، محمد بن نصر مروزی، سوید بن نصر، ابوکریب، محمد بن رافع، علی بن حجر، ابویزید جرمی اور یونس بن عبد الاعلیٰ [۲] وغیرہ جیسے افاضل اور اساطین علم حدیث سے خراسان، حجاز، عراق، مصر، شام اور جزائر وغیرہ میں احادیث نبوی کا سماع کیا،

علامہ ابن حجر نے فن قرأت کی تحصیل کے سلسلہ میں آپ کے دو اور اساتذہ احمد بن نصر نیشاپوری اور ابوشعیب سوسی کا نام بیان کیا ہے [۳]،

تلامذہ اساتذہ کی طرح تلامذہ اور شاگردوں کی بھی اتنی کثرت ہے کہ ان کے ناموں کا احاطہ کرنا دشوار ہے بعض مشہور تلامذہ کے نام یہ ہیں:

ابوبشر دولابی، ابوعلی حسین بن محمد نیشاپوری، ابوالقاسم حمزۃ بن محمد کنانی، ابوعلی حسن ابن خضر السیوطی، ابوبکر بن سنی، ابوالقاسم طبرانی، محمد بن معاویۃ، حسن بن رشیق، ابوالحسن محمد بن عبد اللہ حیویہ، محمد بن قاسم اندلسی، ابوبکر احمد بن محمد بن المہندس، ابوعوانہ، ابوجعفر طحاوی ابوبکر احمد بن حداد، ابوجعفر عقیلی، ابوعلی بن ہارون اور خود نسائی کے صاحبزادے عبدالکریم وغیرہ جیسے مشاہیر نے ان سے حدیث کا سماع کیا، ان میں سے بیشتر وہ ہیں جنھوں نے آپ کی کتاب سنن کی روایت کی ہے [۴]،

علم حدیث میں امتیاز تیسری صدی ہجری کا زمانہ علم حدیث کے انتہائی عروج کا دور سمجھا جاتا ہے اس دور

---

[۱] تہذیب التہذیب ج ۱ ص [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۶ و طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۸۳، ۸۴ [۳] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷ [۴] ایضاً ج ۱ ص ۳۰، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۷ و طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۸۴

میں علم حدیث کا گھر گھر چرچا تھا، لوگ علم حدیث کی تحصیل کے لیے دور دراز کے ملکوں کا سفر اختیار کرتے تھے، ایسے زمانہ میں کوئی صاحب ذوق فن حدیث سے کس طرح بیگانہ اور بے بہرہ رہ سکتا تھا، یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ سے زیادہ نامور محدثین اور اساطین فن کسی زمانہ میں بھی نہیں پیدا ہوئے، اگرچہ متاخرین میں بھی کچھ اہل کمال پیدا ہوئے ہیں مگر انکی تعداد بہت کم ہے، اس دور کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسکے اکثر اہل علم اس فن میں پورا کمال رکھتے تھے اور مجموعی حیثیت سے انکی مثال بعد کے زمانہ میں نہ ملے گی،

اسلیے قدرتی طور پر امام نسائی کا اصلی فن علم حدیث ہی قرار پایا اور اس میں ان کو جو رسوخ اور تبحر حاصل ہوا وہ انکے دوسرے معاصرین کو میسر نہیں۔ امام نسائی کی مقبولیت اور شہرت کا اصلی سبب یہی کمال و امتیاز ہے اور علوم نبوت ہی کی خدمت کا فیض ہے کہ آجتک انکا نام زندہ ہے اور جبتک مسلمانوں میں علم دین کا ذوق باقی رہیگا امام نسائی اور انکی سنن کا نام زندہ رہیگا۔

علم حدیث میں کمال کے جو ذرائع ہو سکتے ہیں امام موصوف ان سب کا نمونہ تھے اور ان میں ایک بلند پایہ محدث کے جملہ اوصاف وخصائص موجود تھے، وہ ضبط وحفظ، ثقاہت وعدالت اور صدق وامانت وغیرہ کا پیکر تھے، جرح وتعدیل کے فن کے ماہر تھے، صحیح وسقیم اور قوی وضعیف روایات کی پوری پرکھ رکھتے تھے، ان کی تصنیفات علوم حدیث میں ان کے کمال اور علو مرتبت پر شاہد ہیں،

اکابر علماے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حافظ ابوعبدالرحمن نسائی سے بڑھکر ان کے زمانہ میں احادیث ورجال کا کوئی عالم نہ تھا، مشہور محدث امام دارقطنی ارشاد فرماتے ہیں،

ابوعبدالرحمن النسائی مقدم علی	امام نسائی اپنے دور میں تمام علماے حدیث سے
کل من یذکر بھذا العلم من اھل	فائق وبرتر تھے، اور ان کی کتاب "صحیح" کے نام
عصرہ وکان یسمی کتابہ الصحیح[1]	سے موسوم کی جاتی ہے،

مشہور حافظ حدیث ابوعلی حافظ کا بیان ہے:

للنسائی شرط فی الرجال اشد من	رجال کے ضبط وثقاہت کے متعلق امام نسائی

[1] تاریخ ابن کثیر ج ۱۱ ص ۱۲۳

مسلم بن الحجاج ...... هو الامام	امام مسلم سے بھی زیادہ سخت شرائط رکھتے تھے ...
فی الحدیث بلا مدافعة[۱]	اور وہ بلا شبہہ بغیر کسی حیلہ و حجت کے امام حدیث تھے،

ابن یونس صاحب تاریخ مصر لکھتے ہیں:

کان النسائی اماما فی الحدیث	نسائی حدیث میں امام، ثقہ، معتبر اور
ثقة ثبتاً حافظاً[۲]	حافظ تھے۔

امام دارقطنی لکھتے ہیں:

کان ابوبکر بن الحداد کثیر الحدیث	ابوبکر بن حداد باوجود کثیر الحدیث ہونے کے
ولم یرو عن احد سوی النسائی	نسائی کے علاوہ کسی سے روایت نہیں کرتے تھے،
وقال رضیت به حجة فیما بینی	اور کہتے تھے کہ میں نے اپنے اور خدا کے درمیان حجت
وبین الله عز وجل[۳]	کے لیے انھیں منتخب کیا ہے،

دارقطنی اور حاکم صاحب مستدرک بیک زبان فرماتے ہیں:

کان افقه مشائخ مصر فی عصره	نسائی اپنے دور میں مصر کے سب سے بڑے فقیہ، صحیح
واعرفهم بالصحیح والسقیم من الآثار	وسقیم روایات کے سب سے زیادہ ماہر اور رجال
واعرفهم بالرجال[۴]	کے سب سے بڑے واقف کار تھے،

علامہ ابن طاہر مقدسی فرماتے ہیں کہ میں نے سعد بن علی زنجانی سے ایک شخص کے متعلق استفسار کیا، انھوں نے اسکی توثیق کی، میں نے کہا امام نسائی تو اسے ضعیف قرار دیتے ہیں، انھوں نے یہ سنکر کہا

یا بنی ان لابی عبد الرحمن شرطا	صاحبزادے! ابو عبد الرحمن کی رجال کے بارے میں
فی الرجال اشد من شرط البخاری ومسلم[۵]	امام بخاری اور امام مسلم سے بھی زیادہ سخت شرطیں ہیں،

---

۱ تا ۴ یہ اقوال عموماً اکثر اہل سیر و تذکرہ نے نقل کیا ہے، ہم نے ابن کثیر کی البدایۃ والنہایہ سے اسے جمع کیا ہے ملاحظہ ہو ج ۱۱ ص ۱۲۳

۵ تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۰۰ و طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۲ ص ۸۴

حافظ ابوعلی نیشاپوری کا ارشاد ہے کہ میں نے سفر و حضر میں چار ائمہ حدیث دیکھے، ان میں سے دو یعنی محمد بن اسحاق اور ابراہیم بن ابی طالب تو میرے وطن میں ہیں، تیسرے نسائی مصر میں اور چوتھے عبدان اہواز میں ہیں۔[1]

مامون مصری کہتے ہیں کہ جب ہم طرسوس آئے اور حفاظ حدیث (عبداللہ بن احمد مرتع اور ابوالاذان وغیرہ) مجتمع ہوئے تو سب نے امام نسائی کے انتخاب کے مطابق حدیثیں لکھیں۔[2]

علامہ ابن سبکی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے شیخ حافظ ابوعبداللہ ذہبی سے دریافت کیا کہ مسلم بن حجاج اور نسائی میں احفظ کون ہے، انھوں نے جواب میں فرمایا نسائی، ابن سبکی کہتے ہیں کہ پھر میں نے اپنے والد ماجد سے اس کا تذکرہ کیا تو انھوں نے بھی اس خیال کی تائید فرمائی۔[3]

غرض امام نسائی اپنے زمانہ میں علم حدیث کے بہت بڑے ماہر اور عالم تھے، وہ مختلف حیثیتوں سے دوسرے محدثین سے ممتاز، بلند پایہ اور منفرد حیثیت کے مالک تھے، ان کی عظمت شان، جلالت قدر اور علم حدیث میں رفعت و امامت کے متعلق اہل علم کی بہت سی شہادتیں ہیں، حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

وکذلک اثنی علیہ غیر واحد من الائمۃ وشھدوا لہ بالفضل والتقدم فی ھذا الشان۔

دوسرے علوم سے تعلق امام نسائی کا اصلی فن تو علم حدیث تھا اور اسی کی بدولت انھیں غیر معمولی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی لیکن اس کے علاوہ بھی وہ دوسرے علوم دینیہ سے بیگانہ نہ تھے، فن قرأت و تفسیر کا حال اس سے پہلے گذر چکا ہے، فقہی اور استنباطی مسائل میں ان کو غیر معمولی نظر و بصیرت حاصل تھی، بلکہ علم حدیث ہی کی طرح ان کے زمانہ میں اس فن میں بھی ان کا کوئی ہمسر نہ تھا، امام دار قطنی اور حاکم صاحب مستدرک کا بیان ہے، "کان افقہ مشائخ اھل مصر فی عصرہ" یعنی ابوعبدالرحمن نسائی اپنے زمانہ کے مشائخ مصر میں سب سے بڑے فقیہ تھے۔ علامہ ابن جوزی نے ابن یونس صاحب تاریخ مصر

[1، 2] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۸ [3] طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج ۲ ص ۸۴

کی اس تصریح "وکان اماما ثقة ثبتاً حافظاً" پر "فقیھاً" کا بھی اضافہ کیا ہے[1]، فقہ میں انکی غیر معمولی مہارت ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ انھیں حمص میں قضا اور ولایت کا منصب تفویض کیا گیا اور خود ان کی سنن میں جا بجا اختلافی مباحث اور فقہی مسائل کا تذکرہ ملتا ہے،

فقہ، حدیث اور تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم اسلامیہ میں بھی انھیں پورا کمال حاصل تھا،

نسائی امام المسلمین تھے فقہ وحدیث میں کامل بصیرت، علمی و دینی خدمات، زہد وتقویٰ اور دوسری گوناگوں فضیلتوں اور کمالات کے باعث وہ مسلمانوں کے امام اور مقتدا قرار پائے، ابن عدی بیان کرتے ہیں کہ میں نے منصور فقیہ اور احمد بن محمد بن سلامۃ طحاوی کی زبان سے سنا ہے کہ "ابو عبد الرحمن امام من ائمة المسلمین[2]" یعنی ابو عبد الرحمن مسلمانوں کے اماموں میں سے ایک امام ہیں۔ حافظ ابو الحسین محمد بن مظفر فرماتے ہیں کہ میرے کانوں نے اپنے مصری مشائخ کی زبان سے نسائی کے فضل ومرتبت اور امامت و تقدم کا اعتراف سنا ہے[3]،

محمد بن سعد باوردی کہتے ہیں کہ "میں نے قاسم مطرز سے نسائی کا تذکرہ کیا تو انھوں نے فرمایا:

هو امام او یستحق ان یکون اماما[4] وہ امام ہیں یا منصب امامت کے اہل اور مستحق ہیں

ابو علی نیشاپوری کا اعتراف ہے کہ

وکان من ائمة المسلمین[5] وہ مسلمانوں کے اماموں میں تھے،

غرض نسائی اپنے اوصاف وکمالات کے اعتبار سے بڑی بلند پایہ شخصیت رکھتے تھے اور شیخ الاسلام اور امام المسلمین کہے جاتے تھے۔ چنانچہ علامہ سیوطی ان کو القاضی، الحافظ، شیخ الاسلام احد الائمة المبرزین والحفاظ المتقنین والاعلام المشهورین کے القاب سے یاد کرتے ہیں[6]

زہد وتقویٰ اور کثرت عبادت امام نسائی کی عملی زندگی بھی انتہائی پاکیزہ تھی، ان کا دل خشیت الٰہی سے لبریز

---

[1] المنتظم ج ۶ ص ۱۳۱، [2] البدایۃ والنهایۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳ و تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷، [3] البدایۃ والنهایۃ ج ۱۱ ص ۱۲۳ [4] و [5] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۷، [6] حسن المحاضرۃ ج ۱ ص ۱۴۵

قلب ذکر الہٰی سے معمور اور دماغ فکر عقبیٰ میں مصروف رہتا تھا، وہ بڑے عبادت گذار، پابند شرع اور صاحب ورع و تقویٰ تھے، رات و دن کا بیشتر حصہ خدا کی عبادت اور ذکر و فکر میں گذارتے، تہجد کا خاص اہتمام والتزام رکھتے تھے، صوم داؤدی کے پابند تھے یعنی ایک دن افطار کرتے اور دوسرے دن روزہ رکھتے، حج بھی اکثر کرتے تھے اور جہاد کا ولولہ بھی تھا، ایک مرتبہ امیر مصر کے ساتھ جہاد میں نکلے اور اپنی بے مثال شجاعت و بہادری اور فداکاری و جانثاری کا مظاہرہ کیا، ان کی بہادری و جانثاری دیکھکر لوگوں کو قرن اول کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوگئی،

سنن اور معمولات نبویہ پر عمل کا خاص اہتمام تھا، رد بدعت اور احیاء سنت میں بڑے سرگرم تھے، غرض ان کی پوری زندگی سنت نبویہ پر عمل میں بسر ہوئی، ان کے کل اوقات عبادت و اطاعت الہٰی میں گذرتے تھے، اور ان تمام معمولات پر عمر بھر قائم رہے[1]،

صبر و استقلال | صبر و رضا، ضبط و تحمل، شجاعت و بہادری اور عزم و استقلال کا پیکر تھے، ان کے صبر و ضبط کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب ۔ ۔ ۔ ۔ کتاب "خصائص علی" تصنیف کی اور لوگوں کے سامنے اسے سنایا تو انھوں نے حضرت امیر معاویہ کے فضائل و مناقب بھی بیان کرنے کا مطالبہ کیا، لیکن امام نسائی نے اس سے انکار کیا، انکے انکار پر انھیں بڑی بے دردی کے ساتھ پیٹا گیا، مگر وہ نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان شدائد کو انگیز کرتے رہے اور ان کے استقلال میں فرق نہ آیا، حافظ ذہبی احمد بن نصر کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

من یصبر علی ما یصبر علیہ النسائی	امام نسائی کی طرح کون صبر کر سکتا ہو حالانکہ ان کے
عندہ حدیث ابن لهيعة ترجمة	پاس ابن لہیعۃ کی حدیث موجود تھی لیکن انھوں نے
ترجمة فما حدث بها وکان لا یری	اسے نہیں بیان کیا اور وہ ابن لہیعہ سے حدیث
ان یحدث بحدیث ابن لهيعة[2]	بیان کرنا مناسب نہیں خیال کرتے تھے،

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱ ص ۳۸، تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸ و البدایہ والنہایہ ج ۱۱ ص ۱۲۳
[2] تہذیب ج ۱ ص ۳۸ و تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸

حلیہ اور طرز معاشرت | امام نسائی بڑے وجیہ و شکیل اور نہایت خوش خوراک و خوش پوشاک تھے، چہرہ اتنا بارونق اور پرنور تھا کہ معلوم ہوتا تھا شمع جل رہی ہے، رنگ نہایت سرخ و سفید تھا، بڑھاپے میں بھی حسن و رعنائی اور ترو تازگی میں فرق نہ آیا تھا، لباس نہایت عمدہ استعمال کرتے، رنگین اور قیمتی لباس پہننے میں مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، بہترین غذائیں کھاتے تھے، مرغ خرید کر پالتے اور خوب فربہ کرکے کھاتے، حافظ ابن کثیر کا بیان ہے کہ روزانہ مرغ کھانے کے بعد نبیذ حلال پیتے تھے[1]، غرض ان کی معاشرت اور دنیاوی زندگی بھی بڑی پرشکوہ تھی،

خاندان | امام صاحب کے خاندانی حالات کی تفصیل نہیں ملتی، مگر ان کی معاشرت اور رکھ رکھاؤ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کسی معزز اور صاحب حیثیت گھرانے کے چشم و چراغ رہے ہوں گے، صاحب شذرات کا بیان ہے:

وکان رئیسا نبیلا حسن البزة	وہ رئیس، نجیب و شریف، خوش وضع
کبیر القدر	اور عظیم المرتبت تھے،

بے نیازی | ان کی طبیعت میں بڑا استغنا، اور بڑی بے نیازی تھی، مزاج میں شاہانہ جاہ جلال، وقار و تمکنت اور عزت نفس و خودداری تھی، شمس الدین ذہبی بیان کرتے ہیں کہ ایک بار امیر مصر کے ساتھ کسی جنگ میں شرکت کرنے کا اتفاق ہوا تو سلطان کی مجلس سے دور ہی دور رہے، اور جنگ میں پوری شجاعت اور بہادری سے حصہ لیا،

ازواج و اولاد | عام طور سے مورخین و اصحاب سیر نے حافظ ابن عساکر کی یہ روایت نقل کی ہے کہ نسائی کے چار بیویاں اور دو لونڈیاں تھیں، لیکن ان کے ناموں کی تفصیل اور اولاد وغیرہ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا، البتہ حافظ ابن حجر نے آپ کے تلامذہ کے تذکرہ میں آپ کے ایک صاحبزادے عبدالکریم کا نام لیا ہے،

---

[1] ان تفصیلات کے لیے تذکرۃ الحفاظ، شذرات الذہب اور البدایہ والنہایہ ملاحظہ ہو،

فقہی مسلک امام نسائی فقہ کے مذاہب اربعہ کے بعد پیدا ہوئے ہیں، اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کس فقہی مذہب سے وابستہ تھے، عام طور سے تذکرہ نویسوں اور ان کے سوانح نگاروں نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے، اس لیے خیال یہی ہوتا ہے کہ وہ عام محدثین کی طرح کسی فقہی مسلک سے وابستہ نہیں تھے، بلکہ جزئیات مسائل میں احادیث نبوی پر عمل کرتے رہے ہوں گے، اور جن ائمہ کے مسلک کو کتاب وسنت سے زیادہ قریب پاتے تھے ان کی توثیق فرماتے تھے، لیکن ابن سبکی نے طبقات شافعیہ میں ان کا تذکرہ کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ انھیں شافعی المذہب سمجھتے تھے اور حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلویؒ فرماتے ہیں:

او شافعی المذہب بود چنانچہ مناسک او برآں دلالت میکند[1]

اسی طرح نواب صدیق حسن خانصاحب نے "الحطہ" میں انھیں شافعی المذہب لکھا ہے۔

تصنیفات امام نسائی کی چند ہی تصنیفات کا عام طور سے تذکرہ ملتا ہے، ذیل میں ان کی تفصیل بیان کیجاتی ہے:

سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ۔ آگے چل کر ہم ان کا مفصل تعارف کرائیں گے، اور بالخصوص صغریٰ پر شرح وبسط کے ساتھ تبصرہ کریں گے اور اس کی خصوصیات بھی واضح کریں گے۔

خصائص سیدنا علیؓ۔ یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو امیرالمومنین حضرت علیؓ بن ابی طالب کے فضائل ومناقب پر مشتمل ہے، اس میں متعدد آثار واحادیث کی بنیاد پر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے محاسن، دربار رسالت میں رسوخ اور دیگر اہل بیت کے فضائل وکمالات کی وضاحت فرمائی ہے، اس کی تالیف کا سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "میں جب دمشق آیا تو حضرت علیؓ سے لوگوں کو بیزار پایا اس لیے یہ رسالہ تالیف کیا تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس کی بدولت ہدایت سے سرفراز کرے"[2] لیکن لوگوں نے بدبختی سے اس رسالہ کو سخت ناپسند کیا اور اس کی سزا میں امام حدیث کو زدوکوب کیا اور مسجد تک سے باہر نکال دیا۔

---

[1] بستان المحدثین ص ۱۱۱ [2] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۹

مسند علی و مسند مالک - یہ دونوں کتابیں جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، حضرت علیؓ اور امام مالکؒ کے مسانید پر مشتمل ہوں گی لیکن غیر مطبوعہ اور نایاب ہیں، اس لیے ان کے متعلق کوئی تفصیل نہیں بیان کیجا سکتی، صاحب کشف الظنون وغیرہ نے بھی کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے،

کتاب الضعفاء والمتروکین - امام صاحب کے سوانح نگاروں نے ان ہی چند کتابوں کا تذکرہ کیا ہے، مگر اس کے علاوہ امام نسائی کی ایک اور مختصر تالیف "کتاب الضعفاء والمتروکین" ہے، جو طبع ہو چکی ہے، اس کے ساتھ امام بخاری کی التاریخ الصغیر اور کتاب الضعفاء الصغیر بھی شامل ہے، مگر حیرت ہے کہ اصحاب سیر و تذکرہ اس کا ذکر نہیں کرتے، معجم المطبوعات میں اس کے متعلق نہایت اجمال کے ساتھ لکھا ہے:

الضعفاء والمتروکین (فی رواۃ	ضعفاء اور متروکین فن رجال کی کتاب ہے جو
الحدیث) طبع مع کتاب المنفردات	۱۳۲۳ھ میں امام بخاری کی کتاب المنفردات
والوحدان للامام البخاری (ہند ۱۳۲۳)[1]	والوحدان کیساتھ ہندستان شائع ہوئی ہے

اس رسالہ میں ضعیف اور متروک الحدیث رواۃ کا حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے ذکر کیا گیا ہے، یہ رسالہ اپنے موضوع پر نہایت اہم اور مفید ہے،

کتاب الجمعہ - حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ نے آپ کے اس رسالہ کا ذکر کیا ہے، مگر اس کے متعلق کوئی تفصیل نہیں لکھی ہے،

ایک جدید مصری عالم محمد عبد العزیز خولی نے فن جرح و تعدیل میں آپ کی ایک کتاب التمییز کا ذکر کیا ہے[2]، اور کتب مدلسین کے سلسلہ میں آپ کی ایک اور تصنیف کا بھی ذکر کیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

---

[1] معجم المطبوعات ج ۲ ص ۱۸۵۲ [2] مفتاح السنۃ ص ۱۵۲

اول من افرد المدلسین بالتصنیف الامام حسین بن علی الکرابیسی (۲۴۸ھ) صاحب الشافعی ثم صنف فیه النسائی[1]	سب سے پہلے مدلسین کے متعلق امام حسین ابن علی کرابیسی شافعی (متوفی ۲۴۸ھ) نے مستقل کتاب لکھی، پھر اس کے بعد امام نسائی نے۔

ان کتابوں کے علاوہ بظاہر امام صاحب کی اور کوئی کتاب موجود نہیں معلوم ہوتی، مگر قیاس ہے کہ "خصائص علی" کی طرح مناقب صحابہ میں بھی ان کی کوئی تالیف ضرور رہی ہوگی اور اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے جب خصائص علی تحریر کی تو لوگوں نے پوچھا کہ "آپ نے شیخین اور دوسرے جلیل القدر اصحاب کے فضائل کیوں نہیں لکھے"۔ انھوں نے جواب دیا کہ "میں جب دمشق آیا تو دیکھا کہ لوگ حضرت علیؓ کے معاملہ میں نواصب کی کیفیت اختیار کر چکے تھے، تو یہ کتاب تالیف کی تاکہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو اس کی بدولت ہدایت بخشے"۔ علامہ ابن سبکی اس کا تذکرہ کرنے کے بعد بعد ہی لکھتے ہیں:

ثم صنف بعد ذالك فضائل الصحابة رضی الله عنهم[2]	پھر اس کے بعد فضائل صحابہ رضی اللہ عنہ تالیف کیے۔

اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

ثم صنف بعد ذالك كتاب فضائل الصحابة وقرأها على الناس[3]	پھر خصائص کے بعد فضائل صحابہ میں کتاب لکھی اور لوگوں کے سامنے اسے پڑھا

علامہ ذہبی رقمطراز ہیں:

ثم انه صنف بعد ذلك فضائل الصحابة[4]	نسائی نے خصائص علی کے بعد فضائل صحابہ پر بھی تصنیف کی

[1] مفتاح السنۃ ص ۱۵۳ [2] طبقات جلد ۲ ص ۸۴ [3] تہذیب ج ۱ ص ۳۸ [4] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸

ان بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام نسائی نے فضائل صحابہ میں کوئی کتاب لکھی تھی،

قیاس ہے کہ ان کے علاوہ بھی امام نسائی کی دوسری تصنیفات ہوں گی جو اب ناپید ہو گئیں، علامہ خیرالدین زرکلی آپ کی تصنیفات کے ذکر میں لکھتے ہیں:

لہ "السنن الکبری" و "السنن الصغری"	سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ فن حدیث میں امام
فی الحدیث والصغری من الکتب	نسائی کی کتابیں ہیں اور صغریٰ صحاح ستہ میں
الستۃ ولہ "خصائص علی" ومسند علی	شامل ہے اور ان کی تصنیفات میں خصائص علیؓ
ومسند مالک وغیر ذلک[1]	مسند علی اور مسند مالک وغیرہ ہیں،

صاحب اعلام کے "وغیر ذلک" کے فقرے سے بھی اسکی تائید ہوتی ہے، اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کی دوسری تصنیفات یا تو اہل فکر و نظر سے مخفی رہیں یا انکی اہمیت مذکورۂ بالا کتابوں کی طرح نہیں تھی، اس لیے انھوں نے انکا ذکر نہیں کیا، اسلیے آج ان کا نام بھی نہیں معلوم۔ واللہ اعلم۔

وفات: امام نسائی کو شامیوں کی مار پیٹ سے اتنی ضربات پہنچی تھیں کہ اسی صدمہ سے ۳۰۳ھ میں انکا انتقال ہو گیا، اتنا مسلم ہے کہ ان کی وفات اسی سے ہوئی لیکن اس تفصیل میں روایات مختلف ہیں، جب ان کو اپنی موت کا یقین ہو گیا تو انھوں نے اپنے رفقاء سے خواہش ظاہر کی کہ انھیں مکہ لے چلیں، ابن خلکان، حافظ ذہبی، ابن جوزی، ابن حجر اور ابن سبکی کا بیان ہے کہ راستہ میں مرو کے مقام میں ان کی وفات ہو گئی اور وہیں دفن کیے گئے، ابن کثیر نے ایک قول نقل کیا ہے کہ بیت المقدس میں دفن کیے گئے، لیکن ابن کثیر، دارقطنی، سیوطی، ابن عماد ابو یونس وغیرہ کا بیان ہے کہ مکہ میں وفات پائی اور صفا و مروہ کے درمیان دفن ہوئے، سنہ وفات ۳۰۳ھ مسلم ہے، مگر بعض کے نزدیک شعبان اور بعض کے نزدیک صفر میں وفات پائی، انتقال کے وقت ۸۸ سال کی عمر تھی،

(باقی)

---

[1] اعلام

جدید عربی ادب کے چند پہلو

ڈاکٹر عبد الکریم جرمانس
مترجمہ مولوی محمود الحسن صاحب ندوی

(۲)

اس کے بعد ڈرامائی شاعری کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا۔ دراصل ڈرامائی ادب عربی میں بالکل نئی چیز ہے۔ اس صنف میں ابتدائی کوششیں خالص قومی نقطۂ نظر سے کی گئیں اور قومی جذبات کو ابھارنے کے لیے اسلاف کی عظمت کے واقعات پیش کیے گئے۔ اس بارہ میں کہ اسٹیج پہ منظوم ڈرامے کے ذریعہ خیالات ظاہر کیے جاسکتے ہیں یا نہیں، لوگوں کا اختلاف ہے،

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے عزیز اباظہ کے منظوم ڈرامہ غروب الاندلس کے دیباچہ میں لکھا ہے "منظوم ڈرامہ اپنی ابتدائی عمر سے آگے نہیں بڑھ سکا اور یہ صنف مواد اور نظم دونوں کو سخت نقصان پہنچاتی ہے۔ اسٹیج پر نثر ہی قابل ترجیح ہے۔" اس کے برعکس عزیز اباظہ کی رائے یہ ہے کہ "عوام کے لیے منظوم ڈرامہ ہی زیادہ دلچسپ ہوتا، جیسا کہ مغربی اسٹیج کے ڈراموں کی کامیابی سے ظاہر ہے۔" احمد شوقی نے پہلی مرتبہ عربی ادب کو منظوم ڈرامے سے روشناس کرایا اور مغربی شعراء کی تقلید کے چند نمونے پیش کیے، چونکہ وہ غیر معمولی ذہین اور عربی شاعری کی روایات سے پوری طرح آگاہ تھے، اس لیے ڈرامائی نظموں میں انھوں نے ان شاندار روایات کو پوری طرح برتا، ایک زمانے میں یہ خیال تھا کہ عربی شاعری کی لچک اس صنف کے لیے بہت موزوں ثابت ہوگی، مگر یہ خیال صرف شوقی کی حد تک تو صحیح ہوسکتا ہے

اس کے بعد منظوم ڈرامہ نگاری پر زوال آگیا، اور ڈرامہ نگار پھر نثر کی طرف واپس آگئے۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اپنے ایک مضمون میں عزیز اباظہ کی مخالفت کرتے ہوئے لکھا ہے "ڈرامائی ادب پہلی جنگ عظیم کے بعد وجود میں آیا، اس نے شوقی کو بالکل بدل دیا، اب وہ درباری شاعر نہیں بلکہ عوام کا ہمنوا بن گیا اور اس کے اثرات نے شوقی کو نیا ادبی طرز اپنانے پر مجبور کیا، اس نئے نظریہ نے اسکے اندر خوشنائی اور قومی شعور کے احساسات پیدا کیے اور اس نے مغربی ڈرامہ نگاروں سے ہمسری کی کوشش کی۔"

یہ بات خاص طور پر ملحوظ رکھنے کے قابل ہے شوقی شاعر پہلے سے تھا، اور ڈرامہ نگار بعد میں بنا یہی وجہ ہے کہ وہ اس صنف میں کامیاب نہ ہوسکا، اس کے ڈرامے مترنم ہیں، اور اس کے مکالمے اس خوبی کی بنا پر بہت پسند کیے گئے اور گویوں نے انھیں گا کر بام شہرت پر پہنچا دیا۔

عراق چونکہ دنیا کے معاشی محور سے بہت دور ہے، اس لیے وہ اپنی پرانی اور فرسودہ روایات کو قائم رکھنے میں بہت حد تک کامیاب رہا۔ عراق کے متعدد شاعروں میں جنھیں انائیل نے اپنی کتاب "الادب العصری" میں پیش کیا ہے، ممتاز شخصیت "جمیل صادق الزہاوی" کی ہے، زہاوی کے چہرے سے اسلامی مشرق کے پرجوش نیک نیت اور فلسفی شاعر کی خصوصیات آشکارا ہوتی ہیں۔ اس کے لمبے پریشان بال، بے ترتیب داڑھی اور بے رونق آنکھیں مشرق کے پریشان احوال کی غمازی کرتی ہیں۔ زہاوی جسمانی طور پر بہت ہی کمزور تھا، وہ مشکل سے اپنے پاؤں ہلا سکتا تھا، بغداد کے قہوہ خانوں میں سفید خچر پر سوار ہوکر جایا کرتا تھا، اور وہیں اپنے فرصت کے اوقات مختلف تفریحوں میں گذارتا اور نظمیں لکھتا تھا، اس نے متعدد سائینٹفک رسالے بھی لکھے ہیں، ان رسالوں میں زہاوی نے تخلیق کائنات اور اس کے عمل کو قانون کشش کے بجائے الیکٹرون کے ردعمل کی جانب منسوب کیا ہے۔ ان سائنٹفک نظریات کے علاوہ اس نے متعدد نظمیں لکھی ہیں، حلیم مصری اپنی مذکورۂ بالا کتاب میں زہاوی کو عربی شاعری کا مجدد تسلیم کرتا ہے، ٹھنڈے دماغ اور سنجیدہ فکر کے انسان اپنی جذباتی رو کو جذب کرلیتے ہیں،

تاہم اس کے اشعار میں تخیل کی کمی نہیں ملتی۔

زہاوی کی شاعری Palo Uolesy اور Wonds wasth سے ملتی جلتی ہے،

زندگی کے مسائل نے اس میں دلچسپی کی روح پھونکی اور قلم کو اس کے اظہار پر آمادہ کیا۔ ڈارون کے نظریۂ ارتقا پر اس کی نظم کے بعض اشعار یہ ہیں:

عاش فی الغاب القرد دهرا طویلا — قبل ان یلتقی للرقی سبیلا

ولد القرد قبل ملیون عام — بشرا فارتقی قلیلا قلیلا

ای شیء الم بالقرد حتی — هجر الغاب نجله والقبیلا

انه لولا العقل لکان ضعیفا — وعلیه الحیاة عبئا ثقیلا

وعلی رجلیه مشی بعد ان سا — ر علی اربع زمانا طویلا

اتخذ الحجر بعد نحت سلاحا — یتقی الوحش ضاریا ان یصولا

ان عقل الانسان خیر سلاح — ولقد تفضل العقول العقولا

یا له من تطور حول القرد — لانسان بحسن التخییلا

ترقی کا راستہ ملنے سے پہلے بندر نے صدیوں تک جنگل میں زندگی کے ایام گذارے،

لاکھوں برس پہلے بندر سے آدمی وجود میں آیا، آہستہ آہستہ اس نے ارتقاء کی منزلیں طے کیں

اس میں کونسی تبدیلی ہوئی جس کی وجہ سے وہ اپنے صحرائی وطن، اولاد و خاندان سے جدا ہو گیا،

اس کے عقل نہ آتی تو بہت کمزور رہتا، اس کی زندگی ہمل اور بڑی بوجھل ہوتی، اپنے چاروں

پیروں سے وہ صدیوں چلتا رہا، پھر دو پیروں سے چلنے لگا، اس نے پتھروں کو گڑھ کر ہتھیار بنائے

تاکہ حملہ آور جانوروں سے اپنی حفاظت کر سکے، انسان کا بہترین ہتھیار اس کی عقل ہے، وہ عقل

جو تمام دوسری عقلوں سے بازی لے گئی، بندر کے انسان بننے میں کسی زبردست تبدیلی اور اس کا

تخیل کتنا حسین ہے۔

یہ عقلی انداز ہے اعتزال پسندوں اور اخوان الصفا کے منکرین سے مختلف نہیں کہا جا سکتا، وہ اپنی
اس طویل نظم کو ان اشعار پر ختم کرتا ہے ؎

کل ظنی ان الحیاۃ علی الارض | بدت من تفاعل الکیمیاء
وھی لیست فی کل ذالک الا | مظھرا من مظاھر الکھرباء
ولدا الکھرباء فی الارض احیاء | بدت قبل البر والدأماء
ثم ان الحیوان بعد دھور | صار انساناً ماشیاً باستواء
وقضت سنۃ الوراثۃ فیہ | ان تکون الابناء کالآباء

میرا گمان ہے کہ روئے زمین پر زندگی کیمیاوی ردعمل سے وجود میں آئی، اس کی حقیقت اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ وہ کہربا کا مظہر ہے، زمین و سمندر کی پیدائش سے پہلے اس قوت نے زمین میں زندگی پیدا کر دی تھی، پھر ایک طویل زمانہ کے بعد جانور سیدھا چلنے پھرنے والا انسان بن گیا، قانون وراثت کا یہ فیصلہ ہے کہ آبا و اجداد کی طرح اس کی نسلیں بھی ہوں،

زہاوی کی عقلیت خالص مشرقی اور خود اس کے اپنے وجدان کا نتیجہ ہے، جب کبھی اس پر تشکیک غالب آتی ہے تو کہتا ہے ؎

حیرۃ فی الحیوۃ قد صدفتنی | عن بلوغی من الحیوۃ مرامی
وقفت انی الطیل وقوفاً | فی ممر الشکوک والاوھام

راز حیات کے تحیر سے زندگی کے مقصد تک میری رسائی نہیں ہوئی، میں شکوک و اوہام کی راہوں میں مدتوں پڑا رہا ہوں۔"

خفاجی نے زہاوی کے مندرجۂ ذیل اشعار میں ابو العلاء المعری کے اثرات کی جانب اشارہ کیا ہے،[1]

---

[1] یہ اشعار اسلیے نقل کیے گئے ہیں تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ آزادی خیال اور الحاد و بیدینی کی وبا کہاں تک پہنچ چکی ہے اور عربی کی یہ شاعری کس راہ پر جا رہی ہے ؎ ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں ؛ تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

وان اکبر شئ فیک یعجبنی | سخریۃ بتقالید وعصیان
وا نکروا فیک الحاد وزندقۃ | وعلی ما انکروہ فیک بہتان
اننی تلمذت فی سنی علیک وان | ابلت عظامک ازمان وازمان
اصابنی فی زمانی ما اصابک من | حیف فما رد ھذا الحیف انسان

تیری سب سے بڑی خوبی جو مجھے پسند آئی وہ تیری طبیعت کی بغاوت اور قدیم روایات کا تمسخر و استہزا ہے، تجھے لوگوں نے ملحد زندیق کہا اور بہتان کے طومار باندھ دیے، میں نے تیری شاگردی اختیار کی، اگرچہ تیری ہڈیوں کو مرور ایام نے گلا دیا، میرے حصہ میں وہی ظلم وجور آیا جو تجھکو ملا تھا، اور جس کو کسی انسان نے نہیں روکا۔

زہاوی کو ان آزادانہ خیالات کے نتائج سے بھی دوچار ہونا پڑا اور بغداد کے دیندار طبقہ نے اس پر اعتراضات کی بوچھار کردی جس کا جواب اس نے اپنی کتاب "مجمر الصادق" میں دیا ہے۔

زہاوی نے غنائیہ نظمیں بھی لکھی ہیں جس سے اس کے جذبات کی گہرائی کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے مندرجۂ ذیل اشعار میں ایک خیالی محبوبہ کو مخاطب کیا ہے ؎

ابیت فی الدار وحدی | معانقا لخیالک
قد غرنی انہ کا | ن باسما کمثالک
لم تسألینی عما | اصابنی بعد ذالک
ما زلت اضمر حبا | مناسبا لجمالک
ابیع کل حیاتی | بساعۃ من وصالک
انی بحبک یا لیلی | لا محالۃ ھالک
فھل ساخطر یوما | اذ ھلکت ببالک

"میں تیرے تصور میں تنہا گھر میں سوتا ہوں، اس چہرہ نے مجھے دھوکا دیا، کیونکہ وہ تیری طرح مسکرا رہا تھا، اس کے بعد مجھ پر کیا گذر گئی یہ نہ پوچھو میں برابر تیرے جمال کے شایان شان تیری محبت کرتا رہا، تیری وصال کے ایک لمحہ کے عوض پوری زندگی بیچ دوں گا، اے لیلی تیری محبت میں ضرور ہلاک ہو جاؤں گا، کیا میرے مرنے کے بعد کبھی تیرے دل میں میرا خیال آئیگا"

زہاوی کے احساسات اتنے بے تکلف ہیں کہ اس کا اسٹائل گیتوں کے اسٹائل سے مل گیا ہے، شوقی نے اپنی کتاب میں زہاوی کی شاعری پر بڑی پرزور تنقید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے "اس کی شاعری بہت زیادہ سائنٹفک ہے اور سائنس بہت زیادہ شاعرانہ ہے، وہ زندگی کے حسن سے نہ تو حقیقی طور پر لطف اندوز ہو سکتا ہے، اور نہ اس کے قبح پر آنسو ہی بہا سکتا ہے"۔

اس کے برعکس خفاجی لکھتا ہے کہ "زہاوی لطیف جذبات کا شاعر ہے، اس نے قنوطیت سے دامن بچا کر المعری کی تقلید کی ہے، وہ رجائیت پسند انیسویں صدی کی آغوش میں پروان چڑھا تھا جس میں انسان عقل اور عقلیت پر زیادہ بھروسہ رکھتا تھا، اس نے اپنی رزمیہ نظم میں المعری کی بہت تعریف کی ہے، زہاوی کے وطن پرستانہ جذبات اس کی نظم "انما فی الرجال غیر القلم" میں بڑے شد و مد سے ملتے ہیں۔

اب میں عراق سے نکل کر دوسرے ملک میں داخل ہوتا ہوں، یہ ملک اگرچہ تاریخی روایات سے مالا مال نہیں ہے، پھر بھی خوشحالی مستقبل کی طرف نگاہیں اٹھا رہا ہے، سوڈان حال ہی میں گمنامی کا پردہ چاک کر کے ابھرا ہے، اور سیاسی کشمکش کی بنا پر اس منطقۂ حارہ کی جانب لوگوں کی نگاہیں اٹھنے لگی ہیں۔

ایک جواں مرگ شاعر اپنے وطن پرستانہ جذبات کو بڑے پرزور طریقہ سے مصر کے سامنے پیش کرتا ہے، التیجانی بشیر کی نظمیں ابھی کتابی شکل میں نہیں آئی ہیں، اور صرف رسالوں و اخبارات

کے صفحات میں منتشر ہیں، امید ہے کہ آنے والی نسل ان نظموں کو اکٹھا کرکے شائع کرے گی، یہ شاعر سوڈان اور مصر میں فطری اتحاد کا قائل تھا، چنانچہ کہتا ہے:

افلسنا الاخی هوی جمیعنا	سرحة الفکر فی اواصر کبری
مصر وایشت وثقفت والمدت	منه شمسا واطلعت فیه بدرا
کیف یا قومنا نباعد من فکر	ین شدا وساندا لبعض اثمرا
کیف قولوا بجانب النیل شطیعه	ویجری علی شواطی اخری
کلما انکروا ثقافه مصر	کنت من صنعها ایراعا و فکر

کیا ہم سب بھائی بھائی نہیں جنھیں وحدت خیال کے مضبوط رشتے نے آپس میں مربوط کر دیا ہے، مصر سرسبز و شاداب اور مہذب ہوا، اور اس کی سرزمین پر چاند اور سورج طلوع ہوئے، اے میری قوم ہم ان دونوں نظریات سے کیسے دست بردار ہو سکتے ہیں، یہ نظریات ایک دوسرے کا سہارا ہیں، لوگ کیسے کہتے ہیں کہ نیل اپنی صدیوں کی راہ چھوڑ کر دوسری طرف بہنے لگے گی، جب بھی میرے اصل وطن نے مصر کی ثقافت کا انکار کیا میں نے اپنے خیالات اس کی دین تسلیم کیے۔

التیجانی بشیر نے اپنے وطن پرستانہ جذبات کا اظہار اپنی ایک مشہور نظم "وحی المحمد" میں کیا ہے، سید اسماعیل الازہری کی حج سے واپسی پر یہ نظم کہی گئی تھی، ایک اور نظم "مدینۃ الشعر والجمال" میں نہایت حسین و تخیلی انداز میں خرطوم کی تعریف کی ہے، ایک اور نظم "انوار القلب" میں سوڈان کے موسم بہار کا منظر بہت خوبصورتی سے کھینچا گیا ہے، جگہ کی قلت اس کی مثالیں پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتی،

میرے لائق دوست ذکی ابوشادی کی صاحبزادی نے خاص طور پر مجھے اپنی جانب متوجہ کیا ہے

ن کی غیر معمولی قابلیت کی بنا پر چند سطریں ان کے متعلق لکھنا ضروری ہیں، پیشہ ورڈاکٹر اور ماہر
ر تومیات ابوشادی نے یورپین بیوی کی مدد سے اپنے گھر میں اپنی ایک دنیا بنالی تھی، انھوں نے
یکسپیر کے ڈرامے عربی میں منتقل کیے، اور انگریزی شاعری کی آزادی و تازگی دونوں کو اس میں
قرار رکھا، انھوں نے بے لچک عربی شاعری کو زندہ اور صداقت سے معمور شاعری کے قالب
یں ڈھالنے کی کوشش کی جس کی مخالفت بھی اسی شد و مد سے ہوئی مگر انھوں نے اپنی سرگرمیوں کا
ائرہ سماجی بہبود تک وسیع کر دیا اور زرعی اصلاحات کے لیے کوشش کی، خطابات کے غلط استعمال
ا پسندیدگی کا اظہار کیا، اس کوشش کی سزا میں انھیں بڑی تکلیفیں پہنچائی گئیں، اتفاق سے انکی
یوی کا انتقال ہوگیا، بیوی کی موت سے اپنے وطن مصر میں تنہائی محسوس ہوئی، اور وہ امریکہ چلے
گئے اور وہیں انتقال کیا، ان کی تصنیفات کچھ چھپ چکی ہیں اور بعض کے مسودے محفوظ ہیں، ان
کارنامے جس طرح ان کی زندگی میں اختلاف کا سبب رہے آیندہ بھی بحث و مباحثہ کا موضوع بنیں گے،

ان کی صاحبزادی صوفیہ نے اپنے والد کے اثر سے امریکن ماحول سے متاثر ہوکر آزاد شاعری
کی طرف توجہ کی اس کا دیوان ۱۹۵۴ء میں قاہرہ سے شائع ہو چکا ہے، جس سے اس کے تخیل اور
س کی حریت پسند روح کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے، اس کے قصیدوں میں مشرق و مغرب کا
خوشگوار امتزاج ہے، اور اس کی تمام نظمیں مقفیٰ نثر کا نمونہ ہیں، شاعری کا یہ اسلوب جبران اور
میاز یادہ نے بھی اپنایا تھا، اس کی بنیاد سیدھے سادھے خیالات پر ہے، اس میں تخیل اور جذبات
کا بھی امتزاج ہے، اور وہ ایک طرح کا منطقی نغمہ ہے، جو قافیہ اور عروض کی قیدوں سے آزاد ہے،
عرب تنقید نگار شاعری کی اس صنف کے بارے میں مختلف الخیال ہیں، کچھ نقادوں کا
خیال ہے کہ شاعری الفاظ کی صنعت کاری کا نام ہے، وہ الفاظ جو تخیل کے بازووں پر ابھرتے
اور ہمارے احساسات و خیالات میں گہرائی پیدا کرتے ہیں، وہ اس نقطۂ نظر کی حمایت میں اسلامی شاعر

حضرت حسان بن ثابت کا یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ ایک بار ان کے صاحبزادے نے نیش کی تعریف کی، باپ نے حیرانی اور پسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا "بیشک یہی شاعر ہے"۔ اور بشار ابن برد کا یہ واقعہ پیش کرتے ہیں کہ اس کی نصیحت آمیز تقریر سن کر حاضرین پکار اٹھے "بیشک تمھاری نثر نظم سے زیادہ شاعرانہ ہے"۔

مگر دوسرے نقادوں کی رائے اس سے مختلف ہے، ان کا خیال ہے کہ شاعری میں عروض وہیئت ضروری ہے، ان دونوں کے بغیر جو شاعری ہوگی وہ ناکام ہوگی، صوفیہ کی نظمیں اگرچہ ہیئت کی پابند نہیں ہیں، پھر بھی ان میں احساس کی گہرائی پائی جاتی ہے، اس کی نظم یاس

اقضی الایام تائہتہ فی بیداء	میں اپنے ایام حیات تاریکی کے صحراؤں میں
من الظلام ..... والطرقات	سراسیمگی کے ساتھ گذارتی ہوں، راستے گھلے
المتضاربۃ کلھا المشاب شائکۃ	ملے ہیں، ہر طرف خار دار جھاڑیاں ہی ہیں نے
فاذا حسبت الامل امامی یومی	گمان کیا کہ امید سامنے کھڑی میری طرف
الی وجدتہ السراب لقامی عنی یخذ	اشارہ کر رہی ہے، تو وہ سراب نکلا،

اپنے قصیدوں "الزورق الصغیر" اور "وسط المحیط" میں اس کشمکش کو نظم کیا، جس سے زندگی میں ان کو واسطہ پڑا" فی عینک الدموع" میں گہرے جذبات کی پر درد صدائیں سنائی دیتی ہیں، اس کے دیوان میں مزاحیہ اشعار بھی ملتے ہیں، الزیاتی (symbolic) اشعار بھی اس کے یہاں پائے جاتے ہیں جنمیں زندگی کے سنجیدہ مسائل تخیل کے لباس میں بیان کیے گئے ہیں، غرض صوفیہ جدید عربی شاعری کا ہونہار نمونہ ہے،

آیئے سمندر پار کرکے پھر مصر آئیں جو پوری ایک صدی سے عربی تہذیب کی نشاۃ ثانیہ کا علمبردار ہے، جدید مصنفین کی وسیع جماعت میں عبد الغنی حسن کی شخصیت نمایاں نظر آتی ہے، اس نے ابن الرومی

پر ایک فاضلانہ کتاب لکھی ہے، خود بھی غیر معمولی شاعر ہے، اس کی وہ تمام نظمیں جو ۱۹۲۰ء سے لیکر ۱۹۵۴ء کے اثنا، میں لکھی گئیں، حال ہی میں کتابی شکل میں "ناض من العمر" کے نام سے شائع ہوئی ہیں یہ دیوان ان پرجوش اور ولولہ انگیز اشعار سے شروع ہوتا ہے، خفاجی نے ان اشعار کا مقابلہ بحتری اور شریف مرتضیٰ کے ابیات سے کیا ہے ؎

من هولاء الصامتون بغيركم | من هولاء المجهون تقدموا

مابالكم تقضى الامور بغيركم | ويكون دونكم القضاء يبرم

وتكادكف الطامعين تصيبكم | وتنال ماقرحوا المطامع منكم

الغانمون الارض بعد محمد | اضحوا وفى كل ارض مغنم

یہ خاموش لوگ کون ہیں، بولو آواز دو، اے جھجکنے والو آگے بڑھو، تم کو کیا ہوگیا ہے کہ تمھارے معاملات کا تصفیہ تمھاری مرضی کے بغیر کیا جاتا ہے، حریصوں کے ہاتھ تم تک پہنچنے والے ہیں، اوران کی حرص وطمع پوری ہونے والی ہے، محمد علی کے بعد لیڈروں کا تسلط ہوگیا اور انھیں ہر جگہ لوٹ کھسوٹ کا موقع مل گیا۔

اتنی بات بہرحال واضح ہے کہ غنی حسن انقلابی شاعر ہے اور موجودہ مصری سماج کی سستی ترقی سے غیر مطمئن ہے، وہ بڑی دلیری سے للکارتا ہے،

يا ايها الاحرار فى خطواتكم | نغم من الصوت القوى الخالد

هو اصوت كل مكافح عن حقه | بين الحتوف وصوت كل مجاهد

هو اصوت احرار الرجال اذا مشوا | للغاية الكبرى بقلب واحد

هو اصوت كل مناضل متحرر | من ربقه الرق القديم البائد

اے حریت پسندو! تمھارے قدموں کے نیچے قوت وابدیت کی صدائیں سنائی دیتی ہیں، یہ

آواز ہر اس مرد مجاہد کی ہے جو اپنے حق کے لیے ہلاکت کے موقعوں پر لڑنے والا ہے، یہ آواز ان حریت پسندوں کی ہے جو ایک مقصد عظیم کے لیے یکجان و متحد ہو کر جد و جہد کرتے ہیں، یہ ان احرار کی صدائیں ہیں جو غلامی کے فرسودہ اور قدیم بندھنوں کو توڑنے لگے ہیں۔

غنی حسن کی ایک کتاب ابھی شائع ہوئی ہے، جس میں انھوں نے متعدد تارکین وطن شاعروں کی تخلیقات بھی شامل کی ہیں، عزیز اباز انے اس کتاب کے دیباچہ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ کسی تارک وطن شاعر نے ڈرامائی نظم میں اضافہ نہیں کیا، لیکن میرے نزدیک یہ رائے کسی حد تک غیر منصفانہ ہے، اباظہ نے اس ماحول کو نظرانداز کر دیا ہے جس میں ان شعرا کو رہنا پڑا، وہ مغربی زندگی کی اس نئی تشکل کے عادی نہیں تھے، ان کی شاعری میں یاد وطن کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دیتی ہے، وہ اب بھی جذباتی طور پر اپنے آبائی وطن سے وابستہ تھے، جہاں تک ڈرامائی شاعری کا تعلق ہے ذکی ابو شادی نے امریکہ میں متعدد ڈرامے نظم میں لکھے ہیں، ان میں ابن زیدون، امرأ القیس اور کلوپیٹرا وغیرہ تاریخی ڈرامے قابل ذکر ہیں۔ ان کا آخری شاندار ڈرامہ غالباً ابھی تک شائع نہیں ہوا ہے، ایک اور ڈرامہ "من نافذة التاریخ" المقتطف میں شائع ہوا تھا، وہ بھی مکمل نہیں، اس کا آخری ایکٹ غیر مطبوعہ ہے، جو آجکل "وادی فلسطین" کے قبضہ میں ہے۔ اس میں شاعر نے انسانیت کی تاریخ ڈرامائی انداز میں پیش کی ہے، اور انسان کا المیہ خاص طور پر بہت موثر ہے۔

غنی حسن نے اپنی کتاب میں جن تارک الوطن شاعروں کا ذکر کیا ہے ان کے نام یہ ہیں: علیا ابو ماضی، جبران، الیاس فرحت، میخائیل نعیمہ، شکراللہ، شفیق المالوف، رشید ایوب، الیاس قنصول، فوضی المعلوف وغیرہ

متعدد امریکن عرب شاعروں نے علامتی نظمیں بھی لکھی ہیں، ان میں ابو شادی، ناصب ادیدا، رشید ایوب، عبدالمسیح حداد، علیا ابو الماضی قابل ذکر ہیں، یہ تمام شعرا انجمن رابطہ نیویارک سے تعلق رکھتے ہیں، مشیل المالوف اور رشید الخوری الشاعر القروی کے قلمی نام سے شمالی امریکہ میں

لکھتے ہیں، انھوں نے ۱۹۲۳ء میں عصبۃ الاندلسی کے نام سے ادبی انجمن بھی قائم کی تھی۔

آخر میں چند سطریں حجاز اور کویت کے ادب پر بھی لکھی جاتی ہیں، کچھ سال پہلے یہاں کوئی ایسی ادبی تخلیق نہیں ہوئی تھی جسے خاص اہمیت دیجائے، میں نے ایک مضمون میں جو اسلامک ریویو میں شائع ہوا تھا، اس پر تبصرہ کیا تھا، اس دور میں ضرور ایک حد تک تھوڑی بہت شاعری موجود تھی، لیکن صرف گنے چنے اسکول کے اساتذہ اور سرکاری ملازمین اس کے شایق تھے،

جب سے بین الاقوامی آمد و رفت نے سعودی عربیہ کو اپنے حلقہ میں شامل کیا ہے اور دوسرے ملکوں سے ثقافتی تعلقات کے دروازے کھلے ہیں اس وقت سے نئے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں اور جدید سماجی مسائل کا مقابلہ کرنے اور قومی پستی کو زور قلم سے سدھارنے کی جد وجہد کا آغاز ہوا ہے، اور نئے شعراء میں عبد اللہ عبد الجبار، ابراہیم حسن غلالی، سید الاموری اور محمد حسن عواد قابل ذکر ہیں،

عبد اللہ عبد الجبار نے ناولیں اور ڈرامے بھی لکھے ہیں، یہ جدید ادبی اسکول سے تعلق رکھتے ہیں اس کا ثبوت ان کے ڈرامے "امّی" سے ہوتا ہے، انھوں نے ابراہیم الغلائیلی کی تنقیدی کتاب "المرصد" کا تتمہ بھی لکھا ہے، ان کا دلچسپ ترین ڈرامہ "الشیاطین الخرس" ہے جو تعمیری مقصد رکھتا ہے، اس ڈرامے کے کردار انفرادی نوعیت کے حامل ہیں، کچھ قدامت پرستانہ نقطۂ نظر کی نمایندگی بھی کرتے ہیں اور کچھ ترقی پسند ہیں،

محمد حسن عواد کا دیوان "البارکم" کے نام سے ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا ہے، ابوشادہ نے انکو جدید رومانٹک شاعر قرار دیا ہے، ان کی نظم "متی" کے اشعار ملاحظہ ہوں،

متی نرتقی المجد الصریح المخلدا — وتکتب فی التاریخ فخراً مؤبدا

متی نملک الشأن الرفیع جلالہ — ونرمی الی العلیاء سہماً مسددا

اما دجلال المجد ما المجد ما رح — بغیر جہاد یترک الشعب مسعدا

ہمیں غیر فانی عظمت کب ملے گی، اور کب تاریخ میں قابل فخر نقش ثبت کریں گے، جلالت وعظمت کی چوٹی پر کب پہنچیں گے اور کب بلندی پر عمدہ تیر پھینکیں گے، عظمت و سربلندی بغیر ۔۔ جد کے نہیں حاصل ہوتی اور حال یہ ہے کہ قوم کوشش سے غافل ہے،

صحرائے عرب کے سینے میں بھی اسی مسرت کا خواب مچل رہا ہے جو نام و نہاد مغربی تہذیب اقوام کو دے رہی ہے، عواد کا نیا دیوان "نحن کیان جدید" اس کی تمناؤں اور منصوبوں کا مظہر ہے،

سعید الاموری مجلۂ الحج کے اڈیٹر ہیں، انکی بعد کی تخلیقات "من تاریخنا اور" الذکری" میں ملتی ہیں،

کویت کا چھوٹا سا علاقہ بھی اب عالمی سطح پر آگیا ہے، اس علاقہ کے شاعروں میں شوقی الایوبی احمد زین الصقاق مشہور ہیں، امیر ستر الغازی کے دیوان سے چند اشعار ملاحظہ ہوں،

قبلتها وهي غضبى قبلة نطقت   لها بما جن قلبي من تباريح

تشيب في خدها ما شب في كبدي   ولاح من وجهها ما عشى بهاروحي

واد برت وكلانا في جوانحه   نار دمقلة غرقى لمسفوح

اس کی خفگی کے باوجود میں نے اس کا بوسہ لے ہی لیا تاکہ وہ درد و غم جو میرے قلب میں ہے اس سے بیان کردے، وہ شعلے جو میرے جگر میں بھڑکتے تھے اس کے چہرہ پر ہویدا ہوگئے، اس کے رخساروں نے وہ راز افشا کر دیا جو میری روح میں پوشیدہ تھا، وہ لوٹ گئی اور ہم دونوں کے سینوں میں آتش سوزاں تھی اور آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

یہ اشعار ابن شبل اندلسی کی ایک چھوٹی سی نظم "قبلة" کی یاد دلاتے ہیں، یہ نظم عربی شاعری کی عظمت دیرینہ اور اس کی تجدید کا آغاز ہے،

اس بے ترتیب اور مختصر جائزہ کو ختم کرنے سے پہلے "شیخ ابراہیم الدباغ" کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، یہ فلسطین کے رہنے والے تھے، ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا، ان کی ایک کتاب فی ظلال الحرّ

کے نام سے ۱۹۴۵ء کتابی شکل میں شائع ہوئی ہے، یہ کتاب ان خطوط پر مشتمل ہے، جو مصنف نے اپنے چچا کو لکھے تھے اور جو تاریخی، سیاسی اور سماجی حالات پر مشتمل ہے، اس کا دیباچہ "عادل الغدبان" کے قلم سے ہے، انھوں نے "دباغ" کو "شاعر الانسانیۃ" کے لقب سے یاد کیا ہے، دباغ انقلابی شاعر تھا، اور آزادی اس کے رگ و ریشہ میں سمائی ہوئی تھی، مگر اسے کیا خبر تھی کہ لیل و نہار کی گردشیں خود اسی کے گھر کی آزادی چھین لیں گی،

یاسائلی عن ھوی نفسی وبغیتھا　　من الحیٰوۃ وقد غصت بتکدیر

ھوای تحریر اھل الارض من ملأ　　من الطغاۃ واقطاب الدساتیر

فکل نفس لھا من سعیھا امل　　ولا تنال مناھا دون تحریر

اے میری روح کی خواہشات اور اسکی آرزو کے پوچھنے والو، میری زندگی غم واندوہ سے بھری ہے؛

میری خواہش یہ ہے کہ کمین ہر فرد کی کوششوں کا مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد بغیر آزادی کے نہیں حاصل ہوتا،

دباغ نے متعدد قصیدے لکھے ہیں جنہیں فلسطین کی ہولناک قسمت کی منظر کشی کی ہے، فلسطین الطاہرۃ، الوطنی الاول، اعلام الشرق، اعلام الوادی، دم الشہید وغیرہ مشہور قصیدے ہیں،

دباغ ازہری تھا، لیکن اس کی نشو ونما آزاد فضا میں ہوئی ہے، اس لیے حب الوطنی اور صوفیانہ جذبات دونوں اس کی شاعری میں ملتے ہیں، اس کے دوستوں نے اس کی تصانیف "حدیث الصومعہ" تاریخ الحریۃ فی العالم اور نقد شعراء العالم تلاش کر کے شائع کرائی ہیں،

بحیثیت مجموعی جدید عربی ادب ترقی کی راہ پر گامزن ہو چکا ہے، اور پوری جرأت سے دنیا کا ادبی مقابلہ کرنے کے لیے باقاعدہ آگے قدم اٹھا رہا ہے،

وفیات

کاکا محمد اسمٰعیل مرحوم مدراسی

از جناب مولوی ثناء اللہ صاحب جامعہ دارالسلام عمرآباد

کاکا اسمٰعیل صاحب مرحوم قوم و ملت کی ان شخصیتوں میں تھے جنھوں نے لاکھوں روپیہ کمایا اور لاکھوں قوم و ملت کی راہ میں صرف کیا، ہندوستان کے بہت سے مذہبی و قومی ادارے ان کی فیاضی سے سیراب ہوئے تھے، ایسے محسن قوم کے حالات سے دوسرے ارباب ثروت سبق حاصل کر سکتے ہیں۔

علاقہ مدراس ضلع نارتھ آرکاٹ کا تاریخی مقام گڑھ آمبور کاکا محمد اسمٰعیل صاحب کا وطن تھا، آپ کے والد کاکا حاجی محمد عمر صاحب ایک دیندار بزرگ، دولتمند تاجر، علماء کے عقیدت مند، فیاض اور غریب پرور تھے، دینی اور اصلاحی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے، مدراس کی روشن کمپنی جو علم نوازی میں مشہور تھی اور اب بند ہوگئی آپ اسکے ایک رکن تھے۔ گڑھ آمبور سے متصل اپنے نام کی مناسبت سے عمرآباد نامی ایک گاؤں آباد کیا اور وہیں ایک اعلیٰ دینی درسگاہ مدرسۂ دارالسلام کے نام سے ۲۴ء میں قائم کی، چند ہی سال بعد دسمبر ۲۸ء میں آپ کا انتقال ہوگیا، آپ کے بعد آپ کے فرزند اکبر کاکا محمد اسمٰعیل صاحب نے جملہ کاروبار کو نہایت خوبی سے سنبھالا۔ والد مرحوم کی جملہ خوبیوں کے علاوہ آپ میں اور بھی بہت سے کمالات تھے، علمی اور دینی خدمت کے جذبہ سے سرشار تھے۔ دولت کا بیشتر حصہ ملی و قومی کاموں میں خرچ کرتے تھے، صاحب دل

ص، موحد اور متبع سنت تھے، متعدد علمی ادارے بذات خود چلا رہے تھے، حسب ذیل ادارے
پ کی یادگار ہیں :

(۱) جامعہ دارالسلام عمرآباد

یہ ایک اعلیٰ دینی درسگاہ ہے جس میں طلبا، کی تعداد سو سے متجاوز ہے. اس میں رہائش، خوراک
، درسی کتابوں کا انتظام بغیر کسی فیس کے مدرسہ کی طرف سے ہوتا ہے. اساتذہ کی تعداد گیارہ بارہ
ے رہتی ہے، درس نظامی میں حذف و ترمیم کرکے اس کا ایک جدید، معقول اور جامع نصاب تیار
ا گیا ہے، مولانا سید سلیمان ندویؒ اس جامعہ کو جنوبی ہند کا ندوہ کہتے تھے.

(۲) محمدیہ اسکول

اس میں ہر قوم و مذہب کے بچے انگریزی اور ملکی زبانوں کی تعلیم پاتے ہیں، طلبا، کی تعداد
یباً دو سو اور اساتذہ کی چھ سات ہے

(۳) مدرسۂ نسواں

اس میں صرف مسلمان بچیوں کو دینی اور قومی تعلیم دیجاتی ہے. دو تین استانیاں کام کرتی ہیں.

(۴) عمر لائبریری

یہ ایک نہایت شاندار کتب خانہ ہے، جس میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور ٹمل کی
ی بہا کتابوں کا ذخیرہ ہے جس میں بلا تفریق ہر خاص و عام استفادہ کرتا ہے. ان کے علاوہ بہر
ے بڑے علمی اور دینی اداروں کی بڑی فیاضی سے امداد فرماتے تھے. دارالمصنفین کے لائف ممبر
، مولانا سید سلیمان ندویؒ سے آپ کو اور مولانا مرحوم کو آپ سے بڑی عقیدت و محبت تھی.

نہایت ہی عالی حوصلہ اور بلند ہمت تھے. تقریباً پندرہ سال سے آپ کا تجارتی کاروبار بالکل
ھا، جو ان اداروں کو چلانے کا سب سے بڑا سہارا تھا، لیکن آپ کی اولوالعزمی اور بلند ہمتی نے ان

اداروں کو بند ہونے نہ دیا اور کسی نہ کسی طرح چلاتے رہے، آپ کی فیاضی سے ہر قوم و ملت کے آدمی مستفیض ہوتے تھے، نہایت خلیق، متواضع اور ملنسار تھے، یگانہ بیگانہ، دوست اور دشمن سب آپ کے حسن اخلاق کے مداح تھے، بڑے دانشمند اور مدبر تھے، پیچیدہ سے پیچیدہ معاملات کو بڑی آسانی سے سلجھا دیتے تھے، اطراف کی ہر چھوٹی بڑی مسلم و غیر مسلم آبادی میں آپ کی حیثیت حکم کی تھی، ہر فرقہ کے لوگ اپنے خاندانی اور قومی اختلافات میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، اور آپ کے دانشمندانہ اور عادلانہ فیصلوں پر بے چون و چرا مطمئن ہو جاتے، آپ کی قومی اور ملکی خدمات کے اعتراف میں سرکار انگریزی نے "خان بہادر" کے لقب سے نوازا،

انتقال سے تین سال پیشتر آپ نے جامعہ کو چلانے کے لیے چند قابل اعتماد، مخیر اور ہمدرد ملت افراد کی ایک کمیٹی بنا دی جو بڑے اخلاص اور توجہ سے جامعہ کی دیکھ بھال کر رہی ہے، اور اس کی ترقی کے لیے فیاضی سے دولت خرچ کر رہی ہے۔

چار پانچ سال کے عرصہ میں آپ پر دو تین مرتبہ فالج کا حملہ ہوا، اور بالآخر اسی مرض میں ۴ مئی ۵۹ء جمعہ کی رات، دس بجے ستّر سال کی عمر میں انتقال کیا،

آپ نے اپنے پیچھے اپنے چھوٹے بھائی کاکا محمد اسحٰق صاحب ٹرسٹی جامعہ اور تین لڑکوں (کاکا رشید احمد صاحب سکریٹری محمدیہ اسکول و مدرسۂ نسواں، کاکا حاجی محمد عمر صاحب جائنٹ سکریٹری جامعہ دار السلام عمر آباد، کاکا حاجی مولوی سعید احمد عمری سکریٹری عمر لائبریری) اور پانچ لڑکیوں کو چھوڑا ہے۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ۔

مطبوعاتِ جدیدہ

حکمائے قدیم کا فلسفۂ اخلاق - از جناب بشیر احمد ڈار، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۴۹۸، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۵ے، ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔

کوئی قدیم ملک اور قوم بھی اخلاقیات کے اعلیٰ تصورات سے خالی نہیں ہے اور قدیم زمانہ سے ان میں اخلاقیات کے نظریات پائے جاتے رہے ہیں، اسی کی بنیاد پر مغربی قوموں نے فلسفۂ اخلاق مرتب کیا ہے، چین، ایران، یونان، مصر اور ہندوستان سب اخلاق و حکمت کا مرکز رہ چکے ہیں، اور یہاں کے حکما، و مصلحین نے اخلاقیات کی تعلیم دی ہے، اور اس کا فلسفہ بیان کیا ہے، مگر اب تک کوئی ایسی جامع کتاب نہ تھی، جس سے قدیم حکما کے فلسفۂ اخلاق کی تفصیل معلوم ہوتی، لائق مؤلف نے اس کتاب کے ذریعہ اس کمی کو پورا کیا ہے، یہ کتاب دس ابواب پر مشتمل ہے، ان میں حکیم کون فیوشس اور چین، گوتم بدھ، بھگوت گیتا، زرتشت، مانی، سقراط، افلاطون، ارسطو، رواقی اور مصری فلسفۂ اخلاق پر بحث کی گئی ہے اور انکا تقابلی جائزہ لیا گیا ہے، کتاب اس لحاظ سے بڑی قابل قدر ہے کہ اس میں ان مفکرین کی اخلاقی تعلیمات پر تنقید کرکے ان کی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور انکے مقابلہ میں اسلام کے اعلیٰ تصور اخلاق کو پیش کرکے اس کا تفوق ثابت کیا گیا ہے، بیشتر تنقیدیں صحیح اور معتدل ہیں، یہ کتاب اس کا ثبوت ہے کہ جدید علوم و فنون کی طرح فلسفۂ اخلاق کو یورپ کی ایجاد سمجھنا غلط ہے، اس کا اصل سرچشمہ مشرق ہی ہے، مولف نے یورپ کی اس ناقدر شناسی کا بھی ذکر کیا ہے، کتاب محنت و کاوش سے لکھی گئی ہے اور بڑی معلومات افزا ہے، موضوع کی خشکی کے باوجود انداز بیان میں شگفتگی ہے، اس کتاب کی اشاعت سے اردو میں ایک سنجیدہ اور مفید علمی کتاب کا اضافہ ہوا۔

الدین یسر - از مولانا محمد جعفر شاہ ندوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ،

صفحات ۳۶۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۶؎ پتہ ایضاً

اسلام ایک فطری اور جامع دین ہے، اس کے دائمی اصول و احکام میں تنگی اور تکلیف مالا یطاق نہیں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دین آسان ہے، مگر اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ شریعت کے قطعی احکام کو ہر شخص اپنے مزاج و مذاق کے مطابق بدل سکتا ہے، پیش نظر کتاب میں مؤلف نے دین کے آسان ہونے کی آڑ میں ان دینی احکام کی شکل و نوعیت میں بھی جو عہد نبویؐ سے ابتک مسلّم چلی آرہی ہے رد و بدل کا مشورہ دیا ہے، مثلاً نماز، اس کی ماثورہ دعاؤں، نماز جنازہ، روزہ، سرقہ، زنا اور شرب خمر کی حدود و تعزیرات کی دوسری متبادل صورتیں بھی اختیار کی جاسکتی ہیں، اور زکوٰۃ کے نصاب کی تعیین، شیخ فانی اور مشقت کا کام کرنے والے مزدوروں اور کسانوں سے روزہ نیز غلامی اور تعدد ازواج وغیرہ کو ختم کیا جاسکتا ہے، موجودہ حالت میں ضبط ولادت بہتر ہے، اگر مصروفیت کے باعث صرف فجر و عصر کی نمازیں پڑھ لیجائیں تو کافی ہیں، اور وضو میں اگر صفائی کے ساتھ اعضا دھو لئے جائیں تو تین مرتبہ دھونے کی مسنون قید پر عمل ضروری نہیں ہے، نماز مادری زبان میں پڑھی جاسکتی ہے، کتابی مردوں کیا مشرکین سے بھی ذہنی ارتقا کے زمانہ میں مومن عورتوں کے نکاح کی اجازت ہوسکتی ہے، جزیہ صرف اہل کتاب ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں، ورنہ مصنف کے نزدیک ارباب حل و عقد اسلام کے تمام قطعی احکام میں ترمیم کرکے اس کو آسان بنا سکتے ہیں، اس سے اس کتاب کی نوعیت اور ثقافت اسلامیہ کے ذہنی اور دینی کارناموں کا اندازہ ہوسکتا ہے، کتب فقہ کے متعلق مصنف کا یہ شکوہ بیجا ہے کہ اس میں طہارت، صلوٰۃ اور نکاح وغیرہ مسائل کے ساتھ تزکیۂ ایمان اور اخلاق کے ابواب کیوں نہیں ہیں اسلیے کہ فقہ تو ظواہر شریعت ہی سے بحث کرتی ہے، امت کے متفقہ تعامل کو صرف اس لیے رد کرنا کہ اس زمانہ میں ملوکیت، استبداد اور بہت سی بدعتوں پر بھی

امت کا تعامل ہو گیا ہے، محض مغالطہ ہے، ان خامیوں کے ساتھ کتاب میں بعض مفید باتیں بھی ہیں، انداز بیان شگفتہ اور مدعا کو سمجھانے کے لیے بکثرت مثالیں پیش کی گئی ہیں، اس کتاب سے مصنف کی ذہانت تو ضرور ظاہر ہوتی ہے، مگر دینی نقطۂ نظر سے سخت گمراہ کن ہے۔

رکعاتِ تراویح - از مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶، قیمت تحریر نہیں، پتہ: ناظم صاحب جامعہ مفتاح العلوم مئو۔

فاضل مولف کی شخصیت تعارف سے مستغنی ہے، اس رسالہ میں انھوں نے دلائل سے آٹھ رکعت تراویح کو غلط اور بیس کو صحیح ثابت کیا ہے، اور یہ دکھایا ہے کہ ساڑھے بارہ سو سال تک امت کا عمل بیس رکعت یا اس سے زائد پر تھا، فاضل مصنف کی نظر حدیث و فقہ پر بڑی گہری ہے اور انھوں نے زیر بحث مسئلہ پر بڑی محققانہ بحث کی ہے، لیکن ان کے تمام دلائل سے اتفاق ضروری نہیں ہے اور انکے جیسے سنجیدہ اہل قلم سے جماعت اہل حدیث خصوصاً صاحب تحفۃ الاحوذی مولانا عبد الرحمٰن مبارکپوری مرحوم پر طنز و تعریض نگاہ میں کھٹکتی ہے،

رحمت دو عالمؐ - مولفہ علامہ قاری احمد صاحب تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، صفحات ۵۰۱ - مجلد مع رنگین گردپوش، قیمت عکر ناشر محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل مقابل مولوی مسافرخانہ کراچی نمبر ا

سیرت نبویؐ پر اردو میں اتنا لکھا جا چکا ہے کہ ان کی مدد سے مستقل کتابیں تیار ہو سکتی ہیں، اس نئی کتاب میں بھی سیرت پاک کی کچھ جھلکیاں دکھائی گئی ہیں، اور اس کے آخر میں اخلاق و عادات کے عنوان کے تحت حدیث کی معتبر کتابوں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال اور معمولات اور بعض صحابہؓ کے مختصر حالات بھی تحریر کیے گئے ہیں، زبان و بیان، کتابت و طباعت اور واقعات کی صحت میں اس سے زیادہ اہتمام کی ضرورت تھی، کتاب عام خواندہ مسلمانوں کے لائق ہے،

مینائے غزل - از جناب بشیر فاروق، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۱۹۲، مجلد مع گرد پوش قیمت ستے، پتہ مکتبہ اللہ زار حبیب جون لمیٹڈ بنگ، الفنسٹن اسٹریٹ، کراچی۔

یہ جناب بشیر فاروق (کوئٹہ) کا مجموعہ کلام ہے، اس سے ان کی قادر الکلامی اور خوش مذاقی کا اندازہ ہوتا ہے، شاعر کا غم "غم جاناں" کے بجائے "غم دوراں" ہے، "تلاش" و "تلاطم" میں ان کا اصل رنگ نمایاں ہے، باطنی محاسن کے ساتھ طرز ادا و بیان کی خوبیوں سے بھی کلام آراستہ ہے، شروع میں جناب جگر مراد آبادی، رئیس امروہوی اور خواجہ عبد الحمید عرفانی نے شاعر کا تعارف اور اس کے کلام کی خصوصیات بیان کی ہیں،

المطالعۃ العربیۃ حصہ اول و دوم } مولفہ جناب ابوبکر شبلی صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۶۳، ۶۳، قیمت عہ، عہ ناشر سندھ اکیڈمی، سکھر۔ مغربی پاکستان،

یہ عربی ریڈر عربی کے مبتدی طالب علموں کے لیے مرتب کی گئی ہے، اور اسباق کی مشقیں بھی دیدی گئی ہیں، وضاحت کے لیے تصویریں بھی ہیں، عربی زبان سیکھنے والوں کو اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے،

دیوان داؤد اورنگ آبادی - مرتبہ خالدہ بیگم صاحبہ چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر صفحات ۴، قیمت عہ نئے پیسے۔ پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد، حیدرآباد دکن

دکن کے مشہور شاعر سراج کے ہم عصر ایک اور شاعر داؤد دکنی تھے، جنکا پایہ شاعری میں سراج سے کم نہ تھا، لیکن انکے کلام کو ویسی شہرت حاصل نہ ہو سکی، خالدہ بیگم صاحبہ نے انکا دیوان تین قلمی نسخوں کی مدد سے مرتب کر کے شائع کیا ہے جو داؤد کی استادی اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے، دو سو سال قدیم ہونے کے باوجود کلام میں روانی اور سلاست ہے اور اسکے سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی، دیوان کے شروع میں داؤد کے مختصر حالات اور انکے کلام پر تبصرہ کیا گیا ہے، اسکی اشاعت سے اردو شاعری کی تاریخ میں ایک مفید کتاب کا اضافہ ہوا،

"ض"

سلسلۂ تابعین و تبع تابعین رض

اہل کتاب صحابہ و تابعین رض

شروع میں عرب کے یہود و نصاریٰ کی قدیم تاریخ اور ان کے تمدنی و سیاسی اثرات اور اُن کی دینی و اخلاقی حالت کی تفصیل اور اس کے بعد حروفِ تہجی کے اعتبار سے (۹۲) اہل کتاب صحابہ اور تابعین اور اُن کے بعد صحابیات اور تابعات کا تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے۔ مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

ضخامت ۲۶۵ صفحے قیمت: للعہ

تابعین رض

اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رض، حسن بصری، اویس قرنی، امام زین العابدین، سعید بن مسیب، محمد بن سیرین، ابن شہاب زہری، اور قاضی شریح وغیرہ ۹۰ اکابر تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور علمی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے۔ مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی

طبع دوم ضخامت ۵۷۶ صفحے قیمت عہ

تبع تابعین رض

(حصہ اوّل)

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں جس طرح صحابۂ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے اور صحابۂ کرام کے بعد اُنہی کی زندگی ملتِ اسلامیہ کے لئے نمونۂ عمل بنی، بالکل اسی طرح تابعین کرام کے جانشین اور اُن کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، سیر الصحابہ کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین تابعین کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کرچکا ہے، اب اُس نے اُن کے بعد کے مقدس تابعین بزرگوں اور ائمۂ دین کا مرقع تیار کرایا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور اُن کے فقہی مسلک کے داعی و علمبردار امام ابو یوسف، امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں اور فقہی اجتہادات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی حصہ اول ضخامت صفحے

قیمت:

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی دو کتابیں

خطباتِ مدراس

یہ وہی خطبات ہیں جو سید صاحب مرحوم نے ۱۹۲۵ء
میں مدراس میں سیرۃ نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر
دیئے تھے، یہ اپنے معلومات کی وسعت، مباحث کی
ندرت اور افادہ کے لحاظ سے سیرۃ کی ضخیم کتابوں پر
بھاری اور سیرۃ کے مقررین کے لئے بہت کارآمد ہیں،
دارالمصنفین نے اس کا نیا اڈیشن بڑے اہتمام و نفاست
سے تیار کرایا ہے ضخامت: ۱۸۲ صفحے، قیمت سے ر

رحمتِ عالم

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے رحمتِ عالم کے نام سے
سیرۃ پر نہایت سلیس اور عام فہم زبان میں ایک اور
چھوٹا سا رسالہ لکھا تھا جو بہت مشہور و مقبول ہوا، اور
بعض مدارس کے نصاب تعلیم میں بھی شامل کر لیا گیا
اس رسالہ کو مطبع معارف نے نہایت اہتمام سے دوبارہ
چھاپا ہے، یہ رسالہ پاکستان میں مکتبۃ الشرق آرام باغ
کراچی سے بھی مل سکتا ہے ضخامت: ۱۴۰ صفحے قیمت ۱۲ر

(دارالمصنفین کی نئی کتاب)

ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک ایک جھلک

یہ تیموری عہد سے پہلے کے مسلمان حکمرانوں کے دور کی سیاسی، تمدنی، اور معاشرتی تاریخ ہے،
اس میں اس عہد کے ہندو مسلمان مورخین کی کتابوں اور مضامین کے وہ تمام اقتباسات جمع کر دیئے
گئے ہیں جن سے اس عہد کے سیاسی، اقتصادی، تجارتی، تمدنی اور معاشرتی حالات معلوم ہوتے ہیں اور
پھر مسلمانوں کی تاریخ کے روشن پہلو ہندو مورخوں کی زبان سے اور ہندوؤں کے علمی کارنامے مسلمان
مورخوں کے قلم سے نقل کئے گئے ہیں جن کو مربوط طور پر پہلی مرتبہ اردو میں پیش کیا گیا ہے۔

ضخامت: - ۵۰۶ صفحے قیمت: سے ؁

مرتبہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے علیگ

رجسٹرڈ نمبر ا ۵۲۰ نومبر ۱۹۵۹ء

معارف

مجلس المصنّفین دار المصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتّبہ

شاہ معین الدّین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دار المصنّفین اعظم گڈھ

مجلسِ ادارت

تاریخ دعوت و عزیمت حصّہ دوم

یعنی

علامہ ابنِ تیمیہؒ کے سوانح حیات

اس میں آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم و مصلح شیخ الاسلام حافظ تقی ابن تیمیہ حرانی کے سوانحِ حیات، اُن کے صفات و کمالات، اُن کی علمی و تصنیفی خد ان کا تجدیدی و اصلاحی کام اور مقام اور اُن کی اہم تصنیفات الجواب الصحیح منہاج فی نقض کلام الشیعہ والقدریہ کا مفصّل تعارف اور اُن کے ممتاز تلامذہ اور منتسبین حافظ ا رحمۃ اللہ علیہ، ابن الہادی، ابنِ کثیر اور حافظ ابنِ رجب وغیرہ کے حالات بیان ک گئے ہیں۔

ضخامت ۳۹۲ قیمت : عہ/

مؤلفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی

قیمت .... ـــــے

جلد ۸۴ ماہ جمادی الاول ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۹ء نمبر ۵

فہرست مضامین

اعلان

شذرات

پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے بعد ادب و صحافت کے میدان میں سب سے ممتاز او
رنگا رنگ شخصیت عبد المجید صاحب سالک مرحوم کی تھی، وہ ادیب و شاعر بھی تھے اور صحافی و مزا
نگار بھی، ان کا مذاق بڑا ستھرا اور قلم متوازن تھا، ایک زمانہ میں ان کی ذات لاہور کی ادبی سرگرمیوں کا
تھی، پنجاب کے بہت سے نوجوان ادیب و صحافی ان ہی کے دامن تربیت کے پروردہ ہیں، طبعاً بڑ
باغ و بہار، سخن طراز اور بزم آرا تھے، انھوں نے علم و ادب کے ساتھ ملک و ملت کی بھی خدمت انجام
متعدد علمی و ادبی تصانیف ان کی یادگار ہیں، ان میں "مسلم ثقافت ہندوستان میں" ان کے حسن ذ
کا نمونہ ہے، ابھی تھوڑے دن ہوئے "ہم نہیں ہوں گے" کی ردیف و قافیہ میں ان کی ایک بڑی دلکش نظ
نظر سے گذری تھی، کیا معلوم تھا کہ یہ شاعری اتنی جلد واقعہ کی شکل اختیار کرلے گی، علم و ادب کی محفا
میں مدتوں ان کی یاد آتی رہے گی، اللہ تعالیٰ علم و ادب کے اس خادم کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفر

گذشتہ مہینہ اعظم گڈھ کی ایک پرانی یادگار حاجی رشید الدین صاحب نے بھی وفات پائی، مرحوم ترجمان ا
مولانا حمید الدین فراہیؒ کے سگے اور مولانا شبلی مرحوم کے ماموں زاد بھائی تھے، دار المصنفین سے انکا تعلق
اور مخلصانہ تھا، اس کی مجلس انتظامیہ کے رکن بھی تھے، مولانا حمید الدین صاحب مرحوم کے بعد مدرسۃ الاصلاح
کو انہی نے سنبھالا تھا، اور عرصہ تک اس کے ناظم رہے، ادھر چند سال سے ضعف پیری کی وجہ
اس خدمت سے سبکدوش ہو گئے تھے، طبعاً بڑے نیک سیرت، پاک دل اور مرنجاں مرنج تھے، مولا

لے اعزہ میں سب سے زیادہ سن رسیدہ اب وہی رہ گئے تھے، نوے سال کے قریب عمر تھی، ادھر کئی سال سے بالکل معذور ہو گئے تھے، ہوش و حواس نے بھی جواب دیدیا تھا، صرف رشتۂ حیات باقی تھا، افسوس کہ وہ بھی منقطع ہو گیا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی رحمتِ کاملہ سے نوازے۔

ابھی یہ سطریں زیرِ تحریر تھیں کہ مولوی سید محمد احمد صاحب کاظمی ایڈوکیٹ الہ آباد کے انتقال کی خبر ملی، مرحوم پرانے اور پکے کانگریسی تھے، ہر زمانہ میں اپنے مسلک پر قائم رہے، قوم پروری کے ساتھ دیندار بھی تھے، اور ان کے دل میں مذہب و ملت کا بھی درد تھا، اور مسلمانوں کے بعض مفید کام انھوں نے انجام دیے، پارلیمنٹ کے ممبر بھی رہے تھے، اور مسلمانوں کے نظامِ قضا کے متعلق ایک بل بھی پیش کیا تھا، لیکن پھر اس کے انجام کا پتہ نہ چلا، ایسے نیشنلسٹ اب مشکل سے ملیں گے، جو ملک و وطن اور مذہب و ملت کے حقوق میں توازن قائم رکھ سکیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کی ملّی خدمات کو قبول اور ان کی مغفرت فرمائے۔

گذشتہ مہینہ بھارتیہ ودیا بھون بمبئی کی کتاب "دی ہسٹری اینڈ کلچر آف دی انڈین پیپل" کے تذکرے کے سلسلہ میں ہم نے ہندوؤں اور ہندو مورخین کی فرقہ پرستی کے بارے میں جو خیالات ظاہر کیے تھے، اس پر بعض ہندو دوستوں نے توجہ دلائی ہے کہ ان دونوں کی فرقہ پرستی کے متعلق یہ تعمیم صحیح نہیں ہے، ایسے ہندو مورخین بھی ہیں جن کا دامن تعصب و تنگ نظری سے پاک ہے، اور ان کی کسی تحریر سے مسلمانوں کو کوئی شکایت نہیں ہو سکتی، اسی طریقہ سے فرقہ پرست ہندوؤں کے مقابلہ میں قوم پرور ہندوؤں کی تعداد زیادہ ہے۔ اس لیے ان کو بڑی جماعت سے تعبیر کرنا صحیح نہیں ہے، اور فرقہ پرستوں کی ٹکر تنہا مسلمانوں سے نہیں ہے، بلکہ حقیقت میں

دو نظریوں اور دو قوتوں یعنی فرقہ پرستی اور قوم پروری میں مقابلہ ہے، اس لیے اسی نقطۂ نظر سے اسکو دیکھنا چاہیے اور اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہم اس نیک مشورے کے شکرگذار ہیں، یہ پہلو ہماری نگاہ سے مخفی نہیں تھا، اور اس سے انکار نہیں کہ آج بھی ایسے وسیع القلب، شریف الطبع اور منصف مزاج ہندو موجود ہیں جن سے مسلمانوں کو کوئی شکایت نہیں اور وہ ہندو مسلمانوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے، یہی حال قوم پرور ہندوؤں کا ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت دو نظریوں میں ٹکر ہے، مگر اس کا نشانہ مسلمان بنتے ہیں، یہ بھی قابل انگیز تھا، بشرطیکہ قوم پروروں کی نمایندہ کانگریس اپنے اصولوں پر قائم اور فرقہ پرستی سے پاک ہوتی اور جرأت و دلیری کے ساتھ فرقہ پرستی کا مقابلہ کرتی، اس وقت یہ امید ہوسکتی تھی کہ یہ صورت حال عارضی ہے اور کانگریس ایک نہ ایک دن فرقہ پرستی پر غالب آجائے گی، لیکن افسوس ہے کہ خود کانگریس میں فرقہ پرستوں کا غلبہ اتنا ہو گیا ہے کہ جو دو چار بچے کھچے سچے کانگریسی باقی رہ گئے ہیں وہ بھی ان کی مخالفت کی ہمت نہیں کر سکتے، اگر کبھی کوئی آواز بلند ہوتی ہے تو اتنی کمزور ہوتی ہے کہ اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، حتی کہ پنڈت جواہر لال نہرو ان کے مقابلہ میں بے بس ہیں اور فرقہ پرستوں کی قوت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، ایسی حالت میں فرقہ پرستی کے استیصال کی شکل کیا ہے، اور مسلمان کس امید پر اور کب تک دل کو تسلی دیتے رہیں۔

اور شکایتوں کو جانے دیجئے، ایک اردو ہی کے مسئلہ کو لے لیجئے جو بڑی حد تک ہندو مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ ہے، مگر مسلمانوں کو اس لیے اس سے زیادہ لگاؤ ہے کہ وہ ان کا تنہا لسانی نہیں تہذیبی مسئلہ بھی ہے، اسی لیے اس کو قابل گردن زدنی قرار دیا گیا ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو کی پر زور

تقریروں اور حکومت کے مسلسل وعدوں کے باوجود خود پنڈت جی کے وطن اور ان کی راجدھانی تک میں جو اردو کے مرکز ہیں، وہ زندگی کے سارے حقوق سے محروم ہے، اس لیے ہندو فرقہ پرستی کی شکایت کیا بیجا ہے، اور اس کے خلاف احتجاج کی اس کے سوا شکل کیا ہے کہ اس کے لیے آواز بلند کی جائے اور جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تو پھر قوم پروری اور فرقہ پرستی کے نازک حدود کا لحاظ رکھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل پر گذرتی ہے۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کہ اب بھی سچے قوم پرور ہندوؤں کی ایک جماعت موجود ہے، جو ہندوستان کو صحیح جمہوری اور سیکولر راستہ پر لیجانا اور سب اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک چاہتی ہے، اسی سے حکومت کی جمہوریت اور سیکولرزم کا بھرم قائم ہے۔ اور یہ جماعت خواہ کتنی ہی چھوٹی اور اس کی آواز کتنی ہی کمزور ہو بہر حال تقویت اسی کو پہنچانا ہے کہ ملک کی فلاح کی امیدیں اسی سے وابستہ ہیں۔

دارالمصنفین کے بانی مولانا شبلی مرحوم کا نقطۂ نظر ہمیشہ قوم پرورانہ رہا اور وہ اس زمانہ میں کانگریس کے حامی تھے جب مسلمان جماعتی حیثیت سے اس سے الگ تھے۔ اور انھوں نے ہندو مسلمانوں کو قریب لانے اور ان کے درمیان غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے بڑے پر زور مضامین لکھے، اس لیے دارالمصنفین کی پالیسی بھی شروع سے یہی رہی اور اس کے کارکن علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس کی کوشش کرتے رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے مضامین کے علاوہ اس مقصد کے لیے "عرب و ہند کے تعلقات" جیسی فاضلانہ اور بے مثل کتاب لکھی، اور اسی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے اسلامی دور کی پوری تاریخ دارالمصنفین سے مرتب و شائع کرنا چاہتے تھے اور اس کا پورا خاکہ انھوں نے معارف میں

دو نظریوں اور دو قوتوں یعنی فرقہ پرستی اور قوم پروری میں مقابلہ ہے، اس لیے اسی نقطۂ نظر سے اسکو دیکھنا چاہیے اور اس کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے۔

ہم اس نیک مشورے کے شکر گذار ہیں، یہ پہلو ہماری نگاہ سے مخفی نہیں تھا، اور اس سے انکار نہیں کہ آج بھی ایسے وسیع القلب، شریف الطبع اور منصف مزاج ہندو موجود ہیں جن سے مسلمانوں کو کوئی شکایت نہیں اور وہ ہندو مسلمانوں کو قریب لانے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن ان کی تعداد بہت تھوڑی ہے یہی حال قوم پرور ہندوؤں کا ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ اس وقت دو نظریوں میں ٹکر ہے، مگر اس کا نشانہ مسلمان بنتے ہیں، یہ بھی قابل اگیز تھا، بشرطیکہ قوم پروروں کی نمایندہ جماعت کانگریس اپنے اصولوں پر قائم اور فرقہ پرستی سے پاک ہوتی اور جرأت و دلیری کے ساتھ فرقہ پرستی کا مقابلہ کرتی، اس وقت یہ امید ہو سکتی تھی کہ یہ صورت حال عارضی ہے اور کانگریس ایک نہ ایک دن فرقہ پرستی پر غالب آجائے گی، لیکن افسوس ہے کہ خود کانگریس میں فرقہ پرستوں کا غلبہ اتنا ہو گیا ہے کہ جو دو چار بچے کھچے سچے کانگریسی باقی رہ گئے ہیں وہ بھی ان کی مخالفت کی ہمت نہیں کر سکتے اور اگر کبھی کوئی آواز بلند ہوتی ہے تو اتنی کمزور ہوتی ہے کہ اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا، حتی کہ پنڈت جواہر لال نہرو تک ان کے مقابلہ میں بے بس ہیں اور فرقہ پرستوں کی قوت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، ایسی حالت میں فرقہ پرستی کے استیصال کی شکل کیا ہے، اور مسلمان کس امید پر اور کب تک دل کو تسلی دیتے رہیں۔

اور شکایتوں کو جانے دیجئے، ایک اردو ہی کے مسئلہ کو لے لیجئے جو بڑی حد تک ہندو مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ ہے، مگر مسلمانوں کو اس لیے اس سے زیادہ لگاؤ ہے کہ وہ ان کا تنہا لسانی نہیں بلکہ تہذیبی مسئلہ بھی ہے، اسی لیے اس کو قابل گردن زدنی قرار دیا گیا ہے اور پنڈت جواہر لال نہرو کی پرزور

فریدوں اور حکومت کے مسلسل وعدوں کے باوجود خود پنڈت جی کے وطن اور ان کی راجدھانی کم میں یہ اردو کے مرکز ہیں، وہ زندگی کے سارے حقوق سے محروم ہے، اس لیے ہندو فرقہ پرستی کی شکایت کیا بیجا ہے، اور اس کے خلاف احتجاج کی اس کے سوا شکل کیا ہے کہ اس کے لیے آواز بلند کی جائے اور جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا ہے تو پھر قوم پروری اور فرقہ پرستی کے نازک حدود کا لحاظ رکھنا بڑا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل پر گذرتی ہے۔

مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس سے انکار نہیں کہ اب بھی سچے قوم پرور ہندوؤں کی ایک جماعت موجود ہے، جو ہندوستان کو صحیح جمہوری اور سیکلر راستہ پر لیجانا اور سب اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک چاہتی ہے، اسی سے حکومت کی جمہوریت اور سیکلرزم کا بھرم قائم ہے، اور یہ جماعت خواہ کتنی ہی چھوٹی اور اس کی آواز کتنی ہی کمزور ہو بہرحال تقویت اسی کو پہنچانا ہے کہ ملک کی فلاح کی امیدیں اسی سے وابستہ ہیں۔

دار المصنفین کے بانی مولانا شبلی مرحوم کا نقطۂ نظر ہمیشہ قوم پرورانہ رہا اور وہ اس زمانہ میں کانگریس کے حامی تھے جب مسلمان جماعتی حیثیت سے اس سے الگ تھے۔ اور انھوں نے ہندو مسلمانوں کو قریب لانے اور ان کے درمیان غلط فہمیاں دور کرنے کے لیے بڑے پرزور مضامین لکھے، اس لیے دار المصنفین کی پالیسی بھی شروع سے یہی رہی اور اس کے کارکن علمی اور عملی دونوں حیثیتوں سے اس کی کوشش کرتے رہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے مضامین کے علاوہ اس مقصد کے لیے "عرب وہند کے تعلقات" جیسی فاضلانہ اور بے مثل کتاب لکھی، اور اسی نقطۂ نظر سے ہندوستان کے اسلامی دور کی پوری تاریخ دار المصنفین سے مرتب و شائع کرنا چاہتے تھے اور اس کا پورا خاکہ انھوں نے معارف میں

شائع کیا تھا، اور اس کے لیے مورخین کا ایک بورڈ بھی بنایا تھا، یہ کام شروع بھی کیا گیا تھا، مگر مالی دشواریوں کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکا، اب دارالمصنفین نے اس کو شروع کیا ہے، اور اس سلسلہ کی ایک کتاب "ہندوستان کے قرون وسطیٰ کی ایک ایک جھلک" شائع ہو چکی ہے، اس میں ان تاریخی واقعات کو نمایاں کیا گیا ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں قربت دیگانگت پیدا ہو اور اس سلسلہ کی دوسری کتابیں زیر تالیف ہیں، دارالمصنفین آیندہ بھی اسی راہ پر گامزن رہے گا،

اب ایک نیا اور آزاد ہندوستان تعمیر ہو رہا ہے، اس لیے غلامی کے دور کے بہت سے تصورات اور سوچنے کے طریقوں کو بدلنے کی ضرورت ہے جس میں تاریخ بھی شامل ہے، اب محض تاریخ نگاری کا نہیں بلکہ تاریخ سازی کا دور ہے اور اسکی ذمہ داری ہمارے مورخین پر بھی ہے کہ وہ ایسی تاریخیں لکھیں جو قومی وحدت، ہندوستان کی ترقی و استحکام کے لیے مفید ہوں، نہ کہ اس کو نقصان پہنچائیں، ایسی تاریخیں لکھنا جس سے ہندوستان کے مختلف فرقوں میں اختلاف و عناد پیدا ہو، ملک کے ساتھ دشمنی ہے، اس سلسلہ میں بعض چیزوں کی وضاحت کی ضرورت تھی جسکی ان محدود صفحات میں گنجایش نہیں ہے، ہم آیندہ کسی موقع پر اسکی تفصیل پیش کرینگے۔

ادارہ معارف اسلامیہ لاہور کے بعد ہندوستان میں کوئی ایسا ادارہ نہ رہ گیا تھا جس میں اسلامی علوم و فنون کے ماہرین جمع ہو کر اپنی تحقیقات پیش کر سکیں، اس کمی کو محسوس کر کے ادارۂ علوم و فنون اسلامی مسلم یونیورسٹی نے اس کا ایک آل انڈیا ادارہ قائم کیا ہو جس کا پہلا جلسہ دسمبر ۱۹۵۷ء میں علی گڈھ میں ہوا تھا، اب دوسرا جلسہ ۲۷، ۲۸، دسمبر ۱۹۵۹ء کو علی گڈھ ہی میں ہوگا، امید ہے کہ اسلامیات سے ذوق رکھنے والے اصحاب علم اپنی شرکت اور اپنے مقالات سے اسکو کامیاب بنائیں گے۔

مقالات

سید صاحبؒ کی یاد میں

از

جناب مولانا نجم الہدیٰ صاحب ندوی

راقم الحروف علامہ سید سلیمان ندوی کا حقیقی ماموں زاد بھائی ہے، سید صاحب کی ولادت ۲۳ صفر ۱۳۰۲ھ میں ہوئی، اور راقم رجب ۱۳۰۱ھ میں پیدا ہوا، اس طرح وہ مجھ سے چھ مہینے چھوٹے تھے، لیکن بچپن سے ندوہ کی تکمیل تعلیم تک میرا ان کا ساتھ اس طرح رہا کہ میری زندگی کی تمام باتوں سے وہ واقف رہے اور میں ان کی ہر بات کا ہمراز رہا۔ اب وہ ساری باتیں خواب و خیال بنکر رہ گئی ہیں، لیکن ان کی خوشگوار یاد اب بھی میرے لیے سرمایۂ حیات بنی ہوئی ہے، جناب شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی اور عزیزی سید صباح الدین عبد الرحمٰن کا برابر تقاضا رہا کہ میں سید صاحب کے خاندانی اور ابتدائی زندگی کے حالات قلمبند کروں لیکن میں کوئی اہل قلم نہیں، اس لیے اس کی تکمیل سے گھبراتا رہا، مگر دونوں عزیزوں کے مسلسل اصرار پر کچھ حالات پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، شاید برادرم شاہ معین الدین کو حیاتِ سلیمانی کی ترتیب میں ان میں کچھ کام کی باتیں مل جائیں۔

سید صاحب کی ولادت دیسنہ میں ہوئی، جو بہار شریف ضلع پٹنہ سے آٹھ میل شمال مشرق میں واقع ہے، اس گاؤں کے آثار قدیمہ سے پتہ چلتا ہے کہ کسی زمانہ میں شاید یہاں سے جین یا بودھ مذہب

والوں کا کچھ تعلق رہا ہے، چنانچہ اب بھی بعض حصوں کی کھودائی کے وقت عہد عتیق کی اینٹیں اور پتھر نکلتے ہیں، ۱۳۰۲ھ سے قبل جب دیسنہ کی مسجد کی تعمیر ایک بلند مقام پر شروع کی گئی تو بنیاد کھودتے وقت اندر سے ہزاروں پختہ اینٹیں برآمد ہوئیں، جو ڈیڑھ فٹ مربع او مستطیل اور تقریباً ۱½ انچ موٹی تھیں، یہی خداداد اینٹیں مسجد کی بنیاد میں کام آئیں، قیاس ہے کہ اس جگہ کوئی گڑھ رہا ہوگا جو اس کی تاریخی اہمیت کی دلیل ہے،

گاؤں کے چاروں طرف پٹھانوں کی قدیم بستیاں ہیں، خود دیسنہ میں بھی ایک دو گھر پٹھانوں کے رہ گئے ہیں، خیال یہ ہے کہ بہار میں جب مسلمانوں کی حکومت قائم ہوئی تو کچھ مسلمان تو شہروں میں آباد ہوگئے ہوں گے اور کچھ گاؤں میں پھیل گئے ہوں گے، اور جو مقامات جنگی حیثیت سے اہم تھے، وہاں پٹھان کثرت سے آباد ہوگئے، چند پٹھان خاندان اس "دیس نو" میں بھی آباد ہوگئے، جو بعد میں دیسنہ کے نام سے مشہور ہوا، پٹھانوں کے بعد سادات آئے اور ان کے بعد ملک آباد ہوئے،

دیسنہ کے دو حصے ہیں، جو زمینداری کے خاتمہ سے پہلے مہاراجہ ٹکاری ضلع گیا کے خالصہ آراضیات کا حصہ تھا، اور دیسنہ کا مشرقی حصہ کلیان پور دیسنہ یا امیٹہ دیسنہ کے نام سے موسوم ہے، اس کی مالگذاری مہاراجہ ٹکاری کو دینے کے بجائے سرکاری خزانہ میں داخل کیجاتی تھی، میری ذاتی تحقیق یہ ہے کہ دیسنہ کا مغربی حصہ شہنشاہ اکبر کے خالصہ آراضیات میں تھا جسے اکبر نے اس عہد کے راجہ ٹکاری کو اس کے حسن خدمات کے صلہ میں بطور انعام دیدیا تھا، اسی وقت سے اس کا نام اکبر پور پڑ گیا، راجہ ٹکاری کے خاندان میں ابتک عہد اکبری کے فرامین موجود ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کو انعام میں بہت سی جاگیریں دی گئیں۔

دیسنہ کا دوسرا مشرقی حصہ پانچ سو بگھے میں پھیلا ہوا ہے، اور کلیان پور دیسنہ کہلاتا ہے،

اور ایمہ اراضی کے نام سے بھی مشہور ہے، ایمہ اراضی کے نام سے بہت سی آراضیات مشرقی بہار کے مواضعات میں موجود ہیں، یہ ان قطعات زمین کو کہا جاتا ہے جو دہلی کے بادشاہوں نے علماء و مشائخ کو عطا کی تھیں، جو سرکاری اصطلاح میں ائمہ کہلاتے تھے، دیسنہ کی آراضی ائمہ اسی قسم کی ہے، عہد مغلیہ کے آخری دور میں بہار کا صوبہ دار کلیان سنگھ ہوا تو اس نے اسکو اپنے نام سے موسوم کر لیا، تاکہ اس کی یادگار بھی رہ جائے، اور خالصہ آراضی اکبر پور سے تفریق بھی ہو جائے۔

سادات دیسنہ کے مورث اعلیٰ حضرت میر حسن شہید کا نسب نامہ حضرت امام علی رضا سے ملتا ہے، ان کے آبا و اجداد مشہد مقدس سے شہاب الدین غوری کے ساتھ ہندوستان آئے، میر حسن شہید عہد اکبری سے بہت پہلے بہار تشریف لائے اور دیسنہ میں مقیم ہوئے اور عہد اکبری میں جب دین الٰہی کا فتنہ اٹھا تو اس سیاسی اور مذہبی بحران میں میر حسن نے شہادت پائی، اور دیسنہ ہی میں مدفون ہیں، ان کی شہادت کے بعد ان کے صاحبزادے سید عثمان دیسنہ ہی میں متوطن رہے، اور ان کی دوسری اولادیں اور مقامات پر منتقل ہوگئیں، سید عثمان کے اکلوتے صاحبزادے میر سید سلیمان تھے، ان کے دو لڑکے تھے، حضرت صدر الدین اور حافظ میر جان محمد، سادات دیسنہ ان ہی دونوں بھائیوں کی نسل سے ہیں، اور جب بہار کے سادات کا عروج ہوا تو حضرت صدر الدین کو ائمہ دیسنہ کے علاوہ اور بھی جاگیر ملی، جس میں سے ایک حصہ انکے چھوٹے بھائی حافظ جان محمد کے نام پر چک جان محمد کے نام سے ابتک مشہور رہے، یہ جاگیر زمینداری کے خاتمہ تک سادات دیسنہ کے قبضہ میں تھی۔

سید صاحب کا دادھیالی سلسلہ رضوی اور نانہالی سلسلہ زیدی ہے، اوپر جاکر چوتھی پشت میں دونوں مل جاتے ہیں، دادھیالی سلسلہ حسب ذیل ہے:

سید سلیمان ندوی بن حکیم سید ابوالحسن بن حکیم سید محمد شیر عرف حکیم محمدی بن میر عظمت علی ابن میر وجیہ الدین عرف میر حکّن بن میر رجب علی بن میر محمد شیر بن حضرت میر صدر الدین نورشا علی (موجودہ آبادی موضع دیسنہ) بن میر سید سلیمان بن میر سید عثمان بن سید حسن شہید بن سید شمس الدین ابن میر سید خلیل بن میر سید عرب ثانی بن میر سید مالک بن میر سید منیر بن میر سید محمد بن میر سید شمس محمد احمد ابن سید معین محمد بن میر محمد بن سید عرب اول بن سید امیر برّان بن میر سیّد میران بن میر سید ابن میر سید محمد بن سید یوسف بن سید اسحاق بن سید یعقوب بن سید حسن بن امام علی رضا بن امام موسیٰ رضا بن امام جعفر صادق بن امام محمد باقر بن امام زین العابدین بن امام حسینؓ شہید کربلا بن حضرت فاطمہؓ بنت حضرت رسالت مآب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم۔

ان کا ننہالی سلسلہ حسب ذیل ہے:

سید سلیمان ندوی بن بی بی قطبن بنت حکیم سید حیدر حسین بن حکیم سید کاظم حسین بن حکیم سید خادم حسین بن حکیم سید رحمت اللہ بن سید امین اللہ ساکن موضع مسیان مقیم دیسنہ شادی از دختر میر صدر الدین علیہ الرحمہ بن سید محمد فاضل بن سید غلام حیدر بن سید عبد الہاشم بن سید عبد اللہ بن سید علاول بن سید ملوک بن سید چاند شہید (مزار بر کوہ پاربتی مضافات بہار) بن سید یحییٰ بن سید محمد عرف سید ہیبت بن سید یحییٰ بن سید محمود بن سید زید بن سید مسعود جاجنیری زا غزنولی ابن سید محمود بن سید بن سید ابوالفرح واسطی بن سید داؤد بن سید حسین بن سید یحییٰ بن سید زید بن سید عمر بن سید ابابکر علی بن سید حسین بن سید علی بن سید محمد بن سید ابویحییٰ عیسیٰ مؤتم الاشبال ابن امام زید شہید بن امام زین العابدین بن امام حسینؓ شہید کربلا بن حضرت فاطمہ الزہراؓ بنت حضرت رسالت مآب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلّم۔

سید صاحب کے ننہالی سلسلہ میں چار پشت تک طبیب ہوتے رہے۔ اطراف بہار

بن یہی پہلا خاندان ہے جس میں طبابت کا سلسلہ برسوں جاری رہا، سید صاحب کے نانا اور میرے دادا حکیم سید حیدر حسین اپنے وقت کے مشہور طبیب تھے، اور اسلام پور ضلع پٹنہ کے مشہور رئیس چودھری ظہور الحق کے خاندانی معالج تھے، پٹنہ کے مشہور حکیم عبد الحمید صاحب کو چودھری صاحب نے کسی موقع پر علاج کے لیے بلایا تو انھوں نے حکیم سید حیدر حسین کے نسخوں کو دیکھ کر فرمایا کہ ان کے ہوتے ہوئے میری ضرورت نہ تھی، ان کے بڑے صاحبزادے سید ناظر حسن بھی بہت اچھے طبیب تھے لیکن عین عالم شباب ہی میں لاولد وفات پاگئے، اس لیے حکیم حیدر حسین کے انتقال کے بعد ان کی جگہ سید صاحب کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن صاحب کا تقرر ہوا، حکیم سید حیدر حسین کے والد حکیم سید کاظم حسین بھی بہت اچھے طبیب شمار کیے جاتے تھے، انکے والد حکیم سید رحمت اللہ دہلی کے مشہور طبیب حکیم محمد شریف خاں بن حاذق الملک حکیم محمد اکمل خاں سے فیضیاب ہوئے تھے،

سید صاحب کے دادا حکیم سید محمد شیر عرف حکیم محمدی کا شمار حاذق اطبار میں ہوتا تھا، انھوں نے شروع میں طب اپنے نانا حکیم سید خادم حسین اور اپنے ماموں حکیم سید کاظم حسین سے پڑھی، پھر ۱۲۴۷ھ سے ۱۲۵۱ھ تک پٹنہ میں رہ کر جناب قاضی محمد وحید الدین خاں کے یہاں رہ کر تکمیل تعلیم کی، طبابت پہلے بہار شریف پھر محلہ گبہہ شیخپورہ ضلع مونگیر میں کی اور وہاں کے نواب علی خاں کے دربار میں بڑی عزت و وقار کے ساتھ رہے، مزاج شاہانہ تھا، نازک مزاجی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی لیکن اپنے فن میں بڑی مہارت رکھتے تھے، اس لیے خاص و عام دونوں ان کی نازبرداری کرتے تھے، تقریباً چالیس سال تک وہاں مطب کرکے ۱۳۰۳ھ میں وفات پائی، بادۂ تصوف کے بھی ذوق آشنا تھے، بہار شریف کی درگاہ انبیر شریف کے سجادہ نشین حضرت شاہ محمد نور قدس سرہ العزیز سے بیعت تھے، اور اسی مناسبت سے تصوف پر ایک

رسالہ نورِ محمدی کے نام سے لکھا تھا، جو چھپ کر شائع ہو گیا ہے، طب پر بھی چند کتابیں لکھیں جن کے نام یہ ہیں، قرابادین محمدی جس کا تاریخی نام مخزن الحکمۃ العلیا، ہے، دستور العلاج یا اصول علاج، یہ دونوں کتابیں حضرت سید صاحب کے والد ماجد کی تعلیم کی خاطر لکھی تھیں، حکیم محمدی شعر و شاعری سے بھی ذوق رکھتے تھے، اور کبھی کبھی مناجات، بزرگانِ دین کی منقبت اور اپنے خاندان کے بزرگوں کی تاریخِ وفات کہا کرتے تھے، انھوں نے اپنا نسب نامہ بھی منظوم کیا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ پدری سلسلہ میں رضوی اور مادری سلسلہ میں زیدی تھے،

ایں نسب نامہ جانبِ ادر	نظم گویم برائے حفظ پسر
نام اجداد مادر خود را	از رہِ صدق می کنم افشا
رضوی ام بے گماں زرُوئے پدر	زیدی ام من ز جانبِ مادر
جدہ ام بنت میر عبداللہ	پس بجاں می کنم شکر اللہ
جد امجد طبیب حاذق بود	میر خادم حسین فایق بود
بے شک و شبہہ آں مسیح زمن	عالم طب و ماہر ہر فن
میر کاظم حسین اموں جاں	بے گماں بود آں طبیبِ ماں

حکیم محمدی کے چھوٹے بھائی مولوی مصطفٰی شیر نے جونپور میں مولانا سخاوت علی سے تعلیم پائی، جو مولانا ابوبکر شیث مرحوم سابق صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے جد امجد تھے، اسی لیے سید صاحب اور مولانا ابوبکر شیث صاحب کے بڑے گھرے مراسم تھے، اور مولانا مرحوم دیسنہ بھی تشریف لائے تھے، مولوی مصطفٰی شیر حصول تعلیم کے بعد سہسرام کے عربی مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے اور وہیں وفات پائی،

حکیم محمدی صاحب کے تین صاحبزادے تھے، جن میں سب سے بڑے سید صاحب کے والد ماجد

حکیم سید ابوالحسن صاحب تھے، ان کی شادی حکیم سید حیدر حسین مرحوم کی بڑی صاحبزادی سے ہوئی جو میری سگی پھوپھی تھیں، پہلے ذکر آچکا ہے کہ حکیم سید رحید رحسین اسلام پور ضلع پٹنہ کے مشہور رئیس چودھری ظہورالحق کے خاندانی معالج تھے، ان کی وفات کے بعد حکیم سید ابوالحسن ان کی جگہ خاندانی طبیب مقرر ہوئے، اور بڑے اعزاز کے ساتھ رہے، ان کی پوری زندگی وہیں گذری اور یہیں حضرت شاہ ولایت علی نقشبندی سے بیعت بھی کی، اور ان کے ساتھ حج کو بھی تشریف لے گئے، لیکن مرشد سے تربیت ابھی پورے طور سے حاصل نہیں کی تھی کہ ان کا وصال ہوگیا، جس سے حکیم صاحب موصوف کی تشنگی باقی رہ گئی، اس لیے کچھ دنوں کے بعد طبیعت میں اضطراب پیدا ہوا، جب یہ کیفیت ناقابل برداشت ہوگئی تو رہبر کی تلاش میں گھر سے پیدل نکل کھڑے ہوئے، بہار شریف کے ہر خانزادہ میں گئے مگر تشفی نہیں ہوئی، جھلی شریف اور پٹنہ سیٹی وغیرہ میں ٹھہرے، لیکن وہاں بھی سیری نہیں ہوئی، آخر میں پھلواری شریف کی خانقاہ پہنچے، صبح کا وقت تھا، سائبان میں لوگ بیٹھے تھے، چائے کا دور چل رہا تھا، یہ بھی ایک گوشہ میں جاکر بیٹھ گئے، حضرت شاہ علی حبیب قدس سرہٗ اس وقت سجادہ نشین تھے، انھوں نے اپنے خادم سے کہہ رکھا تھا کہ آج ایک مہمان آنے والے ہیں، وہ جب آجائیں تو اطلاع کرنا، جب کچھ تاخیر ہوئی تو خادم کو بلایا، خادم نے کہا کوئی مہمان ابھی تک نہیں آیا ہے، شاہ صاحب نے تاکید کی کہ باہر جاکر غور سے دیکھو، خادم باہر آیا تو برآمدہ میں ایک نووارد کو دیکھا جو سید صاحب کے والد ماجد تھے، ان کو ساتھ لیکر شاہ صاحب کے پاس گیا، دونوں میں تخلیہ میں ڈھائی گھنٹے تک راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں، چار دن کے بعد واپسی کا حکم ہوا، اور اسلام پور آکر پوری عمر ریاضت و عبادت میں گذار دی، اور وفات کے بعد اپنے مرشد کے پائیں سپرد خاک ہوئے،

حکیم سید ابوالحسن کے ایک لڑکی اور دو لڑکے تھے، صاحبزادی گاؤں ہی میں سید امیرالحسن ابن میر واعظ شیرین میر صفدر شیر سے بیاہی گئیں لیکن شادی کے فوراً ہی بعد بیوہ ہو گئیں، گاؤں کی تعلیم یافتہ خواتین میں ان کا پہلا یا دوسرا درجہ تھا،

بڑے صاحبزادہ کا اسم شریف سید ابو حبیب تھا، ان کی ابتدائی تعلیم گھر ہی پر ہوئی، عربی پٹنہ اور پھلواری شریف میں پڑھی، حضرت شاہ عین الحق صاحب خلف شاہ علی حبیب قدس سرہٗ کے ہمدرس تھے، مولانا شاہ نعمت علی صاحب سے حدیث اور پھر طب کی تعلیم پھلواری شریف میں مولانا شاہ سید سلیمان اور حکیم وارث حسن صاحب اور پٹنہ میں حکیم محمد نصیر سے پائی، بھوپال میں حضرت شاہ ابو احمد مجددی سے بیعت تھی، ان کا انتقال ۱۹۲۷ء میں ہوا، اور کاغذی محلہ بہار شریف میں سپرد خاک ہوئے، ان کے صاحبزادہ مولانا ابوظفر صاحب ندوی تھے، جو علمی دنیا میں اچھی طرح روشناس ہیں، تین صاحبزادیاں بھی ہیں، ایک سید عبدالباری صاحب اورسیر سے بیاہی گئیں جواب کراچی میں مقیم ہیں، دوسری مولوی عبدالحفیظ ندوی سے منسوب ہیں جو ریلوے ہائی اسکول کھڑگپور سے ریٹائر ہو کر اب وسینہ میں مقیم ہیں، تیسری اس حقیر راقم کی رفاقت کر رہی ہیں،

سید صاحب اپنے بڑے بھائی سے تقریباً ۱۹ سال چھوٹے تھے، گاؤں میں ان کا جدی مکان داؤد مرحوم کے مکان کے نام سے مشہور ہے، لیکن ان کے والد ماجد حکیم سید ابوالحسن نے اپنی شادی کے بعد ایک علحدہ مکان بنوایا جو اس وقت گاؤں کی مسجد کے پچھم اور شمال میں واقع ہے، اور اس میں آجکل ان کے خاندانی خادموں کا خاندان آباد ہے، یہیں سید صاحب کی ولادت ہوئی، ان کے والد نے ان کا نام ابونجیب رکھا، لیکن ان کے منجھلے چچا سید ابوتراب مرحوم نے سلیمان اعظم رکھا، اور وہ سلیمان ہی کے نام سے پکارے گئے،

سید صاحب نے اردو کی تعلیم اپنی ہمشیرہ سے پائی، وہ شروع سے کم آمیز تھے، اور

گاؤں کے ہمسن لڑکوں سے بہت کم ملتے تھے، گاؤں میں ایک زندہ دل بزرگ مولوی محمد یسین جو
یسین چچا کے نام سے مشہور تھے ایک لڑکے محمد حنیف کو پڑھایا کرتے تھے۔ سید صاحب کچھ دنوں
محمد حنیف کے ساتھ ان کے پاس بھی بٹھائے گئے اور پارۂ عم کی کچھ سورتیں ان سے پڑھیں لیکن جلد ہی
مولوی مقصود علی صاحب ساکن موضع ادکھدی ضلع پٹنہ خاص طور پر سید صاحب کی تعلیم کے
لیے بلائے گئے۔ ان کے آنے کے بعد ایک مکتب قائم ہوا، جس میں میرے علاوہ سید مظاہر حسن مرحوم
(حافظ) عبد الصمد مرحوم، محمد حنیف (مختار مرحوم)، ملک رشید الحق، توحید شاہ کے بڑے بھائی
عبد القادر اور دو ہندو سنار کے لڑکے شریک ہوئے، یہ مکتب جہاں قائم ہوا تھا، وہ اس وقت صغیر
مرحوم کا دروازہ کہلاتا تھا، صغیر مرحوم مولانا ابو ظفر ندوی کے چھوٹے ماموں تھے، سید صاحب نے
کلام مجید مولوی مقصود علی صاحب ہی سے ختم کیا، اور فارسی شروع کی، ان کے ساتھ میں بھی
آمدنامہ، کریما، نسخہ تعلیمیہ، گفتگو نامہ اور گلستاں باب اول و دوم پڑھتا رہا، ہم لوگوں
کی تعلیم اس مکتب میں غالباً دو ڈھائی سال رہی، سید صاحب اپنے ہم مکتبوں سے نہ بے تکلفی
سے ملتے اور نہ ہمارے کھیلوں میں شرکت کرتے، ہم لوگ چندہ کرکے کوئی چیز پکاتے تو چندے
میں تو شریک ہو جاتے، لیکن چیزوں کی فراہمی میں دوڑ دھوپ کرنا پسند نہ کرتے تھے، البتہ
گاؤں کی ندی میں جب کبڈی ہوتی تو اس میں شریک ہو جاتے اور کبڈی اچھی کھیلتے تھے، کبھی
کبھی ہم لوگ کوئی تمثیلی ڈرامہ کرتے تو اس میں بھی وہ شریک ہوتے اور ہم لوگ ان کو ہیرو کا پارٹ دیتے۔
سید صاحب کے بڑے بھائی حکیم سید ابو حبیب جب تعلیم پا کر دیسنہ تشریف لائے، اور
یہاں مطب شروع کیا تو ہم دونوں نے ان سے گلستاں باب ہشتم، بوستاں، یوسف زلیخا اور
رقعات عالمگیر وغیرہ پڑھیں، پھر عربی شروع کی، اور میزان، منشعب، پنج گنج، زبدہ، صرف میر،
فصول اکبری اور نحو میں شرح ملا جامی تک پڑھی، منطق میں کبریٰ، میزان منطق اور تہذیب تک

تعلیم پائی، اس درس میں ہم لوگوں کے ہم وطن مولانا محمد قاسم بن حافظ شاہ مولانا تجمل حسین خلیفہ مجاز مولانا فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی بھی شریک ہوتے تھے۔ میرا زیادہ وقت جناب حکیم سید ابو حبیب کے گھر ہی پر گذرتا، میری پھوپھی یعنی سید صاحب کی والدہ مجھ سے گھر کا جو کام بھی لیتیں میں بلا تکلف کر دیتا، کبھی چارپائی بنی جاتی تو میں بھی شریک ہو جاتا، سید صاحب کو ان کاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی، ان کی والدہ اور ہمشیرہ ان پر خفا ہوتیں تو وہ کہتے کہ نجم الہدیٰ آپ لوگوں کا پلنگ بن دیتے ہیں، اس لیے وہ اچھے ہیں، میں نہیں بنتا اس لیے برا ہوں،

اسی زمانہ میں مولوی حکیم سید ابو حبیب کو اپنے گاؤں کی عورتوں کی معاشرتی اصلاح کا خیال ہوا، ان میں بہت بری رسمیں اور بدعتیں رائج تھیں، حکیم صاحب عورتوں کو ہفتہ میں دو روز اپنے گھر بلا کر ان کی تربیت و اصلاح فرماتے، اور رمضان شریف میں پند و نصیحت کا سلسلہ روزانہ جاری رہتا، اس کا طریقہ یہ ہوتا تھا کہ میں یا سید صاحب حضرت شاہ اسمٰعیل شہید کی تقویۃ الایمان کی قرأت کرتے، اور حکیم صاحب اس کا مطلب بیان کرتے، اور موقع موقع سے قرآن شریف کے احکام اوامر و نواہی بھی سناتے جاتے، یہ سلسلہ گیارہ بجے دن تک رہتا، اسی سے میرے اور سید صاحب کے عقائد میں پختگی کی بنیاد پڑی، جس کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں محرم میں امام باڑہ اور تعزیہ داری کے تماشوں سے پرہیز کرنے لگے، اور جو لوگ اس میں شریک ہوتے تھے، ان کے خلاف ہم دونوں نے ایک تحریر مرتب کی ....

اور اس کو لفافہ میں بند کر کے ان لوگوں کے پاس بھجوا دیا، تعزیہ اور سپر بنانے والوں میں ہم دونوں کے بزرگ بھی تھے، ان بزرگوں کو یہ تحریک ناگوار گذری، چونکہ میرے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھی اس لیے میں ان کی عدالت میں حاضر کیا گیا، اور یہ سزا تجویز کی گئی کہ پچیس بار کان پکڑ کر اٹھوں بیٹھوں، اسی کے بعد میں ایک شریر لڑکے کی حیثیت سے مشہور ہوا، اور سید صاحب بدستور نیک لڑکوں

میں شمار ہوتے ہیں،

حکیم سید ابو حبیب صاحب کچھ دنوں کے لیے اپنے پیر و مرشد کے یہاں بھوپال تشریف لے گئے تو ہم دونوں نے مولانا سید بشارت کریم سے پڑھنا شروع کیا، یہ میرے ہمزلف عبد الباری صاحب کے والد ماجد تھے، اور اس زمانہ میں استھانواں میں حافظ ملک شرف الدین کو حدیث شریف کا درس دیا کرتے تھے، ہم دونوں روزانہ صبح کے وقت استھانواں جاتے اور سبق لے کر واپس آتے تھے، استھانواں دیسنہ سے ایک میل کی مسافت پر ہے، جب بھوپال سے حکیم صاحب واپس آگئے تو پھر ہم لوگ ان سے درس لینے لگے، ان ہی کے ساتھ ہم لوگ ظہر کی نماز پڑھنے مسجد جایا کرتے، وہاں نماز کے بعد اخبار وکیل امرت سر پڑھا جاتا اور گاؤں کے لوگ دلچسپی سے سنتے، اس زمانہ میں سر سید احمد خاں کی مخالفت میں پر زور مضامین نکل رہے تھے، ان مضامین سے مجھکو تو کوئی دلچسپی نہ ہوتی تھی لیکن سید صاحب غور سے سنتے،

۱۸۹۷ء کے آخر یا ۱۸۹۸ء کے اوائل میں حکیم صاحب حج کے لیے تشریف لے گئے، اس وقت ہم دونوں کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا، سید صاحب کو ان کے والد اپنے ساتھ اسلام پور لے گئے اور چھ مہینے اپنے ساتھ رکھا، وہ بڑے رکھ رکھاؤ کے بزرگ تھے، ان کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور بات چیت کرنے میں بڑا وقار ہوتا، اس لیے ہم لوگ جب کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ان کے سامنے بڑے ادب سے بیٹھتے، وہ کوئی سوال کرتے تو جواب دیتے وقت بڑی سنجیدگی اختیار کرنی پڑتی، جب وہ اسلام پور سے دیسنہ تشریف لاتے تو ہم دونوں کو ان کے ساتھ دسترخوان پر شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوتی، کھانے میں ہم لوگوں کے منہ سے آواز نکلتی تو فرماتے کہ انسان اس طرح نہیں کھاتے، کتے اور بلی اس طرح کھاتے ہیں، سید صاحب کی آواز ہمیشہ سے پست اور دھیمی تھی، ایک بار حکیم صاحب نے ان سے کچھ پوچھا

تو حسب معمول بہت ہی دھیمی آواز میں جواب دیا، جس کو حکیم صاحب نے نہیں سمجھا، اس لیے پھر پوچھا، سید صاحب نے پھر اسی آواز میں جواب دیا، حکیم صاحب نے جھلا کر کہا "منہ سے آواز کیوں نہیں نکلتی، جی چاہتا ہے کہ تمھارا منہ نوچ لیا جائے،" اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد انجمن الاصلاح دیسنہ کا سالانہ جلسہ تھا، جس کی صدارت حکیم صاحب فرما رہے تھے، اس موقع پر سید صاحب نے بھی تقریر کی جو سامعین نے پسند کی، اس تقریر کو سنکر حکیم صاحب نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا کہ ابو نجیب کو بولنا بھی آتا ہے۔

حکیم صاحب سید صاحب کو تعلیم کے لیے اسلام پور سے پھلواری شریف لے گئے، پھر مجھے بھی پھلواری پہنچا دیا، وہاں میر عابد حسین کے یہاں میرے قیام کا انتظام تھا، اور سید صاحب خانقاہ کی ایک کوٹھری میں مقیم تھے۔ میری قیام گاہ کے متصل حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی کا مکان تھا، اور ان کے صاحبزادوں سے برابر ملاقاتیں ہوتی رہیں، پھلواری شریف سے ہم لوگوں کو پرانا قلبی تعلق تھا، سید صاحب کے والد ماجد نے حضرت شاہ علی حبیبؒ سے فیوض حاصل کیے، میرے بزرگوں کو بھی اسی خانوادہ سے عقیدت و بیعت تھی، اس لیے یہاں ہم لوگوں کو اجنبیت محسوس نہیں ہوئی، ہماری تعلیم حضرت استاذی مولانا شاہ محی الدین کے سپرد ہوئی، وہاں کے مدرسہ میں اس وقت مولانا عبد الرحمٰن کاکوی صدر مدرس تھے، جو مولانا شاہ محی الدین کو حدیث کا دورہ کراتے تھے، ان کے ہم درس مولانا شاہ معین الدین مرحوم، جناب شاہ محمد خلیل، جناب شاہ حکیم محمد شعیب، جناب حکیم عبد المنان صاحب، جناب مولانا رحیم بخش صاحب آروی بانی مدرسہ فیض الغربا، آرہ اور جناب حافظ محمد وصی صاحب ساکن ہزاری باغ بھی تھے، یہ حضرات طلبہ کو شوقیہ درس بھی دیتے تھے، ہم اور سید صاحب دیسنہ سے قدوری اور تہذیب پڑھ کر آئے تھے، پھلواری پہنچکر شرح وقایہ اور تہذیب شروع کی، مولانا رحیم بخش منطق بہت اچھی

پڑھاتے تھے، وہ تہذیب پڑھاتے تو پوری طرح ذہن نشین کرا دیتے، اور ان ہی کی تعلیم کا نتیجہ تھا کہ جب میں ندوہ میں داخل ہوا تو منطق کے درس میں ہمیشہ ممتاز رہا، مولانا شاہ معین الدین مرحوم سے شرح وقایہ پڑھی، سید صاحب پھلواری کے قیام میں حسب معمول طلبہ سے کم ملتے جلتے تھے، ان کے مزاج میں شروع ہی سے تحمل، بردباری اور عفو و درگذر کا مادہ تھا، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوگا، پھلواری کے مدرسہ میں جہان آباد ضلع گیا کا ایک لڑکا پڑھتا تھا، ۱۲ ربیع الاول کے عرس کے موقع پر اس نے دھوکا دے کر ہم دونوں سے کچھ نقد وصول کر لیا، اس کے بعد سید صاحب سے اس کی ملاقات ہوئی تو نادم ہونے کے بجائے ان سے لڑنے لگا، میں بھی اتفاق سے وہاں پہنچ گیا، سید صاحب جیسے جیسے نرم ہوتے جاتے ویسے ہی وہ گرم ہوتا جاتا، میں نے اس کو سختی سے جواب دیا، وہ کچھ ہاتھا پائی پر اتر آیا، اور میں مغلوب ہو گیا، سید صاحب کھڑے تماشا دیکھتے رہے، اور انھوں نے میری کوئی مدد نہیں کی، جب وہ لڑکا چلا گیا تو میں ان پر بہت برہم ہوا کہ تمھاری خاطر تو میں لڑتا رہا اور تم نے کوئی مدد نہیں کی، جب میں زیادہ بگڑا تو بولے میں نے تم سے کب کہا تھا تم میری مدد کے لیے اس سے جھگڑا کرو، وہ خود ہی بولتے بولتے خاموش ہو جاتا اور اس کی نوبت ہی نہیں آتی۔

سید صاحب کا زیادہ وقت مولانا شاہ محی الدینؒ کی صحبت میں گزرتا، یا پھر کوئی اردو کی کتاب پڑھتے، مولانا عبد الحلیم شررؔ کا کوئی تاریخی ناول ان کو مل جاتا، تو اس کو شروع سے آخر تک پڑھ جاتے، سید صاحب کی کوٹھری کے پاس ہی ایک بزرگ مولوی عبد اللہ رہتے تھے، ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد معشوق صاحب شاعر تھے، ان کے کمرہ میں شعر و شاعری کا چرچا رہتا تھا، سید صاحب اس مجلس میں ضرور شریک ہوتے، خانقاہ میں قوالی کی محفلیں برابر ہوتی رہتیں، سید صاحب ان میں بھی شوق سے شرکت کرتے، ان کو شعر و سخن سے فطری

لگاؤ تھا، مگر اس پر جلا پھلواری شریف کے قیام میں ہوئی،

اسی زمانہ میں حضرت حاجی امداد اللہ صاحبؒ مہاجر مکی کے خلیفہ مولانا شاہ منور علی نے مرشد کی ہدایت سے دربھنگہ میں ایک مدرسہ کھولا تھا، جس کا نام مدرسہ امدادیہ تھا، تھوڑے دنوں میں اس کی شہرت پھیل گئی، اس لیے ہم دونوں کو سنہ ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف سے دربھنگہ بھیجدیا گیا، یہاں ہمارا قیام عم محترم سید امیر حسن کے یہاں تھا، جو عم محترم سید رحیم الدین مالک و اڈیٹر اخبار الپنچ کے حقیقی چھوٹے بھائی تھے، اسی مدرسہ میں ہم دونوں نے مولانا مرتضیٰ حسن صاحب دیوبندی سے ہدایہ جلد اول اور مولانا فدا حسین صاحب آروی سے تہذیب پڑھی، مدرسہ میں ہر ہفتہ مجلسِ مکالمہ بھی منعقد ہوتی تھی، طلبہ کو ایک ہفتہ پہلے کوئی عنوان دیدیا جاتا جس پر وہ مضمون لکھتے یا تقریر کرتے، داخلہ کے پہلے ہی ہفتہ میں ہم لوگوں کو اس میں شرکت کا موقع ملا، اور عنوان "وقت کی قدر و قیمت" دیا گیا، گھر آکر ہم دونوں نے اس موضوع پر مضمون لکھنا شروع کیا، مگر میں مشکل سے دو صفحے لکھ سکا، اور سید صاحب نے اتنی ہی دیر میں چار پانچ صفحے لکھ ڈالے، اور اس کو مجلس مکالمہ میں پڑھا جس کی بڑی تعریف کی گئی، اور بعد میں یہ مضمون رسالہ مخزن میں شائع ہوا، جو اس وقت شیخ عبد القادر کی ادارت میں نکلتا تھا،

سنہ ۱۹۰۰ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کا سالانہ جلسہ پٹنہ میں منعقد ہوا، اس میں قدیم اور جدید تعلیم یافتہ جماعتوں کے افراد بڑے شوق سے شریک ہوئے، پنڈال میں بڑی شان و شوکت نظر آتی تھی، اور قدیم و جدید دونوں گروہوں کے تعاون کا بڑا دلکش اور موثر منظر تھا، صوبہ بہار کے اکثر علماء اس میں شریک تھے، ممتاز بیرسٹروں اور وکیلوں کی جماعت بھی تھی، بڑی دلپذیر تقریریں ہوئیں جن سے متاثر ہو کر سید صاحب کے والد ماجد نے فیصلہ کیا کہ ہم دونوں کو تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء بھیجدیں، چنانچہ ہم لوگ برادر محترم سید محمد احسن مرحوم استھانوی کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوئے،

سید محمد احسن صاحب سید صاحب کے پھوپھی زاد اور میرے چچازاد بھائی تھے۔ وہ اس زمانہ میں لکھنؤ میں طب کی تعلیم پا رہے تھے، اور مولانا شاہ محمد علی مونگیری خلیفہ جناب مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی سے ان کے تعلقات تھے، مولانا محمد علی مونگیری کی نظامت ندوۃ العلماء سے پہلے ان کی نگرانی میں سید محمد احسن صاحب تحفہ محمدیہ کانپور سے ایک رسالہ نکالتے تھے، جس میں اسلام پر عیسائیوں اور آریوں کے اعتراضات کے جوابات دیے جاتے تھے، سید محمد احسن صاحب عزیزی محمد ہاشم ندوی سابق ناظم دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن کے والد ماجد تھے،

ہم دونوں ۱۹۰۱ء کے آغاز میں لکھنؤ پہنچے، ہم سے پہلے ہمارے دو ہم وطن اور اعزہ مولانا عبد السبحان بن حاجی شاہ سید محمد اسمٰعیل انسپکٹر پولیس اور مولانا محمد قاسم بن مولانا شاہ حافظ سید تحمل حسین خلیفہ حضرت مولانا فضل الرحمن گنج مرادآبادی ندوہ پہنچ چکے تھے، مولانا عبد السبحان مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے ساتھ رہتے تھے، جو ان کے والد ماجد کے مرشد جناب شاہ محمد کامل صاحب ولید پوری کے قریبی عزیز تھے، مولانا قاسم کے والد ماجد مولانا محمد علی مونگیری کے پیر بھائی تھے، اس لیے ندوہ سے ان کو گھر لگاؤ رہا، اور انھوں نے اپنے لڑکے کو یہاں داخل کیا تھا، ہم دونوں کا داخلہ ندوہ میں ہوا تو مولانا قاسم کے کمرہ ہی میں جگہ ملی،

ہم لوگ دار العلوم کی دوسری جماعت میں داخل ہوئے، جس میں مولانا عبد السبحان اور مولانا قاسم پہلے سے تھے۔ اسوقت دار العلوم میں کل چار درجے کھلے تھے، پہلے درجہ میں صرف، نحو اور حساب کی تعلیم ہوتی تھی، جو مولوی حبیب الدین مرحوم کے سپرد تھی، دوسرے درجہ میں صرف و نحو کی آخری کتابیں، فقہ، فرائض، منطق اور حساب کی تعلیم ہوتی تھی، تیسرے میں فقہ اور منطق کے علاوہ ادب اور فلسفہ بھی تھا، یہ دونوں درجے مفتی عبد اللطیف سے متعلق تھے، چوتھے درجہ میں منطق، فلسفہ اور ادب کے ساتھ حدیث پڑھائی جاتی، اس کے اسباق شمس العلماء مولانا محمد حفیظ اللہ صاحب کے ذمہ تھے، اس وقت دوسرے درجہ میں سب سے زیادہ لڑکے تھے،

ان میں کچھ طلبہ کے نام یاد ہیں، خاکسار، سید سلیمان، سید محمد قاسم دیسنوی، سید عبد السبحان دیسنوی کے علاوہ ظہور احمد شاہجہانپوری مرحوم، انجم مانپوری گیاوی (صاحب طنزیات مانپوری) محمد مبین خلف ثانی مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، حبیب الزمان خاں شاہجہانپوری خلف مولانا محمد مسیح الزماں خاں قائمقام ناظم ندوہ وغیرہ تھے،

چاروں درجے کے ادب کی تعلیم مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے متعلق تھی۔ اس کے علاوہ تعلیم کی نگرانی بھی ان ہی کے ذمہ تھی، داخلہ کے سال اول میں میرا اور سید صاحب دونوں کا معمولی طالبعلموں میں شمار رہا، سید صاحب کو حساب سے مطلق دلچسپی نہ تھی، اس لیے وہ مجھ سے بھی فروتر سمجھے جاتے تھے، استاذی مفتی عبد اللطیف ہر سنیچر کو اور ہم سے اوپر والی جماعت کے درمیان منطق یا فلسفہ کے کسی مسئلہ پر مباحثہ کراتے، اس میں کبھی کبھی مولانا محمد حفیظ اللہ مدرس اول اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی بھی شرکت فرماتے، مناظرانہ گفتگو کرنے میں میری طبیعت بہت لگتی تھی، پھلواری شریف کے قیام کے زمانہ میں مولانا رحیم بخش آروی کے درس میں اس کی مشق بھی پیدا ہوگئی، اور ان ہی کے ذریعہ مجھکو بہت سی مناظرانہ اصطلاحات سے واقفیت ہوگئی تھی، مثلاً تحصیل حاصل محال ہے۔ دعویٰ بلا دلیل قابل حجت نہیں ہوتا، مخالف اور منکر پر بار ثبوت نہیں کسی مجہول شے کی تعریف مجہول امور سے نہیں ہوسکتی مسلمات اور بدیہیات سے انکار علمیت کے خلاف ہے، اسی لیے میں مباحثے اور مناظرے میں زیادہ حصہ لیتا اور نمایاں رہتا۔

شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مہتمم دارالعلوم میری باتوں سے بہت خوش ہوتے۔ ۸ شعبان ۱۳۱۹ھ میں ندوہ کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہوا، اس میں شریک ہونے کے لیے دارالعلوم سے ہر درجہ سے ایک ایک طالب علم کا انتخاب ہوا، میرے درجہ سے مولانا حفیظ اللہ صاحب کی تحریک سے میرا انتخاب ہوا، حالانکہ میں حقیقۃً اس کا مستحق نہیں تھا، تحریری اور علمی لیاقت کی بنا پر سید صاحب یا ظہور احمد شاہجہانپوری کا انتخاب ہونا چاہیے تھا،

فروری ۱۹۰۲ء مطابق شوال ۱۳۱۹ھ میں جب ہم دونوں ترقی پاکر سال سوم میں پہنچے تو
ید صاحب نے بال و پر نکالے، اور مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کے گھنٹہ میں جس میں عروض اور ادب کا
رس ہوتا تھا، وہ نمایاں رہنے لگے، قصیدہ بردہ اور دیوان ابوالعتاہیہ کے اسباق میں جب کوئی نیا
حاورہ یا فعل آجاتا جس کے مختلف صلات سے معنی میں تبدیل ہوتی، تو درس کے بعد مولانا ان محاورات
ور افعال کی مختلف طریقوں سے مشق کراتے، کبھی اردو فقرے عربی میں ترجمہ کرنے کے لیے دیتے، جس میں ان
افعال اور محاورات کا استعمال ہوتا، کبھی اپنی طرف سے عربی جملے اردو میں ترجمہ کرنے کو کہتے، اس طرح نئے
عربی محاورات اور افعال کی مشق کراتے رہتے، میری کاپی بھر جاتی تو اس کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتا،
مگر سید صاحب اس کو ضائع نہ کرتے، اور مولانا چریاکوٹی کی بتائی ہوئی باتوں کو یاد رکھتے، مولانا شبلی کے
سفرنامہ کے آخر میں جدید عربی الفاظ کا جو فرہنگ شامل ہے، سید صاحب نے اس کو بھی یاد کر لیا تھا، اور
لغت کی مدد سے ان کو حل کرتے تھے، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عربی کے مصر سے جو اخبارات ندوہ میں آتے تھے،
ان کو آسانی سے سمجھ لیتے تھے،

ہم لوگ جب متوسط درجہ میں آئے تو مرزا غلام احمد قادیان کی ایک نظم عربی میں شائع ہوئی،
جس کے بارے میں غیر معمولی فصاحت اور بلاغت کا دعویٰ تھا، سید صاحب نے اس نظم کو مولانا محمد فاروق
چریاکوٹی کے سامنے پیش کیا، انھوں نے اس کی تمام ادبی خامیوں بلکہ معائب کو اچھی طرح واضح کر دیا،
مولانا اشعار جاہلیت اور کلام پاک کی آیتوں سے عربی کے طرز بیان، طرز ادا، موقع شناسی اور مخاطب
کی صلاحیت کے موافق طرز کلام کی نوعیت کو سمجھاتے اور اس کا فرق بتاتے، سید صاحب مولانا چریاکوٹی
کے ایک ایک حرف کو لکھ لیتے اور فرصت کے اوقات میں دیکھا کرتے، مگر دوسرے طلبہ کو اس سے کوئی
دلچسپی نہ تھی،

اس زمانہ میں ندوہ میں مشہور شاعر حافظ جلیل حسن صاحب جلیل کے صاحبزادے محمد صدیق صاحب

بھی تھے، ان کا ذوق بھی ادبی تھا، اور وہ بھی سید صاحب ہی کی طرح خاموش اور الگ تھلگ رہنے والے طالب علم تھے، سید صاحبؒ نے ان کو اپنا ہم مذاق پایا، تو ان سے ان کے تعلقات ہو گئے، وہ اپنے والد ماجد کی وساطت سے سجاد حسین صاحب اڈیٹر اودھ پنچ لکھنؤ کے یہاں آتے جاتے رہتے، سید صاحب بھی ان کے ساتھ ان کے یہاں آنے جانے لگے، اس زمانہ میں اودھ پنچ کے آخر میں بطور ضمیمہ آزاد اخبار بھی منسلک رہتا تھا، جس میں خبریں ہوتی تھیں، سید صاحب عربی اخباروں کی خبریں ترجمہ کرکے اس ضمیمہ میں کچھ دنوں تک دیتے رہے، اسی زمانہ میں مولانا عبد العلی صاحبؒ آسی مالک اصح المطابع کے لائق شاگرد مولانا عبد اللہ عمادی عربی میں ایک ماہانہ رسالہ البیان نکالتے تھے، سید صاحب نے اس میں بھی مضامین لکھنا شروع کیے، اس سے سید صاحب کی ادبی اور علمی صلاحیتیں تو ظاہر ہونے لگیں، لیکن اپنے درجہ میں بہت زیادہ ممتاز نہ تھے، سال دوم میں مفتی عبد اللطیف صاحب نے منطق شروع کرائی تو منطق کی پہلی کتاب کبریٰ کا درس اپنے سامنے مجھ سے دلواتے، اور جہاں میں رکتا یا طلبہ کو مطمئن نہ کر پاتا تو مفتی صاحب تقریر شروع کر دیتے، علم الفرائض میں بھی سید صاحب کچھ اچھے نہ تھے، بلکہ یہ خاکسار ان سے بہتر سمجھا جاتا تھا لیکن قدرت کو ان سے بہت بڑا کام لینا تھا، اس لیے ان کی ادبی صلاحیتیں آہستہ آہستہ ابھریں۔

استاذی مولانا مفتی عبد اللطیف تعلیم و تربیت کے معاملہ میں بہت سخت تھے، تمام طلبہ ان سے تھراتے تھے، وہ بے ضابطگی اور عدول حکمی پر بڑی سخت سزا دیتے تھے، ندوہ کے باہر قریب ہی ایک مسجد تھی جس میں طلبہ نماز پنجگانہ پڑھتے تھے، فجر کی نماز میں جو لڑکا غیر حاضر رہتا، اس کو دوپہر کے کھانے میں گوشت کا پیالہ نہ ملتا، اور دال روٹی ہی پر قناعت کرنی پڑتی، سید صاحب رات کو دیر تک مطالعہ کرتے رہتے تھے، اس لیے فجر کی نماز کے وقت ان کی آنکھ نہ کھلتی اور ان کو اکثر دال روٹی پر قناعت کرنی پڑتی، وہ دن کو بھی سو جاتے تو مشکل سے اٹھتے تھے، ان میں پھرتی مطلق نہ تھی، کھانے کی گھنٹی سننے کے بعد بھی دسترخوان پر دیر کرکے پہنچتے، درجہ میں بھی کبھی وقت پر نہ آتے، مفتی عبد اللطیف صاحب نے شروع میں تو سختی کی، لیکن

جب ان کو اس کا اندازہ ہوگیا کہ وہ قصداً دیر کر کے نہیں آتے بلکہ ان کے مزاج ہی میں سستی ہے تو پھر چشم پوشی کرنے لگے، لیکن طلبہ ان کو "پوستی" کہا کرتے تھے، یہ بہار کی اصطلاح ہے جو افیونیوں کے لیے استعمال ہوتی ہے،

مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی جن طلبہ کی طرف مائل ہوتے ان کو انکی طبیعت کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی لقب ان کو دیدیتے، سید صاحب کو "قیس" کہا کرتے تھے، ظہور احمد شاہجہانپوری بہت لاغر اور دبلے تھے اس لیے ان کو "ناحل" کہتے، میں ذرا موٹا تازہ اور چلبلا تھا، اس لیے مجھکو چنگیز خاں کہتے تھے،

۱۹۰۳ء میں ہم دونوں چہارم یعنی متوسط اول میں آئے تو عربی ادب میں سب سے اچھے سید صاحب ہی سمجھے جانے لگے، ان کے بعد ظہور احمد شاہجہانپوری تھے، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی سید صاحب پر بہت شفقت کرتے تھے، اور سید صاحب بھی ان کے مشورے کے مطابق ادب کی کتابوں کا مطالعہ بڑی محنت سے کرتے تھے، ان کے اسی ذوق کی بنا پر ان کو دارالاخبار کا ناظم بنایا گیا، اس زمانہ میں وہ عربی اخبارات کا گہرا مطالعہ کرتے رہے، جس سے عربی زبان میں ان کی صلاحیت اور زیادہ بڑھی، عربی ادب کے مطالعہ سے اردو ادب میں بھی ان کا ذوق نکھرنے لگا، دارالعلوم میں طلبہ اکثر مشاعرہ کرتے تھے جس میں رکن الدین دانا سہسرامی، تجمل حسین شاہجہانپوری، ظہور احمد شاہجہانپوری، مصطفٰی خاں ملیح آبادی، عبدالغفور شرر، سید محمد عثمان گیلانی اور عبدالسلام اعظمی کے ساتھ سید صاحب بھی اپنا طرحی اور غیر طرحی کلام سناتے، مگر ہم لوگ محض سامعین میں رہتے،

اسی سال جناب شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواروی اشاعت اسلام کے سلسلہ میں لکھنؤ آئے اور دارالعلوم ہی میں قیام فرمایا، ان کے ساتھ ان کے بڑے صاحبزادے حسن میاں مرحوم بھی تھے، جن سے سید صاحب کی بڑی بے تکلفی ہوگئی، حافظ شاہ تجمل حسین دسنوی بھی دارالعلوم کی عمارتوں کی تعمیر کے سلسلہ میں مقیم تھے، اور اکثر دونوں بزرگوں کے ساتھ مولانا حفیظ اللہ کی بھی نشست ہوتی، ان تینوں کی گفتگو میں ہم لوگ بہت دلچسپی سے سنتے، اس زمانہ میں تقریباً ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی معزز شخص دارالعلوم آتا اور

طلبہ کا امتحان لیتا رہتا، مولانا فاروق صاحب چریا کوٹی طلبہ کو پیش کرتے، اور معزز مہمان طلبہ سے سوال کرتے تو مولانا اس کو اس طرح دہراتے کہ سوال کا جواب معلوم ہو جاتا، اسی زمانہ میں نواب محسن الملک دار العلوم تشریف لائے، طلبہ سے عربی اخبارات پڑھوا کر امتحان لیا، اس میں سید صاحب اول آئے، انھوں نے نواب صاحب کی مدح میں اپنا ایک عربی قصیدہ بھی پڑھ کر سنایا جس سے نواب صاحب بہت محظوظ ہوئے، شاہ سلیمان پھلواروی نے خوش ہو کر فرمایا کہ انشاء اللہ ہر زمانہ میں ایک سلیمان بہار کی سرزمین میں علم اور دین کی خدمت کے لیے موجود رہے گا، یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی،

سنہ ۱۹۰۳ء ہی میں مفتی عبد اللطیف ندوہ سے مستعفی ہو کر مولانا شاہ محمد علی صاحب کے پاس مونگیر چلے گئے اور ان کی جگہ مولانا محمد شبلی مدرس تشریف لائے، اس جدید انتظام میں حکیم مولانا سید عبد الحی صاحب معتمد مراسلات منشی احتشام علی صاحب معتمد مال، مولانا فتح محمد صاحب معتمد تعلیم نامزد ہوئے، مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس اول اور مہتمم ہوئے، وہ اپنے متعلقین کے ساتھ ندوہ سے باہر رہتے تھے، اس لیے مولانا فتح محمد صاحب نے طلبہ کی نگرانی کے لیے اپنے ایک عزیز کو اتالیق مقرر کیا جو پولیس کی ملازمت ختم کر کے پنشن پاتے تھے، ان کا برتاؤ طلبہ کے ساتھ بالکل پولیس والوں کا جیسا تھا، طلبہ ان سے بے حد خفا رہتے، اور یہ زمانہ طلبہ کی معاشرتی حالت کے لحاظ سے بھی بہت خراب رہا، سرکس اور تھیٹر جاتے، شطرنج اور تاش کھیلنے کی وبا عام ہو گئی تھی، لیکن سید صاحب ان سب لغویتوں سے پاک و صاف رہے، اور سب سے الگ تھلگ کتب بینی میں مصروف رہتے، طلبہ کے قضیوں اور جھگڑوں سے انکو کوئی سروکار نہ تھا،

سنہ ۱۹۰۴ء میں مولانا محمد فاروق چریا کوٹی ندوہ سے چلے گئے، تو سید صاحب پر کچھ دنوں تک ان کی علحدگی کا بڑا اثر رہا، لیکن مولانا نے ادب کا جو ذوق ان میں پیدا کیا تھا اس کی آبیاری وہ برابر کرتے رہے اور اسی سال وہ انجمن المعین کے مستقل ناظم مقرر ہو گئے، اور میں محاسب مقرر کیا گیا، ان عہدوں پر ہم دونوں تکمیل تعلیم تک برابر رہے،

اسی زمانہ میں ہم لوگ شہر جاتے تو قیصر باغ کے چوراہے پر ایک پادری صاحب کو اکثر وعظ کہتے ہوئے پاتے، سید صاحب کو ان سے ملنے جلنے کا موقع ملا، انھوں نے ان کو ایک عمدہ مجلد بائبل دی، سید صاحب نے اس کا مطالعہ کیا جس سے ان کو غیر مذاہب سے واقفیت حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا، ایک روز ہم لوگوں نے ایک اشتہار دیکھا کہ پادری جوالا پرشاد صاحب کرسچین اسکول میں حسب ذیل تین عنوانات پر لکچر دیں گے، ضرورت مذہب، موازنۂ مذاہب، عیسائی مذہب کی برتری اور فوقیت، ندوہ کے طلبہ کی ایک جماعت پہلے دن لکچر میں شریک ہوئی، جس میں ہم دونوں کے علاوہ ضیاء الحسن علوی اور عبد الباری صاحب بھی تھے، جب پادری صاحب نے لکچر دینا شروع کیا تو ہم لوگوں نے ان پر اعتراضات شروع کیے، وہ بڑے حلم و انکسار سے جواب دیتے لیکن تشفی بخش نہ ہوتے، دوسرے دن ہم لوگ پھر پہنچے، موضوع موازنہ مذاہب تھا، سید صاحب نے پادری صاحب کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ وہ اسلام پر آدھ گھنٹہ تک اعتراض کریں اور آدھ گھنٹہ اس کا جواب دینے کے لیے ان کو وقت دیا جائے، پادری صاحب نے اس کو منظور نہیں کیا، اور پانچ منٹ کا وقت دیا، سید صاحب نے جوابی تقریر میں کہا کہ مذہب وہی قابل قبول ہو سکتا ہے جس کے احکام فطرت انسانی کے مطابق ہوں، نہ اس قدر سخت ہوں کہ انسان ان کا متحمل نہ ہو سکے، اور نہ ایسے نرم و آسان ہوں کہ ان کو انسان ناقابل اعتناء سمجھے، مثلاً عیسائی مذہب کی تعلیم ہے کہ اگر تمھارے ایک گال پر کوئی طمانچہ رسید کرے تو دوسرا گال بھی پیش کر دو، یا تم سے کوئی عبا مانگے تو تم اپنی چادر بھی اس کو دیدو، یا ایسے تمام لذائذ کو جنھیں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے لیے مباح اور جائز قرار دیا ہے، چھوڑ کر رہبانیت اختیار کر و، یا کنفشن کا یہ اصول ہے کہ اگر کوئی مرتے وقت پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرلے تو وہ بالکل معصوم ہو جاتا ہے، کس طرح صحیح ہو سکتا ہے، عیسائیوں کا یہ عقیدہ کہ حضرت عیسیٰؑ اپنے کو مصلوب کرا کے اپنی امت کے گناہوں کا کفارہ بن گئے،

انسان کو جرائم اور معاصی کے ارتکاب پر دلیر اور نڈر کر دیتا ہے، سید صاحب نے ان باتوں کو کچھ ایسے مؤثر اور باوقار طریقہ پر پیش کیا کہ حاضرین ان کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے، اور پھر پادری صاحب کا رنگ کچھ ایسا اکھڑا کہ وہ تیسرے دن لکچر دینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

سید صاحب نے شروع سے خالص عربی تعلیم پائی تھی لیکن گفتگو کرنے، ملنے جلنے، تقریر کرنے اور لکھنے لکھانے میں ان کا وہ انداز نہ تھا، جو عربی طلبہ کے کا عام طور سے ہوتا ہے، اس کی ایک وجہ تو ان کی فطری صلاحیتیں تھیں، دوسرا بڑا سبب ان کے وطن کا ماحول تھا، گاؤں میں صرف ہم چند لڑکوں نے عربی کی تعلیم پائی تھی، ورنہ ہمارے تمام اعزہ اور ہم وطن انگریزی پڑھتے تھے، ہم دونوں جب چھٹیوں میں گھر جاتے تو ان ہی عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں کا ماحول ہوتا، جن میں سے بعض یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، ہم دونوں کے گہرے مراسم ملک مظفر امام عرف محمد وحید مرحوم، سید محی الدین مرحوم اور سید وحید النبی سے زیادہ تھے، ملک مظفر امام ام، اے، اوکالج علی گڈھ میں تعلیم پا رہے تھے، اور وہاں کے بڑے ممتاز طالب علم تھے، ۱۹۰۶ء میں بی، اے کیا، اسی زمانہ میں امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کے ولی عہد سردار عنایت اللہ خاں اور ان کے چچا سردار نصر اللہ خاں ہندوستان آئے تو یونیورسٹی کی طرف سے وہ مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ کیے گئے، اس کے صلہ میں سردار عنایت اللہ خاں نے ان کی بڑی پر زور سفارش کی اور وہ ڈپٹی کلکٹری میں لے لیے گئے، سید صاحب ان کو اور وہ سید صاحب کو بے حد عزیز رکھتے تھے، جب دونوں دیسنہ کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ میں شریک ہو جاتے تو جلسہ کی رونق دوبالا ہو جاتی، سید صاحب ان کے عہدہ سے بہت خوش تھے، لیکن ۱۹۱۳ء میں عین عالم شباب میں ان کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کی خبر سنکر سید صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ مجھ سے کہنے لگے کہ افسوس وہ رہتے اور میں ان کے عوض میں چلا جاتا، سید محی الدین مرحوم میرے سگے ماموں زاد بھائی اور سید صاحب کے رشتہ میں بھتیجے تھے۔

پٹنہ میں تعلیم پاتے تھے، ۱۹۰۹ء میں پٹنہ کالج سے بی اے کیا، اور ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد ہوئے،
ن عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی وفات پاگئے، سید صاحب ان سے بھی بہت ہی قریب تر تھے، اور ان کی
ت پر ایک پردرد مرثیہ انجمن الاصلاح کے جلسہ میں پڑھا، ان کے صاحبزادے سید صباح الدین عبد الرحمن
ب دار المصنفین پہنچے تو سید صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے موقع ملا ہے کہ محی الدین مرحوم کی دوستی
ر محبت کا حق ادا کرسکوں، سید وحید النبی بفضل تعالیٰ میری ہی طرح ابھی زندہ ہیں، وہ محکمۂ
بکاری میں انسپکٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں، اور خاندانی ثروت کی وجہ سے بڑی خوشحالی
ں زندگی بسر کرتے ہیں، مولانا عبد الماجد دریابادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب گورنر صوبہ بہار
ب دسینہ تشریف لائے تھے، تو ان ہی کے دولتکدہ پر شاندار دعوتیں ہوئی تھیں، سید صاحب ان سے
خر آخر وقت تک بڑے بے تکلف رہے، مذکورۂ بالا دوستوں اور عزیزوں کے علاوہ دسینہ کے
ور تمام انگریزی خوانوں کے ساتھ سید صاحب کا اٹھنا بیٹھنا رہتا تھا، اس لیے وہ ان کے خیالات
ر رجحانات سے نہ صرف واقف بلکہ غیر شعوری طور پر متاثر بھی ہوتے رہے، اسی لیے ان میں نئی روشنی
ور نئی تہذیب کی جھلک نظر آتی تھی، پھر جب ان کا حلقہ وسیع ہوا تو جس طرح وہ علما کی جماعت کے
حلقے میں جاتے اسی طرح انگریزی خوانوں کے مجمعوں میں بلا جھجھک شریک ہوتے، اس طرح قدیم و جدید
گروہوں کا نقطۂ اتصال بن گئے تھے،

۱۹۰۵ء میں ہم لوگ درجہ ششم میں پہنچے تو اسی سال مولانا شبلی نعمانی ندوہ میں مستقل طور پر
آگئے، اور اپریل ۱۹۰۵ء میں معتمد تعلیمات مقرر ہوئے، سید صاحب نے ان کی تشریف آوری کی تقریب
مسرت میں ایک فارسی قصیدہ کہا، طلبہ میں علمی و ادبی صلاحیت کے لحاظ سے مولانا شبلی کی نظر سید صاحب
اور ضیاء الحسن علوی پر پڑی، اور ان کو انھوں نے ترجمے اور تلخیص کا کام دیا، مولانا شبلی کے پاس عربی
کے جتنے نئے رسالے آتے، سید صاحب ان کو پڑھ کر ان سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے،

انسان کو جرائم اور معاصی کے ارتکاب پر دلیر اور نڈر کر دیتا ہے، سید صاحب نے ان باتوں کو کچھ ایسے مؤثر اور باوقار طریقہ پر پیش کیا کہ حاضرین ان کی تقریر سے بہت متاثر ہوئے، اور پھر پادری صاحب کا رنگ کچھ ایسا اکھڑا کہ وہ تیسرے دن لکچر دینے پر آمادہ نہیں ہوئے،

سید صاحب نے شروع سے خالص عربی تعلیم پائی تھی لیکن گفتگو کرنے، ملنے جلنے، تقریر کرنے اور لکھنے لکھانے میں ان کا وہ انداز نہ تھا، جو عربی کے طلبہ کا عام طور سے ہوتا ہے، اس کی ایک وجہ تو ان کی فطری صلاحیتیں تھیں، دوسرا بڑا سبب ان کے وطن کا ماحول تھا، گاؤں میں صرف ہم چند لڑکوں نے عربی کی تعلیم پائی تھی، ورنہ ہمارے تمام اعزہ اور ہم وطن انگریزی پڑھتے تھے، ہم دونوں جب چھٹیوں میں گھر جاتے تو ان ہی عزیزوں، دوستوں اور ہم وطنوں کا ماحول ہوتا، جن میں سے بعض یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، ہم دونوں کے گہرے مراسم ملک مظفر امام عرف محمد وحید مرحوم، سید محی الدین مرحوم اور سید وحید النبی سے زیادہ تھے، ملک مظفر امام ام، اے، او کالج علی گڈھ میں تعلیم پا رہے تھے، اور وہاں کے بڑے ممتاز طالب علم تھے، سنہ ۱۹۰۶ء میں بی، اے کیا، اسی زمانہ میں امیر حبیب اللہ خاں والی کابل کے ولی عہد سردار عنایت اللہ خاں اور ان کے چچا سردار نصر اللہ خاں ہندوستان آئے تو یونیورسٹی کی طرف سے وہ مترجم کی حیثیت سے ان کے ساتھ کیے گئے، اس کے صلہ میں سردار عنایت اللہ خاں نے ان کی بڑی پر زور سفارش کی اور وہ ڈپٹی کلکٹری میں لے لیے گئے، سید صاحب ان کو اور وہ سید صاحب کو بے حد عزیز رکھتے تھے، جب دونوں دیسنہ کی انجمن الاصلاح کے سالانہ جلسہ میں شریک ہو جاتے تو جلسہ کی رونق دوبالا ہو جاتی، سید صاحب ان کے عہدہ سے بہت خوش تھے، لیکن سنہ ۱۹۱۳ء میں عین عالم شباب میں ان کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کی خبر سنکر سید صاحب اتنے متاثر ہوئے کہ مجھ سے کہنے لگے کہ افسوس وہ رہتے اور میں ان کے عوض میں چلا جاتا، سید محی الدین مرحوم میرے سگے ماموں زاد بھائی اور سید صاحب کے رشتہ میں بھتیجے تھے،

وہ پٹنہ میں تعلیم پاتے تھے، ۱۹۰۹ء میں پٹنہ کالج سے بی اے کیا، اور ڈپٹی کلکٹری کے لیے نامزد ہوئے، لیکن عہدہ سنبھالنے سے پہلے ہی وفات پاگئے، سید صاحب ان سے بھی بہت ہی قریب تھے، اور ان کی وفات پر ایک پر درد مرثیہ انجمن الاصلاح کے جلسہ میں پڑھا، ان کے صاحبزادے سید صباح الدین عبد الرحمن جب دار المصنفین پہنچے تو سید صاحب نے مجھ سے کہا کہ اب مجھے موقع ملا ہے کہ محی الدین مرحوم کی دوستی اور محبت کا حق ادا کرسکوں، سید وحید النبی بفضل تعالیٰ میری ہی طرح ابھی زندہ ہیں، وہ محکمۂ آبکاری میں انسپکٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہوئے ہیں، اور خاندانی ثروت کی وجہ سے بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کرتے ہیں، مولانا عبد الماجد دریابادی اور ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب گورنر صوبہ بہار جب دیسنہ تشریف لائے تھے، تو ان ہی کے دولتکدہ پر شاندار دعوتیں ہوئی تھیں، سید صاحب ان سے آخر آخر وقت تک بڑے بے تکلف رہے، مذکورۂ بالا دوستوں اور عزیزوں کے علاوہ دیسنہ کے اور تمام انگریزی خوانوں کے ساتھ سید صاحب کا اٹھنا بیٹھنا رہتا تھا، اس لیے وہ ان کے خیالات اور رجحانات سے نہ صرف واقف بلکہ غیر شعوری طور پر متاثر بھی ہوتے رہے، اسی لیے ان میں نئی روشنی اور نئی تہذیب کی جھلک نظر آتی تھی، پھر جب ان کا حلقہ وسیع ہوا تو جس طرح وہ علما کی جماعت کے حلقے میں جاتے اسی طرح انگریزی خوانوں کے مجمعوں میں بلا جھجھک شریک ہوتے، اس طرح قدیم وجدید گروہوں کا نقطۂ اتصال بن گئے تھے،

۱۹۰۵ء میں ہم لوگ درجۂ ششم میں پہنچے تو اسی سال مولانا شبلی نعمانی ندوہ میں مستقل طور پر آگئے، اور اپریل ۱۹۰۵ء میں معتمد تعلیمات مقرر ہوئے، سید صاحب نے ان کی تشریف آوری کی تقریب ومسرت میں ایک فارسی قصیدہ کہا، طلبہ میں علمی وادبی صلاحیت کے لحاظ سے مولانا شبلی کی نظر سید صاحب اور ضیاء الحسن علوی پر پڑی، اور ان کو انھوں نے ترجمے اور تلخیص کا کام دیا، مولانا شبلی کے پاس عربی کے جتنے نئے رسالے آتے، سید صاحب ان کو پڑھ کر ان سے پورا فائدہ اٹھاتے تھے،

اس زمانہ میں ہمارے درس میں ادب میں دلائل الاعجاز، حماسہ اور نقد الشعر تھیں جن کو مولانا سید علی زینبی پڑھاتے تھے، اور پوری تیاری کرکے آتے تھے، حدیث میں ترمذی شریف، موطا اور بخاری شریف تھیں، ان کا درس مولانا حفیظ اللہ کے متعلق تھا، سید صاحب حدیث کے مطالعہ میں اپنے ہم درس طلبہ سے ہمیشہ آگے رہتے تھے، جب میں ترمذی کی جرح و تعدیل میں لگا رہتا تو وہ شاہ عبدالعزیز کی عجالۂ نافعہ اور بستان المحدثین کی ورق گردانی میں مشغول رہتے، اور جب موطا کا دور شروع ہوتا تو سید صاحب شاہ ولی اللہ صاحب کی مسوی شرح موطا کا مطالعہ کرتے رہتے اور جب بخاری شریف کا دور شروع ہوتا تو سید صاحب عینی اور فتح الباری، شرح بخاری اور تذکرۃ الحفاظ پڑھکر اپنی معلومات میں اضافہ کرتے، اسی لیے انکی نظر حدیث پر بڑی گہری تھی، جنوری ۱۹۰۵ء کے الندوہ میں حدیث پر انکا مضمون شائع ہوا تو اسکی ہر طرف سے بڑی تعریف ہوئی،

ندوہ میں درسی کتابوں کے علاوہ طلبہ کے لیے درس قرآن، فلسفہ جدید کی تعلیم اور تقریر کی مشق کا بھی انتظام تھا، درس قرآن میں مستقل طور پر صرف دو طلبہ ہی حاضر رہتے، ایک سید صاحب اور دوسرے ضیاء الحسن علوی، یہ درس مولانا شبلی نعمانی دیا کرتے تھے، کچھ دنوں کے لیے مولانا حفیظ اللہ نے بھی دیا، فلسفہ جدید میں سید صاحب اور ضیاء الحسن علوی کے ساتھ میں بھی شریک ہوتا تھا لیکن اور طلبہ زیادہ دنوں تک ساتھ نہ دے سکے، اسکی تعلیم مولانا حمید الدین فراہی اور انکے بعد پروفیسر مرزا سید محمد ہادی دیتے تھے، تقریر کی مشق میں بہت سے طلبہ شریک ہوتے، اسکے پہلے گروپ میں عبدالباری بہاری مرحوم، سید سلیمان اور ضیاء الحسن علوی تھے، دوسرے میں خاکسار کے علاوہ حافظ عبدالصمد اعظمی، قمر الدین اعظمی اور محمد یوسف تھے، تیسرے میں عبدالسلام، مسعود علی اور عبدالواجد تھے، ان میں عبدالباری مرحوم نے اچھی مشق پیدا کی، وہ مولوی غلام محمد شملوی سفیر ندوہ کے ساتھ یوپی کے شہروں کا دورہ کرکے تقریریں کرتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں ہم لوگوں کے سامنے ندوہ کا پہلا گروہ فارغ التحصیل ہوا، اس میں مولوی عبدالباری مرحوم، مولوی محمد جلیل اعظمی، مولوی عبدالرحمن فتحپوری، مولوی محمد یوسف خلف مولانا حفیظ اللہ صاحب تھے، ان تمام حضرات نے ندوہ کی تعلیم سے فراغت کے بعد طب شروع کی، البتہ مولوی محمد یوسف ندوہ ہی میں مدرس ہوگئے، ۱۹۰۶ء میں دوسرا گروہ فارغ ہوا جس میں مولوی ضیاء الحسن علوی بھی تھے۔ وہ ندوہ کے بعد علی گڈھ ایم اے او کالج چلے گئے، اور یہاں سے ایم اے کیا، ۱۹۰۷ء

میں ندوہ کا سالانہ جلسہ بنارس میں ہوا، تو اس میں تقریر کرنے کے لیے ندوہ سے دو طلبہ منتخب ہوئے، مولوی عبدالباری بہاری اور سید صاحب، مولوی عبدالباری کی آواز بلند تھی، انکو غلام محمد صاحب شملوی کیساتھ بہت سی جگہوں پر تقریر کرنے کا اتفاق ہو چکا تھا، اس لیے انکی تقریر ایسی کامیاب رہی کہ مولانا شبلی نے غایت محبت میں عین تقریر کے دوران ہی میں اپنی عبا ان کو پہنا دی، سید صاحب کی آواز دھیمی تھی، اسلیے انکی تقریر کا وہ اثر نہ ہو سکا، جو مولوی عبدالباری کی تقریر کا ہوا تھا، لیکن جو حضرات پنڈال پر تشریف فرما تھے، انھوں نے سید صاحب کی سلجھی ہوئی تقریر کی داد مولانا شبلی کو دی، اور جناب شاہ سلیمان پھلواروی نے خوش ہو کر سید صاحب کو اپنی عبا دینے کا وعدہ کیا، جس کا تقاضا سید صاحب ان سے برابر کرتے رہے، ۱۹۰۶ء میں مولانا ابوالکلام آزاد الندوہ کی سب اڈیٹری کے بعد وکیل کی ادارت سنبھالنے کے لیے امرتسر چلے گئے، سید صاحب کی تحریر میں اس وقت تک کچھ پختگی آ گئی تھی، اسلیے مولانا شبلی نے الندوہ کا پورا کام ان کے ذمہ کر دیا جس کو انھوں نے بڑی خوبی سے انجام دیا، اسی سال ہم لوگوں کا سالانہ امتحان مولانا شبلی نعمانی کی نگرانی میں ہوا، اور سید صاحب کے ساتھ میں بھی امتیازی حیثیت سے پاس ہوا، اس وقت امتحان میں صرف تین طلبہ شریک ہوئے تھے، ہم دونوں اور عبدالخلاق رمضان پوری بہاری تھے،

۱۹۰۷ء کے مارچ میں تقسیم اسناد کا جلسہ ہوا، جس میں ۱۹۰۴ء سے ۱۹۰۷ء تک کے فارغ التحصیل طلبہ شریک تھے، حاضرین میں ندوہ کے حامی اور مخالف، ہمدرد اور نکتہ چیں دونوں تھے، اس موقع پر مولانا شبلی نے اپنے مخصوص اور عزیز طلبہ کی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرانے کی خاطر ان سے تقریریں کرائیں، پہلے مولوی ضیاء الحسن علوی نے اردو میں کلام پاک کے اعجاز پر تقریر کی، پھر سید صاحب نے "علوم جدید و قدیم" کے عنوان پر اردو میں تقریر شروع کی، تقریر کے دوران ہی میں کسی نے کہا کہ اگر عربی میں تقریر کریں تو ہم ندوہ کی کرامات کا یقین کریں، مولانا شبلی نے کھڑے ہو کر کہا کہ ہاں یہ عربی میں بھی تقریر کر سکتے ہیں، کوئی صاحب چاہیں تو اسی وقت موضوع مقرر کر دیں، خواجہ غلام الثقلین نے "ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیونکر ہوئی" موضوع مقرر کیا، سید صاحب نے بغیر کسی جھجک کے فوراً عربی میں تقریر شروع کر دی اور بہت فصیح و صحیح زبان میں تقریر کی جس سے حاضرین بہت متاثر ہوئے اور مولانا شبلی نے غایت خوشی میں اپنے سر سے عمامہ اتار کر شاگرد کے سر پر باندھ دیا، اسکے بعد

ندوہ کے معاندین نہ صرف خاموش ہوگئے بلکہ اس کے حامی بن گئے۔ اس جلسہ کی صدارت مولانا غلام محمد صاحب ہوشیارپوری کر رہے تھے، انھوں نے طلبہ کو ایک ایک حمائل مطبوعۂ بیرت عطا فرمائی، سید صاحب اس حمائل کو ہمیشہ سفر و حضر میں ساتھ رکھتے اور اسی سے تلاوت فرماتے تھے، اثنائے تلاوت میں کوئی خاص بات ذہن میں آجاتی تو اس کو حاشیہ پر لکھ دیتے، کاش وہ حمائل دارالمصنفین کو مل جاتی تو اس سے استفادہ کرنے کا موقع ملتا، ورنہ جہاں ہوگی بجز طاق نسیاں پر پڑی رہنے کے کوئی اس سے فائدہ اٹھانے والا نہ ہوگا۔

ہم دونوں ۱۹۰۷ء میں جب ندوہ سے فارغ ہوئے تو میری اور سید صاحب کی راہیں الگ الگ ہوگئیں، میں زندگی کے کچھ نشیب و فراز دیکھنے اور کچھ دنوں طبابت کرنے کے بعد سرکاری اسکول میں عربی، فارسی اور اردو پڑھانے میں لگ گیا لیکن سید صاحب ان تینوں زبانوں میں علمی افق پر بدر کامل بنکر چمکے، اور میں انکی ضیا باری کا محض تماشائی بنا رہا،

اوائل زندگی سے آخر وقت تک گھریلو زندگی میں ساٹھ سال سے زیادہ انکا ساتھ رہا، یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ ان میں بشری کمزوریاں نہیں تھیں لیکن اس طویل مدت میں یاد نہیں آتا کہ انھوں نے مجھے کبھی ایسی بات کہی ہو جس سے مجھکو تکلیف یا اذیت ہوئی ہو، انکی بے تکلفی میں بھی سنجیدگی ہوتی تھی، ہنسی مذاق میں بھی وقار ہوتا، اور اپنے سے قریب تر رہنے والوں کو زیادہ اپنا گرویدہ اور شیفتہ بناتے تھے، ہم دونوں نے زندگی کا سفر ساتھ شروع کیا تھا، لیکن وہ جس طرح ہر شعبۂ زندگی میں مجھ سے آگے رہے، اسی طرح سفر آخرت میں بھی سبقت کی اور مجھکو پیچھے چھوڑ گئے، وہ اپنی دینداری، خشیت الٰہی، محبت رسول، پاکیزگی نفس، طہارت طبع اور بلند کرداری کی بدولت اپنے ساتھ بہت کچھ توشۂ آخرت لے گئے اور اب جب کہ میں خلوت نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہوں اور ان ہی کی بتائی ہوئی راہ پر گامزن ہوں تو میری آرزو صرف یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں ان سے چولی دامن کا ساتھ رہا، اور انکی دینی و دنیاوی زندگی کے کمال و جمال کو بہت قریب سے دیکھتا رہا، اسی طرح آخرت میں جب ان پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کی بارش ہو رہی ہو، اس وقت میں ان کے ساتھ اس سے محروم نہ رہوں۔ آمین ثم آمین

فقہ اسلامی کے مآخذ

از
جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر مدرس دارالعلوم معینیہ اجمیر

(۳)

ملکی قانون

ملکی قانون سے استفادہ | فقہ اسلامی کا بارہواں ماخذ "ملکی قانون" ہے۔

قرآن وسنت سے اس کے ثبوت کی دلیل وہی آیتیں اور حدیثیں بن سکتی ہیں جو عرف و رواج کے باب میں مذکور ہو چکی ہیں، دعوتِ الٰہی کے اہم مقاصد میں یامرھم بالمعروف (رسول معروف کا حکم دیتا ہے) کا ذکر ہے اور معروف کے عموم میں وہ ملکی قانون بھی داخل ہیں، جو اسلامی اصول کے موافق ہوں اور شرع اور عقل کے خلاف نہ ہوں،

امت مسلمہ کے "مشن" میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے،

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (۳/۱۰۶)	تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں کی اصلاح و ہدایت کے لیے ظہور میں آئی ہو، تم معروف کا حکم دینے والے اور منکر سے روکنے والے اور اللہ

اس بنا پر یہ امت جہاں جہاں گئی وہاں کے اچھے رسوم و قوانین (معروف) کی حوصلہ افزائی کی، ان سب کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ ماقبل کی شریعت کے بقایا تھے اور معاشرتی فلاح و بہبود

کے لحاظ سے وہاں کے باشندوں نے کوئی قانون وضع ہی نہ کیا تھا محض غلط اندیشی اور قومی وجماعتی زندگی سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کے بعض پرانے قوانین کو اپنایا

ابتداء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے ان قوانین کو معمولی ترمیم و اصلاح کے بعد قبول فرمایا، جو عرب میں رائج تھے، خواہ انکا تعلق ما قبل کی کسی شریعت سے تھا یا نہ تھا، اور بعد میں یہی قوانین فقہ اسلامی کا جزء قرار پاگئے، لیکن اس قبولیت کے ہر مرحلہ میں معاشرہ کی حالت اور عوامی شعور کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگالیا گیا اور جنکو قبول کیا گیا ان میں ان کو اس طرح اسلام کے قالب میں ڈھالا گیا کہ وہ شریعت اسلامیہ میں بالکل فٹ ہوگئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں عرب میں حسب ذیل قسم کے قوانین موجود تھے:

(۱) مدعی سے دعویٰ کے ثبوت کے لیے گواہ طلب کیے جاتے تھے، اگر گواہ نہ ہوتے اور مدعا علیہ انکار کرتا تو مدعا علیہ کو قسم دی جاتی تھی،

فقہ کا مسلمہ اصول ہے "البینۃ علی المدعی والیمین علیٰ من انکر" (گواہ مدعی کے ذمہ ہیں اور قسم انکار کرنے والے کے ذمہ ہے)

(۲) نکاح کے کئی طریقے رائج تھے، غلط طریقوں کو موقوف کرکے ان کی جگہ صحیح طریقہ کو قائم رکھا گیا۔

(۳) تملیک جائداد کی مختلف صورتیں رائج تھیں، بیع، ہبہ، رہن، اجارہ وغیرہ ان کو قائم رکھا گیا اور ان سب کے احکام فقہ میں موجود ہیں، (۴) بیع (خرید و فروخت) کی مختلف شکلیں رائج تھیں، بیع صرف، سلم، مرابحہ، تولیہ وغیرہ، ان میں نزاع اور فساد کی صورتوں کو باطل قرار دیکر صحیح صورتوں کو رواج دیا گیا، فقہ میں ہر ایک کے احکام موجود ہیں (۵) زمین کو اجارہ یا بٹہ پر دینے کا رواج تھا (۶) وصیت کا دستور تھا (۷) معاملات کے تصفیہ اور قوانین کے نفاذ کی مختلف صورتیں رائج تھیں وغیرہ، تفصیل پہلے گذر چکی ہے[1]۔

---

[1] ملاحظہ ہو معارف فروری ۵۵ء

غرض رائج شدہ قوانین میں جو بھی اسلامی اصول کے موافق تھے یا ان کو بروئے کار لانے میں معاون بنتے تھے، ان سب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول فرمالیا، اور جن میں کچھ خامی تھی ان میں ترمیم واصلاح کرکے انھیں موافق بنایا،

صحابۂ کرام کا مختلف ملکوں کے قوانین سے استفادہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے بعد صحابۂ کرام وغیرہ کو جن ملکوں اور قوموں سے سابقہ پڑا انھوں نے بھی ان کے اچھے قوانین کو قبول کیا اور بعد میں وہ سب فقہ اسلامی کا جزء بنے، اس کی چند صورتیں تھیں،

(۱) صحابۂ کرام تجارت کے لیے ملک شام، مصر، حبشہ، عراق، یمن، عمان وغیرہ جایا کرتے تھے، شام ومصر میں رومی اور عراق میں ایرانی قانون سے انھیں سابقہ پڑتا تھا، یمن میں بھی یہودیوں، رومیوں، اور ایرانیوں کے اثرات تھے، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہی اسلامی فتوحات کا سلسلہ مغربی جین سے اندلس کے کچھ حصہ تک پہنچ گیا تھا، اس وسیع علاقہ میں کئی مستقل تمدن پہلے سے موجود تھے، اور رومی قوانین بھی رائج تھے،

(۲) ان مفتوحہ ممالک کی زبان، کلچر، مذہب وغیرہ ہر شے کی حفاظت اور معاملات کے تصفیہ اور مراسم کی ادائگی میں حتی الامکان ملک ومذہب کے قوانین کا لحاظ کیا جاتا تھا۔

واقر اهلها فیها علی مللهم وشرائعهم[1]	ملکوں کے باشندے اپنے اپنے مذاہب اور قوانین پر باقی رکھے گئے تھے،

ان کو نکاح، میراث اور دیگر معاملات وغیرہ میں پوری آزادی باقی تھی،

فهم احرار فی شهاداتهم ومناکحاتهم ومواریثهم وجمیع احکامهم[2]	وہ اپنی شہادت، نکاح، وراثت وغیرہ کے تمام قوانین میں آزاد تھے (اپنے قوانین کے مطابق عمل کرتے تھے)

---

[1] کتاب الاموال ص ۱۰۱ [2] ایضاً

ایک عرصہ تک مفتوحہ ممالک کے دفاتر کی زبان بھی ملکی برقرار رکھی گئی تھی، چنانچہ عراق کا دفتر فارسی میں، شام کا دفتر رومی میں اور مصر کا دفتر قبطی میں تھا، عبد الملک کے زمانہ میں عربی زبان دفتری زبان قرار پائی۔

(۳) معاہدین اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ مسلمانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، اور اسلامی حکومت میں انھیں پورے حقوق و مراعات حاصل تھے، اور باہمی اخذ و استفادہ کا سلسلہ جاری تھا، اس لیے قیاس ہوتا ہے کہ ان کے تمدن اور قانون کا اثر بھی اسلامی قانون پر پڑا ہوگا،

حضرت عمرؓ نے مفتوحہ ممالک کے بہت قوانین باقی رکھے

(۴) عراق، شام، مصر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے بہت حد تک رومی، یونانی اور ایرانی قانون لگان و مالگذاری کو باقی رکھا تھا، البتہ ظلم و زیادتی کی صورتیں اور کاشتکاروں کے ساتھ جو سختی تھی انکی اصلاح و ترمیم کر دی گئی تھی، [1]

(۵) جنگی وغیرہ کے لیے یہ قانون تھا کہ بیرونی ممالک کے تاجروں کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے جیسا وہ مسلمان تاجروں کے ساتھ اپنے ملک کے قانون کے مطابق کرتے ہیں، اس طرح بعض ملکی قانون فقہ اسلامی کا جزء قرار پائے،

فقہ کی بنیاد کسی غیر ملکی قانون پر نہیں ہے

اسی طرح مسلمانوں نے دوسری قوموں، دوسرے ملکوں کے بعض اچھے قوانین اور دستوروں کو قبول کر لیا اور ان میں اصلاح و ترمیم کرکے انکو اسلامی سانچہ میں ڈھال لیا، مختلف قوموں اور ملکوں میں اس قسم کا جزئی اخذ و استفادہ بالکل فطری اور ناگزیر ہے، اسلام نے بھی اس کی اجازت دی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن — اچھی اور عمدہ بات مومن کا گمشدہ مال ہے، جہاں پائے

فحیث وجدھا فھو احق بھا — اس کو لینے کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب اسلام کا زرعی نظام

کلمۃ الحکمۃ میں محض اچھی باتیں نہیں بلکہ سب اچھی چیزیں داخل ہیں، لیکن اس کا مطلب نہیں ہے کہ اسلامی فقہ غیر ملکی قانون سے تمام تر ماخوذ ہے۔ جیسا کہ بعض متعصب مستشرقین لکھتے ہیں کہ وہ رومی قانون سے ماخوذ ہے، اور بعض تو اس کو رومی قانون ہی کی دوسری شکل بتاتے ہیں، لیکن ظن و قیاس کے علاوہ اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ اس کے ثبوت میں یہ چند مثالیں دی جاتی ہیں،

(۱) فقہ کا یہ قانونی کلیہ "البینۃ علی المدعی والیمین علی من انکر" رومی قانون میں بھی ہے،

(۲) معاملات و مالیات کے بعض احکام میں مشابہت ہے،

(۳) بعض علمی اصطلات مثلاً فقہ اور فقیہ کے ہم معنی الفاظ رومیوں میں مستعمل تھے،

(۴) اسلامی فتوحات کے وقت شام میں رومی قانون کے بعض مدارس قیصریہ وغیرہ قائم تھے،

(۵) بعض ایسے ادارے اور محکمے تھے جنہیں قانون روما کے مطابق قوانین نافذ تھے،

لیکن یہ ظاہر ہے کہ فقہ کے پورے دفتر میں ایک دو مثالیں یا کسی قانون میں جزوی مشابہت اور قیاسات، اسلامی فقہ سے رومی قانون سے ماخوذ ہونے کا ثبوت نہیں ہے، یہ اور بات ہے کہ دوسرے قوانین کی طرح فقہ میں رومی قانون سے بھی جزوی استفادہ کیا گیا ہو، ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اس موضوع پر نہایت فاضلانہ مقالات لکھے ہیں جن میں اس الزام کی بڑی محققانہ تردید کی ہے۔

فقہی اصول و کلیات

ذیل میں چند وہ اصول و کلیات بیان کیے جاتے ہیں جن سے فقہائے اسلام کے اصولوں کو قائم رکھتے ہوئے احکام میں تخفیف و سہولت کی صورتیں نکالی ہیں، پھر فقہ کی جدید تدوین کے مرحلہ میں بھی ان سے مدد لی جاسکتی ہے،

مشقت سہولت لاتی ہے	(۱) المشقۃ تجلب التیسیر مشقت سہولت لاتی ہے،

اس کی بنیاد قرآن حکیم کی درج ذیل آیتیں ہیں،

یُرِیدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (البقرۃ)	اللہ تمھارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور دشواری نہیں چاہتا۔
یُرِیدُ اللّٰہُ اَنْ یُّخَفِّفَ عَنْکُمْ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِیْفًا (النساء)	اللہ چاہتا ہے کہ (بیجا سختیوں کے بجائے) تمھارے بوجھ کو ہلکا کرے، انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔
لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (بقرۃ)	اللہ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا یہ مقصد بیان کیا گیا ہے:

وَیَضَعُ عَنْھُمْ اِصْرَھُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ کَانَتْ عَلَیْھِمْ (الاعراف)	اللہ کا رسول اس بوجھ سے نجات دلائیگا جسکے نیچے وہ دبے ہونگے، ان پھندوں سے نکالیگا جنمیں گرفتار ہونگے۔

یہ بوجھ اور پھندے دین میں غلو اور تقشف کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور دل و دماغ کو مقید و جامد بنادیتے ہیں جس سے زندگی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں، اور انسان سمٹ سمٹا کر ایک چہار دیواری میں محدود ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ذیل کی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دین شریعت کی نفسیات بیان کرتے ہوئے فرمایا:

ان الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبہ[1]	دین آسان ہے لیکن جو شخص دین میں مبالغہ کرتا ہے اس پر وہ غالب آجاتا ہے۔

ایک اور موقع پر آپ نے اعتدال و میانہ روی کو نبوت کا جزو فرمایا:

الاقتصاد جزء من خمس وعشرین جزءا من النبوۃ[2]	میانہ روی (تمام حالتوں اور تمام کاموں میں) نبوت کا پچیسواں جزء ہے۔

---

[1] بخاری و مشکوۃ باب القصد فی العمل [2] ابوداؤد و مشکوۃ باب الحذر والتانی فی الامور

بحث مشقت کی تفصیل یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ فقہاء نے نہ ہر مشقت کو زیر بحث مشقت میں شمار کیا ہے، اور نہ تخفیف و سہولت کو اس قدر عام کیا ہے کہ انسان جب چاہے اس کی راہیں نکالے بلکہ ہر ایک کے لیے شریعت میں اصول وضوابط مقرر اور حدود وقیود متعین ہیں، الٰہی پالیسی کا بھی تقاضا یہی ہے کہ اس معاملہ میں انسان آزاد نہ چھوڑا جائے، ورنہ دین سہل پسند اور ناعاقبت اندیش لوگوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہ جائیگا۔

شریعت کا مقصد ہے کہ انسانوں کی زندگی صاف ستھری گذرے، ان میں خیالات وعادات پر قابو پانے کی صلاحیت اور ذاتی اغراض ومفاد اور نفسانی خواہشات کو دبانے کی ہمت وطاقت پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ زندگی میں یہ جوہر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب انسان کی حیوانی جبلت پر اخلاقی پابندیاں اور حد بندیاں عاید ہوں، اور ترک واختیار کے اخلاقی وقانونی ضابطے مقرر ہوں، اسکے بغیر نہ انسانی زندگی بن سکتی ہے اور نہ صالح معاشرہ وجود میں آسکتا ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے کہ خواہشات کو قابو میں رکھنے کے لیے احکام وقوانین مقرر کیے جائیں اور ان میں انسان کو معمولی تکلیف ومشقت بھی نہ برداشت کرنی پڑے، اور صالح معاشرہ کو بروئے کار لانے کے لیے خار دار جھاڑیوں سے گذرنا پڑے اور جذبات وخواہشات کی حد بندی میں ہر جگہ تخفیف و سہولت ہو،

جہانتک نفس مشقت کا تعلق ہے انسان کی زندگی کا کوئی شعبہ بھی اس سے خالی نہیں ہے، حتی کہ کھانا پینا وغیرہ زندگی کے معمولات میں بھی مشقت ہے، اسی بنا پر فقہاء کہتے ہیں،

فاحوال الانسان کلھا	اس دنیا میں انسان کی ساری حالتیں مشقت
کلفة فی ھذہ الدار فی اکلہ	والی ہیں حتی کہ کھانا پینا اور دوسرے تمام کام
وشربہ وسائر تصرفاتہ	مشقت سے خالی نہیں ہیں، مگر اللہ تعالیٰ نے

ولکن جعل له قدرة علیها — انسان کو ایسی قدرت و طاقت دی ہے
بحیث تکون تلک التصرفات — کہ وہ ان مشقتوں پر حاوی ہے
تحت قھرہ لا ان یکون ھو تحت قھرھا[1] — نہ یہ کہ مشقتیں انسان پر حاوی ہیں،

ایسی حالت میں شرعی احکام و قوانین کی پابندی میں بالکلیہ مشقت کی نفی کیونکر ممکن ہے۔ اور ہر معمولی تکلیف میں تخفیف و سہولت کا مطالبہ کیسے جائز ہوگا،

مشقت و تکلیف سے دنیا کا کوئی کام خالی نہیں ہوتا ہے | تکلیف و مشقت کی جتنی مقدار دنیوی جد و جہد کے سلسلہ میں انسان کو برداشت کرنی پڑتی ہے، وہ زندگی کے قیام و بقا کے لیے جس کے بغیر چارہ نہیں ہے، بلکہ ایک مخصوص مقدار صحت و توانائی برقرار رکھنے کے لیے بھی ضروری ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کا کام جسمانی مشقت کا نہیں ہے، وہ بھی اپنی صحت کی بقا کے لیے تھوڑی سی مشقت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، ورنہ صحت برباد ہو جائے، غرض مشقت کا ایک معتد بہ حصہ زندگی کا ایک لازمی جزء ہے کہ اس سے کسی صورت میں بھی مفر نہیں ہے، اور ایک حصہ ایسا ہے کہ زندگی کی جد و جہد اور کاروبار میں اس کے بغیر چارہ نہیں ہے، ان دونوں قسموں کو مشقت کے بجائے "محنت" کہنا زیادہ مناسب ہے، اور فقہا کی اصطلاح میں اس کو عادت والی مشقت کہا جاتا ہے، شریعت میں بڑی حد تک ان دونوں میں رخصت اور سہولت نہیں ہے، لیکن جو مشقت ایسی نہیں ہے کہ اس کو عادت میں داخل کیا جا سکے، یا اس کی مقدار اتنی زیادہ ہے کہ قیام و بقا میں مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوتی ہو، اس میں البتہ تخفیف و سہولت کی راہیں نکالی جائیں، فقہا اس کو غیر عادت والی یا خارج از عادت مشقت سے تعبیر کرتے ہیں، فقہ کی کتابوں میں اس کی یہ پہچان بیان کی گئی ہے،

زیر بحث مشقت کی پہچان | ان کان العمل یودی — اس کام کی نوعیت ایسی ہو کہ اس پر دائمی

---

[1] الموافقات للشاطبی ج ۲ ص ۱۲۳

الدوام علیہ الی الانقطاع	عمل سے جانی و مالی نقصان ہوتا ہو یا اس کے
عنہ او عن بعضہ والی وقوع	کرانے والے کی حالت میں تغیر واقع ہوتا ہو
خلل فی صاحبہ فی نفسہ او	جس سے لازمی طور سے کام چھوڑنے یا اس میں
مالہ او حال من احوالہ فالمشقة	تخفیف کرنے پر مجبور ہونا پڑے تو اس
ھنا خارجة عن المعتاد	قسم کی مشقت عادت والی مشقت سے
وان لم یکن فیھا شئ من ذلک	خارج سمجھی جائے گی اور جو ایسی نہ ہوگی
فی الغالب فلا یعد فی العادة	وہ عادت سے خارج نہ ہوگی (بلکہ محنت
مشقة[1]	میں شمار ہوگی)

یعنی جو شرعی احکام ایسے ہوں گے جن پر ہمیشہ عمل کرنے سے جانی و مالی نقصان ہو یا انسان کی حالت دن بدن غیر ہوتی جاتی ہو تو اس قسم کی مشقت تخفیف و سہولت کی طالب ہے۔ اور جو احکام ..نہ ہوں گے وہ نہ مشقت کے ذیل میں آئیں گے اور نہ ان میں تخفیف وسہولت کی گنجائش ہے،

...قت کی قسمیں | فقہا نے اصولی حیثیت سے مشقت کی دو قسمیں بیان کی ہیں: (۱) واقعی مشقت اور (۲) وہمی مشقت،

(۱) واقعی مشقت۔ شارع نے رخصت وسہولت کے جو اسباب بیان کیے ہیں انھیں ...منے رکھکر تخفیف کی صورت نکالی جائے۔ وہ اسباب یہ ہیں:

(۱) سفر (۲) مرض (۳) اکراہ (جبر و زبردستی) (۴) نسیان (۵) جہل (لاعلمی) (۶) عسر (مشکل اور دشواری میں پڑ جانا) (۷) عموم البلوی (عام طور پر لوگوں کا مبتلا ہونا) (۸) نقص ...(قدرتی طور پر کمی) (۹) جنون (۱۰) بیہوشی (۱۱) نیند (۱۲) کمسنی وغیرہ،

---

[1] الموافقات ج ۲ ص ۱۲۳

واقعی مشقت کی مثال وہ مریض ہے جس نے روزہ رکھکر ابھی نہیں دیکھا کہ وہ مرض کی وجہ سے روزہ نہ رکھ سکے گا، لیکن تجربہ اور مستند حکیم کی رائے پر اس کو یقین ہے کہ روزہ رکھنے میں انتہائی مشقت برداشت کرنی پڑے گی، چونکہ مریض کے لیے شریعت میں رخصت موجود ہے اس لیے ایسے شخص کو روزہ نہ رکھنے کی اجازت دیجائے گی، گو اس نے اس کا حالیہ تجربہ نہیں کیا ہے۔

فقہاء نے تخفیف و سہولت کے معاملہ میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، اور حتی الامکان گریز کیا ہے، چنانچہ مذکورہ صورت میں ان کے نزدیک اصل مشکل یہ ہے، کہ پہلے مریض کو روزہ رکھ کر دیکھنا چاہیے، اگر نا قابل برداشت ہو اس وقت رخصت پر عمل کرنا چاہیے لیکن اگر کسی نے ایسا نہیں کیا بلکہ گذشتہ تجربہ ہی کو کافی سمجھا تو علت (مریض پائے جانے) کی وجہ سے اجازت دیدیجائے گی۔

وہمی مشقت یہ ہے کہ شارع نے جن اسباب اور علتوں کا اعتبار کر کے رخصت اور سہولت کی اجازت دی ہے وہ عادۃً تو موجود ہوں لیکن فی الحال نہ پائی جارہی ہوں تو ایسی صورت میں ان کا اعتبار نہ ہوگا، اور نہ ان کی وجہ سے رخصت اور سہولت کی اجازت ہوگی، مثلاً ایک شخص کو باری سے (ناغہ کرکے) بخار آتا ہے، باری کے دن اس وقت تک رخصت کا مستحق نہ ہوگا جب تک بخار شروع نہ ہو جائے، اسی طرح عورتوں کے مخصوص دنوں کی جب تک ابتدا نہ ہو جائے وہ رخصت کی مستحق نہ قرار پائیں گی، غرض اس قسم کی صورتوں میں عادۃً علت کا موجود ہونا کافی نہیں بلکہ اس کا وقوع ضروری ہے، کیونکہ بسا اوقات عادت کے خلاف ہوتا رہتا ہے، اور عادت بدلتی رہتی ہے، اگر اسی کو مدار بنا لیا جائے تو احکام میں نظم و ضبط نہ قائم رہ سکے گا جو شریعت کی جان ہے۔

مشقت کے درجہ اور مرتبہ فقہاء نے مشقت کے درجہ اور مرتبہ بھی مقرر کیے ہیں، جن کی بنا پر وہ رخصت و سہولت کا فیصلہ کرتے ہیں، مثلاً

(۱) اونچا درجہ یہ ہے کہ کسی حکم پر عمل کرنے سے انسان کو اتنی مشقت برداشت کرنی

اس سے جان یا کسی عضو کو نقصان پہنچے۔ یا اس کے ان منافع کے زائل ہونے کا اندیشہ ہو، جن کے لیے اس کی ساخت ہوئی ہے،

(۲) ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ حکم پر عمل کرنے سے معمولی اور ہلکی پھلکی تکلیف ہو، سر یا کسی عضو میں معمولی درد کا اندیشہ ہو، یا مزاج پر ہلکے قسم کے اثر کا خوف ہو،

(۳) درمیانی درجہ یہ ہے کہ حکم پر عمل کرنے سے اتنی مشقت برداشت کرنی پڑے جو ان دونوں کے درمیانی ہو، مثلاً مرض کی حالت میں روزہ رکھنے سے مرض بڑھ جانے یا دیر میں اچھے ہونیکا اندیشہ ہو۔

ان تینوں درجوں میں اونچے اور درمیانی درجہ کی حالت رخصت اور سہولت پیدا کرتی ہے، ادنیٰ درجہ میں رخصت کی گنجایش نہیں ہے، کیونکہ اس قسم کی چیزیں معمولات میں معمولی تبدیلی سے پیدا ہوتی اور دور ہوتی رہتی ہیں، اور ان سے جس قسم کی خفیف مضرت پیدا ہوتی ہے، اس کو روکنے سے زیادہ بہتر اس مصلحت کا حاصل کرنا ہے جو حکم پر عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔[۱]

مشقت کے استعمال میں حد بندیاں اور پابندیاں

فقہا نے مشقت کے استعمال اور اس کے ذریعہ رخصت و سہولت کی اجازت میں حد بندیاں قائم کی ہیں اور پابندیاں لگائی ہیں، تاکہ حیلہ جو اور آزاد طبیعتیں بے محل یا ضرورت سے زیادہ اس کا استعمال نہ کرسکیں، مثلاً

(۱) جس حکم کے بارے میں شارع کی طرف سے صراحت موجود ہوگی اس میں مشقت کا مذکورہ اصول نہ چل سکے گا، اور جہاں یہ صراحت نہ ہوگی اور واقعی ضرورت بھی ہوگی تو صرف ضرورت کی حد تک اس اصول سے کام لیا جائے گا،

المشقة والحرج انما يعتبر في	مشقت اور حرج کا وہیں اعتبار کیا جائیگا جہاں
موضع لا نص فيه اما مع النص	شارع کی طرف سے صراحت نہ ہوگی اور جہاں صراحت
بخلافه فلا[۲]	مشقت کے تقاضا کے خلاف موجود ہوگی وہاں اعتبار نہ ہوگا،

۱؎ الاشباہ والنظائر ص ۹۵ ۲؎ حوالۂ بالا ص ۷۵

احکام وقوانین کے وضع کرنے میں اسلام کا یہ نقطۂ نظر رہا ہے کہ وہ ایسے ہوں کہ انکے ذریعہ منافع کا حصول اور مضرت کا دفعیہ ہوتا رہا ہے، اس نقطۂ نظر کی رعایت جس باریک بینی اور دقیقہ رسی کیساتھ عالم الغیب والشہادۃ کیجانب سے ہو سکتی ہے، ظاہر ہے کہ عام مادی نظریں اسکا تصور بھی نہیں کر سکتی ہیں، بسا اوقات بادی النظر میں ایک چیز انسان کی انفرادی، معاشرتی یا تمدنی زندگی کے لیے نہایت مفید اور کارآمد معلوم ہوتی ہے، لیکن گہرائی میں نتائج کے لحاظ سے ایسی مضرتیں پنہاں ہوتی ہیں کہ ہم اس کا احساس بھی نہیں کر سکتے ہیں۔ اسی طرح بظاہر ایک چیز ضرر رساں اور بیکار معلوم ہوتی ہے لیکن درحقیقت اس میں بہت سے مصالح و مفاد پنہاں ہوتے ہیں جن کا ہم ادراک نہیں کر سکتے،

قرآن حکیم کی درج ذیل آیت میں اسی اصول کی طرف اشارہ ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ	تمھیں جنگ کا حکم دیا گیا ہے، وہ تمھیں ناگوار ہے
لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا	لیکن بہت ممکن ہے کہ تم ایک بات کو ناگوار سمجھتے ہو
وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا	اور وہ تمھارے حق میں بہتر ہو اور بہت ممکن ہے کہ ایک بات
شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ	تمھیں اچھی لگتی ہو اور وہ تمھارے حق میں بری ہو،
وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (بقرہ)	اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

بظاہر جنگ و خونریزی بری چیز ہے، اس میں خود اپنی ہلاکت کا بھی خوف ہے لیکن بعض حالات میں ناگزیر ہو جاتی ہے، اور اس کے بغیر زندگی قائم نہیں رہ سکتی اور شر کا ازالہ نہیں ہو سکتا، اور خیر کے قیام کے لیے جنگ ضروری ہو جاتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان کی معاشرتی اور سماجی زندگی کے باریک تاروں کو سمجھنا اور پھر اسکی روشنی میں راہ عمل متعین کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اگر ایسا ہی آسان ہوتا تو جس طرح عالمی تصرفات کو انسان کے حیطۂ اقتدار میں دیدیا گیا ہے، اسی طرح اس کو بھی دیدیا جاتا، اس کے لیے نہ ہدایت الٰہی کے تسلسل کی ضرورت ہوتی اور نہ دین کے تکمیل کی، اس لیے مشقت کے استعمال اور اس کے ذریعہ رخصت وسہولت کی

اجازت میں بھی بڑی احتیاط اور نکتہ سنجی کی ضرورت ہے، نہ ہر شخص یہ کام کر سکے گا اور نہ اس بارے میں ہر ایک کا فیصلہ قابل اعتبار ہوگا،

مشقت میں جذباتی و نفسانی چیزوں کا ہر جگہ اعتبار نہ ہوگا

(۲) مشقت میں نفسانی خواہشات اور جذباتی میلانات کا بڑی حد تک اعتبار نہ ہوگا، کیونکہ شریعت کا مقصد ہے کہ انسان خواہشات کا تابع نہ بنے، بلکہ خواہشات کو شریعت کا تابع بنائے، قرآن و سنت کی بیشمار تصریحات اسکی تائید میں موجود ہیں۔

قرآن حکیم میں خواہشات کے اتباع کی برائی اس طرح بیان ہوئی ہے:

اَفَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوَاهُ (الجاثیہ)	کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی خواہشات کو معبود بنا رکھا ہے،

ایک اور موقع نفسانی و جذباتی فیصلہ کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے ہوئے فرمایا گیا ہے،

اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ	انسان کا نفس برائی پر بہت زیادہ آمادہ کرنے والا ہے (اسکے غلبہ سے بچنا آسان نہیں ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کا معیار یہ مقرر فرمایا ہے،

لا یومن احدکم حتی یکون هواه تبعا لما جئت به (مشکوٰۃ بحوالہ شرح السنۃ)	تم میں سے کوئی شخص اسوقت تک پورا مومن نہیں ہو سکتا جبتک اسکی خواہشات اس (شریعت) کی تابع نہ ہوں

اسی بنا پر فقہاء کہتے ہیں:

ان قصد الشارع من وضع الشریعة اخراج النفوس عن اهوائها و عوائدها فلا تعتبر فی شرعیة الرخصة بالنسبة الی کل من هویت (موافقات ج ۴)	شارع کا مقصد شریعت کے وضع کرنے سے انسان کو نفسانی خواہشات و عادات سے باہر نکالنا ہے اسلئے رخصت و سہولت میں انسان کی ہر مرضی اور خواہش کا اعتبار نہ ہوگا،

ایک اور موقع پر ہے،

وضع الشریعة علی ان تکون اھواء النفوس تابعة لمقصود الشارع فیھا[1]

شریعت اس لیے وضع کی گئی ہے کہ نفسانی خواہشیں شارع کے مقصود کے تابع بنیں۔

شارع نے جذبات و خواہشات کا ایک حد تک اعتبار کیا ہے

مگر یہی نہیں ہے کہ شریعت نے خواہشات و جذبات کا بالکلیہ اعتبار نہ کیا ہو بلکہ حصول منافع اور دفع مضرت کے لیے جن جن خواہشات و جذبات کی جہاں جہاں رعایت ضروری تھی شارع نے خوردبینی سے انکا مشاہدہ کرکے احکام و قوانین میں ان کی پوری رعایت کردی ہے، چنانچہ بہت سے مسائل میں اصول کلیہ کے خلاف موقع ومحل کی مناسبت سے وسعت سے کام لیا گیا ہے۔

فقہا نے بھی اس رعایت کو تسلیم کیا ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں:

وقد وسع اللہ تعالی علی العباد فی شھواتھم واحوالھم وتنعماتھم علی وجه لا یفضی الی مفسدة ولا یحصل بھا المکلف علی مشقة ولا ینقطع بھا عنه التمتع اذا اخذہ علی الوجه المحدود[2] فلذلک شرع له ابتداء رخصة السلم والقراض والمساقاة وغیر ذلک مما

اللہ تعالی نے انسانی خواہشات، اسکے مختلف حالات اور اسکی خوش عیشی کے بارے میں اس طرح وسعت سے کام لیا ہے کہ جس سے نہ کوئی مضرت پہنچے، نہ مشقت ہو اور نہ فائدہ کا سلسلہ بند ہو یہ اسی صورت میں ممکن ہو جب محدود طریقہ پر محدود پیمانہ میں انھیں استعمال کیا جائے۔ اسی وسعت کی بنا پر شارع نے ابتدا میں بیع سلم قرض پر باہمی لین دین اور مشترکہ کھیتی وغیرہ کی اجازت دی ہے اگرچہ ان میں

---

[1] الموافقات للشاطبی ج ۲ ص ۲۹۳

ھو توسعۃ علیہ وان کان فیہ مانع فی بعض[1] دوسرے قاعدہ کے لحاظ سے ممانعت موجود ہے۔

شقت میں متوقع اور غیر متوقع خطرات کا اعتبار نہیں ہے	(۳) مذکورہ مشقت کے استعمال میں متوقع وغیر متوقع خطرات کو ڈھونڈھ کر نکالنا یا نیکی و پرہیزگاری کے زعم میں معمولی مضرت کے اندیشہ سے اونچے درجہ کی مضرت قبول کر لینا

اور رخصت وسہولت پیدا کرنے کے لیے محض احتمال و امید کا اعتبار کرنا وغیرہ درست نہیں ہے۔

اصل یہ ہے کہ جب دل میں اخلاص و صداقت نہیں ہوتا اور خارجی اثرات کا غلبہ ہوتا ہے تو سادہ احکام و قوانین میں بھی طرح طرح کی پیچیدگیاں اور دشواریاں نظر آتی ہیں، ایسے موقع پر انسان طرح طرح حیلے کر کے بچاؤ کی صورت نکالتا ہے اور اسے معقول بنانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر دیتا ہے بلکہ بسا اوقات نیکی و پرہیزگاری کا خیال خود نیکی و پرہیزگاری ہی کے خلاف استعمال کرنے لگتا ہے، قرآن حکیم میں اس قسم کی تمام باتوں کی ممانعت وارد ہوئی ہے،

وَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ ائْذَنْ لِي وَلَا تَفْتِنِّي أَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوا (التوبہ)	(اور بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں مجھے اجازت دیجئے اور فتنہ میں نہ ڈالیے، یاد رکھو یہی لوگ فتنہ میں گر پڑے (جھوٹے بہانہ بنا کر اللہ کی راہ اور اس کے حکم سے منہ موڑا)

قیام و بقا کی جد و جہد خواہ ابتدائی مرحلہ میں ہو یا درمیانی مرحلہ میں محض وہمی و فرضی باتوں اور معمولی مشقتوں کی بنا پر احکام و قوانین سے گریز کرنا اور یہ گمان کر لینا کہ عمل کی مشقت سے ہم فتنہ میں مبتلا ہو جائیں گے خود یہ بہت بڑا فتنہ اور نفس کا فریب ہے،

فَرِحَ الْمُخَلَّفُونَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلَافَ رَسُولِ اللَّهِ وَكَرِهُوا أَنْ يُجَاهِدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَقَالُوا لَا تَنْفِرُوا فِي الْحَرِّ (التوبہ)	(جو لوگ جہاد میں شریک نہیں ہوئے وہ اس بات پر خوش ہیں کہ اللہ کے رسول کی خواہش کے خلاف اپنے گھروں میں بیٹھے رہے اور ان پر یہ گراں گذرا کہ اپنے مال اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں، انھوں نے کہا...)

حق کی راہ اور صالح معاشرہ کے قیام میں آزمایش اور تکلیف میں مبتلا ہونا لازمی ہے، اسلیے ہر ایسے موقع پر رخصت و سہولت کی خواہش کرنا اور خود فریبی سے دل خوش کر لینا حق پرستی نہیں ہے، دین کو چھوڑیے، دنیاوی جد و جہد میں بھی تکلیف و مشقت کے بغیر چارہ کار نہیں، انسان حصول دنیا کے لیے کیا کیا مشقتیں نہیں برداشت کرتا، ایسی حالت میں دین کا حصول بغیر مشقت کیونکر ممکن ہے (باقی)

---

[1] الموافقات ج ۱ ص ۳۴۷

مسلمانوں کے ہندسی ادب کی ثروت

از جناب شبیر احمد خانصاحب غوری، ایم، اے

(۲)

علم ہندسہ کا آغاز علم کے بہت سے دوسرے شعبوں کی طرح علم ہندسہ بھی ابتدا میں انسان کی عملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے پیدا ہوا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کا آغاز مصر میں ہوا، جہاں دریائے نیل کے سیلاب کی وجہ سے مختلف کھیتوں کی حد بندی اور تشخیص خراج کے لیے زمین کی پیمایش ہر سال ناگزیر ہو جاتی تھی، قدیم یونانیوں نے مصریوں سے اس طریق پیمایش کے غیر منظم اصول و مبادی کو سیکھا اور ترقی دیکر اس علم کی بنیاد ڈالی جو مدارس میں "استخراجی ہندسہ" کے نام سے مشہور ہے،

پہلا یونانی عالم جس نے مصری ہندسہ کو یونانیوں سے متعارف کرایا ثالیس الملطی (Thales of Miletus) ہے۔ پروفیسر برنیٹ لکھتا ہے:

"مصری علم الہندسہ کو یونان میں داخل کرنے کا کام بلا کسی استثنا کے ثالیس الملطی کیجانب سے منسوب کیا جاتا ہے"[۱]

ثالیس کے بعد فیثا غورث (Pythagoras) نے علم ہندسہ کے ساتھ خصوصیت سے اعتنا و اہتمام کیا، اس کی اور اس کے پیرووں کی فلسفیانہ تفکیر کا مدار ہی ریاضیاتی علوم تھے [فیثا غورث ہی کی جانب اقلیدس کے مقالۂ اولی کی شکل ۴۷ (شکل عروسی) منسوب ہے] فیثا غورث کے بعد دوسرے یونانی حکما نے خود کو ہندسی تحقیقات کے لیے وقف کیا، ان کی کوشش سے علم ہندسہ میں تنوع اور وسعت اور

[۱] Burnet: Early Greek Philosophy P. 43

ہیئتی مسائل کے لیے نئی نئی بحثیں پیدا ہوئیں، اور ان کی منظم ترتیب و تدوین سے علم ہندسہ کی مختلف شاخیں وجود میں آئیں۔ ان میں سب سے اہم وہ شاخ ہے جسے "اصول ہندسہ" کہتے ہیں، "اصول ہندسہ" کی حقیقت و ماہیت برقلس (Proclus) کے لفظوں میں حسب ذیل ہے:

"علم ہندسہ کی بنیاد چند ایسی اساسی اشکال پر ہے جن کا باقی اشکال ہندسہ سے وہی تعلق ہے جو اصول کا فروع کے ساتھ ہوتا ہے، اور جن کے ذریعے ان کے تمام خواص کا ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ ان بنیادی اشکال کو "اصول" (Elements) کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔[1]"

"اصول ہندسہ" کی تعلیمی اہمیت کے بارے میں طوبیقا کے آٹھویں مقالے میں لکھا ہے:

"علم ہندسہ کے لیے اصول (ہندسہ) میں تبحر مستحسن ہے۔[2]"

اصول ہندسہ کی ترتیب و تدوین اس اہم موضوع پر سب سے پہلے بقراط کیوسی Hippocrates of Chios) (زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا نصف آخر) نے ایک مستقل کتاب تصنیف کی۔ پھر لاؤن (Leon) نے اس فن میں کتاب لکھی۔ لاؤن افلاطون (۴۲۹۔۳۴۷ ق م) سے کچھ چھوٹا تھا، مگر اس کا شاگرد نہیں تھا، اقادیمیا (افلاطون کے مدرسہ) میں علم ہندسہ کی جو کتاب پڑھائی جاتی تھی وہ تیوذیوس مغنیسادی (Theudius of Magnesia) کی تصنیف تھی،[3] لیکن مسلمان مورخین کا کہنا ہے کہ خود افلاطون نے اصول ہندسہ پر ایک کتاب لکھی تھی تفصیل آگے آرہی ہے۔

لیکن یونان کی ہندسی عبقریت کا لافانی شاہکار اقلیدس (زمانہ ۳۰۰ ق م کے قریب) کی "اصول ہندسہ" ہے جو اگرچہ اس کے پیشرووں ہی کے اکتشافات پر مبنی ہے مگر اس کی خوبی وجودت اور حسن تنظیم کے پیش نظر سابق کے تمام "اصول ہندسہ" ماند ہو کر رہ گئے اور آج کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ برقلیس نے ایک مثالی "اصول ہندسہ" کے ممیزات بیان کرنے کے بعد اقلیدس کے

۱۱۶-۱۱۷

---

[1] T. L. Heath: Thirteen Books of Euclid vol. 1 P. 114 [2] ایضاً ص ۱۱۶ [3] ایضاً ص T. L. 1

اصول ہندسہ کے بارے میں لکھا ہے :

"اقلیدس کا نظام "اصول" بقیہ (سابقہ) کتب اصول کے مقابلہ میں فایق و برتر ثابت ہوا ہے کیونکہ اس کی افادیت مادہ اولین کی اشکال (مجسمات خمسہ) (Primordial figures) کے ہندسی خواص کی تحقیقات میں اعانت کرتی ہے۔ اس کے وضوح اور کمال نظم کا راز اس بات میں مضمر ہے کہ بسیط ترین اشکال ہندسیہ سے پیچیدہ تر اور زیادہ غامض ہندسی مسائل مستنبط کیے جاتے ہیں اور تحقیق کا مدار تصورات اولیہ پر ہے۔"[۵]

یہی نہیں بلکہ آج بھی اقلیدس کے اصول ہندسہ سے استفادہ کیے بغیر چارہ نہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا آرٹیکل نویس "جیومیٹری" لکھتا ہے :

"یونانیوں کی سب سے جامع اور منظم کوشش جو انھوں نے ہندسی اشکال کو ایک منطقی سلسلے میں مرتب کرنے کے ضمن میں کی (کہ ہر ابتدائی شکل اپنی پیشرو سے مستخرج ہو) اور جو ہم تک پہنچی ہے وہ ادبیات عالم کے شاہکاروں میں سے ہے یعنی اقلیدس اسکندرانی کی "کتاب الاصول"........ آج سے ایک نسل پہلے تک اس قدیم تصنیف کے حرفی ترجمے انگلستان کے تمام پبلک اسکولوں میں بطور درسی کتاب کے مروج تھے، عہد حاضر میں تمام ممالک کے اندر ہندسہ کی درسی کتابیں اصول اقلیدس ہی کے انتخابات پر مبنی ہیں جو نوعمر طالب علموں کی تعلیمی سہولتوں کے پیش نظر کیے گئے ہیں، لیکن یہ انتخابات تعلیمی سہولتوں کا دعوی کریں تو کریں، ان کے اندر تعلیمی سہولت کی خاطر ہندسی تفکیر کی منطقی صحت اور جامعیت قربان ہوگئی ہے۔"[۶]

اقلیدس مسلمانوں سے پہلے | علم ہندسہ کا یہ لافانی شاہکار مسلمانوں کی مساعی علمیہ کا موضوع بنے بغیر کیسے بچ سکتا تھا، اس سلسلے میں ان کی سعی مسلسل کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ان کے پیشرودوں نے اس کتاب

---

۵ T. L. Heath: Thirteen Books of Euclid Vol. I P. 115

۶ Encyclopaedia Britanica Vol. I. P.

کے ساتھ جو اعتنا کیا ہے اس کی تفصیل ضروری ہے، اصول اقلیدس ۳۰۰ ق م کے قریب تصنیف ہوئی اور آخری یونانی مہندس برقلس (۴۱۲ء – ۴۸۵ء) ہے، اس کے بعد اقلیدس کے ساتھ یونان میں اعتنا نہیں کیا گیا، اس سات سو آٹھ سو سال کے عرصہ میں اصول اقلیدس کے سلسلے میں خود یونانی ثقافت نے جو کچھ کیا اس کی تفصیل "شرح اقلیدس" اور "شرح مصادرات وحل شکوک" کے ذیلی عنوانات کے تحت آگے آرہی ہے۔

لیکن بعثت اسلام کے قبل دنیا کی عظیم الشان ثقافت رومی و بازنطینی تہذیب تھی، رومیوں نے ۱۴۶ ق م میں یونان کو اور ۳۰ ق م میں مصر کو جو یونانی ثقافت کا گہوارہ تھا، فتح کر کے رومن امپائر میں مدغم کر لیا تھا، پھر فتح یونان کے وقت رومی فاتحین بداوت و بربریت سے نکل کر آئے تھے، بلکہ ایک عظیم الشان سلطنت کے مالک اور ایک ترقی یافتہ تہذیب کے علمبردار تھے، جس کا نظام قانون آج بھی یورپ کے قانونی نظاموں کی اساس ہے، بایں ہمہ اقلیدس کے ساتھ انھوں نے کوئی اعتنا نہیں کیا، اقلیدس کا واحد ترجمہ جو رومن دنیا میں مروج رہا بوئیتھیوس (Boethius) کا کیا ہوا تھا، مگر یہ صرف اصول اقلیدس کے ابتدائی مقالوں کی تلخیص تھی[1]۔ لاطینی زبان میں پہلی مرتبہ کامل اقلیدس کا ترجمہ ایتھلارڈ (Athelhard) نے ۱۱۲۰ء میں کیا، لیکن یہ ترجمہ یونانی سے نہیں بلکہ عربی سے کیا گیا، مگر یہ ترجمہ رومن امپائر کی علمی سرپرستی یا بازنطینی تہذیب کے کارنامے کے بجائے قرون وسطیٰ کے یورپ کی ثقافتی مساعی میں محسوب ہونے کا زیادہ مستحق ہے۔

غرض ۱۴۶ ق م سے جبکہ رومیوں نے یونان کو فتح کیا ۱۱۲۰ء تک ایتھلارڈ نے عربی سے لاطینی میں اقلیدس کا ترجمہ کیا، علم ہندسہ کی سرپرستی کے سلسلے میں رومی ثقافت کا کارنامہ محض اس قدر ہے کہ اس نے اقلیدس کے کچھ ابتدائی مقالوں کی تلخیص کی اور بس۔

---

[1] T. L. Heath: Thirteen Books of Euclid Vol. I P. 92

اس کے مقابلے میں علم ہندسہ کے ساتھ اسلامی ثقافت کے اعتنا کا یہ عالم ہے کہ ڈیڑھ سو سال کی مدت میں [منصور کے زمانہ سے لیکر جبکہ بقول ابن خلدون اقلیدس کا عربی میں پہلا ترجمہ ہوا، اسحٰق بن حنین اور ثابت بن قرہ کے زمانہ تک جبکہ اقلیدس کا مروجہ ترجمہ ہوا] نہ صرف یونان کا ہندسی سرمایہ عربی میں منتقل ہو گیا، بلکہ مہندسین اسلام نے اپنے پیشرو یونانی فضلا کی کوتاہیوں کی اصلاح کرکے اپنی سعی پیہم سے یونانیوں کے ہندسی ورثہ سے کہیں زیادہ ہندسی ادب پیدا کر دیا، اسکی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) اصول ہندسہ - ۱- اصول ہندسہ کا ترجمہ

اصول اقلیدس کا ترجمہ | اقلیدس کا سب سے پہلا ترجمہ عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) کے عہد میں ہوا، ابن خلدون لکھتا ہے:

فبعث ابو جعفر المنصور الی ملک	عباسی خلیفہ ابو جعفر منصور نے قیصر روم کو لکھا
الروم ان یبعث الیه بکتب التی	کہ ریاضیات کی کتابیں ترجمہ کراکے اسے بھیجدیجئے،
لهم مترجمة فبعث الیه بکتاب	چنانچہ اس نے کتاب اقلیدس اور طبیعیات کی کچھ
اوقلیدس وبعض کتب الطبیعیات	کتابیں بھیجیں، ان کتابوں کو مسلمانوں نے
فقرأها المسلمون واطلعوا علی ما	پڑھا اور ان میں جو کچھ لکھا تھا اس پر مطلع ہوئے،
فیها وازدادوا حرصاً علی الظفر	اس سے ان کتابوں کو حاصل کرنے کے لیے جو
بما بقی منها[1]	باقی رہ گئی تھیں، ان کا شوق بڑھ گیا،

یہی نہیں بلکہ سب سے پہلی کتاب جو منصور کے زمانہ میں عربی کے اندر ترجمہ ہوئی اقلیدس کی کتاب "الاصول" تھی، ابن خلدون آگے چل کر لکھتا ہے:

کتاب اوقلیدس ویسمیٰ کتاب الاصول	کتاب اوقلیدس اور اسے کتاب الاصول بھی کہا جاتا ہے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۲۶

.... اول ما ترجم من کتب	.... یونانی کتابوں میں سب سے پہلی
الیونانیین فی الملة ایام ابی	کتاب ہے، جو ابو منصور کے زمانۂ خلافت
جعفر المنصور[1]	میں مسلمانوں میں ترجمہ ہوئی ،

لیکن منصور کے زمانہ میں اقلیدس کا جو عربی ترجمہ ہوا تھا، اس کی تفصیل تاریخ نے محفوظ نہیں رکھی، غالباً بعد کے ترجموں نے جو اس سے زیادہ سلیس اور رواں تھے، اس کو بالکل فراموش کر دیا، اس کے قریباً تیس سال بعد ہارون الرشید کے عہد میں یحییٰ بن خالد برمکی کے ایما سے حجاج بن مطر نے پھر اقلیدس کا ترجمہ کیا، ابن الندیم لکھتا ہے:

نقله الحجاج بن یوسف بن مطر نقلین	حجاج بن یوسف بن مطر نے (یونانی زبان سے) اقلیدس
احدهما یعرف بالهارونی	کے دو ترجمے کیے: ایک نقل ہارونی کے نام سے مشہور ہے،
وهو الاول ونقلا ثانیا ویعرف	اور وہ پہلا ترجمہ ہے، اور دوسرا ترجمہ نقل مامونی کے
بالمامونی وعلیه یعول[2]	نام سے مشہور ہے اور اسی پر اعتماد کیا جاتا ہے ۔

حجاج بن مطر کا پہلا ترجمہ تیسری صدی کے آغاز تک رائج رہا، مگر مامون الرشید کے عہد میں خود حجاج نے اقلیدس کا ازسر نو ترجمہ (نقل مامونی) کیا، چنانچہ اس کے دیباچہ میں لکھا ہے:

"ہارون الرشید کے عہد خلافت میں یحییٰ بن خالد برمک کے ایما سے حجاج اس کتاب کا عربی میں ترجمہ کرنے پر مامور ہوا لیکن جب المامون خلیفہ ہوا تو چونکہ نئے خلیفہ کو علم و ہنر کی ترقی سے بڑی دلچسپی تھی، حجاج نے اس کے التفات خسروانہ کو حاصل کرنے کے لیے اس موقع کو غنیمت جانا اور اس کتاب کی توضیح و تفسیر کے ساتھ اس کی تہذیب بھی کی، اس نے غیر ضروری طوالتوں کو حذف کر دیا، وضاحت طلب ابہامات کی خلا کو پر کیا، اغلاط کی اصلاح کی اور کتاب پر نظر ثانی کے ساتھ اسے اس طرح مختصر کیا کہ مطالب کتاب میں

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۲۲ [2] الفہرست لابن الندیم ص ۳۷۱

کوئی بات نہ چھوٹنے پائی، اس طرح اہل علم و شائقین فن کے واسطے ایک عمدہ ایڈیشن مرتب کیا۔ مگر پہلا ترجمہ جن لوگوں کے پاس تھا، اسی طرح رہا۔"[۱]

لیکن اقلیدس کے "ترجمہ منصوری" کی طرح "نقل ہارونی" بھی آج نایاب ہے، صرف نقل ماموں کے چھ مقالے لیڈن میں ہیں (Codex Ledeusis 399,1) جنھیں Besthorn اور Heiberg نے شائع کر دیا ہے، حجاج کے ترجمہ (مامونی) کے غالباً مجسمات پر تین مقالے [گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں] بوڈلین لائبریری میں موجود ہیں، نمبر ۲۸۰ ۔ اس سلسلے میں کارادی فو Carra de Vaux سے جس نے مسٹر آرنلڈ کی (Legacy of Islam) میں مسلمانوں کے ریاضی وہیئت پر مقالہ لکھا ہے، بڑی چوک ہوئی ہے، وہ لکھتا ہے:

"Euclid as well as The Almagest was Trans-leted into Arabic by Al-Hajjaj .... His Translation comprises The first six books of Euclid."[۲]

[یعنی اقلیدس اور اسی طرح المجسطی کو عربی میں حجاج بن یوسف نے ترجمہ کیا ....

اس کا ترجمہ اقلیدس کے پہلے چھ مقالوں پر مشتمل ہے]

حالانکہ ابن الندیم کی تصریح کے مطابق اس نے دو مرتبہ ترجمہ کیا تھا اور یہ دونوں ترجمے مکمل تھے، پہلا ترجمہ تو جلد ہی غائب ہو گیا۔ لیکن دوسرا ترجمہ محقق طوسی کے زمانہ تک موجود تھا، اور اس نے بالتصریح لکھا ہے کہ یہ مکمل اور پندرہ مقالوں پر [تیرہ اصل اقلیدس کے اور دو حکیم البسقلاوس کے ملحقات] مشتمل تھا، محقق طوسی نے لکھا ہے،

اقول الکتاب یشتمل علی خمسة عشر کتاب مع (حکیم البسقلاوس کے ملحقات کے پندرہ

---

[۱] T. L. Heath: Thirteen Books of euclid. Vol 1 P. 75

[۲] Arnold: Legacy of Islam P. 380.

عشر مقالة مع الملحقتين بآخره	مقالوں پر مشتمل ہے اور وہ حجاج کے نسخہ میں
وهی اربعمائة وثمانية وستون	۴۶۸ شکلیں ہیں، اور ثابت بن قرہ
شکلا فی نسخة الحجاج وبزيادة	کے نسخہ میں اس سے دس شکلیں
عشرة اشکال فی نسخة ثابت[1]	زیادہ ہیں،

طوسی کہتا ہے کہ یہ اختلاف صرف دسویں مقالے تک ہے، بعد کے مقالوں میں حجاج اور ...بت کے نسخوں میں کوئی فرق نہیں ہے، چنانچہ گیارہویں مقالے کے شروع میں لکھتا ہے:

وليس فی المجسمات خلاف	(اور مجسمات (گیارہویں سے پندرہویں مقالے تک)
بین نسختی الحجاج وثابت[2]	میں حجاج اور ثابت کے نسخوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بالفاظ دیگر حجاج کا ترجمہ اقلیدس پوری کتاب (تیرہ یا پندرہ مقالوں) پر مشتمل تھا، مگر کارادی فو...ے اصل ماخذوں کے بجائے مختلف کتب خانوں کی فہرستوں پر اعتماد کیا، اور چونکہ لیڈن کی فہرست...ن لکھا تھا کہ وہاں اس کے پہلے چھ مقالے موجود ہیں اس لیے اس نے حکم لگا دیا کہ حجاج نے صرف پہلے ...ہ مقالوں ہی کا ترجمہ کیا تھا،

اقلیدس کا چوتھا ترجمہ اسحاق بن حنین (المتوفی ۲۹۸ھ) نے کیا اور مشہور مترجم ثابت بن ...رہ نے بعد میں اس پر اصلاح دی۔ ابن الندیم لکھتا ہے:

ونقله اسحق بن حنين و	بعد میں اقلیدس کو اسحق بن حنین نے یونانی سے عربی میں
واصلحه ثابت بن قرة الحرانی[3]	ترجمہ کیا اور ثابت بن قرہ نے اس پر اصلاح دی،

اس ترجمہ کا ایک مکمل اور ناقص نسخہ بوڈلین لائبریری میں موجود ہے (نمبر ۲۷۹ اور ۲۸۰)۔ ایک نسخہ ...ضا لائبریری رام پور میں بھی ہے۔

---

[1] تحریر اصول اقلیدس مطبوعہ طہران ص ۲ [2] ایضاً ص ۱۵۴ [3] الفہرست ص ۳۷۱

پانچواں ترجمہ ثابت بن قرہ نے کیا تھا، ابن الندیم ثابت بن قرہ کے مستقل ترجمہ کا ذکر نہیں کرتا صرف اسحاق کے ترجمہ پر اس کی اصلاح کا ذکر کرتا ہے لیکن ابن القفطی نے لکھا ہے کہ ثابت نے اقلیدس کے دو ایڈیشن مرتب کیے: ایک اسحاق بن حنین کے ترجمہ کی اصلاح اور دوسرا اپنا مستقل ترجمہ،

واصلح کتاب اقلیدس ونقله ایضاً الی العربی اصلاحین الثانی من جید الاول[۱]	ثابت نے (اسحٰق کے ترجمۂ) اقلیدس کی اصلاح کی اور اسے عربی میں بھی ترجمہ کیا، دوسرا پہلے سے بہتر ہے۔

محقق طوسی بھی نہ تو اسحٰق کے ترجمہ کا نام لیتا ہے اور نہ اس پر ثابت بن قرہ کی اصلاح کا ذکر کرتا ہے بلکہ ثابت کے مستقل ترجمہ کا ذکر کرتا ہے، اس کا قول اوپر گزر چکا ہے، جس میں وہ حجاج کے نسخہ کے ساتھ ثابت کے نسخہ کا ذکر کرتا ہے، دوسری جگہ وہ کہتا ہے:

وافرز ما یوجد من اصل الکتاب فی نسختی الحجاج وثابت عن المزید علیہ[۲]	اور میں اصل اقلیدس کو جو حجاج اور ثابت کے نسخوں میں ہے بعد کے اضافوں سے علٰحدہ کروں گا۔

ابن القفطی کے اس قول کی تائید کہ ثابت نے مستقلاً اصول اقلیدس کا ترجمہ کیا تھا جیرارڈ کریمونائی (Gherard of Cremona) (۱۱۱۴ء۔ ۱۱۸۷ء) کے ترجمۂ اقلیدس سے بھی ہوتی ہے۔ جیرارڈ نے جس عربی اصل سے یہ ترجمہ کیا تھا۔ وہ ثابت کے مستقل ترجمہ کا تنقیدی اڈیشن تھا اور اس کے مرتب کے پیش نظر ثابت کا مستقل ترجمہ تھا، کیونکہ وہ بار بار "ثابت کا ترجمہ (Translatio Thebit qui Transtulit hune) "اور ثابت کا عربی میں ترجمہ" (Thebit librum in arabicum linguam") کہتا ہے[۳]:۔

اقلیدس کے "ترجمۂ منصوری" کی طرح حجاج کے دونوں ترجمے بھی اقلیدس کی یونانی اصل سے ماخوذ تھے، اسی طرح اسحاق اور ثابت بن قرہ کے تراجم کی اصل بھی یونانی اقلیدس ہے، چنانچہ ٹی، ایل ہیتھ

---

[۱] اخبار الحکما، باخبار الحکما، ص ۴۸ ۔ [۲] تحریر اصول اقلیدس ص ۲ ۔ [۳] Thirteen books of Euclid by T.L Hearth page 94

لکھتا ہے کہ اسحٰق نے براہ راست یونانی سے اقلیدس کا ترجمہ کیا تھا۔

"There seems to be no doubt that Ishaq who must have known Greek as well as his father, made his translation direct from the Greek."[1]

یعنی [اس بات میں کوئی شک معلوم نہیں ہوتا کہ اسحٰق جو اپنے باپ کی طرح یونانی زبان جانتا تھا، اس نے اپنا ترجمہ یونانی سے کیا تھا]

اسی طرح وہ ثابت کے متعلق لکھتا ہے کہ اس نے اسحاق کے ترجمہ کی اصلاح اقلیدس کی یونانی اصل کی مدد سے کی تھی،

"Thabit undoubtedly consulted Greek Mass for the purpose of his revision. This is expressly stated in a marginal note to a Hebrew version of the Elements made from Ishaq"[2]

یعنی [ثابت نے اسحاق کے ترجمۂ اقلیدس کی اصلاح کے واسطے یقیناً یونانی مخطوطات کا مطالعہ کیا تھا، اسحاق کے عربی ترجمہ سے جو عبرانی ترجمہ کیا گیا تھا اس کے حاشیہ پر یہ بات بالتصریح مذکور ہے]

اور ثابت نے اپنا مستقل ترجمہ بھی یونانی اصل ہی سے کیا تھا، چنانچہ محقق طوسی نے نویں مقالے کی اکتیسویں شکل کے متعلق لکھا ہے:

وروی عن ثابت ان ھذا الشکل[3] ... ثابت سے مروی ہے کہ یہ شکل اور اس سے پہلے والی

والذی قبلہ لم یکونا فی النسخ ... شکل یونانی نسخوں میں نہیں تھیں

[1] Thirteen Book of Euclid by T.L. Heath [2] ایضاً [3] تحریر اصول اقلیدس ص ۱۲۶

ان پانچ ترجموں کے علاوہ اقلیدس کے تین اور ترجموں کا بھی ذکر ملتا ہے، مگر انھیں قبول عام کا درجہ حاصل نہ ہو سکا، ان کے مترجم نظیف رومی، یوحنا القس اور ابو عثمان دمشقی تھے، نظیف اور یوحنا القس کے ترجموں کے سلسلے میں ابن الندیم لکھتا ہے:-

وذکر نظیف المتطبب انه رای المقالة العاشرة من اقلیدس رومیة وهی تزید علی ما فی ایدی الناس اربعین شکلا والذی بایدی الناس مائة وتسعة اشکال وانه عزم علی اخراج ذلک الی العربی وذکر یوحنا القس انه رای الشکل الذی ادعاه ثابت فی المقالة الاولی وزعم انه له فی الیونانی۔ وذکر نظیف انه اراه ایاه[1]

طبیب نظیف نے ذکر کیا ہے کہ اس نے رومی زبان میں اقلیدس کا دسواں مقالہ دیکھا تھا جس میں متداول مقالے سے جو عام طور پر پایا جاتا ہے چالیس شکلیں زیادہ تھیں، متداول مقالے میں ایک سو نو شکلیں ہیں۔ اس نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس نے اسے عربی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور یوحنا القس نے ذکر کیا ہے کہ اس نے وہ شکل دیکھی تھی جس کے متعلق ثابت بن قرہ نے پہلے مقالہ میں دعوی کیا ہے اور گمان کیا ہے کہ وہ یونانی اصل میں موجود ہے، نظیف نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ اس نے اسے یہ شکل دکھائی تھی۔

غالباً اس اقلیدس رومیہ کا عربی میں ترجمہ ہوا خواہ نظیف نے کیا ہو یا کسی اور نے اور اس ترجمہ کے کچھ اجزا پیرس کی قومی لائبریری میں موجود ہیں، ان میں سے ایک جزء کے اندر یہ تصریح ہے:-

"مقالہ عاشرہ کی بعض اشکال میں کچھ اضافے جو یونانی اقلیدس میں نہیں ہیں"

ابو عثمان دمشقی کے ترجمۂ اقلیدس کے بارے میں ابن الندیم لکھتا ہے:

ونقل ابوعثمان الدمشقی منه مقالات رأیت منها العاشرة

ابو عثمان دمشقی نے اقلیدس کے متعدد مقالوں کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، ان میں سے دسواں مقالہ

---

[1] الفہرست ص ۳۷۱

بالموصل فی خزانة علی بن احمد العمرانی[1]

میں نے موصل میں علی بن احمد العمرانی کے کتب خانہ میں دیکھا تھا۔

غالباً ابو عثمان دمشقی کا ترجمہ ببّس (Pappus) کے شرح مقالۂ عاشرہ کا ترجمہ تھا، ابو عثمان کا یہ ترجمہ پیرس کی قومی لائبریری میں موجود ہے۔

اصول اقلیدس کی اصلاح و تحریر | اصول اقلیدس کی تہذیب و اصلاح اور ترتیب و تحریر کے سلسلے میں سب سے پہلا نام فیلسوف العرب کندی کا آتا ہے، اس نے اصول اقلیدس کی اصلاح "رسالہ فی اصلاح کتب اقلیدس"[2] کے عنوان سے اور حکیم ابسقلاؤس (Hypsicles) کے ملحقات (چودہویں اور پندرہویں مقالے) کی اصلاح "رسالہ فی اصلاح المقالة الرابعة عشر والخامسة عشر من کتاب اقلیدس"[3] کے نام سے کی۔ کندی کے بعد ثابت بن قرہ نے "کتاب فی اشکال اقلیدس"[4] لکھی جس میں غالباً اشکال اقلیدس کو نئی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا تھا۔

چوتھی صدی میں ابو جعفر الخازن نے مصادرات کو بڑی خوبی سے ترتیب دیا، مگر اس میں اشکال کی ترتیب بدل گئی۔

اس کے بعد ابو الوفاء البوزجانی نے اقلیدس کو نئے اضافوں کے ساتھ از سر نو مرتب کیا جن میں سے بعض اضافوں کے متعلق اہل فن کا خیال ہے کہ غیر ضروری ہے۔

اسی زمانہ میں استاذ المحقق ابو عبد اللہ النسوی نے اصول اقلیدس کو "التجرید" کے نام سے مرتب کیا، اس کے آٹھ مقالے رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں

چوتھی صدی کے آخر میں شیخ بوعلی سینا نے اقلیدس کا جو اڈیشن مرتب کیا اس میں بہت سے زوائد و مصادرات کو حذف کر دیا لیکن آج ان اڈیشنوں کے نام ہی نام باقی ہیں کیونکہ محقق طوسی کی تحریر اقلیدس کے سامنے وہ سب ماند پڑ گئے، محقق طوسی نے ساتویں صدی کے وسط میں حجاج اور ثابت کے ترجموں کی مدد سے اقلیدس کا وہ اڈیشن

---

[1] الفہرست ص ۳۷۱ [2] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۱ ص ۲۱۱ [3] ایضاً ج ۱ ص ۲۱۲ [4] ایضاً ج ۱ ص ۲۱۹

ان پانچ ترجموں کے علاوہ اقلیدس کے تین اور ترجموں کا بھی ذکر ملتا ہے، مگر انھیں قبول عام کا درجہ حاصل نہ ہو سکا، ان کے مترجم نظیف رومی، یوحنا القس اور ابو عثمان دمشقی تھے، نظیف اور یوحنا القس کے ترجموں کے سلسلے میں ابن الندیم لکھتا ہے :-

وذکر نظیف المتطبب انه رای	طبیب نظیف نے ذکر کیا ہے کہ اس نے رومی زبان
المقاله العاشرة من اقلیدس	میں اقلیدس کا دسواں مقالہ دیکھا تھا جس میں
رومیة وهی تزید علی ما فی ایدی	متداول مقالے سے جو عام طور پر پایا جاتا ہے چالیس
الناس اربعین شکلاً والذی بایدی	شکلیں زیادہ تھیں، متداول مقالے میں ایک سو نو
الناس مائة وتسعة اشکال وانه	شکلیں ہیں۔ اس نے یہ بھی ذکر کیا ہو کہ اس نے
عزم علی اخراج ذلک الی العربی	اسے عربی میں ترجمہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اور
وذکر یوحنا القس انه رای الشکل	یوحنا القس نے ذکر کیا ہے کہ اس نے وہ شکل دیکھی
الذی ادعاه ثابت فی المقالة الاولی	تھی جس کے متعلق ثابت بن قرہ نے پہلے مقالہ میں
وزعم ان له فی الیونانی۔ وذکر	دعوی کیا ہے اور گمان کیا ہے کہ وہ یونانی اصل میں
نظیف انه اراه ایاه[1]	موجود ہے، نظیف نے یہ بھی ذکر کیا ہو کہ اس نے اسے یہ شکل دکھائی

غالباً اس "اقلیدس رومیہ" کا عربی میں ترجمہ ہوا خواہ نظیف نے کیا ہو یا کسی اور نے اور اس ترجمہ کے کچھ اجزاء پیرس کی قومی لائبریری میں موجود ہیں، ان میں سے ایک جزء کے اندر یہ تصریح ہے :-

"مقالہ عاشرہ کی بعض اشکال میں کچھ اضافے جو یونانی اقلیدس میں نہیں ہیں"

ابو عثمان دمشقی کے ترجمۂ اقلیدس کے بارے میں ابن الندیم لکھتا ہے :

ونقل ابو عثمان الدمشقی منه	ابو عثمان دمشقی نے اقلیدس کے متعدد مقالوں
مقالات رأیت منها العاشرة	کا عربی میں ترجمہ کیا تھا، ان میں سے دسواں مقالہ

---

[1] الفہرست ص ۳۷۱

بالموصل فی خزانۃ علی بن احمد	میں نے موصل میں علی بن احمد العمرانی
العمرانی[1]	کے کتب خانہ میں دیکھا تھا۔

غالباً ابو عثمان دمشقی کا ترجمہ بپّس (Pappus) کے شرح مقالۂ عاشرہ کا ترجمہ تھا، ابو عثمان کا یہ ترجمہ پیرس کی قومی لائبریری میں موجود ہے۔

اصول اقلیدس کی اصلاح وتحریر اصول اقلیدس کی تہذیب واصلاح اور ترتیب وتحریر کے سلسلے میں سب سے پہلا نام فیلسوف العرب کندی کا آتا ہے، اس نے اصول اقلیدس کی اصلاح "رسالہ فی اصلاح کتب اقلیدس"[2] کے عنوان سے اور حکیم ابسقلاؤس (Hypsicles) کے ملحقات چودہویں اور پندرہویں مقالے) کی اصلاح "رسالہ فی اصلاح المقالۃ الرابعۃ عشر والخامسۃ عشر من کتاب اقلیدس"[3] کے نام سے کی۔ کندی کے بعد ثابت بن قرہ نے "کتاب فی اشکال اقلیدس"[4] لکھی جس میں غالباً اشکال اقلیدس کو نئی ترتیب کے ساتھ مرتب کیا تھا۔

چوتھی صدی میں ابو جعفر الخازن نے مصادرات کو بڑی خوبی سے ترتیب دیا، مگر اس میں اشکال کی ترتیب بدل گئی۔

اس کے بعد ابو الوفا البوزجانی نے اقلیدس کو نئے اضافوں کے ساتھ از سر نو مرتب کیا جن میں سے بعض اضافوں کے متعلق اہل فن کا خیال ہے کہ غیر ضروری ہے۔

اسی زمانہ میں استاذ المحقق ابو عبد اللہ النسوی نے اصول اقلیدس کو "التجرید" کے نام سے مرتب کیا۔ اس کے آٹھ مقالے رضا لائبریری رامپور میں موجود ہیں

چوتھی صدی کے آخر میں شیخ بوعلی سینا نے اقلیدس کا جو اڈیشن مرتب کیا اس میں بہت سے حدود ومصادرات کو حذف کر دیا۔ لیکن آج ان اڈیشنوں کے نام ہی نام باقی ہیں کیونکہ محقق طوسی کی تحریر اقلیدس کے سامنے وہ سب ماند پڑ گئے، محقق طوسی نے ساتویں صدی کے وسط میں حجاج اور ثابت کے ترجموں کی مدد سے اقلیدس کا وہ اڈیشن

---

[1] الفہرست ص ۳۷۱ [2] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ا ص ۲۱۱ [3] ایضاً ج اص ۲۱۱ [4] ایضاً ج اص ۲۰۹

مرتب کیا جو آج تک مدارس عربیہ میں مروج ہے، وہ اس کے دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

فلما فرغت عن تحرير المجسطي رأيت	جب میں المجسطی کو ایڈٹ کرنے سے فارغ ہوا تو میں نے
ان احرر كتاب اصول الهندسة	مناسب سمجھا کہ اصول اقلیدس کو ایڈٹ کروں
.... واضيف اليه ما يليق به	.... اور اس میں ضروری اضافے کروں ....
وافرز ما يوجد من اصل لكتاب في	اور حجاج اور ثابت کے نسخوں میں جو اصل ترجمہ ہے
نسخة الحجاج والثابت عن المزيد عليه [1]	اسے بعد کے اضافوں سے ممتاز کر دوں ۔

مستشرقین کا خیال ہے کہ محقق نے اپنے ایڈیشن کے دو نسخے مرتب کیے تھے، ایک بڑا اور چھوٹا، بڑا نسخہ کہا جاتا ہے صرف فلورینس میں ہے (Pall 272 ع 313) جو ۱۵۹۴ء میں بمقام روم چھاپا گیا تھا، مگر اس کے مطبوعہ نسخے بھی کمیاب ہیں، چھوٹے نسخے کے مخطوطات ہندوستان اور یورپ کی تقریباً تمام لائبریریوں میں پائے جاتے ہیں، یہ نسخہ ۱۸۰۱ء میں بمقام قسطنطنیہ اور ۱۲۹۸ھ میں بمقام طہران چھاپا گیا،

اسی زمانہ میں (ساتویں صدی ہجری میں) محی الدین یحییٰ بن ابی الشکر المغربی نے اقلیدس کا ایک ایڈیشن بعنوان "تحریر اقلیدس فی اشکال الهندسة" مرتب کیا، اسکا ایک نسخہ جامع ایا صوفیا میں موجود ہے۔

اصول اقلیدس کے فارسی تراجم | اصول اقلیدس کا سب سے قدیم فارسی ترجمہ غالباً وہ ہے جو علامہ قطب الدین شیرازی (المتوفی ۷۱۰ھ) نے کیا تھا، اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رامپور میں موجود ہے، فارسی میں اقلیدس کا دوسرا مشہور ترجمہ مرزا خیر اللہ مہندس کا ہے، جو انھوں نے ۱۱۴۴ھ میں "تقریر التحریر" کے نام سے کیا تھا، اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے،

اقلیدس کا اردو ترجمہ جو جدید ٹکسٹ بکوں سے پہلے ہندوستان کے سرکاری مدارس میں مروج تھا، انگریزی اقلیدس سے کیا گیا تھا، اس لیے وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ (باقی)

۱؎ تحریر اصول اقلیدس ص ۲

امام نسائی اور ان کی سنن

از

جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

(۲)

امام نسائی پر تشیع کا الزام | امام نسائی علم و عمل دونوں اعتبار سے بہت بلند تھے، ان کی زندگی علم و فضل کی طرح زہد و تقویٰ سے بھی آراستہ تھی، مگر اس کے باوجود ان کی جانب کچھ ایسی باتیں منسوب کیجاتی ہیں جو انکی بلند شخصیت کے منافی ہیں، ان پر سب سے بڑا اور اہم الزام تشیع کا لگایا جاتا ہے، جو سراسر غلط ہے مشہور اور محتاط اصحاب سیر و رجال نے اس کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے، چنانچہ علامہ ذہبی، ابن سبکی اور حافظ ابن حجر وغیرہ اس سلسلہ میں بالکل خاموش ہیں،

اس الزام کو شہرت غالباً ابن خلکان کے ایک بیان سے ہوتی ہے، چنانچہ ابن جوزی نے المنتظم میں ابن عماد نے شذرات میں اور نواب صدیق حسن صاحب نے الحطہ میں اسے نقل کر دیا ہے۔ البتہ علامہ ابن کثیر کا بیان کسی قدر مختلف ہے، مگر در اصل ان کا دار و مدار ابن خلکان ہی کی روایت پر معلوم ہوتا ہے، اس لیے ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ ابن خلکان کا پورا بیان یہ ہے:

قال محمد بن اسحاق الاصبھانی	محمد بن اسحاق اصبہانی فرماتے ہیں کہ میں نے
سمعت مشایخنا بمصر یذکرون	مصر میں اپنے استادوں سے سنا ہے کہ ابوعبدالرحمن
ان ابا عبد الرحمن فارق مصر فی	آخر عمر میں مصر چھوڑ کر دمشق چلے گئے وہاں ان سے

آخر عمرہ وخرج الی دمشق فسئل	حضرت معاویہؓ اور ان کے فضائل سے متعلق
عن معاویۃ وما روی فی فضائلہ	روایات کے بارہ میں پوچھا گیا تو انھوں نے جواب دیا
فقال اما یرضی معاویۃ ان یخرج	کہ کیا معاویہ کے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ سربسر
رأسا برأس حتی یفضل و فی	نجات پا جائیں، ان کے فضائل ہی کہاں ہو
روایۃ اخری ما اعرف لہ فضیلۃ	بیان کیے جائیں، ایک دوسری روایت میں ہے
الا لا اشبع اللہ بطنہ وکان	کہ انھوں نے جواب دیا کہ میں ان کی کوئی فضیلت
یتشیع فمازالوا یدفعون	اس کے علاوہ نہیں جانتا کہ "اللہ اسکے پیٹ کو
فی حضنہ حتی اخرجوہ من المسجد	آسودہ نہ کرے۔" اور وہ حضرت علیؓ کے حامی
وفی روایۃ اخری یدفعون	تھے، لوگوں نے یہ جواب سنکر انکی کمر اور کوکھ میں مارنا
فی خصیۃ[1]	شروع کیا اور مسجد سے نکالدیا، دوسری روایت

ہے کہ ان کے خصیتین پر لاتیں ماری گئیں تھا

اولاً اس روایت کی صحت ہی محل نظر ہے، متقدمین میں سے کسی نے اس کو نہیں لکھا ہے اور نہ اس کی سند مسلسل ہے۔ اور ابن خلکان اور امام نسائی کے درمیان کئی صدیوں کا فرق ہے، امام نسائی کا انتقال ۳۰۳ھ میں ہوا ہے، اور ابن خلکان کا ۶۸۱ھ یعنی دونوں کے درمیان تقریباً چار صدیوں کا فرق ہے، ایسی حالت میں امام نسائی کے بارہ میں ابن خلکان کی روایت بغیر کسی سند کے کیسے قبول کیجا سکتی ہے،

اور اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو اس سے صرف اسقدر ثابت ہوتا ہے کہ امام نسائی حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق اچھی رائے نہیں رکھتے تھے، یا ان کو ان کے فضائل کی روایات کا علم نہ تھا، حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہؓ کے فضائل کا انکار شیعیت نہیں ہے، بہت سے اکابر کا یہ مسلک رہا ہے، پھر ابن خلکان نے "کان شیعیا" نہیں بلکہ "کان یتشیع" لکھا ہے، یعنی ان میں شیعیت کا اثر تھا،

[1] تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۳۵، ۳۶

ں ہ روایت کی صحت کی صورت میں واقعہ کی شکل یہ معلوم ہوتی ہے کہ شام بنی امیہ کا مرکز حکومت رہ چکا
اور امیر معاویہؓ کا سب سے سنگین قلعہ تھا، یہاں کے تمام قبائل حضرت علیؓ کے مقابلہ میں ان کے حامی
ر و گار رہتے، اس لیے بنی امیہ کی حکومت مٹنے کے بعد بھی مدتوں یہ اثر قائم رہا اور امیر معاویہؓ اور
ضرت علیؓ کے اختلاف کی صدائے بازگشت صدیوں آتی رہی، امام نسائی کے زمانہ میں بھی یہی
ورت حال رہی جیسا کہ خود اہل شام کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے، اس لیے امام موصوف نے اسکی
صلاح اور حضرت علیؓ سے ان لوگوں کا سوء ظن دور کرنے کے لیے یہ جواب دیا، مگر ان کے دل و
ماغ پر امیر معاویہؓ کا اتنا اثر تھا کہ وہ آمادہ پیکار ہوگئے، اور اس کے جواب میں امام صاحب کی
ہین میں بھی باک نہیں کیا اور ان پر شیعیت کا الزام لگا دیا، حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کے بیان سے
ھی اس کی تائید ہوتی ہے، وہ لکھتے ہیں :-

وسبب موت او آنست کہ چوں از تصنیف	امام نسائی کی موت کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ حضرت
مناقب مرتضوی رضی اللہ عنہ فارغ شد	علیؓ کے مناقب لکھکر فارغ ہوئے تو چاہا کہ جامع مسجد
خواست کہ اں کتاب را در جامع دمشق	دمشق میں لوگوں کے سامنے اس کتاب کو بیان کریں
بر ملا بیان کند تا مردم انجا کہ بسبب طول	تاکہ وہاں کے لوگ بنی امیہ کی مدت مدید تک وہاں
سلطنت بنی امیہ میل بمذہب نواصب پیدا	سلطنت کے باعث جو نواصب کے مذہب کی طرف
کردہ بودند ہتدی شوند قدرے ازاں کتاب	مائل ہوگئے ہیں، ہدایت یافتہ ہو جائیں، اس کتاب
مذکور کردہ بود کہ سائلے گفت کہ در مناقب	کا تھوڑا سا ہی حصہ بیان کیا تھا، کہ ایک شخص نے
امیر المومنین معاویہ نیز چیزے نوشتہ	پوچھا کہ امیر المومنین معاویہ کے فضائل بھی آپ نے
نسائی گفت کہ معاویہ راہمیں بس است کہ	کچھ تحریر کیا ہے، امام نسائی نے کہا، معاویہ کے لیے
سر بسر نجات یابد اورا مناقب کجاست	تو اتنا بس ہے کہ انھیں سر بسر نجات مل جائے

و بعضے گویند کہ ایں کلمہ ہم گفت کہ نزد من از	ان کے فضائل ہی کہاں ہیں، بعض کہتے ہیں کہ
مناقب او ہیچ صحیح نہ شد، مگر حدیث لا اشبع	آپ نے یہ بات بھی فرمائی تھی کہ میرے نزدیک ان کے
اللہ بطنہ، عوام مردم اورا بتشیع تہمت کردہ	مناقب میں کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے، سوائے
..... و چند ضربہ شدید بخصیتین او رسید کہ بہ سبب	لا اشبع اللہ بطنہ کے۔ (یہیں سے) عوام الناس
آں نیم جاں شد[1]	نے ان پر تشیع کا الزام جڑ دیا...... اور چند ضربیں ان کے خصیتین میں لگیں جنکی وجہ سے وہ نیم جاں ہو گئے۔

ابن خلکان کے مقابلہ میں ابن کثیر کا بیان ملاحظہ ہو، اگرچہ ان کا دار و مدار بھی ابن خلکان ہی کی روایت ہے، مگر ان کا پیرایۂ بیان مختلف ہے، وہ لکھتے ہیں:۔

و قد قیل عنہ: انہ کان ینسب	ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی طرف کچھ
الیہ شیٔ من التشیع	شیعیت بھی منسوب ہے۔

اس کے بعد انھوں نے وہی ابن خلکان کی روایت نقل کی ہے، مگر "قیل" کے لفظ سے ظاہر ہے کہ یہ انتساب و الزام ابن کثیر کے نزدیک مشکوک اور مشتبہ ہے، کیونکہ "قیل" کہکر جو بات کہی جاتی ہے وہ کمزور ہوتی ہے" "کان ینسب الیہ" میں صیغۂ مجہول کا استعمال بھی بتاتا ہے کہ راوی کے نزدیک الزام غیر متحقق ہے، اور "شیٔ من التشیع" سے جس تقلیل کا اظہار ہوتا ہے وہ بھی قابل غور ہے

غرض ابن کثیر کے نزدیک امام نسائی کی جانب شیعیت کا انتساب ہر حیثیت سے نہایت ضعیف ہے،

ان باتوں سے قطع نظر امام نسائی کے شیعہ نہ ہونے کا واضح ثبوت یہ ہے کہ وہ حضرت علیؓ سے فرط عقیدت کے باوجود دوسرے صحابہ کے فضائل و کمالات کے بھی قائل تھے، اور مسائل میں ان کے عمل سے استفادہ کرتے تھے، جیسا کہ ان کی سنن سے ظاہر ہے، شیعہ سب سے زیادہ شیخین (ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما) کو مطعون کرتے ہیں، مگر امام نسائی ان کے آراء و اقوال سے حجت و استدلال قائم کرتے ہیں۔

[1] بستان المحدثین ص ۱۱۱

کتاب البیوع میں ایک روایت نقل کی ہے :-

..... قال ابن ابی اوفی نسلف	... ابن ابی اوفی کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہؐ
علی عہد رسول اللہ صلی اللہ	اور ابوبکر و عمر کے زمانے میں گیہوں، جو اور
علیہ وسلم وابی بکر و عمر	کھجور میں بیع سلم ایسے لوگوں سے کرتے تھے
فی البر والشعیر والتمر الی	جن کے متعلق مجھے نہیں معلوم کہ وہ چیزیں
قوم لا ادری اعندھم ام لا ؎۱	ان کے پاس ہوتی تھیں یا نہیں۔

ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں :-

قضی بذلک ابوبکر و عمر ؎۲	ابوبکر و عمر نے یہ فیصلہ کیا ہے۔

ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :-

قضی بذلک ابوبکر و عمر و	اس چیز کا ابوبکر و عمر اور عثمان (رضی اللہ عنہم)
عثمان ؎۳	نے فیصلہ کیا ہے۔

کیا اس کے بعد بھی شیعیت کی گنجایش رہ جاتی ہے۔

البتہ اس سلسلہ میں دو باتیں قابل بحث ہوسکتی ہیں، ایک حضرت علیؓ کی محبت و عقیدت میں غلو، دوسرے حضرت امیر معاویہؓ کے متعلق سخت الفاظ کا استعمال،

پہلے کا جواب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی محبت میں کوئی ایسا غلو ناپسندیدہ نہیں ہے، جو شریعت کے خلاف نہ ہو بلکہ محبت اہل بیت تو ایمان کا جز ہے، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ کا بھی یہی مسلک تھا۔ مشہور مصری عالم ابوزہرہ نے امام احمدؒ کی حضرت علیؓ سے عقیدت کے سلسلہ میں بڑی عمدہ بات لکھی ہے،

"اس معاملہ میں ان کا وہی مسلک تھا جو ان کے شیخ امام شافعی کا تھا، امام شافعی حضرت علیؓ

؎۱ سنن نسائی ج ۲ ص ۲۲۶ ؎۲ ایضاً ۲۳۲ ؎۳ ایضاً ص ۲۳۳

کے فضائل و مناقب روایت کرتے تھے، اور ان سے بڑی عقیدت و محبت رکھتے تھے، لیکن حضرت ابوبکرؓ کے مقابلہ میں جب تفضیل کا سوال آتا تھا تو وہ حضرت ابوبکرؓ کو سب پر ترجیح دیتے تھے، ان کا قول ہے کہ "معاملہ ہمارے جذبات کے تابع نہیں ہے"[۱]۔

امام شافعیؒ ہی کی طرف یہ شعر بھی منسوب ہے :

ان کان رفضا حب آل محمد   فلیشھد الثقلان انی رافض

(اگر اہل بیتؓ سے محبت کرنا ہی شیعیت ہے، تو جن و انس دونوں گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں)

حضرت امیر معاویہؓ کی شان میں امام نسائیؒ کے الفاظ البتہ سخت ہیں، حضرت امیر معاویہؓ بہرحال صحابی ہیں جن کے متعلق ارشاد نبوی موجود ہے، اصحابی کالنجوم بایھم اقتدیتم اھتدیتم وغیرہ۔ مگر اس کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔

(۱) حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ کی فضیلت مسلّم ہے، ان کو کسی طرح حضرت علیؓ کے ہم پایہ نہیں قرار دیا جا سکتا، یہ جمہور امت کا متفقہ فیصلہ ہے، امام نسائیؒ نے شام میں لوگوں کو اسکے برخلاف دیکھا تو جناب امیرؓ کے فضائل و مناقب بیان کرنے میں غلو سے کام لیا، اور اس سلسلہ میں غیر شعوری طور پر جناب معاویہؓ کی نسبت بعض سخت الفاظ نکل گیے۔

(۲) امام نسائیؒ نے امیر معاویہؓ کے متعلق جو الفاظ استعمال کیے ہیں، ان میں وہ منفرد نہیں ہیں، بعض دوسرے ائمہ بھی اسی قسم کے خیالات رکھتے تھے،

(۳) امام نسائیؒ کو حضرت علیؓ سے غیر معمولی عقیدت و محبت تھی، مگر جب وہ شام گئے تو وہاں آپ کے خلاف سوء ظن دیکھکر آپ کے فضائل و مناقب بیان کرنا شروع کر دیے جو بنی امیہ کے حامیوں کو ناگوار ہوئے اور انھوں نے امام نسائیؒ سے امیر معاویہؓ کے فضائل بیان کرنے کی خواہش

---

[۱] احمد بن حنبل ترجمہ مولوی رئیس احمد جعفری ص ۴۴۲

کی، امام صاحب نے یہ سمجھا کہ جناب امیرؓ سے بدگمانی کا اصل سبب امیر معاویہؓ سے فرطِ عقیدت و شیفتگی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ان کی شان میں مذکورہ بالا باتیں کہہ دیں جن سے ان کا منشا امیر معاویہؓ کی مذمت نہیں بلکہ حضرت علیؓ کے فضائل و مناقب مثبت اور منفی دونوں طریقوں سے ثابت کرنا تھا،

(۴) حافظ ابن حجر وغیرہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ امام نسائی کے نزدیک امیر معاویہؓ کے فضائل و مناقب میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں، اس لیے انھوں نے نہیں بیان کیا اور جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو غصہ میں آپ کی زبان سے بعض سخت الفاظ نکل گئے اور غیظ و غضب کی حالت میں جو الفاظ منھ سے نکل جاتے ہیں، ان کا اعتبار نہیں،

سنن نسائی امام نسائی کا سب سے بڑا علمی اور دینی کارنامہ سنن کی تالیف ہے، اسی کتاب کے ذریعہ انکے محدثانہ شان اور تفقہ کا اندازہ ہوتا ہے، اور اسی کی بدولت آج تک ان کا نام زندہ ہے، اس لیے اس کا کسی قدر تفصیل کے ساتھ تعارف کرایا جاتا ہے،

امام نسائی کی سنن میں دو تصنیفات ہیں، سنن کبریٰ اور سنن صغریٰ لیکن صحاح ستہ میں سنن صغریٰ شامل ہے، جس کا دوسرا نام مجتبیٰ ہے، مشہور یہ ہے کہ امام صاحب جب سنن کبریٰ کی تصنیف و تالیف سے فارغ ہو چکے تو رملہ کے امیر نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ کی یہ پوری کتاب صحیح ہے؟ آپ نے جواب دیا نہیں، صحیح اور حسن دونوں کا مجموعہ ہے، امیر نے التماس کی کہ آپ میرے لیے اس میں سے اعلیٰ درجہ کی صحیح حدیثیں الگ کر دیجئے، آپ نے اس درخواست پر ایک دوسری کتاب تیار کی جس کا نام "مجتبیٰ" رکھا، جو سنن نسائی کے نام سے مشہور ہے،

"سنن کبریٰ" اور "سنن صغریٰ" دونوں کے راوی مختلف ہیں، اول الذکر کا راوی ابن الاحمر اور موخر الذکر کا ابن السنی ہے، دونوں کا مختصر حال یہ ہے۔

ابن الاحمر ان کا اصل نام محمد، ابوبکر کنیت، باپ کا نام معاویہ اور دادا کا نام عبد الرحمن تھا، اموی خاندان سے نسبی تعلق تھا، قرطبہ کے رہنے والے اور اندلس کے بلند ترین محدثین میں شمار کیے جاتے تھے، عبید اللہ بن یحییٰ اور بہت سے افاضل سے روایتیں کی ہیں اور طلب علم کی راہ میں جب سفر کیا تو امام نسائی، فریابی اور ابو خلیفہ جمحی وغیرہ سے بھی روایات کیں، حدیث کا خاص ذوق رکھتے تھے، اور بڑے ثقہ و ضابط تھے، کبیر کے راوی ہیں، تجارت کی غرض سے ہندوستان آئے تھے، مگر سارا اثاثہ جس کی قیمت ۳۰ ہزار دینار کے قریب تھی، غرق ہو گیا، اور وطن واپس ہو کر تہی دستی میں رجب ۳۵۸ھ میں انتقال کیا،[۱]

ابن السنی ان کی کنیت ابوبکر، نام احمد، سلسلۂ نسب یہ ہے: احمد بن محمد بن اسحٰق بن ابراہیم ابن اسباط دینوری، یہ جعفر بن ابو طالب ہاشمی کے غلام تھے، علم حدیث سے خاص ذوق تھا، اس کے لیے دور دراز مقامات کا سفر کیا، ان کے اساتذہ میں امام نسائی، ابو خلیفہ جمحی، زکریا ساجی، عمر بن ابی غیلان، باغندی، ابو یعقوب منجنیقی، جاہر بن محمد زملکانی، عبد اللہ بن زیدان البجلی اور ابو عروبہ حرانی اور تلامذہ میں احمد عبد اللہ اصبہانی، محمد بن علی علوی، علی بن عمر اسد آبادی اور احمد بن حسین نکسار وغیرہ ہیں، علامہ ذہبی فرماتے ہیں کہ ابن سنی نہایت متدین، مخیر، عادل اور صادق تھے، سنن صغریٰ کے راوی اور مشہور کتاب عمل الیوم واللیلۃ اور بعض دوسری کتابوں کے مصنف ہیں، وفات کے وقت ۸۰ سال سے کچھ زیادہ عمر تھی، قاضی ابو زرعہ کا بیان ہے کہ میرے چچا علی بن احمد بن محمد فرماتے تھے کہ میرے والد حدیث نبوی لکھ رہے تھے، اور قلم دوات میں ڈالکر خدا سے دعا کر رہے تھے کہ اسی اثنا میں انتقال ہو گیا، سال وفات ۳۶۴ھ ہے۔[۲]

کتب حدیث میں سنن کا مقام یہ صحیح ہے کہ جو مقبولیت صحیح بخاری اور مسلم کو حاصل ہوئی وہ صحاح کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی اور ترتیب میں نسائی کو ابوداؤد اور ترمذی کے بعد جگہ دی گئی ہے،

[۱] شذرات الذہب ج ۳ ص ۲۷ [۲] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۵۱

لیکن اس کا نام ابوداؤد اور ترمذی کے ساتھ ساتھ آتا ہے، اس لیے یہ بھی ان کے ہم پایہ اور ہم مرتبہ ہو، اور اس کا صحاح میں شامل ہونا ہی اس کی اہمیت اور عظمت کے لیے کافی ہے، لیکن جس طرح بعض خصوصیات میں صحاح کی ہر کتاب دوسری کتابوں پر فائق ہے اسی طرح نسائی کی بھی بعض خصوصیات دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

بعض محدثین کا خیال ہے کہ صحیحین کے بعد اسی کا درجہ ہے، اسلیے کہ اس میں سب سے کم ضعیف روایات اور مجروح رجال ہیں، یہ الگ بات ہے کہ اسے دوسری کتابوں کی سی شہرت نہ حاصل ہو سکی، مگر اس کی صحت میں شبہ نہیں، نسائی کے شرائط اور قبول روایت کے معاملہ میں تشدد مشہور ہے، جرح وتعدیل کے ماہرین اور نقادوں کا فیصلہ ہے کہ ان لابی عبد الرحمٰن شرطاً فی الرجال اشد من شرط البخاری[۱]۔ اس لیے یہ انکشاف قطعاً حیرت انگیز نہیں ہے کہ صحیحین کے بعد اسکا درجہ ہے؛

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے کتب حدیث کو صحت وشہرت کے اعتبار سے چار طبقات میں شمار کیا ہے، ان کی تشریح کی روشنی میں سنن کے حسب ذیل خصائص اور مراتب معلوم ہوتے ہیں۔

(۱) نسائی کا شمار اگرچہ صحاح میں ہے لیکن وہ موطا امام مالک اور صحیحین سے فروتر ہے۔

(۲) سنن نسائی جامع ترمذی اور ابوداؤد کے ہم پایہ اور ہم مرتبہ ہے۔

(۳) امام نسائی کی ثقاہت وعدالت، ضبط وحفظ اور رسوخ وتبحر دوسرے اصحاب کی طرح مسلم ہے،

(۴) امام نسائی اپنی شرطوں میں تساہل اور تہاون سے کام نہیں لیتے۔

(۵) نسائی کو صحاح کی دوسری کتابوں کی طرح بڑی مقبولیت حاصل ہے کیونکہ محدثین اور فقہا نے ہر زمانہ میں اس کی حدیثوں سے اعتنا کیا ہے، اہل علم نے غریب حدیثوں کی شرح، رجال کی تحقیق وتفتیش اور اس سے عام فقہی مسائل مستنبط کیے ہیں۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ ج ۲ ص ۲۶۸

(۶) عام علوم شرعیہ کا اس پر مدار اور محدثین وفقہا کا اس پر اعتماد و اعتبار ہے۔

(۷) اس کی روایات متعدد طرق سے مروی ہونے کی وجہ سے مشہور اور مستفیض ہیں۔

(۸) جمہور فقہا اور علماء حرمین کی روایات پر عمل کرنے میں متفق یا کم از کم وہ صحابہ و تابعین کی ایک کثیر جماعت یا کسی بڑے مقام کے لوگوں کی معمول بہ ہیں۔[1]

سنن کا ایک عام سرسری جائزہ | روایت حدیث کا تمام تر دار و مدار اسناد اور رواۃ پر ہے۔ اس لئے اس جائزہ میں اس پہلو کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے، ہمارے پیش نظر سنن کا وہ نسخہ ہے جو مصر کے مطبعہ میمنہ سے ۱۳۱۲ھ میں دو جلدوں میں شائع ہوا ہے اور اس کے ساتھ سیوطی کی شرح اور سندھی کا حاشیہ بھی ہے، اس لیے آیندہ حوالے اسی کے ہوں گے۔

کتب حدیث کی تبویب و ترتیب بھی عام کتب فقہ کی طرح ہوئی ہے، امام نسائی نے اسی اصول کو ملحوظ رکھا ہے، مگر عام محدثین اور ان کے درمیان ابواب کی تقدیم و تاخیر میں کسی قدر اختلاف ہے اور دقت نظر سے دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ نسائی کی ترتیب و تبویب دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ موزوں اور انسب ہے، بعض دوسرے جلیل القدر محدثین نے ابواب کی ترتیب میں موزونیت کا خیال نہیں رکھا ہے، مثلاً امام ابو داؤد نے کتاب الزکوٰۃ کے بعد کتاب اللقطہ کو اس کے بعد کتاب الحج کو، کتاب الحج کے بعد کتاب النکاح و الطلاق اور اس کے بعد کتاب الصیام کو رکھا ہے، امام ترمذی نے کتاب الحج کے بعد ابواب الجنائز اور اس کے بعد کتاب النکاح کو رکھا ہے، اسی طرح ابواب البر والصلہ کے بعد ابواب الطب اسکے بعد انھوں نے ابواب الفرائض اور ابواب الوصایا کو رکھا ہے، رئیس المحدثین امام بخاری نے کتاب الحج کے بعد کتاب الصوم اور اسکے بعد کتاب البیوع کو رکھا ہے، اور کتاب المغازی کے بعد کتاب التفسیر اور اس کے بعد کتاب النکاح لائے ہیں، لیکن امام نسائی کے یہاں اس طرح کی بے ترتیبی اور عدم موزونیت بہت کم نظر آتی ہے۔

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج اول ص ۱۰۵ تا ۱۰۸

امام نسائیؒ نے بعض ایسے ابواب قائم کیے ہیں جو دوسری کتب حدیث میں نہیں ملتے۔ مثلاً کتاب الخیل، کتاب الاحباس، کتاب عشرۃ النساء، اور کتاب الزینۃ وغیرہ۔

رواۃ کا تعارف | امام نسائیؒ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اہل روایت کے اسماء وغیرہ کی پوری تشریح اور تعارف کرا دیتے ہیں، اس کی کئی صورتیں ہیں

(۱) بعض روایتوں میں راوی کے اصل نام کے بجائے صرف کنیت کا ذکر ہوتا ہے، امام نسائیؒ ایسے موقع پر اس کا اصل نام بھی بتا دیتے ہیں جیسے:

قال ابو عبد الرحمٰن ابو معمر اسمہ عبد اللہ ابن سخبرۃ (سنن ج ۱ ص ۱۳۱)

قال ابو عبد الرحمٰن ابو عمار اسمہ عریب بن حمید ایضاً ص ۳۴

ایک مقام پر دو راویوں کے متعلق فرماتے ہیں:-

قال ابو عبد الرحمٰن اسم ابی سلام ممطور وھو حبشی واسم ابی امامۃ صدی بن عجلان (۲ ص ۱۲۸)

قال ابو عبد الرحمٰن ھذا ابو المتوکل اسمہ علی بن داؤد (ج ۲ ص ۳۲۳)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

قال ابو عبد الرحمٰن ابو کثیر اسمہ یزید بن عبد الرحمٰن (ج ۲ ص ۳۲۵)

(۲) بعض جگہ اصل نام تو مذکور ہوتا ہے مگر چونکہ باپ کے نام کو زیادہ شہرت ہوتی ہے اور راوی کی شہرت بھی اسی سے ہوتی ہے، اس لیے اس کا بھی ذکر فرماتے ہیں، مثلاً

حدثنا عبد الرحمن ھو ابن مھدی (ج ۱ ص ۱۶۹)

نیز:-

حدثنا عمار ھو ابن رزیق (ج ۲ ص ۱۱۶)

حدثنا داؤد وھو ابن عبد الرحمٰن العطار (ج ۲ ص ۲۸۲)

انبأنا عبد الله یعنی ابن المبارک (ج ۲ ص ۳۲۳)

عن اسماعیل وھو ابن سمیع (ج ۲ ص ۳۲۶)

(۳) کبھی بیٹے کی شہرت کی بنا پر اس کے ذریعہ باپ کا تعارف کراتے ہیں، مثلاً

عبد اللہ ابن جعفر بن نجیح والد علی بن المدینی (ج ۱ ص ۱۹۴)

محمد بن ابراھیم والد ابی بکر ابن ابی شیبۃ (ج ۱ ص ۲۵۸)

(۴) کبھی راوی کا اس کی نسبت سے تعارف کرا دیتے ہیں، مثلاً

اخبرنی ابوبکر بن اسحٰق ھو الصاغانی (ج ۲ ص ۱۱۶)

ایک جگہ باپ کے نام اور نسبت دونوں کا ذکر فرماتے ہیں:

قال حدثنا حفص وھو ابن عبد الرحمٰن البلخی (ج ۲ ص ۲۵۱)

(۵) کبھی اصل نام مذکور ہوتا ہے لیکن تعارف میں کنیت کا ذکر فرماتے ہیں، مثلاً

عمرو بن شرحبیل یکنی ابا المیسرۃ (ج ۱ ص ۳۴۷)

(۶) بعض رواۃ اپنے کسی خاص وصف کی بنا پر مشہور ہوتے ہیں، اس لیے ان کے نام کے ساتھ اس وصف کا تذکرہ کر دیتے ہیں، مثلاً

حدثنا سعید بن شبیب ابو عثمان وکان شیخاً صالحاً بطرسوس

یا مثلاً ایک روایت میں ابن ام مکتوم کا تعارف اس طور سے کراتے ہیں کہ

وھو الاعمی الذی عاتبہ اللہ عزوجل فی کتابہ (ج ۲ ص ۱۱۷)

(۷) اگر ایک نام کے کئی راوی ہوتے ہیں تو اس کی وضاحت فرماتے ہیں، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن اسمٰعیل بن مسلم ثلاثۃ ھذا احدھم لا بأس بہ

واسمٰعیل بن مسلم شیخ یروی عن ابی الطفیل لا بأس بہ واسمٰعیل بن

مسلم یروی عن الزهری والحسن متروك الحدیث (ج ۲ ص ۱۵)

(۸) ایک مقام پر ایک راوی کے ذکر کے ساتھ ہی اس کے چار بھائیوں کا ذکر کیا ہے۔

قال ابو عبد الرحمٰن ابو علی الحنفی هم اربعة اخوة احدهم ابو بکر و

بشر وبشر بالك واخر (ج ۲ ص ۱۹۰)

راوی اگر کسی راوی کو چھوڑ دے | اگر روایت کرنے والا کسی راوی کو متن سے حذف کر دیتا ہے تو اس کی توضیح فرماتے ہیں، مثلاً ایک روایت میں منصور کی اعمش سے مخالفت کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"خالفه منصور رواه عن مجاهد عن ابن عباس ولم یذکر طاؤساً" (ج ۱ ص ۱۴)

مجاہد نے اعمش کی روایت میں طاؤس کے واسطے سے ابن عباس سے یہ روایت کی تھی

قال ابو عبد الرحمٰن لم یذکر مالك عروة بن المغیرة (ج ۱ ص ۲۸)

الا ان بکیراً لم یذکر عبد الرحمٰن (ج ۱ ص ۲۰۴)

روایات میں کمی بیشی | اگر بعض روایتوں میں کسی راوی سے کچھ کمی بیشی ہو جاتی ہے تو اس کی وضاحت بھی فرما دیتے ہیں۔ مثلاً

مشہور روایت ہے کہ "اتی (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) سباطة قوم فبال قائماً" بعض راویوں نے اس سلسلہ میں آپ کے وضو کے بیان میں مسح علی الخفین کا ذکر کیا ہے، لیکن بعضوں نے اسے حذف کر دیا ہے، امام صاحب فرماتے ہیں:

قال سلیمان فی حدیثه ومسح علی خفیه ولم یذکر منصور المسح (ج ۱ ص ۱۱)

ایک روایت میں تمام اعضاء مغسولہ کا ذکر موجود ہے لیکن رجلین کا نہیں، اسلیے وہ فرماتے ہیں

قال عبد العزیز واخبرنی من سمع ابن عجلان یقول فی ذلك وغسل رجلیه (ج ۱ ص ۲۹)

ایک اور روایت کے متعلق فرماتے ہیں:

وبعضهم يزيد على بعض في الحديث (ج ۱ ص ۱۹۵)

حج کے باب میں محصر کے متعلق ایک روایت کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:

قال شعيب في حديثه وعليه الحج من قابل (ج ۲ ص ۲۹)

اسی طرح اگر کوئی راوی سلسلۂ روایت میں کسی راوی کا اضافہ کردے تو امام صاحب اس کی بھی وضاحت فرماتے ہیں، مثلاً

ادخل ابو الزناد بينه وبين خارجة مجالد بن عوف (ج ۲ ص ۱۶۵)

راوی کے انفراد کا ذکر | بعض راوی کسی روایت یا جزو روایت کے بیان کرنے میں منفرد ہوتے ہیں، اس لیے امام صاحب نے سنن میں اس کا تذکرہ بھی کیا ہے، مثالیں ملاحظہ ہوں۔

روایت کے الفاظ میں انفراد کی مثالیں:-

قال ابو عبد الرحمٰن لا اعلم احداً ذكر في هذا الحديث وتوضئي غير حماد بن زيد وقد روى غير واحد عن هشام ولم يذكر فيه وتوضئي (ج ۱ ص ۵۴)

قد روى هذا الحديث غير واحد لم يذكر احد منهم ما ذكره ابن عدي والله اعلم (ج ۱ ص ۴۵)

باب رفع اليدين عن الارض قبل الركبتين میں تحریر فرماتے ہیں:

لم يقل هذا عن شريك عن يزيد بن هارون والله تعالىٰ اعلم (ج ۱ ص ۱۶۳)

ایک اور موقعہ پر فرماتے ہیں:

قال ابو عبد الرحمٰن "ثم احدث احراما" اعلم احدا قاله غير نوح بن حبيب ولا احسبه محفوظاً والله سبحانه وتعالىٰ اعلم (ج ۲ ص ۹)

وقد روی ھذا الحدیث غیر واحد عن الزھری فلم یذکر فیہ ما ذکرالولید بن مسلم (ج ۲ ص ۳۰۵)

یا راوی کا کسی حدیث کو سند روایت کرنے میں انفراد ہو، مثلاً

قال ابو عبدالرحمٰن لا اعلم احداً اسند ھذا عن عبداللہ بن الفضل الا عبدالعزیز و اسمٰعیل مرسلاً (ج ۲ ص ۱۸)

لا اعلم احداً اسند ھذا الحدیث عن الزھری غیر معمر واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم (ج ۲ ص ۲۱)

کوئی راوی کسی سے روایت کرنے میں منفرد ہو، مثلاً

قال ابو عبدالرحمٰن لا اعلم احداً روی ھذا الحدیث عن نافع عن ابن عمر غیر موسیٰ الجہنی وخالفہ ابن جریج (ج ۲ ص ۳۴)

کوئی راوی کسی راوی کا نام بیان کرنے میں منفرد ہو مثلاً

قال ابو عبدالرحمٰن ما اعلم احداً قال فی ھذا الحدیث منصور غیر ابن عدی واللہ تعالیٰ اعلم۔ (ج ۲ ص ۵۰)

اسی طرح ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

قال ابو عبدالرحمٰن لا اعلم احداً قال فی ھٰذا الحدیث الاسود غیر زائدہ (ج ۲ ص ۸۹)

اسی انفراد کے باعث روایت میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے، امام صاحب نے اس کا اکثر ذکر کیا ہے، ایک مثال ملاحظہ ہو:

وھذا خبر ضعیف لان یحییٰ بن یمان انفرد بہ دون اصحاب سفیان ویحییٰ بن یمان لا یحتج بحدیثہ لسوء حفظہ وکثرۃ خطئہ (ج ۲ ص ۳۳۴)

متابعت کا ذکر | ایسے ہی وہ راوی کی عدم متابعت کا بھی تذکرہ کرتے ہیں، اسکی کئی صورتیں ہیں۔

۱۔ کسی خاص فقرہ یا جملہ پر عدم متابعت، مثلاً۔

قال ابو عبدالرحمٰن لا اعلم احداً تابع علی بن مسھر علی قولہ "فلیرقہ" (ج ۱ ص ۲۲)

قال ابو عبدالرحمٰن لا نعلم احداً تابع عمر بن یحییٰ علی قولہ "یصلی علی حمار" (ج ۱ ص ۱۲۱)

۲۔ کسی راوی سے روایت کرنے میں عدم متابعت، مثلاً:

قال ابوعبدالرحمٰن لا اعلم احداً تابع یزید بن خصیفه عن بسر بن سعید علی قوله عن ابی هریرة
(ج ۲ ص ۲۸۳)

۳۔ کسی خاص روایت میں راوی کی عدم متابعت، مثلاً

قال ابوعبدالرحمٰن لا نعلم احداً تابع ایمن بن نائل علی هذه الروایة (ج ۱ ص ۱۸۹)

یا مثلاً

لا اعلم احداً تابع شبابة علی هذا الحدیث (ج ۱ ص ۲۵۲)

اسناد میں عدم متابعت کا ذکر، مثلاً

ما اعلم احداً تابع اللیث علی هذا الاسناد غیر ابن جریج (ج ۱ ص ۲۰۸)

اسی عدم متابعت کے نتیجہ میں روایات میں ضعف اور سقم پیدا ہو جاتا ہے، امام موصوف نے سنن میں اس کی وضاحت کردی ہے، مثلاً ایک روایت میں آتا ہے: "لیس من البر الصیام فی السفر"۔

امام صاحب اس سلسلہ میں ارشاد فرماتے ہیں:

هذا خطاء الصواب والذی قبله لا نعلم احداً تابع ابن کثیر علیه (ج ۱ ص ۳۱)

یا مثلاً ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اشربوا فی الظروف ولا تسکروا"

امام نسائی فرماتے ہیں:

وهذا حدیث منکر غلط فیه ابو الاحوص سلام بن سلیم لا نعلم ان احداً تابعه علیه من اصحاب سماک بن حرب وسماک لیس بالقوی وکان یقبل التلقین۔
(ج ۲ ص ۳۳۲)

یا مثلاً

لا نعلم احداً تابع ایمن بن نائل علی هذه الروایة وایمن عندنا لا بأس به والحدیث خطاء (ج ۱ ص ۱۸۹)

(باقی)

ادبیات

غزل

از جناب منظور علی صاحب فاروقی تمنا بجنوری

دل و نگاہ کے ہر ہر مقام سے گذری
تمھاری یاد بڑے اہتمام سے گذری

تغیرات سحر سے نہ شام سے گذری
حیات عشق تمھارے ہی نام سے گذری

بہت بلند حدودِ دوام سے گذری
وہ زندگی جو محبت کے نام سے گذری

ہے آج کیفِ محبت بدوشِ میخانہ
ضرور وہ نگہ مست جام سے گذری

ہزار حشر پہ بھاری وہ اک قیامت ہے
گلی میں ان کی جو انکے خرام سے گذری

کمال جلوہ طرازی کے برق وادی طور
جھجھک جھجھک کے بہت تیز بام سے گذری

تجھے قسم ہے تغافل کی اپنے، فکر نہ کر
کٹے گی شب بھی یونہی جیسے شام سے گذری

وہ چشم مست تو اٹھتی سی بزم میں دیکھی
نہ جانے شیشہ کی پھر کیسے جام سے گذری

وہ خال عارض جاناں بزیر سایۂ زلف
نظر جو دانے پہ ڈالی تھی دام سے گذری

نماز تیرے پرستارِ زلف کی ہے نماز
کہ قبلہ و بندِ قعود و مقام سے گذری

تمنا آج بھی اک راز وہ حقیقت ہے
جو ہر نگاہِ خواص و عوام سے گذری

غزل

از جناب سلام ساگری

حسن بھی لرزتا ہے عشق کے فسانے سے
آپ اور سو جائیں حالِ دل سنانے سے

ایک داغِ مایوسی ایک داغِ ناکامی
مل گیا جو ملنا تھا عشق کے خزانے سے

التفاتِ پیہم تھی بے توجہی تیری
اور بھی بھڑک اٹھی شمعِ دل بجھانے سے

کونسی ہے تابانی دامنِ تصور میں
اس جہاں کو نسبت ہے جانے کس زمانے سے

تار کچھ بقا کے تھے دامنِ محبت میں
رشتۂ فنا ٹوٹا دل کسی پہ آنے سے

بجلیاں بھی گرتی ہیں پھول بھی بکھرتے ہیں
انقلاب آتے ہیں تیرے مسکرانے سے

برق کا تبسم تھا بادلوں کے پردے میں
نام ہو گیا روشن میرے آشیانے سے

اے سلامؔ دو عالم آج غرقِ مستی ہیں
نغمۂ محبت سے حسن کے ترانے سے

غزل

از جناب کریم الرضا خانصاحب وکیل شاہجہانپور

منتِ غیر نہ کی جور کا شکوہ نہ کیا
آپ رسوا ہوئے ہم عشق کو رسوا نہ کیا

ہم بھلا ان سے تغافل کا گلہ کیا کرتے
ہم نے خود بیخودیِ شوق میں کیا کیا نہ کیا

کشتیِ شوق نے طوفاں کے تھپیڑے کھائے
ناخدا کا مگر احسان گوارا نہ کیا

دل تو آمادۂ اظہارِ تمنا تھا، مگر
یہ بھی آدابِ محبت نے گوارا نہ کیا

ترکِ توبہ تو بڑی بات نہ تھی او ساقی
کیا کہیں کس کی نگاہوں نے اشارا نہ کیا

فطرتِ حسن تو ہی عشق کو رسوا کرنا
عشق نے حسن کو رسوا کیا اچھا نہ کیا

ہم تو اربابِ جنوں کے صفِ اول میں رہے
پھر بھی وابستگیِ شوق کو رسوا نہ کیا

یوں پیدا کیے مشرق نے ہزاروں لیڈر
بعد جوہرؔ[1] کے قلندر کوئی پیدا نہ کیا

---

[1] مولانا محمد علی جوہر۔

مطبوعات جدیدہ

ترجمان السنۃ جلد سوم تالیف مولانا بدر عالم صاحب، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت معیاری، صفحات ۵۱۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت مجلد عـہ غیر مجلد عـہ/

پتہ :- ندوۃ المصنفین، دہلی۔

اردو میں احادیث نبوی کے ترجمہ اور تشریح اور اس کے متعلقہ مسائل ومباحث پر ے علماء نے کتابیں لکھی ہیں، مگر جس اہتمام، وسعت نظر اور تحقیق وجامعیت سے مولانا لم صاحب اس کام کو انجام دے رہے ہیں، وہ اس سے پہلے نہیں ہوا تھا، وہ حضرت مولانا ا کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں ہیں اور احادیث نبوی اور اس سے متعلقہ علوم پر ی نظر بڑی گہری اور وسیع ہے، اس لیے وہ اس اہم کام کو جس خوبی سے انجام دے سکتے ہیں ہ توقع دوسرے سے نہیں ہوسکتی، چنانچہ ترجمان السنۃ کے نام سے انھوں نے جو سلسلہ شروع کیا س کی دو جلدیں پہلے شائع ہوچکی ہیں، یہ تیسری جلد ہے، اس میں قضا وقدر اور نبوت ورسالت اہم مسائل سے متعلق احادیث کا ترجمہ ضروری تشریحات کے ساتھ کیا گیا ہے، ہر باب کے آغاز میں امندرجہ احادیث سے پیدا شدہ مباحث اور پیچیدہ مسائل پر محققانہ روشنی ڈالی گئی ہے، ضا وقدر، رسول کریم کے تذکرہ، عصمت انبیاء، اور آخر میں حضرت مسیح کے رفع اور قرب قیامت دل پر بڑی تحقیقی، بصیرت افروز اور سیر حاصل بحث ہے، جابجا مختلف النوع اسرار ونکات حارف وحقائق معرض تحریر میں آگئے ہیں، اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں جدید

ذہن وفکر اور موجودہ رجحانات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے، اس کے محاسن کا صحیح اندازہ مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ تمام مسائل میں مصنف کے خیالات سے کلی اتفاق ضروری نہیں، بعض مباحث میں اطناب ہو گیا ہے اور بعض ایسے شبہات قلم انداز ہو گئے ہیں جو موجودہ ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں، مصنف نے ضعیف روایات بھی نقل کی ہیں، اور اس کی ضرورت بھی واضح کی ہے، یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص کے لیے قابل قبول ہو، مجموعی حیثیت سے ترجمان السنہ نہایت مفید، جامع اور موجودہ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ایک محققانہ کتاب ہے اور اس کا مطالعہ احادیث کے اساتذہ، طلبہ اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ سب کے لیے یکساں مفید ہے، اللہ تعالیٰ اس مفید اور ضروری کام کی تکمیل کے لیے لائق مصنف کی عمر اور صحت میں برکت دے اور انھیں حدیث نبوی کی اس غیر معمولی خدمت کا اجر عطا فرمائے۔

انوار مصابیح بجواب رکعات تراویح از جناب مولانا نذیر احمد رحمانی اعظمی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۸۰، قیمت عہ پتہ: نذیر احمد رحمانی دار الاقامہ نمبر ۱۶/۵۷ پانڈے حویلی بنارس۔

مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی کتاب "رکعات تراویح" پر گذشتہ اشاعت میں تبصرہ کیا جا چکا ہے، یہ رسالہ اس کا جواب ہے، اسے جماعت اہلحدیث کے مشہور عالم مولانا نذیر احمد رحمانی نے لکھا ہے اور زیر بحث مسئلہ کے متعلق مسلک اہل حدیث پر عائد کردہ الزامات کا محققانہ جواب دینے کی کوشش کی ہے اس رسالہ میں بھی جا بجا طنز و تعریض اور لہجہ کی درشتی ہے جو اہل علم کے شایان شان نہیں۔ اس طرح کے فروعی مسائل پر وقت اور صلاحیت صرف کرنے کے بجائے اگر ہمارے علما کسی مفید کام میں وقت صرف کرتے تو وہ مسلمانوں کے لیے زیادہ مفید ہوتا،

نو طرز مرصع - مرتبہ ڈاکٹر سید نور الحسن صاحب ہاشمی چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر

صفحات ۲۲۰۔ قیمت تحریر نہیں۔ ناشر ہندوستانی اکیڈمی اترپردیش، الہ آباد

نوطرز مرصع میر محمد حسین عطا خاں تحسین اب بہت کمیاب ہے، اس لیے ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی نے متعدد قلمی اور مطبوعہ نسخوں کی مدد سے یہ نسخہ مرتب کرکے ایک مفید مقدمہ اور دیباچہ کے ساتھ شائع کیا ہے، مقدمہ میں تحسین کے حالات، قصہ کے زمانہ، سبب تصنیف، مآخذ اور اسلوب بیان وغیرہ پر بحث کی گئی ہے، اور دیباچہ میں ان تمام نسخوں کا ذکر اور ان کا مقابلہ کیا گیا ہے جو مرتب کے پیش نظر تھے، نوطرز مرصع اپنے دور کے طرز تحریر کا نمونہ اور مرتب کے نزدیک شمالی ہند میں اردو نثر کی پہلی کتاب ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس کتاب کو مرتب اور شائع کرکے مفید ادبی خدمت انجام دی ہے۔

اسباب بغاوت ہند ۔ تالیف سرسید احمد خاں، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۸۴، مجلد مع مصور گردپوش، قیمت ۸؍ ناشر: یونیورسٹی پبلشرز، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

سرسید کا رسالہ اسباب بغاوت ہند بہت مشہور ہے جو اس سے پہلے بھی چھپ چکا ہے مگر اب کمیاب تھا، اس لیے یونیورسٹی پبلشرز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اس کو شائع کیا ہے، فوق کریمی صاحب نے اس کا مقدمہ لکھا ہے، اس میں سرسید کو مخلص اور محب قوم و وطن ثابت کرنے اور انگریزوں کی مخالفت سے احتراز اور ان سے دوستی کے بارہ میں ان کے مشورہ کو اس وقت کے تقاضوں اور مصلحتوں کے مطابق قرار دیا گیا ہے، سرسید نے یہ رسالہ اس زمانہ میں لکھا تھا جب کوئی ہندوستانی اسکی ہمت نہیں کرسکتا تھا، اس سے ان اعتراضات کی خود بخود تردید ہو جاتی ہے جو ان پر کیے

رنگ برنگ ۔ شائع کردہ مرکز ادب مدراس، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۹۶ مجلد مع رنگین گردپوش، قیمت ۱۲؍ پتہ: تاج بک ڈپو مسجد بڑی میٹ مدراس نمبر

مدراس کے چند صاحب مذاق اشخاص نے مرکزِ ادب کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا ہے، اس میں سرپرست دار المصنفین کے دیرینہ رفیق مولوی محمد یوسف صاحب کوکنی ایم اے (ریڈر مدراس یونیورسٹی) کا نام ہے، ادارہ کا مقصد مدراس کے ادیبوں اور شاعروں کی نگارشات کو شائع کرنا ہے، رنگ برنگ اس سلسلہ کی پہلی پیشکش ہے، جو وہاں کے ۱۳ شاعروں کی غزلوں کا منتخب مجموعہ ہے، شروع میں "جھلکیاں" کے زیرِ عنوان شعراء کا مختصر تعارف کرایا گیا ہے، انتخاب اگرچہ معیاری نہیں مگر ظاہری محاسن کی طرح باطنی محاسن سے خالی بھی نہیں ہے، اس سے مدراس میں اردو شعر و سخن کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، مرکزِ ادب مدراس کی یہ پیشکش ہمت افزائی اور تحسین کی مستحق ہے، ہم کو توقع ہے کہ وہ آیندہ زبان و ادب کی زیادہ مفید اور قابل قدر خدمات انجام دے گا۔

غلبۂ دین: - مرتبہ جناب مولوی سید محمود علی صاحب بخاری، چھوٹی تقطیع، کاغذ معمولی، کتابت و طباعت قدرے بہتر، صفحات ۱۴۵، قیمت عہ، پتہ: شعبۂ تالیف و تصنیف دینا انجمن آصف نگر، حیدرآباد دکن، اندھرا پردیش۔

مصنف ایک مبلغ ہیں، اس کتاب میں انھوں نے ظلم و فساد کے اسباب، اس کی مختلف صورتوں، غلبۂ دین کے تین اہم موانع (اتباع ہوا، آباپرستی اور اہل اقتدار کی اطاعت) اہل حق کیساتھ نصرت الٰہی کے ظہور کی مختلف شکلوں اور آخر میں اہل حق کی ان خصوصیات کا ذکر ہے جس سے وہ نصرت الٰہی کے مستحق ہوتے ہیں، ایک جگہ اس خیال کی تردید کی ہے کہ غلبۂ دین حصول اقتدار کا نام نہیں یہ تو صحیح ہے کہ غلبۂ دین کا مقصد حصول اقتدار نہیں ہے لیکن قوت و اقتدار کے بغیر دین کا غلبہ کیا اسکا پورا قیام بھی ممکن نہیں ہے، اسی طرح یہ سے ختم نبوت کے بعد غلبۂ دین کے لیے سلسلۂ وحی کے قیام کو ضروری قرار دینا بھی صحیح نہیں ہے، البتہ اگر وحی کے اصطلاحی معنی کے بجائے کسی دوسری نوع کی وحی مراد لیجائے تو اس سے انکار نہیں مگر اس کے لیے کشف و الہام وغیرہ کی اصطلاح موجود ہے، وحی کے لفظ سے ختم نبوت میں التباس پیدا ہوجاتا ہے اس لیے ایسے مشتبہ الفاظ کا استعمال احتیاط کے خلاف ہے، ان فروگذاشتوں سے قطع نظر کتاب مفید اور مسلمانوں کے پڑھنے کے لائق ہے۔

"ض"

سلسلۂ تابعین و تبع تابعینؓ

اہل کتاب صحابہ و تابعینؓ

ع میں عرب کے یہود و نصاریٰ کی قدیم تاریخ اور کے تمدنی و سیاسی اثرات اور اُن کی دینی و اخلاقی ت کی تفصیل اور اس کے بعد حروف تہجی اعتبار سے (۹۲) اہل کتاب صحابہ اور تابعینؓ کے بعد صحابیات اور تابعات کا تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے، مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

ضخامت ۲۷۵ صفحے قیمت: للعہ

تابعینؓ

اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ، حسن بصریؒ، اویسؒ قرنی، امام زین العابدینؓ، سعید بن مسیبؒ، محمد بن سیرینؒ ابن شہاب زہری، اور قاضی شریح وغیرہ ۹۶ اکابر تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور علمی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

طبع دوم ضخامت ۵۵۶ صفحے قیمت عہ

تبع تابعینؓ

(حصۂ اول)

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں جس طرح صحابۂ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے اور صحابۂ کرام کے بعد اُنہی کی زندگی ملت اسلامیہ کے لئے نمونۂ عمل بنی، بالکل اسی طرح تابعین کرامؒ کے جانشین اور اُن کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، سیر الصحابہ کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین تابعینؒ کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کر چکا ہے، اب اُس نے اُن کے بعد کے مقدس آب بزرگوں اور ائمۂ دین کا مرقع تیار کرایا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور اُن کے فقہی مسلک کے داعی و علمبردار امام ابو یوسفؒ، امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں اور فقہی اجتہادات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی حصۂ اول ضخامت صفحے

قیمت:

رجسٹرڈ نمبر ا ۵۲۰

دسمبر ۱۹۵۹ء

معارف

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتّبہ

شاہ معین الدّین احمد ندوی

قیمت آٹھ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنّفین اعظم گڈھ

جلد ۸۴ ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۹ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۹ء نمبر ۶

فہرست مضامین

شذرات

محمود احمد صاحب عباسی کی کتاب "خلافت یزید و معاویہ" کئی مہینے ہوئے ہمارے پاس آئی تھی، مگر معارف میں ریویو کے لیے اس کثرت سے کتابیں آتی ہیں کہ مہینوں کے بعد اس کی نوبت آتی ہے، اس لیے اب تک یہ کتاب ہماری نظر سے نہیں گذری تھی، مگر اس نے ایک فتنہ کی شکل اختیار کرلی ہے اور ہمارے پاس اس کے بارہ میں استفسار کے مسلسل خطوط آرہے ہیں، اس لیے اس کے متعلق اظہار رائے ضروری ہوگیا، اس کتاب میں مصنف نے منہاج السنۃ کی تلخیص المنتقی پر محب الدین الخطیب کے حواشی سے زیادہ استفادہ کیا ہے، مگر اس میں ان کے قلم کے بھی اضافے ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ اس کی بعض تاریخی بحثیں بڑی قابلِ قدر ہیں لیکن ان میں حق کیساتھ باطل بھی اس طرح ملا ہوا ہے کہ اسکو جدا کرنا مشکل ہے، اور مجموعی حیثیت سے مصنف کی اسپرٹ اور کتاب کا مقصد نہایت غلط ہے،

یہاں تک تو بلا شبہہ صحیح ہے کہ مورخین نے بنی امیہ کے ساتھ بڑی بے انصافی کی ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ ہی کے زمانہ سے بنی امیہ کے خلاف ایک جماعت پیدا ہوگئی تھی، اس کے بعد حضرت علیؓ کے مقابلہ میں حضرت امیر معاویہؓ کی صف آرائی، پھر یزید کی ولیعہدی اور سب سے آخر میں واقعہ کربلا نے جن کو عام مسلمان بھی ناپسند کرتے تھے، اور واقعۂ شہادت سے خاص طور سے متاثر تھے، بنی امیہ کے مخالفین کو ان کے خلاف پروپیگنڈے کا پورا موقع دیدیا اور انھوں نے انکی واقعی غلطیوں کی آڑ لیکر ان کے متعلق بہت سے مبالغہ آمیز واقعات بلکہ جھوٹے افسانے ان کی جانب منسوب کر دیے، اس میں ان قوموں نے زیادہ حصہ لیا جن کو مسلمانوں نے محکوم بنایا تھا، ان واقعات سے فائدہ اٹھاکر بنی عباس نے اپنی حکومت قائم کرلی، یہ بھی بنی امیہ کے سخت دشمن تھے، اسلیے ان کے زمانہ میں بھی

بنی امیہ کی مخالفت برابر جاری رہی اور عباسی حکومت سندھ سے لیکر شمالی افریقہ تک تھی، اس لیے بنی امیہ کے متعلق جو افسانے بھی مشہور ہو گئے وہ پوری دنیائے اسلام میں پھیل گئے،

~~~~~~~~

اسی زمانہ میں تاریخ نویسی کا آغاز ہوا، اس لیے وہ تمام افسانے جو پولیٹکل مقصد سے تراشے گئے تھے، تاریخوں میں داخل ہو گئے، بنی امیہ کی بعض بدعتوں اور صریح غلطیوں سے انکار نہیں لیکن اسی کے ساتھ تاریخ اسلام میں ان کے شاندار کارنامے بھی ہیں، چنانچہ تاریخوں میں انکی مخالف روایات کے پہلو بہ پہلو ان کے کارنامے بھی نظر آتے ہیں، جو پروپیگنڈے کے حجاب میں عام نظروں سے چھپ کر رہ گئے تھے، مگر جب تحقیق و تنقید کا دور آیا تو بہت سے لغو افسانے مسترد قرار پائے اور بنی امیہ کی تصویر کا دوسرا رخ بھی نظر آنے لگا۔

~~~~~~~~

اس پہلو سے اس دور کی تاریخ کا جائزہ لینا کوئی قابل اعتراض فعل نہیں ہے، بلکہ ایک علمی خدمت ہے اور مختلف زمانوں میں علما، محققین اس کام کو انجام دیتے رہے ہیں، خود راقم نے سیر الصحابہ اور تاریخ اسلام میں بنی امیہ خصوصاً حضرت امیر معاویہؓ اور واقعۂ کربلا کے متعلق تمام غیر معتبر روایات کی پوری تردید کی ہے اور بنی امیہ کی غلطیوں کے ساتھ ان کے کارنامے بھی دکھائے ہیں، مگر اس طرح کہ اس سے حضرت علیؓ اور حضرت امام حسین رضی اللہ عنہما کے مرتبہ اور انکی عظمت میں کوئی فرق نہیں آنے پایا ہے، اسی لیے کسی شیعہ کو بھی اس پر اعتراض کا موقع نہ مل سکا، اگر مصنف "خلافت معاویہ و یزید" بھی غیر جانبداری اور اعتدال و توازن کے ساتھ ان واقعات کا جائزہ لیتے تو کم از کم کسی اہل علم کو ان پر اعتراض کرنے کا موقع نہ ملتا، مگر وہ بنی امیہ خصوصاً حضرت امیر معاویہؓ اور یزید کی مدافعت اور حمایت میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ کو ملزم بنانے میں بھی باک نہیں کیا ہے، انھوں نے واقعات پر جس طرح بحث کی ہے اور اس سے جو نتائج نکالے ہیں اس سے حضرت علیؓ اور حضرت امام حسینؓ خطا کار اور امیر معاویہؓ اور یزید برسر حق نظر آتے ہیں، جو نہ صرف جذباتی حیثیت سے قابلِ اعتراض بلکہ تاریخی حیثیت سے بھی غلط ہے۔

صدیوں کے پرانے واقعات تو مختلف رنگوں کا مجموعہ ہوتے ہیں، مورخ کا موئے قلم ان سے جیسی تصویر چاہے بنا سکتا ہے یہی تصنیفی آرٹ محمود احمد عباسی نے بھی دکھایا ہے اور ایک مقصد کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے، اور اس سے حسب منشا نتائج نکالے ہیں، اس لیے کتاب کا یہ پہلو تاریخی حیثیت سے بھی بہت کمزور ہے، امروہہ شیعوں کا ایک مرکز ہے، مصنف کا وطن بھی امروہہ ہے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان کے زخم خوردہ ہیں اس لیے انھوں نے بھی اسی رنگ کی کتاب لکھ دی اور جو کتاب اس جذبہ سے لکھی جائے گی اس میں اعتدال و توازن قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، اسی بے اعتدالی کا شکار مصنف "خلافت معاویہ و یزید" بھی ہوئے ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

اس کتاب کی اشاعت کا سب سے افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ اس سے شیعہ سنی اختلاف کا ایک نیا فتنہ کھڑا ہو گیا ہے، مگر غنیمت یہ ہے کہ اہل سنت نے بھی اس پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہے، ممکن ہے مناظرانہ ذہنیت رکھنے والے کچھ سنی اس کے حامی نکل آئیں لیکن ان کی اکثریت اس کو ناپسند کرتی ہے، اور ان کے متعدد اکابر اس سے برأت ظاہر کر چکے ہیں، اس لیے ہم کو توقع ہے کہ شیعوں کا سنجیدہ طبقہ اس کو شیعہ سنی مسئلہ نہ بننے دے گا، ورنہ اگر اس کے جواب میں شیعوں نے گڑے مردے اکھاڑنا شروع کر دیے جیسا کہ بعض شیعہ اخبارات کر رہے ہیں تو پھر یہ مسئلہ واقعی شیعہ سنی مسئلہ بن جائیگا جس کے نتائج دونوں کے لیے مضر ہوں گے، اب یہ زمانہ ان پرانے قضیوں میں الجھنے کا نہیں ہے بلکہ انکو بھلا دینے کا ہے۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

افسوس ہے کہ مولانا احمد سعید صاحب، صدر جمعیۃ علمائے ہند نے ۴ دسمبر کو انتقال فرمایا، مولانا مرحوم ان علمائے دین میں تھے جن کی پوری زندگی ملک و ملت کی خدمت میں گذری، وہ جنگ آزادی کے نامور مجاہد تھے اور اس راہ میں بارہا قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، مولانا کفایت اللہ صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب مرحوم کے بعد اس طبقہ کے علماء میں ایک مولانا احمد سعید ہی کی ذات رہ گئی تھی، وہ بھی ہم سے جدا ہو گئے۔

ع افسوس کز قبیلۂ مجنون کسے نماند

دینی، ملی اور سیاسی خدمات کے ساتھ مولانا بڑے خوش بیان خطیب تھے، دلی کی ٹکسالی زبان بولتے تھے، یں کرتے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، شرافت و وضعداری میں بھی دلی کی پرانی تہذیب کا نمونہ تھے، طبعاً بڑے ندہ دل اور خوش مذاق تھے جس محفل میں بیٹھتے تھے اپنی باتوں سے پوری محفل کو مائل کر لیتے تھے، عرصہ ہوا یک سیاسی مقدمہ کے سلسلہ میں ان کو کچھ دنوں اعظم گڈھ میں رہنا پڑا تھا، دارالمصنفین میں قیام تھا، اعظم گڈھ ں کی عدالت سے ان کو سزا ہوئی اور یہیں کے جیل میں قید ہوئے، اس لیے مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ا، اسی زمانہ سے ان کے حسن اخلاق اور پرلطف صحبت کا جو نقش قائم ہوا تھا وہ ابتک باقی ہے۔ مولانا پنے دور کی آخری یادگار تھے، اس لیے ان کی وفات سے ایک دور کا خاتمہ ہوگیا، اللہ تعالیٰ اس ادم دین وملت کو اپنی بے پایاں رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

ہندوستان کی آزادی کے بعد مسلمان بچوں کی مذہبی تعلیم کا مسئلہ بہت اہم ہوگیا ہے، انگریزوں کے زمانہ میں ظام تعلیم بڑی حد تک سیکلر تھا، انھوں نے تعلیم کے ذریعہ کسی فرقہ کی تہذیبی خصوصیات کو مٹانے کی کوشش نہیں کی تھی، ن کے زمانہ میں نیم سرکاری اسلامی مکاتب کا سلسلہ بھی تھا، جو اب قریب قریب ختم ہو رہا ہے، ابتدائی تعلیم بری نہ تھی، اردو اور ہندی کا درجہ برابر تھا، اب تعلیم جبری ہو رہی ہے، اردو عملاً تعلیم سے خارج کر دی گئی ہے، ر ہندی کی تعلیم اس کی تمام کلچری خصوصیات کے ساتھ لازمی ہوگئی ہے، ابتدائی تعلیم کی کتابیں تمامتر ہندو مذہب نہ و کلچر کی ترجمان ہیں اسلیے جو بچے ان اسکولوں میں پڑھتے ہیں وہ اپنی تہذیب و روایات سے بیگانہ ہوتے جاتے ہیں۔

~~~~~~~~~~~~~~~~~~~~

پہلے اگر مذہب کی باقاعدہ تعلیم نہیں بھی ہوتی تھی تو ہر مسلمان کے گھر کا ماحول ایسا ہوتا تھا کہ بچے اپنے مذہب او بنی روایات سے بیگانہ نہیں ہونے پاتے تھے، اب ہماری لڑکیاں بھی یہی تعلیم حاصل کرینگی اس لیے خود ان کا کلچر بدل بائے گا اور ان کی گود میں جو بچے پلیں گے، نہ صرف انکی مادری زبان ہندی ہو جائے گی بلکہ وہ تمامتر ہندو کلچر کے

رنگ میں رنگ جائینگے اور انکی ملی خصوصیات ختم ہو جائیں گی، اگر مسلمان اپنی مذہبی تعلیم کا کوئی دوسرا نظام قائم کرتے ہیں تو اس میں بھی طرح طرح کی دشواریاں اور پیچیدگیاں ہیں، اس لیے یہ مسئلہ عرصہ سے مسلمان اصحاب فکر کے سامنے ہے اور اسکے حل کی بعض ابتدائی اور انفرادی کوششیں بھی کی گئیں، مگر ایسے مسائل اس قسم کی کوششوں سے حل نہیں ہوتے، اسلیے قاضی عدیل احمد صاحب عباسی وکیل بستی نے جو ایک دردمند اور عملی مسلمان ہیں، اسکی جانب اجتماعی قدم اٹھایا ہے، ان مسائل پر غور اور اسکی مشکلات کو حل کرنے کیلئے ۳۰، ۳۱ دسمبر ۶۵ء کو مولانا سید ابوالحسن علی کی صدارت میں بستی میں ایک دینی تعلیمی کنونشن کر رہے ہیں ہم کو توقع ہے کہ اس مسئلہ سے دلچسپی رکھنے والے مسلمان عموماً اور تعلیمی تجربہ اور تعلیمی اداروں سے تعلق رکھنے والے خصوصاً اس کنونشن میں ضرور شریک ہونگے۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

اردو میں یہ بڑی کمی تھی کہ اس میں اسلامیات کی کوئی انسائیکلوپیڈیا نہ تھی، یہ کام اس حیثیت سے تو زیادہ دشوار نہ تھا کہ لاڈن کی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام موجود ہے، ضروری ترمیم و اضافہ کے ساتھ اسی کا ترجمہ کیا جا سکتا تھا، عربی دائرۃ المعارف الاسلامیہ بھی اسی کا ترجمہ ہے، مگر یہ کام بجائے خود آسان نہ تھا، اور پاکستان ہی میں ہو سکتا تھا، چنانچہ کئی سال ہوئے لاہور یونیورسٹی کے زیر اہتمام اس کو شروع کیا گیا تھا اور اس کی بنیاد بھی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام ہی پر ہے، اب اس کے دو اجزاء عمدہ کاغذ اور خوبصورت ٹائپ میں شائع ہو گئے ہیں، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی پہلی جلد کی جو A سے D تک کے حروف پر مشتمل ہے نظر ثانی اور ترمیم ہو رہی ہے۔ اس لیے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ کو الف اور ب چھوڑ کر ت سے شروع کیا گیا ہے، یہ دونوں حروف انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی ترمیم شدہ جلد کی اشاعت کے بعد شائع ہوں گے، اس کے ادارۂ تحریر میں پروفیسر شفیع صاحب جیسے فاضل اہل نظر شامل ہیں، اس لیے یقین ہے کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جو فروگذاشتیں ہیں، ان کی تصحیح اور ضروری ترمیم و اضافے کر دیے جائیں گے، اور اردو دائرہ معارف اسلامیہ ہر حیثیت سے جامع و مکمل ہو گی، اگر یہ کام انجام پا گیا تو لاہور یونیورسٹی کا بڑا کارنامہ ہو گا۔

~~~~~~~~~~~~~~~~

مقالات

فقہ اسلامی کے مآخذ

از جناب مولانا محمد تقی صاحب امینی صدر مدرس دارالعلوم معینیہ اجمیر

(۴)

تخفیف و سہولت کی ایک دوسری صورت فقہی احکام میں تخفیف و سہولت کی ایک صورت یہ ہے کہ احکام و قوانین کے نفاذ میں اصول تدریج سے کام لیا جائے یعنی ابتدا میں ذہن و مزاج کو اسکے لیے تیار کیا جائے اور رفتہ رفتہ اس کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کیجائے، جب صلاحیت پیدا ہو جائے گی تو خود بخود اس کو قبول کرنے کیلئے آمادہ ہو جائے گا۔

دنیا کا کوئی قانون اور کوئی نظام اوپر سے نہیں مسلط کیا جا سکتا، بلکہ وہ اندر سے ابھرتا ہے اور اپنا مقام خود پیدا کرتا ہے، اور اک بارگی اس کے اثرات زندگی میں نہیں نمایاں ہوتے بلکہ ذہنیت کی تبدیلی اور فضا کو سازگار بنانے کے لیے ایک مدت درکار ہوتی ہے، اس بات کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے کہ دنیا کی کوئی قوم و جماعت کسی نئے نظام اور نئے قوانین کا نام سنتے ہی اپنی طبیعت و مزاج کے سانچہ کو یکسر بدلکر اور تمام پرانے بتوں کو توڑ کر خوش آمدید کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی اور حکومت کی جانب سے اعلان ہوتے ہی اس پر عمل ہونے لگے گا۔

۲۳ سال کی مدت میں قرآن مجید کا نزول اور احکام کو قوانین کے نفاذ میں قومی مزاج و طبیعت کا

لحاظ اور تدریج کی رعایت اور ہر موقف کے مناسب حال تخفیف وسہولت کی صورتیں وغیرہ اس امر کی شاہد ہیں کہ کسی حکم کو دل میں اتارنے کے لیے سب سے حکیمانہ طریقہ تدریج ہے۔ اگر ان کو یک بیک مسلط کرنے کی کوشش کیجائے تو ذہنی سانچہ سے مطابقت نہ ہونے کی وجہ سے بڑی دشواریوں اور شفقتوں کا سامنا ہوگا، اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ بہت سی مسلمہ صداقتیں بھی مشکوک نظر آئیں گی۔ اور معیشت و معاشرت کے بعض ایسے مسائل میں بھی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوگی جو قیام و بقا کے لیے ضروری ہیں۔ اور جن کے بغیر کوئی صالح معاشرہ وجود ہی میں نہیں آسکتا،

اس سلسلہ میں قرآن حکیم کے "اصول نسخ" سے بھی مدد مل سکتی ہے۔ جس کی حیثیت فقہاء کی نظر میں "تعبیر وتفسیر" اور" بیان کی ہے۔ یعنی معاشرتی زندگی کے حالات و تقاضا کی مناسبت سے اصل روح اور مقصد کو برقرار رکھتے ہوئے احکام میں توسیع و تخفیف اور تعمیم و تخصیص کی صورت پیدا کی جائے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں:

والثانی ان یکون شیئ مظنة	نسخ کی دوسری قسم یہ ہو کہ کسی مصلحت کی رعایت
مصلحة او مفسدة فیحکم علیه	سے یا مفسدہ کے اندیشہ سے کوئی حکم دیا جائے
حسب ذلک ثم یاتی زمان لایکون	پھر ایسا زمانہ آجائے کہ اس میں یہ مقصود
فیه مظنة بها فیتغیر الحکم[1]	نہ رہ جائے تو وہ حکم بدل جائے گا،

سلف کے زمانہ میں اس سے کافی مدد لی گئی

سلف صالحین کے زمانہ میں اس اصول نسخ سے کافی مدد لی گئی ہے۔ اور فقہاء نے بھی وقتی حالات ومصالح کی بنا پر "قوت نافذہ" کے اتنے وسیع اختیارات مانے ہیں کہ بعض جائز معاملات کو بھی وقتی طور پر وہ ممنوع قرار دے سکتی ہے۔ اور بعض کے نفاذ کو موخر کر سکتی ہے۔ اس ذیل میں بہت سے ایسے وسائل و ذرائع آسکتے ہیں جو معاشرتی حالات کے پیش نظر اختیار کیے گئے تھے، مگر جب وہ حالات باقی نہیں رہ گئے ہیں تو لازمی طور سے ان میں ترمیم وتبدیلی کی ضرورت ہوگی،

---

[1] حجة اللہ البالغہ ص ۲۲،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسب ذیل طرز عمل سے اس اصول پر روشنی پڑتی ہے۔"حطیم" خانہ کعبہ کا ایک حصہ تھا، جو عرصہ سے خانہ کعبہ کی عمارت میں شامل نہ تھا، اس کے باوجود رسول اللہ ؐ نے قومی مزاج کی رعایت کرتے ہوئے کعبہ کی عمارت میں اس کو شامل نہ فرمایا، اور حضرت عائشہ صدیقہؓ سے اس کی یہ وجہ بیان فرمائی :

لولا حداثان قومك بالكفر	اگر قوم کفر سے نکل کر نئی نئی اسلام میں نہ داخل
لنقضت الكعبة وبنيتها على	ہوئی ہوتی تو کعبہ کو توڑ کر" اساس ابراہیم"
اساس ابراهيم	پر اسکو بناتا (اور حطیم کو اس میں شامل کرتا)

دراصل ہر دور میں معاشرتی و تمدنی حالات بدلتے رہتے ہیں اور پھر اسی مناسبت سے احکام دقوانین میں تبدیلی کا سوال اٹھتا ہے، لیکن "جواہر تمدن" اور "جراثیم تمدن" میں فرق کرنا ضروری ہے اور ہدایت الٰہی کی روشنی کے ذریعہ فرق سمجھا جا سکتا ہے، ورنہ "برعکس نام نہند زنگی کا فور" مثل صادق آئے گی اور انسان ترقی اور تمدن کے نام پر نہ معلوم کتنے "جراثیم" کو "جواہر" سمجھ کر ان کو تمدن کا جزء بنالے گا اور تمدن کی خدمت کرنے کے بجائے ان کا دشمن بن جائے گا۔

حرج اٹھایا گیا ہے | (۲) الحرج مرفوع حرج اٹھایا گیا ہے

قرآن حکیم میں اس اصول کی بنیاد حسب ذیل آیات ہیں :

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ (الحج)	اللہ نے تمھارے لیے دین میں تنگی نہیں رکھی ہے
مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَٰكِنْ يُرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ (المائدہ)	اللہ تمھارے اوپر تنگی نہیں چاہتا لیکن ضرور چاہتا ہے کہ تمھیں پاک وصاف رکھے۔

حرج کی تحقیق | ان آیتوں میں دین کے معاملہ میں "حرج" کی نفی کی گئی ہے، حرج کا مفہوم عرب کی ناکسالی

زبان میں یہ منقول ہے۔

الحرجة من الشجر ما ليس له مخرج[1]	وہ گھنی جھاڑی (جس میں الجھے بغیر) نکلنے کا کوئی راستہ نہ ہو۔

حضرت عائشہؓ نے "حرج" کے معنی "ضیق" (تنگی) بیان کیے ہیں[2]۔

فقہ میں ہے:

اصل الحرج الضیق[3]	حرج کی اصل تنگی ہے

ایک مرتبہ حضرت ابوہریرہؓ نے ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے پوچھا کہ دین میں تنگی نہ ہونے کا کیا مطلب ہے، جبکہ ہم اپنی خواہشات و مرغوبات سے روک دیے گئے ہیں، انھوں نے فرمایا تنگی نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ قدیم قوموں کے لیے (ان کے مناسب حال) جو سخت احکام مقرر کیے گئے تھے، ویسے سخت احکام اس امت کے لیے نہیں مقرر ہوئے[4]،

ایک اور موقع پر حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ "دراصل یہ اسلام کی وسعت کا بیان ہے کہ احکام و قوانین کی دشواری و تنگی کی تلافی و تدارک کے لیے مختلف صورتیں اور مختلف طریقے مقرر ہیں،

انما ذلك سعة الاسلام ما جعل	یہ اسلام کی اس وسعت کا بیان ہے جو اللہ نے
الله من التوبة والكفارات[5]	توبہ اور کفارہ کی شکل میں تدارک کی صورتیں مقرر کی ہیں،

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ان توضیحات سے دو باتیں ظاہر ہوتی ہیں،

(۱) دین میں سخت قسم کے احکام (تنگی والے) نہیں ہیں (۲) انسانی کمزوری اور سماجی خرابی کی وجہ سے اگر بعض احکام سخت ہیں تو ان کے سدھار کی مختلف صورتیں ہیں،

حضرت عکرمہؓ نے حرج کی نفی سے اسلام کی وسعت مراد لی ہے	حضرت عکرمہؓ (جلیل القدر تابعی) نے اسلام کی وسعت اور حرج کی نفی سے احکام و قوانین میں وہ لچک مراد لی ہے، جو حالات و مقامات کی مناسبت سے زمان

---

[1] الموافقات ج ۲ ص ۱۵۹، [2] تفسیر کشاف ص ۲۹۲ تفسیر کبیر ص ۱۲۸، حاشیہ تفسیر کبیر ص ۳۸۰ [3] الموافقات ج ۲ ص ۵۹، [4] تفسیر کبیر وغیرہ [5] الموافقات ج ۲ ص ۱۵۹

سختی کو ناگزیر کر لیتی ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں،

ما احل لکم من النساء مثنیٰ و ثلاث و رباع[۱] یعنی اللہ تعالیٰ نے دو دو تین تین اور چار چار عورتوں سے شادی کی اجازت دی ہے،

معاشرتی زندگی میں ازدواجی زندگی کا مسئلہ نہایت اہم اور نازک ہے، اس میں اسلام نے اپنے دستور کے مطابق مقصود کے درجہ میں سب سے زیادہ زور عدل و توازن پر دیا ہے، حالات و مقامات کی مناسبت سے اگر یہ عدل و توازن اپنی حیثیت کے مطابق ایک عورت کے ساتھ شادی کرنے سے پیدا ہوتا ہو، تو اس کی اجازت ہے، اور اگر ایک سے زیادہ کے ساتھ شادی کرنے سے ہوتا ہے تو چار تک کی اجازت ہے،

بالکلیہ شادی نہ کرنے کی اجازت اس بنا پر نہیں ہے کہ یہ حالت انسان کی طبعی و تمدنی زندگی کے موافق نہیں ہے، بالفرض اگر حالات سازگار نہیں ہیں تو ایسی صورت میں انسان حالات کو سازگار بنانے کا مکلف ہے،

یہ وسعت اس لیے نہیں ہے کہ اس کو ہوس رانی کا ذریعہ بنایا جائے یا اس کے ذریعہ معاشرتی زندگی کی ہمواری ختم اور حقوق کی پامالی کی جائے بلکہ اس لیے ہے کہ انسان اپنے فطری حق سے محروم نہ رہے اور اس کے ذریعہ معاشرتی ہمواری پیدا ہو،

اسلام کی نظر میں اصل چیز زندگی میں عدل و توازن اور معاشرہ میں ہمواری ہے، اس کے لیے طریقۂ کار کیا اختیار کیا جائے؟ اس پر اس نے زیادہ زور نہیں دیا ہے، بلکہ انسان کی نفسیاتی اور مزاجی کیفیت کے پیش نظر اونچی اور نیچی حد کی تعیین پر اکتفا کیا گیا ہے،

اس اجازت سے اگر ہر مقام اور ہر حالت میں کام لیا گیا تو زندگی میں عدل و توازن باقی نہ رہے گا، اور اگر ہر حالت اور مقام سے اس کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو یہ حرج (تنگی) کی صورت ہوگی جس کا نتیجہ

---

[۱] الموافقات ج ۲ ص ۱۵۹

جنسی آوارگی کی شکل میں ظاہر ہو کر پورے معاشرہ کو تباہ کر دے گا،

اس قسم کے معاملات میں نہ ترقی پسندی سے مرعوب ہونے کی اور نہ کشمکش سے گھبرا کر زندگی سے گریز اختیار کرنے کی ضرورت ہے، بلکہ اصل چیز حالات و مقامات کا صحیح تجزیہ کرکے موقع و محل کی تعیین اور پھر اسی مناسبت سے مقررہ احکام و قوانین کے "فٹ" کرنے کی ضرورت ہے۔

حالات و مقامات کا صحیح تجزیہ کرنا آسان نہیں ہے، ہر دور کا یہ مشکل ترین کام سمجھا گیا ہے، اس کو سمجھے بغیر فراخی اور تنگی کا فیصلہ بہت دشوار ہے،

انسان کی عملی زندگی میں الٰہی شریعت کا کردار ماہر طبیب کے جیسا ہے

اصل یہ ہے کہ انسان کی عملی زندگی میں شریعت الٰہیہ کی حیثیت ایک ماہر طبیب جیسا ہے جو نبض کی حرکت، مریض کی حرارت و برودت اور مرض و مزاج کی کیفیت و نوعیت دیکھکر دوا و غذا تجویز کرتا ہے، تاکہ دواؤں اور غذاؤں کے ذریعہ طبیعت میں اعتدال و توازن پیدا کرکے اس کی قوت مدافعہ بحال کر دیجائے کہ وہ خود ہی مرض کا استیصال کرتی رہے،

ظاہر ہے کہ مریض اور مرض کی تشخیص و تجویز کا کام کس قدر مشکل ہے؟ اور اس مقصد تک پہنچنے کے لیے کتنے مراحل درکار ہیں؟ اور ہر مرحلہ میں گرمی و سردی اور نرمی سختی کا اندازہ لگا کر دوا اور غذا میں مناسب ترمیم کا معاملہ کتنا اہم ہے؟

فعل الطبيب الرفيق يحمل المريض
على ما فيه صلاحه بحسب حاله
وعادته وقوة مرضه وضعفه
حتى اذا استنقلت صحته هيأ له
طريقا في التدبير وسطا لائقا

الٰہی شریعت کا کردار ایک شفیق طبیب کی طرح ہے جو مریض کی حالت، عادت، مریض کی قوت اور ضعف کے تقاضے کے مطابق مریض کو مرض کی اصلاح پر آمادہ کرتا ہے، یہاں تک کہ جب مریض کی صحت مستقل ہو جاتی ہو تو اس کے لیے

فی جمیع احوالہ[۱]

ایک ایسا معتدل لائحہ عمل تجویز کر دیتا ہے جو اس کی تمام حالتوں کے مناسب ہوتا ہے۔

احکام و قوانین کے جامع سسٹم تک پہنچنے کیلئے مختلف مراحل درکار ہیں

اس میں شک نہیں کہ جس طرح اطبا کے یہاں دواؤں اور غذاؤں کا "پورا کورس" موجود ہوتا ہے، اسی طرح احکام و قوانین کا ایک جامع سسٹم ہے لیکن اس کو برمحل منطبق کرنے کے لیے حالات و تقاضے کو سمجھنا اور مختلف طریقے اختیار کرکے معاشرہ کو کورس کی تکمیل کے قابل بنانا نازک ترین کام ہے۔ ختم نبوت اور تکمیل ہدایت کا یہ مطلب ہے کہ معاشرہ کو مختلف مراحل سے گذار کر ایک معیاری معاشرہ کی تشکیل کے لیے ایک مکمل کورس اور ایک "جامع سسٹم" عطا کر دیا گیا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ انسان اس معاشرہ کے تمام درمیانی مراحل چھوڑ کر چھلانگ لگا کر "جامع سسٹم" کی بلند چوٹی پر پہنچنے کی کوشش کرے۔

اصل چیز زندگی میں عدل و توازن ہے اس کے لیے مختلف مراحل کا ثبوت

ذیل میں بعض وہ آیتیں اور حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جن سے بتدریج اور مختلف طریقوں سے زندگی میں عدل و توازن کی کیفیت پیدا کرنے کا ثبوت ملتا ہے۔

ابتداءً میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کی بہت سی آیتوں میں مختلف انداز سے ان کا منافی تصرفات کی طرف توجہ دلائی جن پر دنیوی زندگی کا قیام و بقا موقوف ہے، اور جب دنیا کی طرف رغبت اور توجہ میں بے اعتدالی ظاہر ہونے کا اندیشہ ہونے لگا تو مختلف انداز سے دنیا کی بے وقعتی اور بے ثباتی کا بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ (انعام)

دنیا کی زندگانی تو کچھ نہیں ہے محض لہو و لعب ہے اور متقیوں کے لیے یقیناً آخرت ہی کا گھر بہتر ہے۔ افسوس کہ تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

---

[۱] الموافقات ج ۲ ص ۱۴۳

وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ	یہ دنیوی زندگی محض لہو و لعب ہے، اصلی
وَّلَعِبٌ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ	زندگی واقعی دار آخرت ہے، کاش کہ
الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (عنکبوت)	لوگ جانتے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ان مما اخاف عليكم ما يفتح لكم	مجھے زیادہ اندیشہ اس حالت سے ہے جبکہ دنیا کی فتوحات
من زهرات الدنيا وزينتها [1]	اسکی زیب و زینت اور تر و تازگی تمھیں حاصل ہوگی،

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا:

فو الله لا الفقر اخشى عليكم	واللہ مجھے تمھارے فقر و افلاس سے اندیشہ نہیں ہے
ولكن اخشى عليكم ان تبسط	بلکہ اس بات کا زیادہ اندیشہ ہے کہ جب تم کو بھی
عليكم الدنيا كما بسطت	ویسی ہی دنیا کی فراغت و وسعت حاصل ہوگی
على من كان قبلكم فتنافسوها	جیسی کہ تمھارے اگلوں کو حاصل تھی کہ تم بھی اس میں
كما تنافسوها وتهلككم	اسی طرح مبتلا ہو جاؤ گے جس طرح وہ لوگ مبتلا ہو گئے،
كما اهلكتهم [2]	پھر وہ تم کو اسی طرح ہلاک کر دیگی جس طرح انکو ہلاک کیا ہے۔

مگر جب معاشرہ کی تشکیل اس منزل پر پہنچ گئی کہ بے اعتدالی کا زیادہ اندیشہ نہ رہ گیا تو فرمایا:

قل من حرم زينة الله التي	آپ کہہ دیجئے کہ اللہ کی زینتیں جو اس نے اپنے
اخرج لعباده والطيبات من	بندوں کے برتنے کے لیے پیدا کی ہیں اور کھانے
الرزق (الاعراف)	پینے کی اچھی چیزیں کس نے حرام کی ہیں۔

دوسری جگہ پیغمبروں کے ضمن میں قوم کو حکم دیا گیا ہے:

يا ايها الرسل كلوا من الطيبات	اے پیغمبرو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور عمل صالح

---

[1] بخاری و مسلم [2] ایضاً

واعملوا صالحا انی بما تعملون علیم (المومنون)

کرو جو عمل تم کرتے ہو وہ مجھ سے پوشیدہ نہیں ہیں،

البتہ اس میں اعتدال قائم رکھنے کے لیے مختلف قسم کی پابندیاں لگا کر غذاؤں، دواؤں (ماموارت) اور پرہیزوں (منہیات) کا ایک مکمل کورس بنا دیا گیا، جس پر عمل سے پھر کسی نقصان کا اندیشہ باقی نہیں رہتا،

ان کے علاوہ کتاب وسنت میں بہت سی آیتیں و حدیثیں ہیں جو زندگی کے مختلف مراحل کا پتہ دیتی ہیں اور ان کے مفہوم میں ظاہری فرق محض زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے ہے مثلاً ایک جگہ ہے:

اِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْہُ یُحَاسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ (البقرہ)

جو کچھ تمھارے دل کے اندر ہے خواہ تم اسے ظاہر کرو یا پوشیدہ رکھو، ہر حال میں اللہ اسکا جاننے والا ہے اور وہ تم سے اسکا ضرور حساب لے گا (تم اپنے اندر کا گناہ دنیا کی نظروں سے چھپا سکتے ہو، لیکن اللہ کے محاسبہ سے نہیں بچ سکتے۔)

اس کے بعد ہے:

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا لَہَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْہَا مَا اکْتَسَبَتْ (البقرہ)

اللہ کسی شخص پر اسکی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہے جس نے اچھے کام کیے اس کا نفع اسی کیلئے ہے اور جس نے برے کام کیے اس کا وبال بھی اسی پر ہے۔

ایک اور جگہ اسی سلسلہ میں ہے:

قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا

میرے ان بندوں سے آپ کہہ دیجئے جنھوں نے

عَلٰۤى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ	(اور گناہ جرم کر کے) اپنے اوپر زیادتی کی ہو کر
اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا	وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، یقیناً اللہ سارے
اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر)	گناہوں کو بخش دیگا وہ بڑا غفور رحیم ہے۔

یا مثلاً جب یہ آیت نازل ہوئی:

وَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ	اور یاد رکھو کہ تمھارا مال اور تمھاری اولاد
فِتْنَةٌ (الانفال)	(تمھارے لیے) فتنہ (ایک آزمایش) ہے۔

تو لوگوں کو آل اولاد اور ازدواجی زندگی سے بے رغبتی ہونے لگی اور بعض نے تو رسول اللہؐ سے مجرد رہنے اور دنیوی علایق سے کنارہ کشی اختیار کر کے ترک دنیا کی اجازت چاہی لیکن آپؐ نے دنیوی علایق کی طرف رغبت دلاتے ہوئے معتدل زندگی ہی کو صحت مند زندگی قرار دیا، اور اس پر ثابت قدم رہنے کی تاکید فرمائی،

لکنی اصوم وافطر واصلی وارقد	مجھے دیکھو میں روزہ (نوافل) رکھتا بھی ہوں
واتزوج النساء فمن رغب	اور نہیں بھی رکھتا، نماز پڑھتا ہوں اور سوتا بھی
عن سنتی فلیس منی[1]	ہوں، اور عورتوں سے شادی کرتا ہوں جس شخص
	نے میرے اس (معتدل) طریقہ سے روگردانی
	کی یاد رکھو وہ میرے گروہ سے نہ ہوگا۔

یہ دراصل رسول اللہؐ نے ان تین اشخاص کے جواب میں فرمایا تھا جن میں سے ایک نے دائمی روزہ رکھنے، دوسرے نے دائمی شب بیداری کرنے اور تیسرے نے ہمیشہ مجرد رہنے کا عہد کیا تھا، اس سے اسلامی زندگی کے اعتدال و توازن کا پتہ چلتا ہے،

اجتماعی کے علاوہ انفرادی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کی صورتیں | یہ تدبیریں تو اجتماعی اور معاشرتی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے تھیں، اسی طرح انسان کی انفرادی زندگی میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے

[1] بخاری و مسلم و نسائی

بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختلف طریقے اور مختلف تدبیریں اختیار فرماتے تھے، آپ کے پاس مختلف قسم کے لوگ آتے اور افضل اعمال (سب سے زیادہ فضیلت کا کام) کے بارے میں سوال کرتے تھے، یا بغیر سوال کے بعض اعمال کی طرف آپ لوگوں کو توجہ دلاتے تھے، جو حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی، مثلاً کسی سے آپ نے نماز کو افضل اعمال فرمایا اور کسی سے والدین کی خدمت کو اور کسی سے جہاد کو، ان کے علاوہ بھی بہت سے اعمال کو آپ نے افضل قرار دیا ہے، اور یہ تفاوت اشخاص کے حالات اور ان کی نفسی کیفیت کی بنا پر ہوتا تھا، آپ لوگوں کی حالت سمجھکر یہ اندازہ لگا لیتے تھے کہ اس شخص کی زندگی میں بے اعتدالی کن راہوں سے آسکتی ہے، اور احکام و قوانین میں کس کو مقدم و موخر کرنے سے یہ بے اعتدالی دور ہو سکتی ہے، یہ قدرتی بات ہے کہ ہر شخص کی عملی زندگی مختلف ہوتی ہے، کسی شخص کا کوئی پہلو کمزور ہوتا ہے کسی کا کوئی، اس لیے جو پہلو کمزور ہوگا اسی کی اصلاح پر زیادہ زور دیا جائے گا، اس لیے ہر شخص کے افضل اعمال یکساں نہیں ہو سکتے، مثلاً ایک مالدار شخص کے لیے مال و دولت خرچ کر دینا آسان ہے لیکن جسمانی مشقت زیادہ مشکل، ایسے شخص کے لیے وہ اعمال زیادہ فضیلت والے ہوں گے، جن کا تعلق جسمانی مشقت سے ہے، یا جو شخص جسمانی مشقت کا عادی ہے لیکن مال و دولت کا زیادہ حریص ہے، اس کو مال و دولت کے خرچ پر زور دیا جائے گا اور وہی اس کے لیے افضل قرار پائے گا، اس طرح دوسرے احکام و اعمال کے موقع و محل کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے،

فقہا لکھتے ہیں:

فقہا کے بیانات سے اسکی تائید و تصدیق

وهكذا نجد الشريعة ابدا في مواردها و مصادرها[1]	اسی طرح تم شریعت کو ہر مقام اور محل کی مناسبت سے ان خصوصیات کا حامل پاؤگے۔

پھر آگے کہتے ہیں:

وعلى نحو من هذا الترتيب يجري	ایک ماہر طبیب غذاؤں کے بارے میں سوالات کے

---

[1] الموافقات ج ۲ ص ۱۶۷

الطبيب الماهر ابتداءً على ما يقتضيه الاعتدال في توافق مزاج المغتذي مع مزاج الغذاء ويخبر من سأله عن بعض المأكولات التي يجهلها المغتذي أهو غذاء أم سم أم غير ذلك فاذا اصابته علة بانحراف بعض الاخلاط قابله في معالجته على مقتضى انحرافه في الجانب الآخر ليرجع الى الاعتدال وهو المزاج الاصلي والصحة المطلوب[1]

جواب میں ایسی ہی ترتیب پر عمل کرتا ہے جب وہ کسی شخص کے مزاج اور غذا کے مزاج میں اعتدال وہم آہنگی پیدا کرنا چاہتا ہو، جب وہ دیکھتا ہے کہ کسی شے کے استعمال سے بعض اخلاط مضمحل ہو جاتے ہیں اور ان سے مطلوب نتیجہ حاصل ہونے میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے یا دیر لگتی ہے تو فوراً دوسری جانب کی رعایت سے اس کا "توڑ" کرتا ہے، اور تقدیم وتاخیر نیز کمی بیشی کے مختلف طریقوں کے ذریعہ اعتدال وہم آہنگی کو واپس لاتا ہو، یہ اعتدال ہی انسان کا مزاج اصلی ہو اور یہی مطلوب صحت ہو جس کے لیے مختلف مدارج سے گذرنا پڑتا ہے،

مذکورہ نکتہ سمجھ لینے کے بعد بڑی حد تک فقہی احکام و قوانین میں "حرج" کی گتھی سلجھ سکتی ہے اور معاشرت و تمدن کے نئے پیدا شدہ مسائل کے حل میں جن کے بارے میں تبدیلی اور ترمیم کا سوال اٹھتا رہتا ہو اس سے بڑی مدد ملتی ہے،

حرج کی حدیں وہ مسائل جن میں واقعی "حرج" کی صورت پیدا ہوتی ہو اور "الحرج مرفوع" کے اصول کو عمل میں لانے کی ضرورت ہو، ان کے بارہ میں حسب ذیل حدبندیاں اور پابندیاں ہیں:

"حرج" کی حدبندی کرتے ہوئے فقہاء کہتے ہیں:

اصل الحرج الضيق فما كان من

حرج کی اصل تنگی ہے اس لیے جو مشقتیں عادةً

---

[1] الموافقات ج ۲ ص ۱۶۷

معتادات المشقات فی الاعمال — روزانہ کے کام کاج میں ہوتی ہیں، وہ حرج

المعتاد مثلها فلیس بحرج لغة — میں نہ داخل ہوں گی، نہ لغوی اعتبار سے

ولا شرعاً[1] — اور نہ شرعی اعتبار سے۔

اس کی مزید تشریح یہ ہے

کیف وھذا النوع من الحرج — ایسا (یعنی مطلقاً حرج سے گلوخلاصی) کیسے ہو سکتی

وضع لحکمة شرعیة وھی التمحیص — ہے جبکہ کسی نہ کسی درجہ میں "حرج" کا ہونا تو شرعی

والاختیار حتی یظھر فی الشاھد — حکمت میں داخل ہو یعنی احکام و قوانین کے ذریعہ

ما علمه الله فی الغائب[2] — انسان کی آزمایش ہو، مختلف کسوٹیوں پر

اس کو کسا جائے تاکہ اسکی اندرونی چیزیں ابھر کر

یہ ابتلاء وآزمایش ترک و اختیار دونوں سے متعلق احکام میں ہوتی ہے،

والابتلاء یتعلق بالمشروع — ابتلاء وآزمایش کا تعلق ماموراتِ و منہیات

وغیر المشروع فعلاً وترکا[3] — دونوں قسم کے احکام سے ہے۔

حرج و تنگی کی ایک صورت تو دنیوی معاملات و کاروبار میں ہے، دوسری صورت دینی و ملی معاملات میں۔ مثلاً اگر کسی حکم و قانون پر عمل درآمد سے اس سے زیادہ اہم بات میں تنگی و دشواری پیدا ہوتی ہے (واجب کا ترک لازم آتا ہو یا حرام فعل کے مرتکب ہونے کی نوبت ہو) تو شرعی اعتبار سے اس قسم کی مشقت کا ازالہ ضروری ہوگا اور جب کسی اصول دین کی پامالی کا اندیشہ ہوگا تو دنیوی حرج ہی اس کو فوقیت حاصل ہوگی۔

ان اصول الدین تقدم علی — اصول دین (کی حفاظت) تو انسانی جان

اعتبار النفس والاعضاء — اور جوارح پر مقدم ہے، البتہ جو احکام

---

[1] الموافقات ج ۲ ص ۱۰۹ [2] ایضاً [3] کید الی ص ا

اما غیر اصول الدین فانت تعلم ان الامر فیھا غیر ذلک[1] | اصول دین سے نہیں، اس کا حکم دوسرا ہے،

حرج کے پہچان کی ایک تدبیر فقہاء نے ایسی حرج اور مشقت کی پہچان کے لیے جن کے سمجھنے میں عام نظریں دھوکا کھاتی ہیں، بعض اصول بنائے ہیں جو یہ ہیں: کام میں جو مشقت اور تنگی ہوتی ہے، اس کے تین درجے کیے جائیں، اعلیٰ، ادنیٰ اور اوسط۔ اعلیٰ یہ کہ اگر اس مشقت سے کچھ ہی زیادہ اور ہو تو وہ غیر عادت والی مشقت بن جائے، ادنیٰ یہ کہ اگر اس میں کچھ تھوڑی بھی کمی ہو جائے تو وہ نفس مشقت ہی کے زمرہ سے خارج ہو جائے، اور اوسط یہ کہ ان دونوں کے درمیانی ہو۔

ظاہر نظر میں اعلیٰ مشقت غیر عادت والی کے زمرہ میں آسکتی ہے، کیونکہ دونوں میں فاصلہ بہت کم باقی رہتا ہے، اس کے باوجود فقہاء اس کو معتاد (عادت والی) ہی میں شمار کرتے ہیں، اور رخصت و سہولت کی اجازت نہیں دیتے۔

بتدریج منزل تک پہنچنے میں تنسیخ کی ضرورت نہیں ہوتی شریعت کا مقصد یہ ہے کہ احکام و قوانین کی پابندی کے ذریعہ انسان منافع کا حصول اور مضرت کا دفعیہ کرتا ہے، اگر اس مقصد کے حصول میں خارجی سبب سے رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور انسان کے فعل کو اس میں دخل نہیں ہوتا ہے تو اصولاً صحیح طریقہ یہ ہے کہ خارجی رکاوٹوں کو دور کرکے معاشرہ کو اس قابل بنایا جائے کہ انسان آزادی اور فراخ دلی کیساتھ اپنا منافع حاصل کرتا اور مضرت دفع کرتا رہے نہ یہ کہ احکام و قوانین ہی میں تبدیلی کر دیجائے، البتہ اگر کسی حکم پر عمل کرنے سے حرج اور ضرر عام ہو اور ملک و ملت کے نقصان میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہو تو اسوقت تک کے لیے حکم کے نفاذ کو مؤخر کیا جاسکتا ہے حکم کی تحدید اور تعمیم و تخصیص کی صورتیں نکالی جاسکتی ہیں، جب تک کہ معاشرہ اس قابل نہ ہو جائے کہ کامل حکم کو برداشت کرکے اسکے ذریعہ منافع کا حصول اور مضرت کا دفعیہ مکمل طریقہ پر نہ کر سکے، موقع و محل کے لحاظ سے اس طریقہ کو اختیار کرنے میں نہ تنسیخ کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کی ضرورت ہی ہوتی ہے، بلکہ اس کی حیثیت بتدریج کسی منزل تک پہنچنے کے لیے مناسب حال پروگرام اور لائحہ عمل

[1] حاشیہ الموافقات ج ۲ ص ۱۵۳

ہو جاتی ہے ،

اس کی تائید درج ذیل تصریحات سے ہوتی ہے ،

قرآن حکیم میں یہودیوں کے حالات کے ضمن میں مذکور ہے :

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا	یہودیوں کے ظلم کی وجہ سے ہم نے کئی ایک اچھی چیزیں ان پر حرام کر دیں جو (پہلے) ان کے لیے حلال تھیں، اور نیز اس وجہ سے کہ وہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے بہت روکنے لگے تھے ،

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عارضی طور پر قوم کو ان مباح اور جائز باتوں سے بھی روکا جا سکتا ہے ، جو غلط استعمال کی وجہ سے وہ برائیوں کا ذریعہ بنگئی ہوں ،

خانہ کعبہ میں حطیم والی روایت اوپر گذر چکی ہے ۔ اس سے محدثین نے حسب ذیل مسائل مستنبط کیے ہیں ،

(۱) بڑی چیز کی خاطر چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے ،

(۲) تالیف قلب کا حتی الامکان خیال رکھنا چاہیے ۔

(۳) کسی ایسی چیز سے تعرض نہ کرنا چاہیے جو زیادہ اہم نہ ہو اور قولی رغبت کی بنا پر روک دینے کی وجہ سے نفرت پیدا ہونے کا اندیشہ ہو ،

مختلف پیغمبروں کے لائے ہوئے احکام و قوانین میں تفاوت کی بڑی وجہ یہی معاشرتی حالت کا اختلاف اور بتدریج انسانی مزاج اور طبیعت کو اس قابل بنانا تھا کہ اعتدال کے ساتھ وہ منافع حاصل کرے اور مضرت دفع کرنے کے قابل بن سکے ۔

نقصان دور کیا جائے اب اس کے متعلق چند اور فقہی قاعدے بیان کیے جاتے ہیں جن سے نقصان و خلل کی حد بندی ہوتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس اصول کو کس موقع پر کس طرح اور کس حد تک استعمال کیا جا سکتا ہے ،

نقصان دور کیا جائے | (۳) الضرر یزال — نقصان دور کیا جائے ۔

اس اصول کی بنیاد قرآن وسنت کی وہی تصریحات ہیں جو اوپر ذکر ہو چکی ہیں ۔ ان کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر اسلامی احکام وقوانین کا مزاج بیان کرتے ہوئے تقریباً اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے ۔

لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام[1] — اسلام میں نہ خود نقصان اٹھانا ہے اور نہ دوسرے کو نقصان پہنچانا ہے

قرآن وسنت سے اسکی تائید | شریعت کا منشاء ہے کہ منافع کا حصول اور مضرت کا دفعیہ ہو ۔ اس کو بروئے کار لانے میں جو رکاوٹیں درپیش ہوں ان کا ازالہ بھی شریعت کے منشاء میں داخل سمجھا جائے گا ۔ قرآن حکیم کی اس آیت سے اس پر روشنی پڑتی ہے

وَاعْلَمُوْا اَنَّ فِیْکُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ لو یطیعکم فی کثیرٍ من الامر لعنتم ولکن اللہ حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان (حجرات) — اور جان لو کہ تم میں اللہ کا رسول موجود ہے ، بہت سی باتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ ان میں تمھارا کہنا مان لے تو تم مشکل اور دشواری میں پڑ جاؤ ، لیکن اللہ نے تمھارے لیے ایمان کو مرغوب بنایا اور تمھارے دلوں میں اس کو مزین کیا ، نیز کفر ، نافرمانی اور گناہ کو اس نے تمھارے لیے ناپسند کیا ۔

فقہاء اس آیت کے ذکر کے بعد کہتے ہیں :

فقد اخبرت الآیۃ ان اللہ حبب الینا الایمان بتیسیرہ و تسھیلہ وزینہ فی قلوبنا بذلک[2] — اس آیت سے پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آسانی اور سہولت کے ساتھ ہمارے لیے ایمان کو مرغوب بنایا ہے اور اسی حیثیت سے ہمارے دلوں میں اسکو مزین کیا ۔

---

[1] موطا و دار قطنی [2] الموافقات ج ۲ ص ۱۳۶

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

علیکم من الاعمال ما تطیقون	تم وہی اعمال کرو جن کے کرنے کی طاقت رکھتے ہو،
فان اللہ لا یمل حتی تملوا[1]	اللہ نہیں تھکے گا بلکہ تم خود ہی (کرنے سے) تھک جاؤ گے،

عمومی حیثیت سے رسول اللہ کا احکام و قوانین کے بارے میں یہ طرز عمل رہا ہے،

وما خیر علیہ الصلوٰۃ والسلام	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جن دو امروں کے
بین امرین الا اختار ایسرھما لم	بارے میں اختیار دیا جاتا تو ان میں جو زیادہ آسان
یکن اثما[2]	ہوتا اسکو آپ اختیار فرماتے جبتک اس میں گناہ نہ ہوتا

اس سلسلہ کی اور بہت سی روایتیں ذکر کرنے کے بعد فقہاء کہتے ہیں،

من السامۃ والملل والعجز و	(ان روایتوں میں) تھکاوٹ، تکان، عجز طاعت
تنفض الطاعۃ وکراھیتھا[3]	میں اگراں و ناپسندیدگی کا سبب بننے والی تمام
	حالتیں اور صورتیں داخل ہیں،

اس اصول پر عمل درآمد کی چند مثالیں	فقہاء نے اس اصول سے بہت سے مسائل کا استنباط کیا ہے اور مقررہ قاعدہ و ضابطہ کے مطابق خلل اور نقصان کو دفع کیا ہے، مثلاً

خرید و فروخت کا معاملہ ہونے کے بعد عیب نکلنے کی وجہ سے معاملہ کے فسخ کا اختیار، اسی طرح دوسرے خیار رویت (دیکھنے کے بعد پر معاملہ کی موقوفی) خیار شرط (شرط پر معاملہ کا معلق ہونا) اور تمام وہ صورتیں اور حالتیں جن میں تصرفات سے روک دیا جاتا ہے، سب اسی پر مبنی ہیں، اور خلل اور نقصان کے اندیشہ ہی سے مذکورہ معاملات میں وسعت اور سہولت سے کام لیا گیا ہے، شفعہ اور کراہیت کے ابواب، قصاص، حدود، کفارہ اور تلف کر دینے کی صورت میں ضمان

---

[1] نسائی وغیرہ [2] ترمذی [3] الموافقات ج ۲ ص ۱۳۶

کے احکام اور تقسیم کے معاملہ میں دونوں فریق کی رعایت وغیرہ سے متعلق قوانین حتیٰ کہ حاکم اور قاضی کے تقرر تک کے معاملہ کو فقہاء نے اس اصول کے ذیل میں شمار کیا ہے، اور جزئیات و فروع کے بیان میں زیادہ سے زیادہ اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ نہ کوئی شخص کسی کو نقصان پہنچا سکے، اور نہ خود نقصان اٹھائے،

فقہاء نے اس طریقہ سے دراصل شریعت کو اس حدیث کے مطابق بنایا ہے،

ان هذا الدين متين فاوغلوا فيه برفق ولا تبغضوا الى انفسكم عبادة الله (بیہقی)	یہ دین نہایت مضبوط ہے اس میں نرمی سے ہاتھ ڈالو، اور اللہ کی عبادت (قوانین کی تعمیل) کو اپنے لیے مبغوض و ناپسند نہ بناؤ،

(باقی)

شیخ الاسلام قطب عالم حضرت مخدوم شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری بہاری

اور

علم و ادب

از مولانا سید عبد الرؤف صاحب اورنگ آبادی

حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری کی ذات قدسی صفات جامع کمالات اور شریعت وطریقت و رشاد و ہدایت کی سرچشمہ تھی، اور آپ دینی و روحانی کمالات کے ساتھ شعر و ادب کا بھی نہایت بلند اور پاکیزہ ذوق رکھتے تھے، آپکے عرفانی پہلو پر بہت لکھا گیا ہے مگر ادبی پہلو پر کسی نے توجہ نہیں کی، اس مضمون میں آپ کے ایسے مکاتیب پیش کیے جائیں گے جن میں سلوک و تصوف کے حقایق کے ساتھ شعر و ادب کی بھی چاشنی ہے۔

حضرت شیخ اور ان کے مکاتیب کا درجہ مورخین اور تذکرہ نگاروں کی نظر میں

اصل موضوع سے پہلے حضرت شیخ اور ان کے مکاتیب کے متعلق ہندوستان کے مورخین و تذکرہ نگاروں کی رائیں نقل کی جاتی ہیں، علامہ ابوالفضل آئین اکبری میں لکھتے ہیں کہ مخدوم یحییٰ بن اسرائیل کے صاحبزادہ شیخ شرف الدین منیری ایک بلند پایہ صوفی تھے اور حضرت گنج شکر سے کسب فیض کیا تھا، ابتدا کہساروں اور بیابانوں میں ریاضت کی، پھر اپنے برادر بزرگ شیخ خلیل الدین محمد کے ہمراہ شیخ نظام الدین اولیاء کی زیارت کے لیے دہلی پہنچے، مگر اس وقت شیخ موصوف وفات پاچکے تھے، اور بعض بیانات کے مطابق انھوں نے شیخ کی زیارت کی اور ان کی ہدایت سے حضرت نجیب الدین فردوسی کے حضور میں پہنچے اور ارادت و خلافت سے سرفراز ہوئے، مخدوم کے مشہور خلفاء میں شیخ شمس الدین مظفر بلخی اور شیخ جمال الدین اودہی ہیں جنھیں جمال قتال بھی کہا جاتا ہے، حضرت مخدوم نے بہت سی تصنیفات یادگار چھوڑیں، مکتوبات شیخ نفس کشی کے لیے

ازبس مفید ہیں، آپ کی خواب گاہ بہار خاص ہے[1]،

علامہ مذکور کا یہ لکھنا کہ سر آمد چشتیاں بود او رمزار گنج شکر فیض برگرفت" غیر مستند ہے۔

صاحب طبقات اکبری لکھتے ہیں: سکندر لودی شیخ شرف الدین منیری قدس سرہٗ کے مزار کی زیارت کے لیے ۱۸ شوال ۹۰۱ھ کو بہار پہنچا اور فقراء و مساکین کو داد و دہش سے خوش کرکے دہلی پور آیا[2]۔

صاحب منتخب التواریخ ملا عبد القادر بدایونی کا بیان ہے: سلطان سکندر لودی ۹۰۱ھ میں قطب المشائخ شیخ شرف الدین منیری قدس سرہٗ کی زیارت کو ترہت سے روانہ ہوا، اور درویش پور واپس آیا[3]۔

صاحب فرشتہ ملا محمد قاسم تحریر کرتے ہیں شیخ شرف الدین منیری اور ان کے بیرادر بزرگ شیخ خلیل الدین شیخ نظام الدین اولیاء سے حصول ارادت کی نیت سے دہلی پہنچے، اور آپ کی خدمت میں حاضر ہوکر مرید ہونے کی درخواست کی، شیخ نے فرمایا کہ تمھارا حصہ خانوادۂ فردوسیہ میں ہے، اس ارشاد کی تعمیل میں دونوں بھائی شیخ نجیب الدین فردوسی کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ کے مرید ہوئے اور شیخ شرف الدین احمد سند و خرقۂ خلافت سے سرفراز ہوکر بہار آئے اور یہیں اقامت گزیں ہوئے۔ ان کی تصانیف میں ایک کتاب معدن المعانی ہے[4]۔

صاحب فرشتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ بابر قصبہ منیر پہنچا تو شیخ شرف الدین منیری کے والد بزرگوار شیخ یحییٰ کے مزار پاک کی زیارت کی اور خیر و خیرات کرکے آگرہ واپس گیا۔

صاحب شاہ عالم نامہ غلام علی خاں کا بیان ہے: شاہ عالم بادشاہ جب بہار پہنچا تو اس سے کہا گیا کہ اس علاقہ میں زبدۃ الاصفیاء، قدوۃ الاولیاء، شاہ شرف الدین قدس سرہ العزیز

۱؎ آئینۂ اکبری جلد اول فارسی ص ۲۲۹ ۲؎ طبقات اکبری فارسی ص ۳۲۰ ۳؎ منتخب التواریخ فارسی ص ۱۶۰
۴؎ فرشتہ فارسی جلد اول ص ۴۱۱ ۵؎ شاہ عالم نامہ فارسی ص ۱۱۶ - ۱۱۷

کا مزار فائض الانوار واقع ہے، یہ سنکر بادشاہ درگاہ کی زیارت کو روانہ ہوا، جس وقت اس کی سواری بہار پہنچی اور راستہ سے گذر رہی تھی تو شہر کے باشندوں رعایا و برایا، شریف و رذیل ہر ایک نے فرق مبارک پر اس قدر نقرئی پھول یعنی روپیے برسائے کہ مسکینوں اور محتاجوں نے ان سے اپنے دامن کو بھر لیا اور ہر طبقہ نے مسرت و خوشی کا اظہار کیا، جلوس شاہی میں درگاہ تک ہر کہہ ومہ کے سر پر سیم و زر کی بارش ہو رہی تھی، اسی بارش میں بادشاہ کی سواری درگاہ تک پہنچی اور درگاہ کے خدام نے حضور شاہ میں دستار اور حلقہائے کمان تبرکاً پیش کیے،

صاحب آثر عالمگیری محمد ساقی مستعد خاں لکھتا ہے کہ بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے مطالعہ میں حجۃ الاسلام غزالی کی تصانیف شیخ شرف الدین یحییٰ منیری اور شیخ زین الدین قدس سرہما کے منتخب مکتوبات اور اسی طرح کی دوسری کتابیں بالالتزام رہا کرتی تھیں،[1]

صاحب سیر المتاخرین سید غلام حسین طباطبائی الحسینی نے بعینہ آئین اکبری کا بیان نقل کر دیا ہے[2] اور میر جعفر ناظم بنگالہ کے بہار آنے کے تذکرہ میں مخدوم کے مزار پر اس کی حاضری کا ذکر کیا ہے،

تذکرہ نگاروں کا بیان | صاحب مناقب الاصفیا مخدوم شاہ شعیب بن شیخ جلال منیری تحریر فرماتے ہیں:[3]

شیخ جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری طریقت و حقیقت کے مشائخ کبار سے تھے، مجاہدہ و ریاضت میں ان کی شان عجیب تھی، سلوک سے پیشتر آپ پر جذب کا غلبہ تھا جنگلوں، کوہساروں میں

---

[1] آثر عالمگیری فارسی ص ۱۴۳۵ [2] سیر المتاخرین فارسی ص ۱۰۷، [3] مناقب الاصفیا مخطوطہ فارسی" درزمان سلطنت بادشاہ غازی محمد شاہ وصوبہ داری نواب فخر الدین خاں بہادر فخر الدولہ شجاعت جنگ در بلدہ عظیم آباد عرف پٹنہ تاریخ بست ویکم شہر صفر المظفر ۱۱۴۳ھ یکہزار و یکصد و چہل و سہ ہجری حسب فرمودہ شیخ محمد اسد اللہ صاحب نواسہ حضرت مخدوم شیخ شعیب مرقوم بخط احقر العباد مستند نانکچند اتمام یافت"

یہ مخطوطہ سب سے قدیم اور مستند ہے اور خانقاہ فتوحہ کے کتبخانہ کی زینت ہے۔

ریاضت و عبادت میں تیس سال بسر کئے، آپ کا مقصود و مطلوب صرف ذات خدا تعالیٰ تھی، تارک ماسوا اللہ تھے، آپ کی نظر میں دنیا معدوم تھی، آپ کی ہمت عالی کے سامنے آخرت و نعمائے آخرت بھی بے حقیقت شے تھی، دین و دنیا کی منزلت و مرتبت سے بیزار اور خوارق و کرامات سے بڑی تبری فرماتے تھے، احوال حقیقت میں صاحب تمکین تھے، معرفت کے تنا یقین کا مرجع تھے، طریقت کے دقایق اور حقیقت کے اسرار میں آپ کے کلمات لطیف و غامض ہیں، علم تصوف میں ان کی تصانیف بکثرت ہیں، ہندوستان میں علم حقیقت اور توحید خاص کے اسرار آپ ہی سے شروع اور شائع ہوئے۔ امام احمد غزالی، امام محمد غزالی، عین القضات ہمدانی، ابن عربی خواجہ فرید الدین عطار، شیخ عراقی مولانا جلال الدین رومی جیسے اہل حقیقت اور موحدوں کے کلمات آپ ہی نے بیان کیے، آپ سے پہلے ہندوستان میں کوئی شخص ان بزرگوں کے کلام کا مطالعہ نہ کرتا تھا، اور جو کرتا تھا، ان کے منشائے حقیقی کے فہم و ادراک سے قاصر تھا، اس قصور فہم کے سبب اس پر اعتراض کرتا تھا، مشائخ کے ملفوظات میں ان بزرگوں کے عارفانہ کلام کا ذکر بہت کم ملتا ہے، شیخ شرف الدین سے پہلے توحید خاص کے اسرار سننے کی تاب کسی میں نہ تھی، اس کا کہنا تو بہت بڑی بات ہے، الا ماشاء اللہ۔

صاحب اخبار الاخیار مولانا عبد الحق محدث دہلویؒ ارقام فرماتے ہیں:

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ہندوستان کے مشاہیر مشائخ میں ہیں، ان کی منقبت کی چنداں ضرورت نہیں ہے، ان کی تصانیف بلند پایہ ہیں، ان میں مکتوبات مشہور اور لطیف ترین تصنیف ہیں، شیخ موصوف کے مجموعہ مکتوبات مشہورہ کے علاوہ ان کے کچھ اور مکتوبات بھی ہیں جو اپنے مرید اور صاحب سر خلیفہ شیخ مظفر بلخی کو تحریر کیے تھے، کہا جاتا ہے کہ شیخ مظفر بلخی کو راہ سلوک میں جو واقعات و معاملات و حالات پیش آئے تھے، وہ ان کو شیخ کی خدمت میں لکھ بھیجتے تھے، شیخ اس کا

۵؎ اخبار الاخیار فارسی ص ۱۱۶

جواب دیتے تھے، ان ہی مکتوبات میں ہے کہ ہمارے مکتوبات معاملات و مشکلات کے لیے حل تام ہیں مگر یہ اسرار ربوبیت افشا ہونے چاہئیں، ان مکتوبات کو کسی کو نہ دکھایا، ہرچند کہ شیخ مظفر بلخی سے مریدوں نے التجا کی کہ مخدوم کے مکتوبات خاص ہم کو بھی عنایت ہوں کہ ہم لوگ بھی ان سے مستفید ہوں، اور اس کو نقل کرکے یادگار کے طور پر رکھیں، مگر شیخ کی وصیت اور اسرار ربوبیت کے اخفا کے خیال سے آپ نے یہ مکتوبات کبھی کسی کو نہیں دکھائے۔

صاحب خزینۃ الاولیا، غلام سرور خلف مفتی غلام محمد بن مفتی رحیم اللہ قریشی لکھتے ہیں:

شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کا شمار ہندوستان کے اولیا اور مشائخ کبار میں ہے، ریاضت، اخلاص عبادت اور تقویٰ و رشد و ارشاد میں یگانہ و یکتا تھے، اس لیے ان کے مناقب لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کی تصانیف برتر و بلند پایہ ہیں، آپ کے مکتوبات اور ملفوظات جو معدن المعانی کے نام سے موسوم ہیں، اور ارشاد السالکین اور شرح آداب المریدین آپ کی مشہور ترین تصانیف سے ہیں، آپ کو شیخ نجیب الدین فردوسی سے جو شیخ رکن الدین فردوسی کے مریدوں میں تھے، ارادت حاصل تھی، شیخ شرف الدین ابتدا از شیخ المشائخ نظام الدین بداؤنی سے شوق ارادت میں دہلی پہنچے، مگر اس وقت شیخ المشائخ واصل بحق ہو چکے تھے، اور شیخ نجیب الدین فردوسی دہلی میں موجود تھے، چنانچہ ان کی خدمت میں پہنچے، شیخ موصوف آپ کے استقبال کے لیے گھر سے برآمد ہوئے اور فرمایا تمھارا حصہ میرے پاس امانت ہے، اب میں تمھیں وہ امانت سپرد کرتا ہوں، برسوں سے اس دن کا منتظر تھا۔

شیخ شرف الدین نے آپ سے ارادت حاصل کی اور نعمت و دولت روحانی لیکر وطن مالوف کیجانب روانہ ہوئے، اثنائے راہ میں بہار کے جنگلوں میں ٹھہر گئے اور راجگیر کے پہاڑوں پر برسہا برس تک اس طرح ریاضت و عبادت میں مشغول رہے کہ آپ کے مخلص مرید مولانا نظام الدین مغربی کے سوا کسی کو

---

[1] خزینۃ الاولیا، فارسی ص ۲۹۰

آپکے حال کی خبر نہ تھی، آپ کبھی کبھی حضرت مخدوم کی زیارت کے لیے جنگلوں میں جایا کرتے تھے،

مخدوم کا ذوق علم و ادب | حضرت مخدوم کے ادب و انشاء کا کمال مکتوبات، ملفوظات اور شرح آداب المریدین سب میں نمایاں ہے، مکتوبات اور شرح آداب المریدین اگرچہ تصوف اور اسرار تصوف میں ہیں، مگر ان کی نثر میں گلستاں کی نثر جیسی سلاست و لطافت و حلاوت ہے، ان میں دوسرے ادبی محاسن کے علاوہ ایسی برجستگی، روانی اور سلاست ہے، اور موقع موقع سے ایسے برمحل اشعار لائے گئے ہیں جن سے عبارت کا حسن اور دوبالا ہو جاتا ہے، اور اس کی تاثیر بہت بڑھ جاتی ہے اور ان اشعار کا ایک منتخب مجموعہ مرتب ہو سکتا ہے، مکتوبات کے ظاہری و معنوی محاسن پر صاحب اخبار الاخیار لکھتے ہیں، "واز جملہ تصانیف او مکتوبات مشہور تر ولطیف ترین تصانیف است۔" حقیقت ہے کہ مکتوبات صدی اور شرح آداب المریدین ادب و انشاء کا بہترین نمونہ ہیں۔

شرح آداب المریدین کے محاسن متداول نہ ہونے کے باعث عام نظروں سے پوشیدہ ہیں،

مخدوم جہاں کے پیشرو بعض صوفیائے کبار نے بھی مکتوبات کے ذریعہ تصوف و درویشی کی تعلیم دی ہے، مگر مخدوم جہاں کے مکاتیب کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ کا ہر ایک مکتوب بجائے خود تصوف کے ایک مقالہ اور رسالہ کی حیثیت رکھتا ہے، یہ روش خاص آپ ہی کی ایجاد ہے، آپکے بعد جن کسی نے بھی یہ روش اختیار کی وہ آپ ہی کی تقلید ہے،

ذوق شعر و شاعری | شعر و شاعری میں بھی مخدوم جہاں کو دستگاہ کامل تھی، عربی و فارسی اور بھاشا تینوں زبانوں

لہ قاضی عین القضات ہمدانی اور محبوب سبحانی غوث صمدانی رحمہما اللہ تعالیٰ نے بھی مکتوبات تحریر کئے ہیں، فارسی مکتوبات غوث الاعظم رحمہ اللہ تعالیٰ مخطوطہ پیش نظر ہے، مکتوبات کی زمین تو فارسی ہے، مگر آیات قرآن اس کثرت سے مسلسل ہیں کہ عربی ہی مکتوبات معلوم ہوتے ہیں، یہ مخطوطہ حضرت مخدوم منعم پاک جن سے اس صوبہ میں ابو العلائیہ سلسلہ جاری ہوا ان کے پیر طریقت سید جعفر محمد طیب ملقب ابو سعید ابن مبارک پیر جلال حسین کے ملاحظہ سے گذرا ہوا اس نسخہ پر جو مہر و تحریر ہے اس سے یہ حقیقت ظاہر ہے۔ تاریخ کتابت تاریخ ۱۲ ذیقعدہ ۱۰۸۱ھ بدست سید غلام شرف الدین کتبخانہ خانقاہ فتوحہ پٹنہ۔

میں آپ کو پوری مہارت تھی، اگرچہ عام نظروں سے آپ کی شاعرانہ حیثیت پوشیدہ ہے، مگر اس کے داخلی و خارجی شواہد موجود ہیں، آپ کے مکتوبات و ملفوظات میں جو اشعار درج ہیں اگرچہ ان کی نسبت پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ آپ ہی کے ہیں لیکن قرائن اسی کے موید ہیں اور اس کی بعض شہادتیں بھی ملتی ہیں،

چنانچہ شیخ الاسلام والمسلمین حضرت عین الدین عبد الباری المشتہر بہ شاہ رکن الدین[1] احمد بن معین الدین ابن قطب الدین شطاری کے مخطوطہ ملفوظات سے اس کی شہادت ملتی ہے، اس کے جامع و مرتب صاحب منہاج الشطارین سید امام الدین احمد شطاری راجگیری (بہار) اور کاتب عبد الباری المعروف بہ رکن الدین شطاری الیتمی ہیں، اس کا سنہ ترتیب و کتابت ۱۱۰۴ھ ربیع الثانی ہے، مناہج الشطارین کی مجلس سیزدہم روز دوشنبہ غرہ ماہ ربیع الآخر میں سلطان فیروز شاہ کا ذکر اثنائے تناول طعام میں حضرت موصوف نے ان الفاظ میں فرمایا:

چوں سلطان فیروز در بہار آمد برائے دیدن مخدوم شاہ احمد چرم پوش رفت ایشان تعظیم نکردند چوں پیش حضرت مخدوم شاہ شرف الدین احمد قدس سرہٗ رفت، حضرت مخدوم استقبال نمودہ آوردند سلطان فیروز دست مخدوم گرفتہ اشارہ پیش رفتن کرد و حضرت مخدوم بہ تواضع عقب می شدند آخر سلطان فیروز را پیش کردہ روانہ شدند، سلطان فیروز دیں فرد خواند

در بہشتی رودم طریق حاجب   پس بر دم جہنی است واجب

---

[1] شیخ شاہ رکن الدین شطاری بہاری کا سنہ وفات ۱۱۱۰ھ ہے، کسی نے تاریخ وفات "جاں داد و نہ بذکر اللہ اللہ" کہی ہے۔ اور ملفوظات کی ترتیب کا سنہ ۱۱۰۴ھ اس لیے شیخ موصوف کی حیات میں اس کی ترتیب ہوئی تھی اور شیخ کے نظر سے بھی وہ گذر چکی تھی، محب محترم پروفیسر سید حسن عسکری کے کتبخانہ میں موجود ہے۔

حضرت مخدوم منیر ایں فرد خواندند

گر پیش روی چراغ راہی | ور پس بروی جہاں پناہی

جواب فی البدیہ یہ شعر پڑھنا حضرت مخدوم کے ذوق شاعرانہ کی سند ہے۔

حضرت مخدوم کی ایک نادر کتاب اسباب النجاۃ لمعرفۃ العصاۃ[1] ہے، یہ کتاب اوراد اور ملفوظات میں ہے، کتابت کا سنہ ۹۰۹ھ ۲۵ رجب المرجب ہے، اس کی کتابت ایک مقدس بزرگ شاہ حسین نصر اللہ نے اپنے دست خاص سے کی ہے،

اس کتاب کے باب دوم فصل چہارم میں محبت اور اصناف محبت کے سلسلۂ ذکر میں فرماتے ہیں کہ

"در محبت بندہ مرحق را محبت بر دو نوع است محبت عام و محبت خاص، محبت عام از جملہ مقامات است و آں آوردن طاعت است و احتراز نمودن از معاصی و مخالفت چنانکہ گفتہ اند"

تعصی الالٰہ وانت تظہر حبہ[2] | ھذا العمری فی الفعال بدیع

لو کان حبک صادقا لاطعتہ | ان الحبیب لمن یحب المطیع

محبت عام کی تعریف میں ابیات مندرجہ کے استشہاد کے بعد خود اس کا ترجمہ یوں نظم فرمایا ہے:

دعوی دوستی خدا کردہ و انگہے | عاصی شوی ہر اورا ایں نوع منکر ست

گر دوستی بصدق بودے طاعت آمدے | زاں روز کہ دوست گردد طاعت ادست

آداب المریدین کے متن[3] "واجمعوا علی الفقر ان افضل من الغنی اذا کان مقرونا بالرضی"

---

[1] یہ نادر کتاب غیر مطبوعہ ہے اور محترم جناب حکیم شاہ نقی حسن صاحب بلخی سجادہ نشین خانقاہ فتوحہ پٹنہ کے کتبخانہ کی زینت ہے،

[2] کلام مذکور بہت مشہور ہے، ذرا الفاظ کے ردوبدل کے ساتھ درسی و غیر درسی کتابوں میں پایا جاتا ہے اور محمود وراق یا عبد اللہ بن مبارک شافعی کی طرف منسوب ہے [3] آداب المریدین شیخ المشائخ ضیاء الدین نجیب الدین ابو النجیب سہروردی کی تصنیف ہے اور اسکی شرح حضرت مخدوم جہاں نے کی ہے، شرح آداب المریدین کا یہ مخطوط نسخہ قاضی یحییٰ ابن سید غلام شرف الدین کے قلم کا لکھا ہوا ہے، اور سنہ کتابت ۱۱۹۰ھ ہے، یہ نادر نسخہ خانقاہ فتوحہ پٹنہ کے کتبخانہ کی زینت اور مولانا حکیم شاہ نقی بلخی صاحب کی ملکیت ہے،

کی شرح کے سلسلہ میں حضرت انسؓ کی یہ روایت پیش کی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک مجلس میں تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور بشارت دی کہ یا رسول اللہ آپ کی امت کے فقراء اغنیاء سے پانچسو سال پیشتر بہشت میں داخل ہوں گے، اس بشارت سے آپ بہت مسرور ہوئے اور فرمایا کہ تم میں کوئی ایسا ہے جو اس کے مناسبِ حال اشعار پڑھے، ایک بدوی نے کہا: ہاں یا رسول اللہ اور یہ رباعی پڑھی:

لقد لسعت حیة الھوی کبدی فلا طبیب لھا ولا راقی
الا الحبیب الذی شغفت بہ فعندہ رقیتی وتریاقی

یہ سنکر آنحضرتؐ نے تواجد فرمایا

حضرت مخدوم جہاں نے اس کا ترجمہ رباعی ہی میں کمال حسن وخوبی کے ساتھ کیا ہے،

قطعہ رباعی

از مارِ غمت گزیدہ وارم جگرے کو را نکند ہیچ فسونے اثرے
جز دوست کہ من شیفتۂ روئے ویم افسون وعلاجِ من نداند دگرے

خیام میں علامہ مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ سلجوقی عہد کے حکما وصوفیہ کی رباعیات کے سلسلۂ ذکر میں تحریر فرماتے ہیں کہ ذیل کی رباعی کو احمد علی سندیلوی نے مخزن الغرائب (یا مجمع الغرائب) میں جو ۱۲۱۸ھ میں طبع ہوکر شائع ہوچکی ہے، شیخ شرف الدین احمد منیری کے نام سے لکھا ہے،

عودم چو نبود سپید آوردم روئے سیہ و موئے سپید آوردم
تو خود گفتی کہ ناامیدی کفر است فرمان تو بردم امید آوردم

حضرت مخدوم کی جانب اس رباعی کے انتساب کی توثیق خانوادۂ فردوسیہ اور حضرت مخدوم جہاں کے متوسلین کی تحریروں سے بھی ہوتی ہے، جو شرح آداب المریدین مخطوطہ ۱۱۹۰ھ کے صفحۂ اول پر درج ہے، اس میں صاف تحریر ہے

رباعی از حضرت مخدوم جہاں شرف الدین شرف الحق والدین قدس سرہ العزیز

چوں عود نبود چوب آوردم روے سیہ و موے سفید آوردم
چوں خود گفتی کہ ناامیدی کفر است فرمانِ تو کردم امید آوردم

گو ان دونوں رباعیوں کے بعض الفاظ میں معمولی سا فرق ہے، مگر اس قسم کا فرق لائق اعتبار نہیں اور شرح آداب کی رباعی کے الفاظ زیادہ لطیف ہیں،

قیاس غالب ہے کہ سندیلوی کی تحقیق متوسلین حضرت مخدوم کی تحقیق کی رہین منت ہے، ان شہادتوں سے مخدوم جہاں کا مذاق شاعرانہ پوری طرح ثابت ہے، بھاشا کے دوہرے آپ کے مکتوبات و ملفوظات اور آپکے متوسلین کے مکتوبات میں بکثرت ملتے ہیں جو مخدوم جہاں کی جانب منسوب ہیں ان دوہروں کا مجموعہ مولانا عبد الحق نے طبع کرا دیا ہے،

مکتوبات کا تقدس اور مخدوم کا تصوف

عارف رومیؒ کی مثنوی کے بارہ میں کسی ارادت مند نے کہا تھا کہ "ہست قرآن در زبان پہلوی"۔ عارف ہندی کے مکتوبات اور شرح آداب المریدین کی نسبت بھی اگر یہی مصرع دوہرایا جائے تو بالکل بجا اور درست ہوگا، عارف رومی نے کتاب و سنت اور آیات و احادیث سے جس طرح اسرار تصوف بیان کیے ہیں، اسی طرح عارف بہاری نے بھی اسی سرچشمہ سے سلوک و تصوف کی آبیاری کی ہے۔ صاحب مناقب الاصفیا لکھتے ہیں کہ "دربیان دقائق طریقت و اسرار حقیقت و معرفت عالی کلام بود در ہر طورے بیان شانی داشت، در عشق و محبت کلمات لطیفہ و غامض آوردہ۔ اسرار توحید خواص و علم حقیقت در ہند از ظہور یافت"۔ مولانا مظفر شمس بلخی سے بڑھ کر مخدوم کے اسرار تصوف کا محرم کون ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "پیرمن بر دین خدا و بر سنت مصطفیٰ بود و من مذہب پیر خود دارم ع داری سر ما اگر نہ دور از برما"۔ مولانا نے مخدوم کے تصوف کو ایک شعر میں اس طرح ظاہر کیا ہے،

عصمت بہ ذات پاک تن لایزال داشت بے زلّت و زلاقدمش بر صراط بود

صاحب مناقب الاصفیا لکھتے ہیں کہ "او تارک ما سوا اللہ بود دنیا بہ نسبت او معدوم بود وجود داشت، آخرت ونعیم آخرت بجنب ہمت او متروک بود، مقصود جانش خدا سے بود۔"

صاحب اسرار مولانا لکھتے ہیں کہ "درویشی و تصوف بس ہمیں یک حرفست" الانقطاع عما سواے اللہ چوں اللہ می گوئی ما سوا اللہ را آتش زن

نفش از لا احب الآفلین زن چوں ابراہیم بت را بر زمیں زن

حضرت مخدوم کا ارشاد کہ "آرزوئے من آنست کہ نام من نہ دریں جہاں باشد نہ داں جہاں" ترک و تجرید کا انتہائی درجہ ہے، مولانا لکھتے ہیں کہ "ہر کہ مومن است عاشق است و ہر کہ عاشق است مومن است میان عشق و ایمان ملازمہ مساوی ثابت می داں" الایمان والعشق توامان"

ع ہر کرا عشق نیست ایماں نیست

راہ سلوک میں مجاہدات کی غرض و غایت ترک ما سوا ہے۔ اور ترک ما سوا کا ثمرہ عشق ہے، عشق اور عشاق کو کلام اللہ نے نفقرا اور فقرا سے تعبیر کیا ہے، اور ان کی شان رضاے الٰہی کی طلب بیان کی ہے، اور طلب رضا میں وہ عزیز سے عزیز شئے کو قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے، مولانا لکھتے ہیں کہ "مہاجرین و انصار کہ سابق و پیش رو گشتند از چہ گشتند از نماز بسیار یا از روزہ بسیار لا واللہ بلکہ پاکبازی و تاراج گری اگر باور ندار ی آیت بخواں للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم واموالهم يبتغون فضلا من الله ورضوانا

ہر زماں در محو خود پیش آمدند پاکبازانان کہ درویش آمدند

اس راہ میں سب سے بڑی چیز رضوان اللہ ہی ہے، ورضوان من اللہ اکبر"

مخدوم کے تصوف کے دوسرے راز داں مولانا حسین نوشہ توحید بلخی نے مخدوم کے تصوف کو یوں نظم فرمایا ہے

مقتدائے دین من پیر منیری — این سخن بگفت از سروری

کاے برادر گر بخواہی اصل کار — این سخن را در دلِ خود پاش دار

این ریاضت نیست کاے لے بچے بری — کم بگوئی کم بخسپی کم خوری

بچگان طفل وہم بیوہ زناں — این ریاضت می کند از آب وناں

پاسبان دل شواند رکل حال — تا نیابد ہیچ دزد آنجا مجال

ہر خیال غیر حق را دزد خواں — این ریاضت سالکاں را فرض داں

از ہوا و حرص دل را قطع کن — با چنیں رہ اتباع شرع کن

ہر کہ ایں رہ می رود دل شاد باش — دیں نعم از بہر او آمادہ باش

ہر چہ آں فضیلت دہد قربت دہد — واز خیال غیر حق فرقت دہد

این ریاضت باشدلے عالی مقام — گوش کن تفسیر آنرا در کلام[1]

مکتوبات مخدوم اور صوفیاے کرام صاحب مناقب الاصفیا ناقل ہیں کہ شیخ اعز کاکوئی اور شیخ احمد بہاری دلی پہنچے اور خلاف شرع چند کلمات زبان پر لائے۔ فیروز شاہ نے باشندگان دہلی کی شکایت اور علمائے دہلی کے فتوی پر ان بزرگوں کے قتل کا حکم دیدیا، مخدوم جہاں کو جب یہ خبر ملی تو بہت متاسف ہوئے اور ان لفظوں میں بیزاری ظاہر فرمائی کہ "در شہرے کہ خون ایں چنیں کساں ریختہ شود عجب بود کہ آن شہر آباداں ماند"۔ جب یہ کلمات سلطان کے کان تک پہنچے تو اس نے علمائے دہلی سے کہا کہ میں نے آپ ہی لوگوں کے فتوی پر ان لوگوں کے قتل کا حکم دیا تھا، اور شیخ شرف الدین منیری اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں، اس کے جواب میں علما نے کہا کہ شیخ کو طلب کرلیا جائے اور ان سے اس کی وجہ دریافت کیجائے، اسی اثنا میں سید جلال الدین بخاری کا خادم خاص فیروز شاہ کے پاس آیا اور سیر کے

[1] یہ نظم مولانا مظفر شمس بلخی کے مکتوبات کے اوراق آخر پر مولانا غلام شرف الدین کے قلم سے مرقوم ہے، مزید براں نوشہ توحید کے

تبرکات پیش کیے۔ سلطان نے خادم سے دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ اس مرتبہ شیخ نے بڑی مدت کے بعد یاد فرمایا۔ خادم نے عرض کی کہ آجکل ہمارے شیخ کے پاس شیخ شرف الدین منیری کے مکتوبات آگئے ہیں، شیخ ان کے مطالعہ کے لیے خلوت گزیں ہو گئے ہیں اور اس درمیان میں کسی سے ملاقات نہیں کی، یہ سنکر سلطان کو تنبہ ہوا اور اس کو مخدوم جہاں کے طلب کر لینے پر شرمندگی ہوئی اور اسی وقت دوسرا فرمان لکھا کہ حضرت مخدوم کو زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس واقعہ سے مکتوبات کی عظمت اور مخدوم جہاں کی جلالت ظاہر ہوتی ہے،

ایک مرتبہ سید موصوف سے بعض لوگوں نے پوچھا کہ آخر زندگی میں آپ کا مشغلہ کیا ہے، جواب دیا "شیخ شرف الدین منیری کے مکتوبات کا مطالعہ" پھر استفسار کیا "مکتوبات کو آپ نے کیسا پایا، جواب دیا کہ مکتوبات کے بعض مقامات ہنوز حل نہیں ہوئے۔ اور میں سمجھ نہیں سکا ہوں،

صاحب مناقب الاصفیاء نے برہان الاتقیاء کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب شیخ منیری کے مکتوبات شیخ المشائخ محبوب الٰہی کے خلیفہ اجل حضرت شیخ نصیر الدین اودھی مشہور بہ چراغ دہلی کے پاس پہنچے اور اس کا مطالعہ شروع کیا تو استغراق میں کئی روز تک آپ کی زبان مبارک پر یہ کلمات جاری رہے،

"سبحان اللہ شرف الدین منیری کفر صد سالہ بارکف دست کردہ نمودہ"۔

کبیر الاولیاء پانی پتی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ مکتوبات مخدوم کے مطالعہ کے وقت ایسا محسوس کرتے تھے کہ ان پر انوار کی بارش ہو رہی ہے،

امام نسائیؒ اور انکی سنن

از

جناب مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی رفیق دار المصنفین

(۴)

راویوں کی باہم مخالفت امام صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ راویوں کے درمیان باہمی مخالفت کا تذکرہ کر دیا کرتے ہیں، اس کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔

۱۔ ایک راوی دوسرے راوی کے بارہ میں مخالفت کرے، مثلاً

خالفه عامة اصحاب شعبة ممن روی هذا الحدیث فلم یذکروا مسروقاً۔ (ج ۱ ص ۲۵۳)

خالفه قتادة رواه عن مسلم بن یسار عن ابی الاشعث عن عبادة (ج ۲ ص ۲۲۲)

۲۔ ایک راوی دوسرے راوی سے بعض الفاظ کی روایت میں اختلاف کرے۔ مثلاً

قال ابوداؤد حفاة غرلا وقال وکیع ووهب عراة غرلا"..... قال ابوداؤد یجاء وقال وهب ووکیع سیؤتی" (ج ۱ ص ۲۹۵)

قال احدهم والحجر بالحجر ولم یقله الآخر (ج ۲ ص ۲۲۱)

خالفه وکیع فی لفظه (ج ۲ ص ۳۱۵)

۳۔ لفظ اور اسناد دونوں میں مخالفت ہو۔ مثلاً

خالفه شریک فی اسناده ولفظه (ج ۲ ص ۳۳۲)

روایت کو مرفوع بیان کرنے میں مخالفت ہو، مثلاً

خالفه هشام ولم يرفعه (ج ۲ ص ۲۸۸)

کسی حدیث کی روایت میں مخالفت ہو اور اسی بنیاد پر اس حدیث کی تضعیف کی جائے، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن سلیمان بن ارقم متروك الحدیث واللّٰه اعلم

خالفه غیر واحد من اصحاب یحیی بن ابی کثیر فی هذا الحدیث (ج ۲ ص ۱۲۵)

راویوں کے درمیان عدم سماع کا تذکرہ | جب راویوں کے درمیان سماع ثابت نہ ہو تو امام نسائی اسکا ذکر کرتے ہیں۔

عدم سماع کی کئی نوعیتیں ہو سکتی ہیں

(۱) دو راویوں میں مطلق سماع ثابت نہ ہو، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن مخرمة لم یسمع من ابیه شیئاً (ج ۱ ص ۵۰)

ابو عبیدة لم یسمع من ابیه شیئاً ولا عبد الرحمٰن بن عبد اللّٰه بن مسعود

ولا عبد الجبار بن وائل بن حجر (ج ۱ ص ۲۰۸)

قال ابو عبد الرحمٰن مکحول لم یسمع عن عنبسة شیئاً (ج ۱ ص ۲۵۷)

(۲) راوی نے کوئی خاص روایت دوسرے راوی سے نہ سنی ہو، مثلاً

هشام بن عروة لم یسمع من ابیه هذا الحدیث واللّٰه سبحانه وتعالیٰ اعلم (ج ۱ ص ۶۵)

الاوزاعی لم یسمع هذا الحدیث عن الزهری وهذا حدیث صحیح

قد رواه یونس عن الزهری (ج ۲ ص ۶۰)

سعید لم یسمعه من ابی هریرة بل سمع من اخیه عن ابی هریرة (ج ۲ ص ۲۲۳)

ابن شبرمة لم یسمعه من عبد اللّٰه بن شداد (ج ۲ ص ۳۳۲)

(۳) دو راویوں کے مابین کسی ایک ہی روایت کا سماع ثابت ہو، مثلاً

قال ابو عبدالرحمٰن الحسن عن سمرۃ کتاب ولم یسمع الحسن عن سمرۃ

الا حدیث العقیقۃ   (ج ۲ ص ۲۰۵)

یعنی حسن سمرۃ سے جو روایات کرتے ہیں تو وہ کسی کتاب سے لیکر ورنہ دونوں کے درمیان صرف حدیث عقیقہ کا سماع ثابت ہے۔

رواۃ کے شک کا بیان | اگر راوی کو کسی روایت میں شک وشبہہ ہو جائے تو نسائی اس کا تذکرہ بھی کر دیتے ہیں، مثلاً

شک سلمۃ وقال لا ادری فیہ الی المرفقین او الی الکفین قال عمر نویدک من ذلک

ما تولیت قال شعبۃ کان یقول الکفین والوجہ والذراعین فقال لہ منصور

ما تقول فانہ لا یذکر الذراعین احد غیرک فشک سلمۃ فقال لا ادری ذکر الذراعین ام لا
(ج ۱ ص ۶۱)

(ترجمہ) سلمہ کو شک ہوا اور وہ کہتے ہیں کہ مجھے معلوم نہیں کہ راوی نے (مرفقین) کلائیوں تک کہا ہو یا (کفین) ہتھیلیوں تک عمر نے کہا تو نے جو ذمہ داری لی ہو ہم اسکا تمھیں ذمہ دار جانیں گے۔ شعبہ کہتے ہیں کہ وہ کفین (ہتھیلیاں) وجہ (چہرہ) اور ذراعین (کلائیاں) کہا کرتے تھے، منصور نے یہ سنکر کہا تم کیا کہہ رہے ہو کیونکہ ذراعین (کلائیوں) کا تمھارے علاوہ کوئی ذکر نہیں کرتا، چنانچہ سلمہ کو شک ہو گیا کہ راوی نے ذراعین کا ذکر کیا ہے یا نہیں۔

قال عبادۃ فلا ادری قول النبی صلعم او قول جبیر (ج ۲ ص ۳۲۱)

راوی کی تشریحات کا ذکر | راوی اگر کسی روایت کے سلسلہ میں کوئی تشریح کرتا ہے تو امام صاحب اس کا تذکرہ بھی کہیں کہیں کر دیتے ہیں، مثلاً

قال السائب یعنی بالجماعۃ فی الصلوٰۃ (ج ۱ ص ۱۳۵)

قال ابو مجلز کانہ قال ذلک لانہ فی صلوٰۃ (ج ۱ ص ۱۶۶)

راوی کی لفظی تشریح کا ذکر:

قال مالک تفتض تمسح بہ فی حدیث محمد قال مالک الحفش الخص
(ج ۲ ص ۱۱۴)

معنوی تشریح :-

قال شعبة ای لا یوخذ احد باحد اللہ تعالیٰ اعلم (ج ۲ ص ۲۵۱)

کسی اصطلاحی لفظ کی تشریح :

والشغار کان الرجل یزوج ابنته علی ان یزوجه اخته (ج ۲ ص ۵)

راوی اپنی تشریح میں روایت کی توثیق کرے، مثلاً

قال الحسین وقال احمد ھذا حدیث صحیح (ج ۲ ص ۳۲۵)

اسی طرح راویوں کی دوسری وضاحتوں اور تشریحوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

راویوں کی توثیق و تضعیف | امام صاحب رجال کے بڑے ماہر تھے، اس لیے سنن میں جا بجا، رواۃ کی توثیق و تضعیف کا ذکر ملتا ہے، چند مثالیں یہ ہیں،

تضعیف کی مثالیں :

قال ابو عبد الرحمن بریدة ھذا لیس بالقوی فی الحدیث (ج ۱ ص ۱۲۹)

قال ابو عبد الرحمن معقل بن عبید اللہ لیس بذلك القوی (ج ۱ ص ۱۵۰)

قال ابو عبد الرحمن وعبد اللہ بن نجیح والد علی بن المدینی

متروک الحدیث (ج ۱ ص ۱۹۴)

وہ ائمہ فن کی توثیق کے باوجود بھی راویوں کی تضعیف کرتے ہیں، مثلاً

قال ابو عبد الرحمن عمرو بن ابی عمرو لیس بالقوی فی الحدیث وان کان

قد روی عنه مالك (ج ۲ ص ۲۶)

اسی طرح ایک جگہ تضعیف کرنے کے بعد اس راوی سے نقل روایت کا سبب بھی بیان کیا ہے :

قال ابو عبد الرحمن ابن خثیم لیس بالقوی فی الحدیث وانما اخرجت

هذا انکلا یحمل ابن جریج عن ابی الزبیر ثم اکتبناه الا عن اسحق بن ابراهیم

ویحیی بن سعید القطان لم یترک حدیث ابن خیثم ولا عبد الرحمٰن

الا ان علی بن المدینی قال ابن خیثم منکر الحدیث وکان علی بن المدینی

خلق للحدیث (ج ۲ ص ۴۳)

توثیق کی مثالیں:

قال ابو عبد الرحمٰن وایمن عندنا لا بأس به (ج ۱ ص ۱۸۹)

قال ابو عبد الرحمٰن عبد الله بن جعفر هذا لیس به بأس (ج ۱ ص ۱۹۲)

راوی کی ثقاہت ہی کی بنیاد پر روایت کی تصویب کرتے ہیں، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن هذا الحدیث لیس بثابت وعبد الکریم لیس

بالقوی وهرون بن ایاب اثبت منه وقد ارسل الحدیث وهرون

ثقة وحدیثه اولیٰ بالصواب من حدیث عبد الکریم (ج ۲ ص ۰۶)

راوی کی ثقاہت کے متعلق ائمہ فن کا قول نقل کرتے ہیں، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن کان المخرمی یقول هو ثقة یعنی محمد

بن سعد الانصاری (ج ۱ ص ۱۴۶)

راوی یا روایت کے متعلق کسی عجیب بات کا ذکر کسی روایت یا راوی کے بارہ میں اگر کوئی نادر اور خاص بات ہوتی ہے تو نسائی بعض اوقات اسکا ذکر فرما دیتے ہیں، مثلاً ایک روایت میں ہے:

جریر بن عبد اللہ نے ایک بار وضو کیا اور موزوں پر مسح کیا تو لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے،

امام نسائی فرماتے ہیں:

وکان اصحاب جریر یعجبھم قولہ — جریر کے ساتھیوں کو انکی بات عجیب معلوم ہوئی
وکان اسلامہ قبل موت النبی — اس لیے کہ وہ نبی اکرمؐ کی وفات سے کچھ ہی
بیسیر — پہلے مسلمان ہوئے تھے۔

کسی روایت کو بیان کرنے میں اگر راوی کی کوئی مالوف عادت ہو تو اس کا بھی اظہار کر دیتے ہیں، مثلاً "لایبولن احدکم فی الماء الدائم" کی مشہور روایت میں ایک راوی یعقوب بن ابراہیم ہے، امام نسائی اس کے متعلق فرماتے ہیں:-

کان یعقوب لایحدث بھذا الحدیث الابدینار (ج ۱ ص ۲۱)

مشکل الفاظ کی شرح | سنن میں کہیں کہیں غریب اور مشکل الفاظ کی تشریح بھی ہوتی ہے، مثلاً

قال ابوعبدالرحمن الرکس ، طعام الجن (ج ۱ ص ۱۷)

وہ مشہور روایت جس میں ایک اعرابی کے حرم نبوی میں پیشاب کرنے اور صحابہ کا اس کو مارنے کے لیے جھپٹنے کا ذکر ہے، یہ الفاظ آئے ہیں: دعوہ لاتزرموا" امام نسائی اس کی نسبت فرماتے ہیں: یعنی لاتقطعوا علیہ (ج ۱ ص ۲۰)

معراج والی روایت میں "صری" کا لفظ آتا ہے، نسائی اس کی شرح کرتے ہیں:

"صری" ای حتم (ج ۱ ص ۸۰)

ایک جگہ نہایت محققانہ انداز میں فرماتے ہیں:

قال ابوعبدالرحمن الشکال من الخیل ان یکون ثلاث قوائم محجلة وواحدة مطلقة او تکون الثلاثة مطلقة ورجل محجلة ولیس یکون الشکال الا فی رجل ولایکون فی الید۔ (ج ۲ ص ۱۱۹) (شکال اسے کہتے ہیں کہ گھوڑے کی تین ٹانگیں سفید ہوں اور ایک مطلق ہو یا تین ایک طرح کی مطلق ہوں اور ایک ٹانگ سفید ہو اور اشکال ہاتھ میں نہیں بلکہ صرف پیر میں ہوتا ہے)

موقوف، مرسل، مسند اور مرفوع روایات کی نشاندہی وہ اکثر موقوف، مرسل، مسند وغیرہ روایات کی نشاندہی بھی کر دیتے ہیں،

موقوف کی مثالیں:

رواه حميد بن عبد الرحمن بن عوف موقوفاً (ج ۱ ص ۲۵۶)

وقفه مالك (ج ۲ ص ۲۷۵)

مرسل کی مثالیں:

قال ابو عبد الرحمن هذا الحديث ليس بثابت وعبد الكريم ليس بالقوي وهارون بن اياب اثبت منه وقد ارسل الحديث (ج ۲ ص ۷۲)

ارسله حماد بن زيد (ج ۲ ص ۱۵۷)

ارسله ابو نعيم (ج ۲ ص ۲۴۹)

مسند کی مثالیں:

رواه عنه يونس بن عبيد فاسنده (ج ۲ ص ۱۷۱)

مسند اور مرسل کی بیک وقت وضاحت:

قال ابو عبد الرحمن لا اعلم احداً اسند هذا عن عبد الله بن الفضل الا عبد العزيز رواه اسمعيل بن امية مرسلاً (ج ۲ ص ۳۱۷)

مرفوع کی مثال

رفعه الاعمش (ج ۲ ص ۳۲۳)

روایات کی تصویب اور تخطیہ امام نسائی کی نظر چونکہ حدیث پر گہری اور وسیع تھی، اس لیے حدیثوں میں معمولی خطاء و صواب پر بھی ان کی نظر پہنچ جاتی تھی، اس کی بعض مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ راوی حدیث سے اگر کسی راوی کا نام لینے میں کسی طرح کا سہو ہو جائے، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن هذا خطاء والصواب خالد بن علقمة ليس مالك بن عرفطة (ج ۱ ص ۲۷)

هذا غلط من ابن عيينة وعبد الله بن زيد الذى ارى النداء هو عبد الله بن زيد بن عبد ربه وهذا عبد الله بن زيد بن عاصم (ج ۱ ص ۲۲۴)

۲۔ اسناد میں غلطی:

قال ابو عبد الرحمٰن هذا خطاء والصواب اشعث عن الحسن عن ابى هريرة (ج ۱ ص ۴۱)

هذا خطاء والصواب ابو سلمة عن ابى هريرة (ج ۲ ص ۱۵۹)

قال ابو عبد الرحمٰن هذا خطاء والصواب ابو نصر واسمه حميد بن هلال (ج ۲ ص ۱۷۱)

۳۔ راوی غلطی سے صحابی کے قول کو رسول اللہ کا قول قرار دے، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن هذا عن رسول الله صلعم خطاء انما هو قول ابى الدرداء (ج ۱ ص ۱۴۶)

۴۔ امام صاحب نفس حدیث کا بھی تخطیہ کرتے ہیں:

قال ابو عبد الرحمٰن ولا احسب هذا الحديث الا خطاء والله تعالى اعلم (ج ۱ ص ۲۴۵)

هذا الحديث عندى خطاء والله تعالى اعلم (ج ۱ ص ۲۴۶)

قال ابو عبد الرحمٰن هذا حديث منكر (ج ۲ ص ۹۷)

قال ابو عبد الرحمٰن وحديث حجاج عن حماد بن سلمة ليس هو بصحيح (ج ۲ ص ۱۹۶)

۵۔ تخطیہ کی طرح تصویب بھی کرتے ہیں، مثلاً

قال ابو عبد الرحمٰن هذا الحديث جيد جيد (ج ۲ ص ۳۰۶)

قال ابو عبد الرحمٰن هذان الحديثان صحيحان عن عبدة (ج ۲ ص ۱۵۹)

۶۔ بعض اوقات تصویب اور تخطیہ ایک ہی ساتھ کرتے ہیں، اس کی کچھ مثالیں پہلے گذر چکی ہیں، بعض اور ملاحظہ ہوں۔

قال ابو عبد الرحمٰن هذا خطاء والصواب مرسل

قال ابو عبد الرحمٰن هذا الصواب والذی قبله خطاء (ج ۲ ص ۱۵۹)

موازنہ و محاکمہ | رواۃ اور احادیث کا موازنہ کرکے "اصوب" اور "اصح" روایت کی نشاندہی فرما دیتے ہیں۔

احادیث کا موازنہ :-

ليس في هذا الباب حديث احسن من هذا الحديث وان كان مرسلا (ج ۱ ص ۳۹)

وهذا اولى بالصواب من الذی قبله (ج ۱ ص ۱۹۰)

وهذا الصواب عندنا وحديث عثمان بن عمر خطاء (ج ۱ ص ۲۵۳)

هذا خطاء فاحش والصواب حديث بشر (ج ۲ ص ۸۶)

قال ابو عبد الرحمٰن هذا اولى بالصواب (ج ۲ ص ۹۸)

قال ابو عبد الرحمٰن المرسل اولى بالصواب من المسند والله سبحانه وتعالىٰ اعلم (ج ۲ ص ۱۰۳)

قال ابو عبد الرحمٰن وحديث سليمان التيمی وجعفر بن اياس اشبه من حديث مصعب بن شيبة ومصعب منكر الحديث (ج ۲ ص ۲۷۵)

اسی طرح رواۃ کے درمیان بھی محاکمہ اور موازنہ کرتے ہیں۔

قال ابو عبد الرحمن خالد اثبت من المعتمر (ج ۱ ص ۳۴۳)

قال ابو عبد الرحمن والحکم اثبت من سلمة بن کہیل (ج ۱ ص ۳۴۴)

قال ابو عبد الرحمن عمارة احفظ من یحیی وحدیثه اولی بالصواب (ج ۲ ص ۲۸۶)

شک تردد کا اظہار امام نسائی کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے اشتباہ اور تردد کا اظہار بھی کر دیا کرتے ہیں،

قال ابو عبد الرحمن وانبأنا قتیبة بهذا الحدیث مرتین ولعله ان یکون قد سقط علیه منه سطر (ج ۱ ص ۱۹۱)

کذا وقع فی کتابی ولا ادری عمن الخطاء فی موضع وتر علیه السلام (ج ۱ ص ۲۳۸)

حدیث یحیی بن سعید هذا اسناده حسن وهو منکر واخاف ان یکون الغلط من محمد بن فضیل (ج ۱ ص ۳۰۳)

قال ابو عبد الرحمن هذا الحدیث عندی مرسل وطلحة بن یزید لا اعلمه سمع من حذیفة شیئاً (ج ۱ ص ۱۴۶)

عدم فہم کا اعتراف اگر روایت کا کوئی حصہ یا لفظ پوری طرح سمجھ میں نہ آتا تو بے تکلف اس کا اظہار کر دیتے ہیں۔ مثلاً

ولم افهم "غب" کما اردت (ج ۲ ص ۵۸)

فلم افهم قتیبة کما اردت (ج ۲ ص ۶۸)

احادیث تحویل میں راوی کے الفاظ کی تعیین امام صاحب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ کوئی روایت دو راویوں سے مروی ہونے کی صورت میں دونوں کی سندیں نقل کرتے ہیں اور نقل روایت میں جس راوی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں، اس کی وضاحت فرما دیتے ہیں، مثلاً

اللفظ لاسحاق (ج ۱ ص ۱۶۷) عن عیسیٰ بن یونس واللفظ له (ج ۱ ص ۱۹۳)

واللفظ لمحمد (ج ۲ ص ۷۷) اخبرنا محمد بن عبداللہ بن یزید وسعید بن عبدالرحمن

واللفظ له (ج ۲ ص ۱۳۹)

ایک باب سے متعلق بہت ساری روایتوں کا ذکر

ایک باب سے متعلق اگر متعدد روایات ہوں تو امام صاحب عموماً ان سب کا ذکر کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مثلاً کتاب الصلوٰۃ میں پہلے باب کا عنوان ہے

"فرض الصلوٰۃ وذکر اختلاف الناقلین فی اسناد حدیث انس بن مالک واختلاف الفاظهم فیه" (ج ۱ ص ۷۶)

اور کتاب القسامۃ میں:

"ذکر اختلاف الناقلین لخبر سهل فیه" (ج ۲ ص ۳۲۷)

اور اسی طرح صوم وصال وغیرہ میں بھی اس طرح کے ابواب قائم کیے ہیں۔

اگر کسی مسئلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف صورتیں ثابت ہوں تو نسائی عموماً ان سب صورتوں کا تذکرہ کرتے ہیں، اس کی چند مثالیں یہ ہیں:

باب الدعاء بین التکبیرۃ والقرأۃ (ج ۱ ص ۱۴۲)

باب الذکر فی الرکوع (ج ۱ ص ۱۶۰)

باب الدعاء فی السجود (ج ۱ ص ۱۲۸)

باب کیف التشهد (ج ۱ ص ۱۴۳)

باب الذکر بعد التسلیم (ج ۱ ص ۱۹۷)

باب کیف صلوٰۃ الکسوف وغیرہ

اور اگر وہ کسی باب کی بہت سی ہم معنی روایتوں کو نہیں نقل کرتے ہیں، تو کم از کم ان کی سندیں

نقل کرکے "بمثلہ" یا "فذکر نحوہ" وغیرہ کہکر گذر جاتے ہیں، مثلاً

اخبرنا عمرو بن علی قال حدثنا عبد الرحمٰن قال حدثنا ابو الاحوص

عن اشعث عن ابیہ عن مسروق عن عائشۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم بمثلہ (ج ۱ ص ۲)

اخبرنا عمرو بن سواد بن الاسود قال اخبرنا ابن وھب قال انبانا

عمرو بن الحارث قال حدثنا قتادۃ عن محمد بن سیرین عن ابی ھریرۃ

عن رسول اللہ علیہ وسلم بمثلہ (ج ۱ ص ۱۸۳)

تفقہ اور استدلال امام نسائی جلیل القدر محدث ہونے کے ساتھ ہی بلند پایہ فقیہ بھی تھے، سنن کے صفحات ان کی فقاہت پر گواہ ہیں، یہاں چند مثالیں نقل کیجاتی ہیں:-

قال ابو عبد الرحمٰن وفی ھذا دلیل	اس کے اندر تھوڑے یا زیادہ ہر طرح کے نشہ کی
علی تحریم السکر قلیلہ وکثیرہ ولیس کما	حرمت کا بیان ہے، اور وہ بات نہیں ہے جو فریق
یقول المخادعون لانفسھم بتحریمھم	میں مبتلا لوگ کہتے ہیں کہ شراب کا آخری گھونٹ
آخر الشربۃ وتحلیلھم ما تقدمھا	حرام اور اس سے پہلے کے گھونٹ حلال ہیں،
الذی یشرب فی الفرق قبلھا ولا	اس لیے کہ اہل علم کے نزدیک
خلاف بین اھل العلم ان السکر	اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ نشہ کلی طور سے
بکلیتہ لا یحدث علی الشربۃ	آخری ہی گھونٹ میں طاری ہوتا ہے
الآخرۃ دون الاولی والثانیۃ	اور پہلے یا دوسرے گھونٹ میں نہیں
بعدھا وباللہ التوفیق (ج ۲ ص ۳۲۷)[1]	طاری ہوتا۔

امام نسائی نے خمس کی تشریح نہایت بصیرت افروز انداز میں کی ہے اور چونکہ وہ کافی طویل ہے اس لیے محض اس کا ترجمہ یہاں کیا جاتا ہے:-

---

[1] ج ۲ ص ۳۲۷

"اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے واعلموا انما غنمتم من شیء فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل (جان لو کہ جو غنیمت تمھیں ملی ہے تو اس کا پانچواں حصہ اللہ، رسول، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے)

آیت میں یہاں "للہ" کا ذکر ابتدائے کلام میں آیا ہے، کیونکہ ساری چیزیں اللہ ہی کے لئے ہیں یا خدا نے شاید فئی اور خمس میں اپنی ذات کو اس لیے شریک کیا ہے کہ دراصل یہ بہترین قسم کی کمائی ہیں، اور صدقہ کو اپنی طرف اس لیے منسوب نہیں کیا کہ وہ اموال کی ناپاکیوں کا نام ہے، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ غنیمت میں سے کچھ لے لیا جائے گا تاکہ کعبہ پر اسے خرچ کیا جائے اور اس حصہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا بتایا ہے، اور نبی کا حصہ امام کی طرف منتقل ہوگا جس سے وہ اسلحہ اور جنگی سامان خریدے گا، اور اس میں سے ان لوگوں کو بھی دیگا جنھیں وہ مناسب سمجھے گا، مثلاً جن سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچتا ہے یا علم دین، حدیث، فقہ اور قرآن وغیرہ کی تحصیل میں صرف کرے گا اور ایک حصہ آپ کے قرابتداروں یعنی بنو ہاشم اور بنو مطلب کو ملے گا خواہ وہ امیر ہوں یا فقیر، ایک قول یہ بھی ہے کہ آپ کے قرابت داروں میں سے صرف فقرا یعنی یتیم اور مسافر وغیرہ کو دیا جائے گا، اور یہی قول میرے نزدیک زیادہ صحیح ہے۔ واللہ اعلم۔ اور بڑے، چھوٹے، مرد اور عورت میں برابر برابر تقسیم کیا جائیگا، کیونکہ حدیث میں یہ نہیں ہے کہ نبیؐ نے کسی کو کسی سے زیادہ دیا ہو، اس بارہ میں علماء کے کسی اختلاف کا مجھے علم نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی شخص کسی کی اولاد کے حق میں اپنے تہائی مال کی وصیت کر دے تو مرد و عورت سب کو برابر ملے گا، اسی اصول پر ان تمام چیزوں کو قیاس کرنا چاہیے جو کسی کے قرابتداروں اور خاندان والوں کے لیے متعین کر دی گئی ہو، الا یہ کہ شارعؑ نے اس سلسلہ میں کوئی واضح حکم صادر فرما دیا ہو، اسی طرح مسلمانوں کے یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کو ایک ایک حصہ دیا جائیگا اور مسکین و مسافر کا حصہ کسی دوسرے کو نہیں دیا جا سکتا، باقی خمس کے چار اور حصوں کو

امام ان بالغ مسلمانوں کے درمیان تقسیم کردے گا جو جنگ میں شریک رہے ہوں "۔

بعض ابواب کی سرخی ہی سے امام صاحب کے تفقہ اور استدلال کا ثبوت ملتا ہے، مثلاً

باب مسح الاذنين مع الرأس وما يستدل به على انهما من الرأس

(ج ۱ ص ۲۹) یعنی سر کے ساتھ کانوں کے مسح کا بیان اور اسکا ذکر کہ وہ دونوں بھی سر کے اندر شامل ہیں۔

اسی طرح بعض ابواب کے ذریعہ وہ اپنے مخالف مسلک کی تردید کرتے ہیں، مثلاً کتاب الصلوٰۃ میں ایک باب اسی لیے "باب المحافظة على الصلوٰت الخمس" (ج ۱ ص ۸۰) لائے ہیں، اس کی تشریح ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک وتر واجب ہے (یعنی فرض تو نہیں ہے مگر سنت سے اسکا درجہ زیادہ ہے) ہیں اور شوافع کے یہاں وتر سنت موکدہ ہے۔ نسائی اس باب کے ذریعہ امام ابوحنیفہؒ کے مسلک تردید کرنا چاہتے ہیں،

اسی طرح ایک اور باب "باب التشدید فی تاخیر العصر" (ج ۱ ص ۸۹) ہے، اس سے بھی یہ کی تردید مقصود ہے، کیونکہ احناف نماز عصر مثلین کے بعد پڑھتے ہیں۔

بعض مواقع پر امام صاحب نہایت لطیف استنباط کرتے ہیں، ذیل میں اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"آمین بالجہر" کا باب قائم کرکے یہ حدیث لاتے ہیں

عن ابی هريرة قال قال رسول الله صلی الله علیه وسلم اذا امن القاری فامنوا فان الملئكة تؤمن فمن وافق تامينه تامين الملئكة غفر الله ما تقدم من ذنبه (ج ۱ ص ۱۴۷)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب نماز پڑھانے والا آمین کہے تو تم لوگ بھی آمین کہو کیونکہ اسوقت ملائکہ آمین کہتے ہیں اور جس کی آمین اور ملائکہ کی آمین میں موافقت ہوجائے تو اللہ تعالی اس کے سابقہ گناہ معاف کردے گا۔

اس استدلال کی تشریح یہ ہے کہ امام آمین زور سے کہے گا جب ہی مقتدی سنیں گے،

اسی طرح "باب النیۃ فی الوضوء" میں یہ مشہور حدیث "انما الاعمال بالنیات" (ج ۱ ص ۲۴) نقل کی ہے یعنی جب سارے اعمال کا دار ومدار نیت پر ہے اور وضو بھی ایک عمل ہے اسلیے اس کا دار و مدار بھی نیت پر موقوف ہوگا۔

امام نسائیؒ کی فقاہت کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ وہ ایک ہی حدیث سے متعدد مسائل کا استنباط کرتے ہیں اور انھیں جدا جدا عنوانوں اور بابوں میں بیان کرتے ہیں، اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ کی مشہور روایت ہے کہ

اذا استیقظ احدکم من منامہ	جب کوئی شخص سو کر اٹھے تو اسے برتن میں
فلا یغمس یدہ فی وضوئہ حتی	ہاتھ ڈالنے سے پہلے تین مرتبہ دھو لینا چاہیے'
یغسلہا ثلاثا فان احدکم	کیونکہ نہ معلوم اس کے ہاتھ سوتے میں
لا یدری این باتت یدہ	کہاں کہاں پہنچے ہوں گے۔

اسے دو جگہ "باب تاویل قولہ عزوجل اذا قمتم الی الصلوٰۃ فاغسلوا وجوھکم وایدیکم الی المرافق" (ج ۱ ص ۳) اور "الوضوء من النوم" (ج ۱ ص ۲۰) میں لائے ہیں۔

ایسے ہی حدیث "کان الرجال والنساء یتوضؤن فی زمان رسول اللہ جمیعاً" کو "باب الرخصۃ فی فضل المرأۃ (ج ۱ ص ۲۴) باب وضوء الرجال والنساء (ج ۱ ص ۲۳) دونوں جگہ لائے ہیں،

یہ چند خصوصیات ہیں جنھیں نسائیؒ کی سنن کے ایک سرسری مطالعہ سے معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، محاسن کی طرح بعض معائب بھی اس میں نظر آتے ہیں، مثلاً امام نسائیؒ نے بعض ضروری ابواب کو اپنی کتاب میں نہیں بیان کیا ہے، اور بعض مواقع پر ان کا استدلال کمزور بھی معلوم ہوتا ہے: مگر یہ خامیاں خوبیوں کے مقابلہ میں بہت کم ہیں۔ (باقی)

مسلمانوں کے ہندسی ادب کی ثروت

از جناب شبیر احمد خاں صاحب غوری ایم، اے

(۳)

ُصول ہندسہ کی دوسری کتابوں کا ترجمہ یونانی ذہانت نے "اصول ہندسہ" کے موضوع پر جو کتابیں ب کی تھیں، ان میں اقلیدس کی "اصول ہندسہ" سب سے مشہور تھی، اس سے پہلے اور مہندسین نے ی "اصول ہندسہ" پر کتابیں لکھی تھیں، جن کی تفصیل اوپر مذکور ہو چکی ہے، اقلیدس کے پیشرووں ں آخری نام تھیوڈیوس (Theudius) کا ہے محققین یورپ کی رائے میں اسی کی ترتیب دی ہوئی "اصول ہندسہ" اکادیمیائے لاطونی کے درس میں داخل تھی لیکن مؤرخین اسلام کا کہنا ہے کہ خود افلاطون نے اصول ہندسہ پر ایک کتاب لکھی تھی اور اس کی ُصول ہندسہ" کو قسطا بن لوقا بعلبکی نے عربی میں ترجمہ کیا تھا، چنانچہ ابن الندیم افلاطون کے تذکرہ میں لکھتا ہے.

كتاب افلاطون اصول الهندسة	افلاطون کی کتاب اصول ہندسہ کا ترجمہ
ترجمه قسطا[1]	قسطا بن لوقا نے (عربی میں) ترجمہ کیا تھا،

قسطا کے اس ترجمہ پر سنان بن ثابت بن قرہ نے اصلاح دی تھی، اور مفید اضافے کیے تھے، ابن قفطی سنان کی تصانیف میں لکھتا ہے:

اصلاحه لكتاب افلاطون	سنان بن ثابت کی تصانیف میں سے افلاطون
في الاصول الهندسية وزاد	کی "اصول الہندسیہ" کی اصلاح ہے، اس نے اس

لہ الفہرست لابن الندیم ص ۳۴۴

فی هذا الکتاب شیأ کثیرا[۱]	کتاب میں بہت سی چیزوں کا اضافہ کیا تھا،

یونانی ہندسہ کی تاریخ میں [جس طرح یورپین مورخین نے اسے مرتب کیا ہے] اقلیدس کے بعد کسی اور اصول نگار کا پتہ نہیں چلتا، مگر ابن الندیم کہتا ہے کہ اس کے بعد مانالاؤس (Menelaus) نے اصول ہندسہ پر ایک کتاب لکھی تھی، جسے ثابت بن قرہ نے ترجمہ کیا تھا، چنانچہ وہ مانالاؤس کی نقد میں اس کا ذکر کرتا ہے،

کتاب اصول الهندسة عمله	کتاب اصول ہندسہ جسے ثابت بن قرہ نے ترجمہ
ثابت بن قرة ثلاث مقالات[۲]	کیا تھا، اس میں تین مقالے ہیں،

ثابت بن قرہ نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی تھی جیسا کہ البیرونی کی تصریح سے (جو آگے آرہی ہے) ظاہر ہے،

مانالاؤس کی "اصول ہندسیہ" مهندسین اسلام میں بہت زیادہ مقبول ہوئی، سب سے پہلے بنو موسیٰ نے "کتاب المساحة" کی سولھویں شکل میں اس کا حوالہ دیا:

وهذا العمل لرجل من القدماء	اور یہ ہندسی دریافت قدماء میں سے ایک
(اسمه مانالاؤس اورده فی کتابه	(یونانی) شخص کی ہے جسکا نام مانالاؤس تھا،
فی الهندسة[۳]	اس نے اسے اپنی کتاب میں جو علم ہندسہ پر ہے ذکر کیا ہے

یہ کتاب البیرونی کے زمانہ تک مروج تھی، چنانچہ وہ "استخراج الاوتار" میں لکھتا ہے:-

ان مانالاؤس رام فی الشکل الثانی	مانالاؤس نے اپنی "اصول ہندسہ" کے تیسرے
من المقالة الثالثة من کتابه فی	مقالہ کی دوسری شکل میں اس کا قصد کیا ہے،
فی اصول الهندسية .... سلك الیه	اور اس مسئلہ کا بہت لمبا ثبوت دیا ہے پھر

[۱] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۴۳ [۲] الفہرست ۲۶۸ [۳] معرفۃ مساحۃ الاشکال البسیطۃ والکریۃ بنی موسیٰ رسائل طوسی،

مسئلة طويلا جداً ثم عمله ثابت بن قرة حين فسر ذلك الكتاب[1]	جب ثابت بن قرہ نے اس کی شرح لکھی تو اس کا دوسرا ثبوت دیا،

ثابت بن قرہ کے بعد ابو الجود نے شکل محولۂ بالا کی توضیح کے لیے ایک مستقل رسالہ لکھا جیسا کہ البیرونی لکھتا ہے:

"وان ابا الجود افرد لهذا المعنى مقالة واستخرجه بطريق تجاوز كل طوا له وصعوبة[2]" بعدازاں ابوسعید السجزی نے اس مسئلہ کو بڑے آسان طریقے سے حل کیا ہے، البیرونی کہتا ہے: فلما وقف عليها ابو سعيد السجزی استخرجه بطريق هو فی نهاية السهولة[3]"

اصول ہندسہ کی تیسری کتاب جو مسلمانوں میں ترجمہ ہوئی سارینوس ثیبائی (Syrianus of Thebese) کی تھی، ابن القفطی نے ایک حکیم سوریانوس کا ذکر کیا ہے، مگر صرف شارح ارسطو کی حیثیت سے[4]، البیرونی کہتا ہے کہ اس نے ایک "اصول ہندسہ" بھی لکھی تھی جو غالباً عربی میں ترجمہ ہوئی، کیونکہ یہ کتاب البیرونی کے پیش نظر تھی اور اس نے اس سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ لکھتا ہے:

البرهان عليه من كتاب الدوائر لارشميدس وكتاب سارينوس الثيبائی فی الاصول الهندسة[5]"

اصول ہندسہ کے عنوان سے چوتھی کتاب ارشمیدس (Archimedes) کی تھی، جسے ثابت بن قرہ نے یونانی سے عربی میں ترجمہ کیا تھا، دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اسے ۱۹۴۷ء میں شائع کر دیا ہے [ابن الندیم نے ارشمیدس کی کتاب الماخوذات کا نام کتاب الماخوذات فی اصول الهندسه[6] لکھا ہے، اگر یہ مذکورۂ بالا کتاب سے مختلف ہے]

یونانی ہندسہ کی دوسری کتابوں کا ترجمہ | اقلیدس نے "اصول ہندسہ" کے علاوہ اس فن میں ایک اور کتاب

---

[1] استخراج الاوتار للبیرونی ص ۴۹ [2] ایضاً ص ۵۰ [3] ایضاً ص ۵۰ [4] اخبار العلماء باخبار الحکماء ص ۱۳۵
[5] استخراج الاوتار ص ۷، [6] الفہرست لابن الندیم ص ۳۷۲

بعنوان "کتاب المعطیات" (Data) لکھی تھی۔ "کتاب المعطیات" کو سب سے پہلے کندی نے عربی میں منتقل کیا تھا، مگر غالباً یہ آزاد ترجمہ تھا[1]۔ بعد میں اسے اسحٰق بن حنین نے باقاعدہ عربی میں ترجمہ کیا، اور اسحاق ہی کے ترجمہ کو ساتویں صدی کے وسط میں محقق طوسی نے متوسطات کی دوسری کتابوں کے ساتھ ایڈٹ کیا[2]۔ (کتاب المعطیات بھی متوسطات میں محسوب ہوتی تھی)

اقلیدس کی کتاب المعطیات کے علاوہ متوسطات میں ارشمیدس کی مندرجۂ ذیل کتابیں داخل تھیں۔

کتاب المفروضات: ثابت بن قرہ نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا اور محقق طوسی نے اسے ایڈٹ کیا[3]۔

کتاب الماخوذات: اس کا نام ابن الندیم نے "کتاب الماخوذات فی اصول الہندسہ" لکھا ہے، ثابت ابن قرہ نے اس کا عربی میں ترجمہ کیا[4]۔ ابوسہل الکوہی نے اس کی پانچویں شکل کو ثابت کرنے کے لیے ایک مقالہ "تزیین کتاب ارشمیدس فی الماخوذات"[5] کے عنوان سے لکھا، اس کے بعد استاذ المختص ابوالحسن علی بن احمد النسوی نے اس کتاب کی تفسیر لکھی[6]، ساتویں صدی میں محقق طوسی نے متوسطات کے ضمن میں اسے ایڈٹ کیا

معطیات اقلیدس، مفروضات ارشمیدس اور ماخوذات ارشمیدس کو دائرۃ المعارف حیدرآباد نے رسائل طوسی کے ساتھ شائع کر دیا ہے۔

ارشمیدس کی ان دو کتابوں کے علاوہ ابن الندیم اس کی تصانیف میں ایک اور کتاب "کتاب الدوائر المتماسہ" کا ذکر کرتا ہے۔ اس کا مترجم معلوم نہیں مگر عربی میں ترجمہ ہوئی تھی اور اس کے بہت سے نسخے اب بھی ملتے ہیں، ان کی مدد سے دائرۃ المعارف حیدرآباد نے اسے "اصول ہندسہ ارشمیدس" کے ساتھ سنہ ۱۹۴۷ء میں شائع کر دیا ہے، ممکن ہے کہ اس کا مترجم بھی ثابت بن قرہ ہو۔

"الدوائر المتماسہ" کے عنوان سے ابلونیوس (Apollonius) نے بھی حسب

---

[1] عیون الانباء لابن ابی اصیبعہ ج ۱ ص ۲۰۱ [2] رسائل طوسی ج ۱ رسالہ نمبر (۱) [3] ایضاً جلد ثانی رسالہ نمبر (۲)
[4] ایضاً رسالہ نمبر (۲) [5] ایضاً رسالہ نمبر (۳) ص ۲ [6] ایضاً

تصریح ابن الندیم ایک کتاب لکھی تھی،[1] جو غالباً عربی میں ترجمہ ہوئی،

البیرونی کا خیال ہے کہ ابلیونیوس نے ہندسہ میں ایک اور کتاب بھی لکھی تھی جس کا نام "مسائل للیونانیین" تھا، اس کا ترجمہ یوحنا بن یوسف نے کیا تھا، چنانچہ وہ "استخراج الاوتار" میں لکھتا ہے:

مسائل للیونانیین لانقہ ان تکون لابلونیوس ترجمها یوحنا بن یوسف[2]	مسائل للیونانیین بہت ممکن ہے ابلونیوس کی تصنیف ہو، اسے یوحنا بن یوسف نے ترجمہ کیا تھا،

ابن الندیم کہتا ہے کہ اقلیدس کی طرف دو اور کتابیں منسوب تھیں [اگرچہ غلط طور پر]: کتاب الترکیب اور کتاب التحلیل،[3] غالباً یہ بھی ابلونیوس کی تصنیف تھیں، اگرچہ وہ ابلونیوس کی تصانیف میں ان کا ذکر نہیں کرتا، مگر ابراہیم بن سنان بن ثابت بن قرہ (المتوفی سنہ ۳۳۵ھ) نے اپنے رسالہ "حرکات الشمس" میں لکھا ہے کہ ترکیب و تحلیل ابلونیوس کا منہاج خصوصی تھا، وہ لکھتا ہے:-

ووجدت المهندسين فی هذا العصر قد اغفلوا طریق ابلونیوس فی التحلیل والترکیب[4]	میں نے اس زمانہ کے مہندسین کو دیکھا ہے کہ وہ ابلونیوس کے طریق تحلیل وترکیب سے غافل ہیں،

اس سے خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ کتابیں ابلونیوس کی تصنیف ہوں، غالباً ان دونوں کتابوں کا ابن الندیم کے زمانہ میں عربی ترجمہ بھی متداول تھا، کیونکہ متاخرین نے بھی ان کے موضوعوں پر کتابیں لکھیں (جن کی تفصیل آگے آئے گی)

۲۔ اصول اقلیدس کی تلخیص | اقلیدس ایک ضخیم کتاب ہے، جس میں تقریباً پانچ سو اشکال ہیں، حدود و مصادرات ان کے علاوہ ہیں، فن ہندسہ کے خصوصی طالبین کے علاوہ عوام اور ان طالبان علم کے لیے جو تمام علوم

---

[1] الفہرست ص ۲۶۶، [2] استخراج الاوتار ص ۲۰۰، [3] الفہرست ص ۲۶۶، [4] حرکات الشمس لابراہیم بن سنان بن ثابت شائع کردہ دائرۃ المعارف حیدرآباد۔

سے فی الجملہ شناسائی بہم پہنچانا چاہتے ہوں، اس ضخیم کتاب کے مختصرات کی ضرورت کا ہمیشہ سے احساس رہا ہے، چنانچہ رومیوں کے زمانہ میں بوئیتھیوس کی تلخیص اقلیدس میں متداول تھی (تفصیل اوپر آچکی ہے) مسلمان فضلا نے بھی اپنے زمانہ میں اقلیدس کے مختصرات مرتب کیے،

اقلیدس کے اختصار و تلخیص کے سلسلے میں سب سے پہلا نام اسحاق بن حنین کا آتا ہے جس نے ۲۹۸ھ میں وفات پائی تھی، ابن ابی اصیبعہ نے اس کی مصنفات میں "اختصار کتاب اقلیدس" کا ذکر کیا ہے[1]، یہ کتاب آج ناپید ہے،

تثقیف ذہنی کے لیے تحصیل علم کرنے والوں کے لیے اصول اقلیدس کا ملخص فلسفہ کی عام مجامیع (Compendiums) میں شامل ہوتا تھا، اس قسم کی قدیم ترین کتابیں "رسائل اخوان الصفا" ہے، [زمانہ چوتھی صدی کا ثلث دوم، مصنفین غیر معلوم] اس میں باون رسالے ہیں، دوسرا رسالہ بنام "جومطریا" (Geometeria) اصول اقلیدس کی ایک ہلکی پھلکی تلخیص ہے[2]۔

چوتھی صدی کے سرے پر شیخ بوعلی سینا کا نام ملتا ہے، اس نے علوم فلسفیہ کے جو مجموعے مرتب کیے ان میں تین مشہور ہیں: شفا، نجاۃ اور دانش نامۂ علائی (فارسی) ان کے اندر ریاضیات کے ضمن میں اصول اقلیدس کی تلخیصات بھی مندرج ہیں،

۱۔ شفا کی تلخیص اقلیدس کے بارے میں ابن ابی اصیبعہ لکھتا ہے:

واشتغل باصفهان بتتميم كتاب الشفا ففرغ من المنطق والمجسطى	قیام اصفہان کے زمانہ میں شیخ کتاب الشفا کی تکمیل میں مشغول ہوا اور منطق اور مجسطی کے مباحث سے
وكان قد اختصر اقليدس و الارثماطيقى والموسيقى واورد	فراغت پائی اور اسی طرح اس نے اقلیدس، ارثماطیقی اور موسیقی کے مباحث کا اختصار کیا اور ریاضیات

[1] عیون الانبا، لابن ابی اصیبعہ جلد اول ص ۲۰۱ [2] رسائل اخوان الصفا جلد اول ص ۴۳ - ۵۵

فی کل کتاب من الریاضیات	کی ہر کتاب میں ضروری اضافے کیے ......
زیادات .... واورد فی اقلیدس	اصول اقلیدس کی تلخیص میں بھی اسی کے مانند
شبهها[1]	اضافے کیے۔

"ریاضیات شفا" کے نسخے رضا لائبریری رام پور اور جامع ایا صوفیا میں موجود ہیں۔

ب۔ ابن ابی اصیبعہ نے شیخ کی مصنفات میں ایک کتاب "مختصر اقلیدس" کا بھی ذکر کیا ہے اور لکھا ہے

"مختصر اوقلیدس واظنه	مختصر اقلیدس: اسکے بارے میں میرا گمان ہے کہ وہ
المضموم الی النجاة"[2]	کتاب النجاۃ میں بطور ضمیمہ کے شامل ہے۔

مگر بیہقی کا خیال ہے کہ یہ شیخ کے شاگرد رشید عبدالواحد الجوزجانی کا الحاق ہے، چنانچہ وہ جوزجانی کے تذکرہ میں لکھتا ہے:

وهو الذی اعان ابا علی علی جمع	اور اسی نے (جوزجانی نے) کتاب الشفا کے جمع کرنے
کتاب الشفا والحق بآخر النجاة والرسالة	میں شیخ کی مدد کی اور نجاۃ اور رسالہ علائیہ
العلائیة طرفا من العلوم	(دانش نامہ علائی) کے آخر میں علوم ریاضیہ کے
الریاضیة[3]	مباحث کا الحاق کیا،

کتب خانۂ آصفیہ حیدرآباد میں "مختصر اقلیدس" کے نام سے ایک مخطوطہ ہے، جو ممکن ہے یہی ہو اسی طرح رضا لائبریری رام پور میں ایک مخطوطہ بعنوان "منتخب لباب اقلیدس" ہے جو غالباً "نجاۃ ابن سینا" سے ماخوذ ہے، مترجم کا نام محمد عابد ہے جنھوں نے اسے عربی سے فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔

ج۔ بیہقی کی مذکورۂ بالا تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچویں صدی میں عبدالواحد الجوزجانی نے "دانش نامہ علائی" کے آخر میں علوم ریاضیہ کا ایک مختصر مرتب کرکے اضافہ کیا تھا، اس میں اقلیدس کی تلخیص بھی تھی۔

---

[1] عیون الانباء جلد ثانی ص ۶ [2] ایضاً ص ۱۹-۲۰ و تتمہ صوان الحکمہ ص ۹۴ [3] تتمہ صوان الحکمہ ص ۹۳-۹۴

چھٹی صدی کے آخر میں صاحب نجم الدین اللبودی نے جو اپنے عہد کے فاضل اجل تھے، اقلیدس کی "تلخیص" مختصر کتاب اقلیدس" کے عنوان سے کی[۱]

ساتویں صدی میں محقق طوسی نے جن کا ذکر اوپر اقلیدس کے ایڈیٹر کی حیثیت سے آچکا ہے، اصول اقلیدس کی ایک سو پانچ ۱۰۵ اشکال کا انتخاب مرتب کیا، اس کا ایک نسخہ قاہرہ میں موجود ہے۔

لیکن سب سے زیادہ شہرت شمس الدین محمد بن اشرف السمرقندی کی "اشکال التاسیس" کو حاصل ہوئی، انھوں نے پہلے مقالہ کی پینتیس ۳۵ اشکال کا جو علم ہندسہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، ایک ملخص "اشکال التاسیس" کے نام سے مرتب کیا، اس کے نسخے برٹش میوزیم اکسفورڈ اور گوتھا میں موجود ہیں، ان کے علاوہ جامع ایاصوفیا میں بھی کئی نسخے ہیں۔

سمرقندی کی اشکال التاسیس" پر قاضی زادہ رومی (شرح چغمنی کے مصنف) نے شرح لکھی، اس کے نسخے ہندوستان اور یورپ کی اکثر لائبریریوں میں موجود ہیں، غالباً بعد میں علماء نے اس کے ساتھ بہت زیادہ اعتنا کیا، کیونکہ اکثر لوگوں نے اس پر حواشی لکھے ہیں، ان میں سے فصیح الدین محمد النظامی اور ابو الفتح محمد ابن ابی سعید الحسینی کے حواشی زیادہ مشہور ہیں، فصیح الدین نظامی نے اپنا حاشیہ امیر شیر علی نوائی کیلئے لکھا تھا، تاج السعیدی (ابو الفتح محمد بن ابی سعید الحسینی) قاضی زادہ رومی کے شاگرد تھے، ان کے حاشیہ کا ایک نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں موجود ہے۔

"اشکال التاسیس" پر ایک ہندوستانی عالم محمد زمان بن محمد صادق سنبھلوی نے فارسی زبان میں ایک شرح لکھی تھی، جس کا نام "تحریر الاشکال لحل اشکال التاسیس" ہے، اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔

ساتویں صدی کے آخر میں علامہ قطب الدین شیرازی نے فارسی زبان میں علوم حکمیہ کا

---

[۱] عیون الانبا، جلد ثانی ص ۱۸۹

یک مجموعہ "درۃ التاج فی غرۃ الدباج" کے نام سے مرتب کیا۔ شیخ بو علی سینا کی طرح انھوں نے بھی اس میں اقلیدس کا ایک مختصر درج کیا۔

آٹھویں صدی میں محمد بن محمود العاملی نے مختلف علوم منقولہ و معقولہ میں ایک کتاب بنام "نفائس الفنون" مدون کی، اس میں اقلیدس کا ایک مختصر بھی شامل ہے۔

قرآن مجید کے فرانسیسی ترجمے

از جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب پیرس



مسلمانوں کی یورپ میں آمد | قسطنطنیہ (حال استانبول) کے بادشاہ ہرقل کے نام بھیجا ہوا مکتوب نبوی ۶ھ کی چیز ہے، امام بخاری وغیرہ کی روایت کے مطابق یہ تبلیغی خط، جس میں قرآن مجید کی بعض آیتیں بھی ہیں، ہرقل کو اس وقت پہنچا جب وہ حمص میں تھا، اور سفیر سے اس نے بیت المقدس پہنچنے پر ملاقات کی،

تاریخ طبری کے بیان کے مطابق ۲۶ھ میں حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلامی فوجیں اندلس (جنوبی اسپین) میں پہنچ گئیں، اور کمک نہ ملنے کے باوجود وہیں حاکمانہ وقابضانہ مقیم رہیں،

تاآنکہ اس کے ستر سال بعد طارق اور موسیٰ بن نصیر نے اس آغاز کو انجام تک پہنچایا،

فاطمی دور کے ممتاز مورخ القاضی الرشید ابن الزبیر نے اپنی کتاب الذخائر والتحف میں بیان کیا ہے کہ طارق نے اربونہ (حال ناربون، فرانس) پر بھی قبضہ کیا تھا، اس کے کچھ ہی دن بعد عبد الرحمٰن الغافقی نے بورڈو فتح کیا اور وہاں کے حکمراں کی لڑکی سے شادی کی، اس کے بعد شمال کی طرف کسانوں اور دیگر نوآبادکاروں کی امن پسند مہم کے ساتھ روانہ ہوا لیکن پورتیے اور طور کے درمیان ایک غیرآباد مقام پر جسے اب خندق الملک (فوسے دو روا) کہتے ہیں، شارل مارتل سے مٹ بھیڑ ہوئی اور بظاہر کسی جاسوس یا کسی غدار نے رات کو عبد الرحمٰن الغافقی کو شہید کر دیا، اس لیے دوسرے دن بے سری فوج اندلس واپس ہو گئی، نئے امیر اندلس نے دوسرے ہی سال دوبارہ طور جانے کی تیاری کی، لیکن خوارج نے بغاوت کر دی، اس لیے مجبوراً فرانس کی نوآبادکاری ملتوی کرنی پڑی، میں نے دو تین مرتبہ ان مشاہد شہداء پر حاضر ہو کر فاتحہ پڑھی ہے۔

چند نسلوں بعد تونس کے اغلبی حکمرانوں نے پرووانس (جنوبی فرانس)، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی تک اپنا اقتدار پھیلایا، اس دور یعنی دسویں اور گیارہویں صدی عیسوی کی فرانس میں کافی یادگاریں اب تک باقی ہیں، مثلاً قلعوں کے کھنڈر، ہتھیار، سکے وغیرہ،

قرآن مجید کا ترجمہ مجریط (میڈرڈ) کے کتب خانوں میں قرآن مجید کے چار ترجمے اب تک محفوظ ہیں، جو اسپینی زبان میں عربی خط میں لکھے ہوئے ہیں، پولینڈی اور لتھوانی زبانیں بھی ایک زمانے میں وہاں کے مسلمان عربی خط میں لکھتے تھے، ایسے پولینڈی اور لتھوانی (عربی خط والے) تراجم قرآن کے مخطوطے بھی اب تک باقی ہیں، حال میں اسی طرح کا ایک یوگوسلافی (عربی خط والا) ترجمہ قرآن کا قلمی نسخہ بھی ملا ہے، ان حالات میں یہ گمان کرنا

بے جا نہیں کہ اموی اور عباسی (اغلبی) دور میں جب فرانس کے تقریباً ایک تہائی رقبہ پر کم و بیش سو سال تک مسلمانوں کا قبضہ رہا تو نومسلموں کی ضرورت کے لیے عربی خط میں فرانسیسی ترجمۂ قرآن کی اشاعت ضروری ہوگئی، لیکن ابتک کوئی دستاویزی ثبوت ایسے فرانسیسی ترجمے کا نہیں ملا ہے، قدیم ترین جس فرانسیسی ترجمہ کا ذکر ملتا ہے، وہ اس سے دو[۲] صدی بعد کا ہے، جیساکہ ذیل میں بیان کیا جاتا ہے،

فرانسیسی تراجم قرآن مجید (۱) قسطیلہ کے حکمراں الفونسو دہم (حکمرانی ۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء تا ۶۸۳ھ / ۱۲۸۴ء) کے حکم سے طلیطلہ کے ایک عالم دون ابراہام نے (جو غالباً یہودی تھا) قرآن مجید کے سورۃ المعارج کا اسپینی میں ترجمہ کیا، اور پھر اس اسپینی سے بوناونتورا دسیب (Bonnaventura de seve) نے اس کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا، (جیساکہ جویش انسائیکلوپیڈیا میں بعنوان "قرآن" ذکر ہے) لیکن بظاہر اب اس کا کوئی وجود باقی نہیں،

(۲) پھر چار سو سال تک سکوت رہا، اس کے بعد ۱۰۵۶ھ / ۱۶۴۶ء میں سیور دورئیے (Sieur du ryer) پارلیس نے مکمل قرآن مجید کا ایک ترجمہ Lal Coran de Mahomet کے نام سے شائع کیا، جس کے سوا سو سال میں کم از کم اکیس اڈیشن چھپے اور اس کی اساس پر متعدد یورپی زبانوں میں ترجمہ ہوا،

(۳) ساواری (M. Savary) کا ترجمہ دو جلدوں میں پہلی مرتبہ پارلیس میں ۱۱۸۶ھ / ۱۷۷۲ء میں Lekoran کے نام سے چھپا، اس کے بعد اس کے کئی اڈیشن شائع ہوئے، اب بھی یہ بازار میں آسانی سے ملتا ہے، ادبی نقطۂ نظر سے بہت عمدہ، لیکن صحت کے لحاظ سے ناقابلِ اعتماد ہے،

(۴) رینو (Reinaud) فرانس کے ممتاز ترین عربی دانوں میں گزرا ہے،

اس کی مشہور تالیف "عربوں کا حملہ فرانس پر اور پھر وہاں سے سوئٹزرلینڈ اور اٹلی پر" حال میں پروفیسر ہارون خاں شروانی کے انگریزی ترجمے کے ذریعہ کافی معروف ہو چکی ہے، اسی مستشرق نے ۱۲۴۴ھ / ۱۸۲۸ء میں دو جلدوں میں ایک کتاب شائع کی جس میں ڈیوک De Blacas اور بعض دوسرے لوگوں کے ذخیروں کی عربی، فارسی اور ترکی چیزوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسکی دوسری جلد میں متعدد آیتوں اور سورتوں کا ترجمہ ہے۔

(۵) گارسین دتاسی کے نام سے اردو داں اچھی طرح واقف ہیں، اس کی متعدد تالیفوں کے مندرجات سے گمان ہوتا ہے کہ وہ مخفی طور سے مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے فرانسیسی میں "قرآن سے ماخوذ اسلامی عقائد و فرائض" کے نام سے ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں ایک کتاب شائع کی جس میں بکثرت قرآنی سورتوں کا ترجمہ ہے، مولف نے صراحت کی ہے کہ یہ ساواری (نمبر ۳) سے ماخوذ ہے، لیکن نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے، پھر نظر ثالث کے بعد یہی مواد ۱۲۹۵ھ / ۱۸۷۸ء میں (salmisme D apres le Coran) کے نام کے شائع ہوا۔

(۶) کازیمیرسکی (Kasimirski) اصل میں پولینڈ کا باشندہ تھا، پھر جامعہ پیرس میں عربی کا پروفیسر مقرر ہوا، اس نے ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۰ء میں مکمل قرآن مجید کا فرانسیسی ترجمہ شائع کیا، اس کے کم از کم چھبیس اڈیشن ہو چکے ہیں اور اب تک مقبول ہے، اور دوسرے ترجموں کے مقابلہ میں بہت اچھا ہے۔

(۷) کازیمیرسکی کے ترجمہ پر نظر ثانی کرکے پوتیے (G. Pauthier) نے ایک اڈیشن شائع کیا۔

(۸) ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۶ء میں مارسل (J.J. Marcel) کے ترجمے کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ مگر اشاعت کا پتہ نہیں چلتا۔

(۹) اسی طرح ایک اور مارسل (Citoyen Marcel) نے مختلف

آیات اور سورتوں کا منظوم ترجمہ کیا، یہ بھی میری نظر سے نہیں گذرا،

اس کے علاوہ بعض اور ترجموں کے حوالے ملتے ہیں، مثلاً

(۱۰) گالان (Gallant) نے ایک ترجمہ کیا، لیکن اس کی اشاعت سے پہلے فوت ہو گیا، اس کا مسودہ لاپتہ ہے،

(۱۱) لبلوا (Le Pellois) نے اپنی فرانسیسی کتاب "قرآن اور عبرانی بائبل" میں نمبر ۰۵ تا ۱۵ کی سورتوں کا ترجمہ شائع کیا،

(۱۲) سینٹ ہلیر (ST. Hilaire) نے بھی اقتباسات شائع کیے (جیسا کہ امریکی مشنری رسالہ مسلم ورلڈ نے ۱۹۲۷ء میں بیان کیا،)

(۱۳) پارس کے کتب خانہ عام میں مخطوطہ ۱۴۶۶ بھی قرآن مجید کا فرانسیسی ترجمہ کہا جاتا ہے، مگر اس کی تحقیق میں نہ کر سکا اور ذیل کے جدید تراجم سے میں خود واقف ہوں،

(۱۴) تربوت (CH. Gillotte) کے الجزائر کے شہر عنابہ میں ۱۲۷۱ھ / ۱۸۵۴ء میں فقہ اسلامی پر جو کتاب چھاپی ہے، اس میں قرآن مجید کے اقتباس بھی ہیں،

(۱۵) فاطمہ زاہدہ (Zaida) نے Le Koran کے نام سے فرانسیسی میں ایک کتاب لزبن (پرتگال) میں ۱۲۷۸ھ / ۱۸۶۱ء میں شائع کی ہے۔ مولفہ اپنے کو مسلمان کہتی ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس فرضی نام سے بعض مکاروں نے گپ شپ پر مشتمل ایک کتاب چھاپی ہے، سوائے سورہ فاتحہ کے اس میں کوئی اور قرآنی سورت مجھے نظر نہ آئی۔

(۱۶) جنیوا (سوئٹزرلینڈ) کی یونیورسٹی کے قیم (ڈکٹر) دوار مونتے (Edouard MonTeT) نے پارس میں ۱۳۴۴ھ / ۱۹۲۵ء میں ایک ترجمہ شائع کیا، اگرچہ یہ ترجمہ ابتک تین بار چھپ چکا ہے لیکن اتنا ناقص ہے کہ ناقابل اعتنا ہے،

(۱۷) مارڈروس (J. C. Mardrus) نے ۱۳۴۵ھ ۱۹۲۶ء میں باسٹھ سورتوں کو پاریس میں Chapitres Du Coran کے نام سے شائع کیا،

(۱۸) دو الجزائری مسلمانوں احمد الأعمش اور ابن داؤد نے وہران (الجزائر) میں ۱۳۵۰ھ ۱۹۳۱ء میں ایک ترجمہ چھاپا جو بہت مقبول ہے،

(۱۹) پیل (O. Pesle) جو غالباً نو مسلم تھے، اور احمد تیجانی نے مل کر پاریس میں ۱۳۶۶ھ ۱۹۴۶ء میں ایک ترجمہ شائع کیا، جس کے تین اڈیشن نکل چکے ہیں، یہ ترجمہ پرانہیں ہے،

(۲۰) ریژی بلاشیر (Regis Blachere) آجکل جامعۂ پاریس میں عربی کے پروفیسر ہیں، انھوں نے ۱۳۶۶ھ ۱۹۴۶ء تا ۱۳۷۱ھ ۵۱ میں ایک ترجمہ شائع کیا، جس کا دوسرا اڈیشن ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۷ء میں شائع ہوا ہے،

(۲۱) آلاری بے ریس (Henri Peres) نے الجزائر میں ۱۳۷۱ھ ۱۹۵۱ء میں سورۂ فاتحہ اور سورۂ بقرہ کا ترجمہ طلبہ کی تدریسی ضرورتوں کے لیے چھاپا ہے،

(۲۲) ترکی عالم محمود مختار پاشا نے حکمت قرآنی (Sagesse Coranique) کے نام سے پاریس میں منتخبات قرآنی کا ترجمہ شائع کیا ہے،

(۲۳) قدیرہ (Ghedira) ایک تونسی مسلمان نے فرانس کے شہر لیون میں ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۶ء میں ایک ترجمہ اہتمام سے آرٹ پیپر پر چھاپا ہے،

(۲۴) آں ری مرسیے (Henri Mercier) نے مراکش کے شہر رباط میں ۱۳۷۶ھ ۱۹۵۶ء میں منتخبات قرآنی مع ترجمہ شائع کیے ہیں، اس میں عربی متن کو عربی خط کے علاوہ لاطینی خط اور موسیقی کی صوتی علامات میں بھی نقل کیا ہے، اور چند مہمل اور بھونڈی تصویریں بھی ایک بد بخت مسلمان کی طرف منسوب کرکے درج کی ہیں،

(۶۵) بشیرالدین محمود احمد امیر جماعتِ قادیان نے بھی ایک ترجمے کا اعلان کیا تھا، مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ چھپا یا نہیں،

(۶۶) راقم الحروف ناچیز کا ترجمہ، پارس ۱۳۷۹ھ/۱۹۵۹ء،

آخرالذکر ترجمے کی سرگذشت ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء کی بات ہے کہ ایک دن کسی اجنبی نے دروازے پر گھنٹی بجائی، معلوم ہوا کہ رتینے نامی نشریات کے مالک ہیں، کہنے لگے کہ میں قرآن مجید کا عربی متن اور ترجمہ چھاپنا چاہتا ہوں، اور پروفیسر ماسینیوں نے آپ کا پتہ دیا ہے، اور یہ فرمایش کی کہ میں ساواری (مذکورالصدر) کے ترجمہ کی نظرثانی کر دوں، دو ہفتوں کے بعد اس کا نمونہ لے گیا، اور آج تک پھر اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں دی،

اس کے چند ماہ بعد ایک اور کمپنی Club Francais Du Livre کے ڈائرکٹر نے پروفیسر ماسینیوں کے ہی حوالہ سے ملاقات کی اور کہا، ہم نے حال ہی میں بائبل کا ایک نیا ترجمہ شائع کیا ہے، جو مقبول ہوا ہے، ہم چاہتے ہیں کہ قرآن مجید کا بھی ایک نیا فرانسیسی ترجمہ شائع کریں، میں نے کہا کہ اگر کوئی فرانسیسی ایک اجنبی کے ترجمے میں "بوئے کچوری می آید" کہنے لگے، معیاری ترجمہ تو وہی ہوتا ہے جو کوئی ایسا فرانسیسی ادیب کرتا جو عربی پر بھی عبور رکھتا اور مسلمان بھی ہوتا، مگر یہ چیز عنقا ہے، اس لیے اس کا حل یہی ہے کہ ایک عربی دان مسلمان اور ایک فرانسیسی ادیب اشتراکِ عمل سے ترجمہ کریں اور ہم آپ کو ایسا آدمی مہیا کرینگے،

میرے لیے یہ بڑی سعادت تھی، اس کا معاوضہ بھی کافی ملا، مگر میں نے یہ پوری رقم حیدرآباد کی اسلامی انجمن "مرکز ثقافت اسلامی" کو دیدی، صفر ۱۳۷۷ھ میں معاہدے پر دستخط ہو گئے اور یہ شرط قرار پائی کہ اٹھارہ مہینوں میں ترجمہ پورا کر دیا جائے،

میں نے پارس اور استانبول میں کام جاری رکھا اور میرے مسودے پر تمت بحمداللہ

پاریس ۲۰ صفر ۱۳۷۵ھ اور ٹائپ شدہ صحیفے پر ایک ماہ بعد کی تاریخ ستمبر ۱۹۵۵ء درج ہے،

جیسے جیسے کام ہوتا گیا اپنے رفیق کار موسیو لیتوزمی کو بھیجتا رہا، وہ ترمیم کرکے واپس کرتے

رہے، نظر ثانی میں بھی اسی طرح ان کو بھیجتا رہا، اس کے بعد ان کے مسکن شہر روبے (Roubaix)

میں جاکر دسمبر ۱۹۵۸ء اور جنوری ۱۹۵۹ء میں چند ہفتوں تک پاس قیام کر کے شروع سے آخر تک

مکرر تصحیح کر کے ناشر کے سپرد کر دیا گیا اور انتظامی مراحل کے گزرنے کے بعد ۱۹۵۹ء میں کمپوز ہونا شروع ہوگیا

اور سات سو صفحے کے پروف ایک ماہ میں مل گئے، اکتوبر میں طباعت اور جلد بندی ہوئی،

اور یکم نومبر کو شائع ہوگیا، بعون اللہ وفضلہ۔

اس ترجمہ کی بعض خصوصیتیں یہ ہیں:

اس کی طباعت دو رنگی ہے، ترجمہ الگ رنگ میں ہے اور حواشی الگ رنگ میں،

تاکہ باطنی تقدس کے ساتھ ظاہری حسن سے بھی آراستہ ہو، حواشی میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ جہاں کہیں توریت، انجیل، زبور کے حوالے ہیں یا قرآنی قصے ان کتابوں میں ہیں، ان کے مکمل حوالے دیے گئے ہیں، حجاب اور تعدد ازدواج وغیرہ کے احکام میں توریت و انجیل کے حوالے بھی دیے گئے ہیں، "وانہ لفی زبر الاولین" کے سلسلے میں حضرت ادریس سے لیکر حضرت عیسیٰ علیہما السلام تک کے اقوال اور پارسی اور ہندو کتب مقدسہ کے مکمل حوالے ہیں، اور دوسرے جو فوائد ذہن میں آئے وہ بھی درج کیے گئے ہیں،

شروع میں پچاس ساٹھ صفحوں کا ایک مقدمہ ہے، اس کی اہم ذیلی سرخیاں یہ ہیں:

قرآن کا مولف، الہام ربانی کا مفہوم مختلف ملتوں میں، نزول وحی کی کیفیت، قرآن و حدیث کا فرق، قرآن کا اسلوب بیان اور اس اسلوب کا مقصد، مندرجات قرآنی، قرآن میں یہودیوں سے زیادہ خطاب کیوں ہے، قرآنی تصور حیات اور اقسام احکام،

عورت کا ذکر قرآن میں، غلامی اور قرآن، سیرت نبویہ قرآن کی روشنی میں، اس سے قرآنی اشاروں کا تاریخی پس منظر سمجھ میں آجاتا ہے، قرآن مجید کی تدوین کی تاریخ، ترتیب آیات و سورت ہائے قرآنی، عربی خط اور اعراب اور دیگر علامات تحریری، قرآن کے نسل بہ نسل تحفظ کا دہرا طریقہ یعنی تحریر و حفظ، صحت متن کے لیے استاذ سے سماع اور اجازت، اختلاف روایات، مسئلہ تنسیخ و تبدیل، تجوید و تلاوت، تراجم قرآنی جن کا آغاز صحابۂ کرام نے فرمایا، تاریخ (مسلمان مترجمین اور غیر مسلم مترجمین) ایک نئے فرانسیسی ترجمے کی ضرورت، یورپی زبانوں میں تراجم قرآنی کی مکمل فہرست،

کتاب میں جغرافیۂ قرآنی اور مشاعر حج کے متعدد نقشے بھی ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

ادبیات

ولادتِ باسعادت

ساقی نامہ

از جناب جگن ناتھ آزاد

جگن ناتھ آزاد صاحب نے جمہور نامہ کے نام سے کئی ہزار اشعار کی ایک طویل نظم لکھی ہے جس میں ابتدائے آفرینش سے لیکر اسوقت تک دنیا کی سرگذشت بیان کی گئی ہے، اس کا ایک باب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور اسکی برکتوں پر بھی ہے، آزاد صاحب اگرچہ ہندو ہیں لیکن اسلامی افکار و تصورات اور مسلمانوں کی تہذیب و روایات کے بڑے مزاج شناس ہیں، اسلیے اسلامی موضوع پر انکی نظموں میں اسلامی روح بولتی نظر آتی ہے، اسلیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ٹکڑا بڑا مؤثر اور دلکش ہے، اس قسم کی نظموں میں جو مختلف النوع واقعات اور خیالات پر مشتمل ہوں، شاعرانہ پہلو کا سنبھالنا آسان نہیں ہے لیکن جگن ناتھ صاحب ایک قادر الکلام شاعر ہیں اسلیے انھوں نے اس نظم میں شاعرانہ خوبیوں کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے، جسکا اندازہ اس نظم سے ہوگا، "م"

پلادے معرفت کی جس قدر بھی ہے باقی
کہ میرے لب پہ ذکرِ فخرِ موجودات ہے ساقی

اٹھا دہ جام جو احساس کی دنیا کو گرما دے
مرے جذبے کو اپنی ایک موجِ مے سے چمکا دے

جو مجھ کو بات کرنے کا مؤدب ڈھنگ سکھلا دے
مری گفتار کی قوت پہ یہ احسان فرما دے

کہ اب مجھکو گزرنا ہے بڑے نازک مقاموں سے
کبھی بطحا کی صبحوں سے کبھی یثرب کی شاموں سے

جہانِ شاعری میں آج رہ جائے بھرم میرا
سخن سنجوں کی صف میں ہو نہ شرمندہ قلم میرا

مجھے لکھنا ہے اک انسانیت کا بابِ تابندہ
منور جس کے ہوں الفاظ مصرعے جس کے رخشندہ

مجھے اک محسنِ انسانیت کا ذکر کرنا ہے
مجھے رنگِ عقیدت فکر کے سانچے میں بھرنا ہے

بیاں کرنا ہے اوجِ ابنِ آدم بن کے کون آیا
بیاں کرنا ہے فخرِ ہر دو عالم بن کے کون آیا

بتانا ہے کہ جب انسان سیدھی راہ بھولا تھا
وہ جب نازاں تھا کج بینی پہ گمراہی پہ پھولا تھا

تو کیونکر غیب سے انسانیت کا رہنما آیا
شفاعت کا لیے ساماں بشر کا آسرا آیا

وہ کیا ساماں تھا جب اتری تھی رحمت دو جہانوں کی
بلندی مل گئی کیونکر زمیں کو آسمانوں کی

بشر سے کس طرح تورات کے وعدے ہوئے پورے
سحر کے شام کے دن رات کے وعدے ہوئے پورے

بشارت جس کی دی تھی ابنِ مریم نے زمانے کو
وہ ہستی کون تھی کب آئی تھی محفل سجانے کو

نہ ہے تابِ سخن مجھ کو نہ ہے تحریر کا یارا
میں ذرہ ہوں مرا موضوع خورشیدِ جہاں آرا

کہانی لکھ چکا ہوں گرچہ سورج چاند تاروں کی
بہت دہرا چکا ہوں داستاں رنگیں بہاروں کی

مگر وہ چاند تارے پھول سورج سب ہیں جسمانی
جواب موضوع ہے خورشید میرا وہ ہے روحانی

یہ خورشیدِ ضمیر آرا ہے خورشیدِ معانی ہے
اسی خورشید کی ذرے کے لب پر اب کہانی ہے

عرب اور باقی دنیا کی حالت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے قبل

عرب کی سرزمیں پر خیمہ زن گھر اندھیرا تھا
جہاں تک کام کرتی تھی نظر ظلمت کا ڈیرا تھا

عرب کی سرزمیں ہر قید سے آزاد دنیا تھی
یہ دنیا اک عجب مجموعۂ اضداد دنیا تھی

یہ صحرائے لق و دق یہ شتربانوں کا گہوارہ
لیے بیٹھا تھا ہر گوشے میں ایماں سوز نظارہ

قبیلوں میں یہاں تقسیم تھی انسان کی دنیا ۔۔۔ فقط جنگ و جدل پر تھی فدا اس ان کی دنیا
بہانہ ڈھونڈتے پھرتے تھے انسان جنگ بازی کا ۔۔۔ ہر اک گھر ان کی گھٹی میں پڑا تھا فتنہ سازی کا
بظاہر گرچہ تھے یہ دین ابراہیم کے پیرو ۔۔۔ بباطن تھے مگر سب اپنی ہی تنظیم کے پیرو
یہاں جتنے بھی پینے تھے شجاعت کے ٹھکانے تھے ۔۔۔ مگر اپنے ہی بھائی اس شجاعت کے نشانے تھے
بہادر جس قدر بھی تھے بہم دست و گریباں تھے ۔۔۔ جنوں وہ تھا کہ اپنے ہاتھ تھے اپنے ہی داماں تھے
کمال بدزبانی تھا کمال انکی طلاقت کا ۔۔۔ نمونہ فحش گوئی کا نمونہ تھا فصاحت کا
بڑا معیار تھا ان کی شرافت کا نجابت کا ۔۔۔ کہ دھندلا سا تصور بھی نہ تھا عورت کی عزت کا
یہ اپنی بیٹیوں کو جا کے زندہ گاڑ آتے تھے ۔۔۔ کتاب زندگی کا یہ ورق خود پھاڑ آتے تھے
سمجھتے تھے کہ بیٹی داغ ہے انسان کے دامن کا ۔۔۔ اسے کہتے تھے وہ اک خار ہستی کے گلستاں کا
عجب انداز تھا انکی ثقافت کا عدالت کا ۔۔۔ نرالا رنگ تھا ان کی شجاعت کا سخاوت کا
جو تھے جود و کرم والے نمایاں تھا یہ حال انکا ۔۔۔ کہ کمزوروں کے حق کو مار لینا تھا کمال انکا
سخی جو تھے وہ بیواؤں کا حق اپنا سمجھتے تھے ۔۔۔ جواں بیٹے جو تھے ماؤں کو حق اپنا سمجھتے تھے
یہاں مذہب کی عزت تھی نہ تھی ایمان کی عزت ۔۔۔ نہ ہو ایمان کی تو پھر کہاں انسان کی عزت
غرض اس سرزمیں کی تھی عجب ناگفتنی حالت ۔۔۔ جو نظارہ تھا اس کا، تھا وہی نظارۂ عبرت

جہاں قرآن بن کر حرف حق کو جگمگانا تھا
وہ خطہ آج اک گہرے اندھیرے کا ٹھکانا تھا

ایران

عرب سے مختلف تھا گرچہ کچھ ایران کا عالم ۔۔۔ یہاں بھی تھا مگر ناگفتنی ایمان کا عالم
شہنشاہی کی یاں بے نور شمعیں جھلملاتی تھیں ۔۔۔ بھڑک اٹھتی تھیں وہ کچھ دیر جب بجھنے پہ آتی تھیں

یہ ان بجھتی ہوئی شمعوں کا تھا انداز نورانی
کہ ظلمت میں اضافہ کر رہی تھی ان کی تابانی

یونان اور روم

وہی یونان کہلاتا تھا جو تہذیب کی دنیا
وہی روئے زمیں پر آج تھا تخریب کی دنیا

یہ تحقیق و تجسس کا جہاں تھا آج ویرانہ
فلاطوں کی خرد، سقراط کی دانش تھی افسانہ

زمیں بالکل ہی بنجر تھی گھٹا جس پر برستی تھی
کتابِ زندگانی اہلِ معنی کو ترستی تھی

ارسطو کی طلاقت ایک گم گشتہ خزانہ تھی
سکندر کی شجاعت ایک پارینہ فسانہ تھی

وہ دنیا جس پہ تھی اسکندرِ اعظم کی دارائی
بالآخر رومیوں کے ایک دن زیرِ نگیں آئی

یہ رومی کاروبارِ زندگی میں گرچہ ماہر تھے
مگر تہذیب کے معنی سمجھنے سے وہ قاصر تھے

نہ تھا ان کو ذرا فن و ہنر کے نام سے مطلب
انھیں تھا بس حکومت اور اسکے کام سے مطلب

یہ بے چارے رہے اخلاق کے عالم سے ناواقف
یہ آدم زاد تھے ہمدردیِ آدم سے ناواقف

چین

بہت چمکا زمیں پر چین کی تہذیب کا تارا
مگر اب بجھ کے ٹھنڈا ہو چکا تھا یہ جہاں آرا

کبھی ہوتی رہی ہو گی یہاں تعظیم کنفیوشس
دلوں سے ہو چکی تھی محو اب تعظیم کنفیوشس

ولادتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم

غرض دنیا میں چاروں سمت اندھیرا ہی اندھیرا تھا
نشانِ نور گم تھا اور ظلمت کا بسیرا تھا

کہ دنیا کے افق پر دفعۃً سیلابِ نور آیا
جہانِ کفر و باطل میں صداقت کا ظہور آیا

حقیقت کی خبر دیتا بشیر آیا نذیر آیا
شہنشاہی نے جس کے پاؤں چومے وہ فقیر آیا

بھٹکتی خلق کو رستہ دکھانے رہنما آیا
سفینے کو تباہی سے بچانے ناخدا آیا

مبارک ہو زمانہ کو کہ ختم المرسلین آیا
سحابِ رحم بن کر رحمۃ للعالمین آیا

خلیق آیا کریم آیا رؤف آیا رحیم آیا
کہا قرآں نے جس کو صاحبِ خلقِ عظیم آیا

بصیرت عام فرماتا ہوا مردِ بصیر آیا
اندھیرے کی حکومت میں تجلّی کا سفیر آیا

بشر بنکر زمانے کا جمالِ اولیں آیا
متاعِ صدق لیکر صادق الوعد و امیں آیا

وہ آیا فقر و فخری رتبہ ہے جس کی قناعت کا
وہ آیا جو معلّم ہے جہاں میں دینِ فطرت کا

وہ آیا جس کو کہئے فخرِ آدم، ہادیِ اکرم
وہ آیا جس کو کہئے زندگی کا محسنِ اعظم

سراپا علم بنکر صاحبِ امّ الکتاب آیا
زمینِ تشنہ لب کی زندگی بنکر سحاب آیا

تجلّی عام فرماتا ہوا شمس الضحےٰ آیا
امام الانبیاء آیا محمد مصطفےٰ آیا

محمد مصطفےٰ یعنی وہ محبوبِ خدا آیا
دلوں نے سرخوشی پائی کہ احمد مجتبےٰ آیا

کبھی پھرتا رہا جو زندگی کی چشمِ حیراں میں
وہی جلوہ سمٹ کر آگیا خود بزمِ امکاں میں

نویدِ جانفزا پائی یتیموں نے غریبوں نے
غلاموں، بے سہاروں، بیکسوں، آفت نصیبوں نے

پیامِ زندگانی مل رہا تھا زیردستوں کو
قضا آنکھیں دکھاتی پھر رہی تھی خود پرستوں کو

دلِ دنیا سے ہر ارمان اٹھتا تھا دعا بن کر
مسرت نعرہ زن تھی چارسو پیکِ صبا بن کر

سلام

سلام اے ظلِّ سبحانی سلام اے نورِ یزدانی
سلام اے وقت کی تقدیر کے ماتھے کی تابانی

سلام اے سازِ ایمانی سلام اے سوزِ قرآنی
سلام اے حرزِ روحانی سلام اے نطقِ ربانی

سلام اے آسمانِ قدس کے مہرِ جہاں آرا سلام اے کیف و رنگِ نوبہارِ باغِ گلستاں آرا
سلام اے رحمتِ عالم، سلام اے سیدؐ الا سلام اے فخرِ آدم انبیا کے طرۂ زیبا
سلام اے نورِ حق، اے شمعِ ظلمت خانۂ دنیا سلام اے ساقیِ دریا دلِ میخانۂ دنیا
سلام اے دستگیرِ بیکساں اے ہادیِ اکرم سلام اے دو جہاں کی زندگی کے محسنِ اعظم
سلام اے وہ کہ ہے پیغمبرِ امی لقب تیرا سلام اے وہ کہ تیری ذات پر نازاں نسب تیرا
سلام اے وہ کہ تھے تیرے لیے تورات کے وعدے بشر سے تھے سحر کے شام کے دن رات کے وعدے
سلام اے وہ کہ تیری ابنِ مریم نے بشارت دی جہانِ زندگی کے کیف نے کم نے بشارت دی
سلام اے بیکسوں کو ارجمندی بخشنے والے سلام اے پست حالوں کو بلندی بخشنے والے
سلام اے دیوِ باطل کی کلائی موڑنے والے سلام اے آدمی کا حق سے رشتہ جوڑنے والے

سلام اے نازشِ نفخِ دو تارِ آدمِ فانی
سلام اے بزمِ تاریک جہاں میں شمعِ نورانی

مطبوعات جدیدہ

زجاجۃ المصابیح (عربی) جلد رابع — مرتبہ مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ صاحب، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۴۴۱، قیمت ۲۵ روپے۔ پتہ: مولانا ابوالحسنات سید عبداللہ شاہ صاحب نقشبندی، حسینی علم، جوبلی پوسٹ آفس (۲) حیدرآباد دکن (ہند)

اس کتاب کے پہلے حصوں پر معارف میں ریویو کیا جا چکا ہے، یہ کتاب کا چوتھا حصہ ہے جو کتاب الآداب، کتاب الرقاق اور کتاب الفتن پر مشتمل ہے، اس کی ترتیب بالکل مشکوٰۃ المصابیح کے طرز کی ہے، صرف فرق یہ ہے کہ مشکوٰۃ میں شوافع کے مسلک کی مؤید روایات ہیں، اور اس میں احناف کے مسلک کی، فاضل مرتب نے حواشی میں متداول شرحوں کی مدد سے احادیث کی ضروری تشریح، اور ان سے حنفی مسلک کا استنباط، اور اس کی مؤید دوسری حدیثیں بھی نقل کر دی ہیں، اور فقہ کی کتابوں سے حنفی مسلک کا تذکرہ بھی کر دیا ہے، اور جن مسائل پر اعتراض کیا جاتا ہے، اس کا جواب بھی دیا ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب احادیث نبوی کا ایک مفید مجموعہ بھی ہے اور حنفی مسلک کی ترجمان بھی، یہ کتاب مرتب کر کے مولف نے دونوں کی لائق تحسین خدمت انجام دی ہے۔

نور المصابیح (اردو) — مترجمہ مولانا محمد منیر الدین صاحب، لمبی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۱۱۰۳، قیمت للعمر ہے۔ پتہ: مکتبہ نقشبندیہ ۲۲۳-۱۶۰-۵ حسینی علم بارہ گلی، حیدرآباد دکن (۲)

یہ کتاب زجاجۃ المصابیح حصۂ اول کا اردو ترجمہ ہے، اور کتاب الایمان، کتاب العلم اور کتاب الطہارۃ

اور اس کے تحتانی ابواب پر مشتمل ہے، اس ترجمہ سے زجاجۃ المصابیح کا افادہ عام ہو جائے گا، اور اردو خواں طبقہ بھی اس سے فائدہ اٹھا سکے گا، ترجمہ اگرچہ عام فہم ہے، مگر اس میں مزید سلاست اور شگفتگی پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔

مذہب وتمدن - از مولانا ابوالحسن علی ندوی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۲۰، قیمت عہ؍ پتہ: ادارۂ نشریات اسلام، رحیم یارخاں، مغربی پاکستان،

یہ کتاب فاضل مصنف کا وہ مقالہ ہے جو انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی فرمائش پر اس کی ایک علمی مجلس میں پڑھا تھا اور اسی زمانہ میں یہ شائع بھی ہو گیا تھا، مگر اب نایاب تھا، اسلیے ادارۂ نشریات اسلام نے مصنف کی نظر ثانی کے بعد دوبارہ شائع کیا ہے، فاضل مقالہ نگار نے اس مقالہ میں مذہب، فلسفہ اور تمدن کے بعض مشترک، اہم اور بنیادی مسائل پر عقل، فلسفہ، اشراق، روحانیت اور دوسرے تمدنی نظاموں کی روشنی میں بحث کر کے ثابت کیا ہے کہ یہ سب ان مسائل کو حل کرنے سے قاصر ہیں اور مذہب و رسالت کی تعلیمات ہی ان کی مشکلات کو حل کر سکتی ہیں فاضل مصنف کی دوسری تحریروں کی طرح یہ مقالہ بھی ایمان و یقین سے معمور اور بڑا موثر و دلپذیر ہے، اور خصوصیت کے ساتھ جدید تعلیمیافتہ طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہے،

تذکرۂ مخطوطات جلد چہارم مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری صاحب زور تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۴۱۰ مجلد مع گردپوش وغیر مجلد، قیمت تحریر نہیں، پتہ: سب رس کتاب گھر، ادارۂ ادبیات اردو، خیریت آباد، حیدرآباد، ۴

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد کے کتب خانہ کے مخطوطات کی فہرست کی تین جلدیں اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں، جن پر معارف میں تبصرہ ہو چکا ہے، یہ چوتھی جلد دو سو قلمی کتابوں کی فہرست پر مشتمل ہے اور پہلی جلدوں کی طرح اس میں بھی تصنیف اور مصنف کے متعلق ضروری معلومات تحریر کی گئی ہیں،

شروع میں چاروں جلدوں کی اجمالی اور چوتھی جلد کی بلحاظ موضوع فہرست بھی دیدی گئی ہے، یہ فہرست اردو پر کام کرنے والے طلبہ کے لیے بڑی مفید اور کارآمد ہے،

رباعیات محروم ۔ ازجناب تلوک چند محروم، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت وطباعت عمدہ، صفحات ۲۵۲، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۱۲؍ پتہ: رسالہ بیسویں صدی، ترکمان گیٹ، دہلی،

جناب تلوک چند محروم اس دور کے اساتذۂ سخن میں ہیں اور اردو شعروادب پر انکی نظر استادانہ ہے، بقول سر عبدالقادر مرحوم "انھوں نے اپنی عمر بھر کی محنت سے یہ ثابت کیا ہے کہ اردو ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک بیش قیمت سرمایہ ہے"، اردو کے اصناف سخن میں رباعی بہت مشکل صنف ہے، اس لیے دوسرے اصناف سخن کے مقابلہ میں رباعیات کے مجموعے کم ہیں، لیکن جناب محروم جس درجہ کے غزل گو اور ناظم ہیں، اسی درجہ کے رباعی گو بھی ہیں، اور انکی رباعیات کا ایک مجموعہ عرصہ ہوا چھپ چکا ہے، اب اس کا دوسرا اڈیشن شائع ہوا ہے جس میں مختلف عنوانات کے تحت بڑی حکیمانہ اور سبق آموز رباعیاں ہیں، اردو رباعیوں کے علاوہ آخر میں چند فارسی رباعیاں بھی شامل ہیں، یہ مجموعہ جناب محروم کے کلام کی پختگی و بلندی، زبان کی حلاوت و سلاست اور بیان کی دلکشی و دلآویزی کا نمونہ ہے، مجموعے کے شروع میں اکبر الہ آبادی کی ایک منظوم تقریظ کے علاوہ ڈاکٹر اقبال اور علامہ برج موہن دتاتریہ کیفی کے پرمغز دیباچے ہیں جن میں رباعیات محروم کی مختلف حیثیتوں پر تبصرہ کیا گیا ہے، یہ مجموعہ اپنی فنی اور معنوی خوبیوں کے لحاظ سے ارباب ذوق کے مطالعہ کی چیز ہے،

شہادت حسین ۔ مرتبہ جناب مفتی انتظام اللہ شہابی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۱۳۹، مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت عہ؍ ناشر محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب قرآن محل، مقابل مولوی مسافر خانہ، کراچی، پاکستان،

حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی سوانح اور واقعۂ شہادت پر اردو میں کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، یہ نئی کتاب مشہور اہل قلم مفتی انتظام اللہ صاحب شہابی نے لکھی ہے، اس میں واقعۂ کربلا کے علاوہ شروع میں حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے مختصر حالات اور آخر میں آپ کے کمالات، فضائل اخلاق اور اولاد و ازواج کا بھی تذکرہ ہے، کتاب عام لوگوں کے مطالعہ کے لیے اچھی ہے،

تذکرہ شعرائے قدیم نظم نگر } مرتبہ جناب حسرت سہروردی بی اے، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶، مجلد مع گرد پوش، قیمت عہ، (۱) سکریٹری تامل ناڈ اردو مجلس "نشیمن" (رجسٹرڈ) تلے نگر، ترچنا پلی (۲) مینہ پریس، ٹرپلیکن، ہائی روڈ، مدراس ۵۰ وغیرہ

یہ جنوبی ہند کے علاقہ ترچنا پلی (نظم نگر) کے تقریباً ایک صدی پہلے کے بعض شعراء کا تذکرہ ہے لیکن اس میں شاعروں کے حالات برائے نام ہیں، زیادہ تر کلام کے نمونے اور ان کی خصوصیات پر تبصرہ کیا گیا ہے، اسلیے اسکو تذکرہ مشکل ہی سے کہا جا سکتا ہے، کتاب میں غیر ضروری باتوں کے بجائے اگر شعرا کے حالات پر زیادہ توجہ کیجاتی تو یہ کتاب زیادہ مفید ہوتی، غالباً یہ مرتب کی پہلی تصنیفی کوشش ہے، اس لیے اس میں تحریر کی خامیاں بھی ہیں لیکن اس حیثیت سے مفید ہے کہ اس سے جنوبی ہند کے ایک دور دراز علاقہ میں اردو کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے اور وہاں کے شعراء کے حالات اور ان کا کلام گو مختصر سہی محفوظ ہو گیا،

سفر حجاز - از جناب عبد الکریم ثمر صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ عمدہ، خوبصورت ٹائپ، صفحات ۱۶۰، قیمت عہ پتہ: مکتبۂ عرفان، اچھرہ، لاہور، پاکستان،

مصنف شاعر کی حیثیت سے روشناس ہیں، اس کتاب سے معلوم ہوا کہ وہ نثر کا بھی ذوق رکھتے ہیں، گذشتہ سال وہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے تھے، یہ کتاب اسی سفر کی روداد ہے، اس میں حج و زیارت اور سفر کی روداد کے علاوہ مکہ معظمہ، مدینہ طیبہ، دوسرے مقامات اور

کے آثار و مشاہد کے مختصر تاریخی اور تمدنی حالات اور آخر میں گنبد خضرا کے سایہ میں لکھے ہوئے سلام اور نعتیہ نظمیں بھی شامل ہیں، جن کے لفظ لفظ سے سوز و گداز اور عقیدت و محبت کے بات ٹپکتے ہیں، اس لیے اس کا مطالعہ ہم خرما و ہم ثواب کے مصداق ہے، مگر کتابت باعت کی غلطیاں بہت ہیں،

(۱) **حقیقت کی تلاش** } از جناب وحید الدین خاں صاحب، چھوٹی تقطیع
(۲) **اسلام ایک عظیم جد و جہد** } کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات بالترتیب ۵۹
۳۲۔ قیمت بالترتیب ۵۰ اور ۳۲ نئے پیسے، پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رامپور۔ یو پی

یہ دونوں رسالے دراصل دو مقالے ہیں، پہلا مقالہ مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال میں پڑھا گیا ا، اس میں انسانی ذہن کے تین فطری اور نفسیاتی سوالات خالق، معبود اور انجام کی تلاش کا زیر کرکے پہلے عقل و سائنس سے اس کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پھر رسول اللہ صلی اللہ یہ وسلم کی دعوت سے ایسا تشفی بخش جواب دیا گیا ہے کہ اس میں اسلامی دعوت کا خلاصہ آگیا ہے، وسرے مقالے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام نے جس کامیابی اور کامرانی کا وعدہ کیا ہے وہ بڑی بد و جہد اور قربانی کے بعد حاصل ہوتی ہے، اور اس جد و جہد کے تین لازمی اور بنیادی مراحل یں، ایمان، ہجرت، اور جہاد، اور ان کی ضروری تشریح بھی کردی گئی ہے، یہ دونوں مقالے پنی افادیت کے لحاظ سے عام مسلمانوں اور خصوصیت کے ساتھ جدید تعلیمیافتہ لوگوں کے مطالعہ کے قابل ہیں،

سحر حلال ۔ مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبد الحق صاحب، تقطیع چھوٹی، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۳۴، قیمت عہ، پتہ ۵۵۹ ڈائل روڈ، بائیکلہ، بمبئی نمبر ۱۱

یہ جناب ساحر بھوپالی کا مجموعۂ کلام ہے، اس کا زیادہ حصہ غزلیات پر مشتمل ہے، چند نظمیں اور

تضمینیں بھی ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ساحر صاحب اصل میں غزل گو ہیں، زبان اور تخیل کی بعض خامیوں سے قطع نظر مجموعی حیثیت سے کلام غزل کے لوازم سے آراستہ ہے، مگر اس کی قیمت زیادہ ہے،

اردو صرف و نحو۔ مرتبہ ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب، چھوٹی تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت اچھی، صفحات ۱۳۴ قیمت عہ پتہ: انجمن ترقی اردو ہند، علی گڈھ

یہ کتاب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کی پرانی تصنیف ہے، اب اسکا نیا اڈیشن انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا ہے، اردو صرف و نحو کے قواعد اختصار مگر جامعیت اور استقصاء کیساتھ بیان کیے گئے ہیں، کتاب کی خوبی کیلئے مصنف کا نام

اوراق پریشاں۔ از جناب چودھری محمد مصطفےٰ حسین صاحب بسمل لکھنوی، متوسط تقطیع، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۲ مجلد مع رنگین گرد پوش، قیمت: ؏ پتے: مدرسۃ الواعظین کینٹنگ اسٹریٹ لکھنو (۲) دلاور حسین اسٹاف رپورٹر۔ امرت بازار پتریکا۔ ۲۳ بی ایبٹ روڈ۔ لکھنو۔ (۳) ادبستان گوئن روڈ لکھنؤ وغیرہ۔

جناب چودھری محمد مصطفےٰ حسین بسمل لکھنوی مرحوم، حضرت عزیز لکھنوی کے شاگرد اور ایک قادر الکلام و پرگو شاعر تھے، انکی وفات کے بعد انکے لائق فرزند چودھری عباس حسین صاحب اور دوسرے متعلقین کی کوششوں سے یہ مجموعہ شائع ہوا ہے، جو بیشتر غزلیات پر مشتمل ہے، دوسرے اصناف سخن برائے نام ہیں، کلام ظاہری اور معنوی دونوں خوبیوں سے پوری طرح آراستہ ہے، اس لیے ارباب ذوق اس سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں،

ذہنی تربیت۔ از جناب شوکت علی صاحب بی۔ اے ایل۔ ٹی تقطیع خورد، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۹۶ قیمت ۱۲ر پتہ: مکتبہ جماعت اسلامی ہند، رام پور یو پی۔

یہ کتاب بچوں کی ذہنی تربیت اور دماغی تفریح کے لیے لکھی گئی ہے، اس میں دلچسپ اور پر لطف سوالات ہیں جن کا آخر میں جواب بھی دیدیا گیا ہے، کتاب جس مقصد کے لیے لکھی گئی اس کے لیے مفید ہے، اور اس سے بچوں کے علاوہ فرصت کے اوقات میں بڑی عمر کے لوگ بھی دماغی تفریح حاصل کر سکتے ہیں۔

"ض"

سلسلۂ تابعینؓ و تبع تابعینؓ

اہل کتاب صحابہ و تابعینؓ

شروع میں عرب کے یہود و نصاریٰ کی قدیم تاریخ اور اُن کے تمدنی و سیاسی اثرات اور اُن کی دینی و اخلاقی حالت کی تفصیل اور اس کے بعد حروفِ تہجی کے اعتبار سے (۹۳) اہل کتاب صحابہ اور تابعین اور اُن کے بعد صحابیات اور تابعات کا تذکرہ قلم بند کیا گیا ہے، مرتبہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

ضخامت ۲۶۵ صفحے قیمت: للعہ

تابعینؓ

اس میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ، حسن بصریؒ، اویسؒ قرنی، امام زین العابدینؒ، سعید بن مسیب، محمد بن سیرینؒ، ابن شہاب زہری، اور قاضی شریح وغیرہ ۹۶ اکابر تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے سوانح اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی، اور علمی مجاہدات اور کارناموں کی تفصیل ہے، مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی،

طبع دوم ضخامت ۵۵۶ صفحے قیمت عہ

تبع تابعینؒ

(حصۂ اول)

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں جس طرح صحابہ کرام کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے اور صحابۂ کرام کے بعد اُنہی کی زندگی ملتِ اسلامیہ کے لئے نمونۂ عمل بنی، بالکل اسی طرح تابعین کرامؒ کے جانشین اور اُن کے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، سیر الصحابہ کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین تابعینؒ کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کر چکا ہے، اب اُس نے اُن کے بعد کے مقدس بزرگوں اور ائمۂ دین کا مرقع تیار کرایا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور اُنکے فقہی مسلک کے داعی و علمبردار امام ابو یوسف، امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضیل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور اُن کے علمی، مذہبی، اخلاقی کارنامے اور فقہی اجتہادات کی تفصیل بیان کی گئی ہے، مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی حصۂ اول ضخامت صفحے

قیمت: